سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازیگر
دوسرا حصہ

بماری ۔ کسی کو خبر نہیں تھی۔ ہم وہاں ایک ایک پہنچے تو اڈے
میں کھلبلی مچ گئی۔ شمولی نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ نصیب میاں نے
میری بلائیں لے لیں۔ "اے واہ میاں! سبحان اللہ! ایسی بھی کیا ستم گری۔ نہ تار
نہ پیام۔ نہ کلام نہ سلام۔ تسنیم بیگم کی استاد نواب کو کسی پہلو چین نہیں
تھا۔ آہیں بھرتے تھے۔" نصیب میاں نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتے
ہوئے کہا۔

اڈا اجڑا اجڑا معلوم ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر میں آدمیوں سے بھر
گیا۔ ہر شخص بچہ سے گلے مل رہا تھا اور میری عدم موجودگی میں تجمل کی کیفیت
بیان کر رہا تھا۔ کانٹے نے بمبئی میں مجھے سچ بتایا تھا۔ جلد ہی مجھے خود بھی
اندازہ ہوگیا کہ اڈے کا وہ حال نہیں ہے جو پہلے تھا۔ کئی آدمی پیسہ دینا
بند کر چکے تھے۔ سونا گلی کے علاقے پر استاد تیور خاں نے پوری طرح
قبضہ جما لیا تھا۔ اُدھر گھورشی پہلے ہی مومبلے کے اڈے پر جا بیٹھا تھا۔ دور دراز
کے علاقے والے اڈے بھی پیسہ دیتے ہوئے آنا کانی کرنے لگے تھے اور
کہتے تھے کہ جب استاد تجمل اس طرف کی خبر ہی نہیں لیتا تو وہ کیوں اُسے
علاقے کی آمدنی میں شریک کریں۔ تجمل کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔
مجھے بتایا گیا کہ علاقوں میں گشت کرنے والے آدمی بھی حساب میں صاف
نہیں ہیں۔ پیسہ درمیان ہی میں اڑا جاتے ہیں۔ تجمل کے بمبئی جانے کے
بعد حالات اور خراب ہوگئے تھے۔ گھورشی کی تعداد میں کا ذکر سب کے ہونٹوں
پر تھا۔ تجمل کے اڈے کے کئی پرانے آدمی گھورشی سے مل گئے تھے۔

دوسرے دن شہر میں دور دور تک یہ خبر پھیل گئی کہ تجمل واڈے کے
ساتھ واپس آ چکا ہے۔ شام کو استاد تیور خاں تمام رقم لے کے خود حاضر ہوگیا۔
اُس نے تجمل سے معذرت طلب کی اور رقم کی ادائی میں تاخیر کے مختلف
عذر تراشے۔ تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ رقم نصیب میاں کو دے دی گئی۔ رات
تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ دو ہی دنوں میں رکی ہوئی اچھی خاصی بڑی
رقم جمع ہوگئی۔ سارا اڈے کی پرانی رونق رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔ کانٹے
بمبئی سے آنے کے بعد اب تک الگ تھلگ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ سرگرم ہوگیا۔
اُس نے تجمل سے ایک ہزار روپے کے جوئیں کے نام بمبئی روانہ کردیے اور
کئی آدمیوں کی سختی کے ساتھ یہ تاکید کردی کہ یہ روپے صرف جوئیں خرچ کرے
گی۔ وہ جوئیں کے سلائے ہوئے کپڑے پہنتے ہوئے تھا۔ کپڑے میلے ہوگئے
تھے لیکن پھٹتے انھیں اتارنا نہیں تھا۔ حالانکہ یاد جانے پر عصر تک تجمل
نے اُسے نہیں جانے دیا۔ اڈے کے دوسرے لوگ اس کی خاطر تواضع میں مصروف
تھے۔ تیور خاں اُسے اپنے ساتھ سونا گلی بھی لے گیا تھا۔ شمولی، ساوے، ببلا
لالو وغیرہ سب میرے گرد جمع رہتے تھے۔ نصیب میاں اِدھر سے اُدھر
تھرکتے رہتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص پیسے لے کے آتا، وہ چلاتے: "استاد
برکت ہی برکت ہے۔ ساری برکت چشمِ بد دور لاڈلے میاں کی ہے۔ واہ
نواب! ذرا ایک بکرا تو منگواؤ۔"

دو دن تک یہی ہنگامہ رہا۔ تجمل زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا اور
اُن سے ملتا رہا۔ وہ خود عموماً خاموش ہی رہتا۔ تیسرے دن صبح ہی صبح تجمل

جبکہ ساتھ اس مدرسے میں گیا جہاں مولوی محمد شفیق مجھے اردو کورا کر گئے تھے۔ صدر مدرس جمیل سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے اور مولوی محمد شفیق کا سامان دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ سامان ایک الماری میں ابھی تک بند تھا۔ وہاں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ مولوی شفیق کے سامان سے ایک کاپی نکلی۔ کاپی میں تعویذ لکھے ہوئے تھے اور کلکتے کی مختلف دکانوں کے پتے بھی درج تھے۔ جمیل نے صدر مدرس سے وہ کاپی عاریتاً طلب کی۔ انھوں نے بڑی حیل و حجت کے بعد وہ کاپی دے دی۔ میں کورا کے سارے کپڑے لے جانا چاہتا تھا مگر مدرس نے کاپی ہی بڑی مشکل سے دی تھی۔ وہ کپڑے اصل میں فیض آباد کے تھے مگر کورا نے بھی انھیں پہنا تھا۔ ان میں کورا کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ کسی دن رات کو یہاں آ کے انھیں چوری کر لوں گا۔ تالا بہت معمولی تھا۔ ایک جھٹکے میں کھل سکتا تھا اور مدرسے میں کوئی خاص پہرا بھی نہیں رہتا تھا۔ دوپہر تک جمیل مولوی صاحب کی کاپی کے صفحوں پر جا جا کے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کسی کو بھی مولوی صاحب کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انھوں نے ایک عرصے سے ان کی شکل نہیں دیکھی ہے، نہ ان کے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہیں۔

اُس دن رات کو جمیل نے خلاف توقع اپنے تمام اڈوں کا نگران استاد جامو کو بنا دیا۔ جمیل کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اُس کی عدم موجودگی میں جامو اور جامو کی عدم موجودگی میں کالے اور لالا اڈے کا کام سنبھالیں گے۔ کالے کی طرح لالا کا ہاتھ بھی چاقو میں بہت رواں تھا۔ سب نے یہ اعلان حیرت سے سنا کیونکہ بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ جمیل جامو کے بجائے لاڈلے کو متعین کرے گا۔ کالے نے مجھے بتایا کہ جامو بے حد اصرار کے بعد کلکتے میں رکنے پر تیار ہوا ہے اور اُس نے لکھنؤ کے کلّن خاں کو اطلاع دے دی ہے کہ وہ فیض آباد میں اُس کے چھوٹے بھائی مجو کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ فیض آباد کا اڈا یوں بھی محفوظ تھا۔ وہاں کلکتے اور بمبئی کی طرح آپس میں اختلافات پیدا ہونے کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ شہر بھی چھوٹا تھا اور جامو کی گرفت سخت تھی۔

صرف چار دن میں اڈے کے معاملات مکمل طور پر اپنی ڈگر پر آ گئے۔ نصیب میاں کو روزنامچے میں اندراج کرنے کے کام سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ تقریباً اڈے سے کترا جانے والے بھی لوگ واپس آ چکے تھے مگر گھوشی نہیں آیا تھا اور آنے والے لوگ گھوشی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بیان کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جمیل یا جامو اسے خود تلاش کریں گے اور کہیں گے کہ یا تو وہ اڈا چھوڑ دے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ [illegible] یا تو جمیل کے اڈوں میں شامل نہ ہوتا اور شامل ہو گیا تھا تو اسے واپس نہیں جانا چاہیے تھا۔ ادھر جمیل تیزی سے اپنے

کام منتشر کر رہا تھا اور اپنے معتبر آدمیوں کو بلا کے مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔ جمیل نے خاص خاص لوگوں کے سوا شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ میں شمولی یا سارے کو ساتھ لے کے روز صبح سویرے اڈے سے نکل جاتا تھا اور دوپہر کو واپس آتا تھا۔ شمولی رات کو مجھے سارے [illegible] سناتا۔ اس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔ یہاں بھی بیکاری اور کام نہیں تھا۔ دن بھر گلی گلی پھرتا اور شام کو اڈے واپس آ کے ادھر ادھر کی باتیں سنا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے جیلر صاحب نظر آ گئے۔ وہی جیلر صاحب جو مجھ پر بہت مہربان تھے اور جن کی لڑکی شمو کو میں نے جیل میں پڑھایا تھا۔ اتفاق سے جیلر صاحب کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں نے راستہ بدل دیا۔ اُس دن رات کو کئی آدمیوں نے [illegible] جمیل کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ گھوشی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھائے۔ اس سے اڈے کی بدنامی ہو رہی ہے۔ جمیل نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جمیل کے لیت و لعل کی وجہ کیا ہے۔ اگر وہ خود گھوشی کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا کہ گھوشی پر چاقو اٹھانا اُس کے لیے مشکل کی بات ہے تو وہ کسی کو بھی بھیج سکتا تھا۔

پانچویں دن صبح صبح سب جاگ گئے تھے۔ جمیل نہا رہا تھا اور نصیب میاں روزنامچے پر پنسل سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ گلی میں آتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں مرچوار کے علاقے میں تھا۔ میں نے ٹیکسی اڈے کی عمارت کے دروازے پر رکوائی۔ دروازے پر جو لوگ موجود تھے انھوں نے مجھے دیکھا تو گھبرا کر اندر کی طرف دوڑے اور دو دوسرے میری جانب لپکے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔ "گھوشی کہاں ہے؟" میں نے اُن میں سے ایک سے دریافت کیا۔

"اندر ہے۔" اُس نے آگے آ کے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"اُس سے کہو کہ لاڈلا ملنے آیا ہے۔"

اُس نے اپنے شانے سکوڑ لیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا پھر اُس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اندر کی طرف بھاگا مگر وہ ابھی دہلیز ہی میں تھا کہ گھوشی کو آتا ہوا دیکھ کے پلٹ پڑا۔ گھوشی کے پیچھے کئی آدمی تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "لاڈلے!" گھوشی نے دور ہی سے مجھے پکارا اور میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ نخوت سے بولا۔

"گھوشی! میں تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ شاید تو نے سنا نہیں کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے سن لیا تھا۔" وہ منہ بنا کے بولا۔

"اس وقت میں تجھ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ سیدھے سیدھے اڈا واپس

کر دے۔ میں زیادہ بات نہیں کروں گا۔ تو نے اڈا زبردستی نہیں لیا ہے۔ تو نے جمیل بھائی کے ساتھ [illegible] کیا ہے۔ تو نے استاد جمیل کی خاموشی غلط سمجھی اور یہ بھی غلط سمجھا کہ میں مر گیا ہوں۔ میں تیرے سامنے زندہ موجود ہوں۔ اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

"استاد جمیل اڈا سنبھالنے کے کام کا نہیں رہا۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔" گھوشی نے کھولتے ہوئے کہا۔ "اور یہ اڈا مرچوار ہے۔ استاد جمیل نے نہیں لیا تھا۔ تو نے لیا تھا۔ تو چلا گیا تو اڈے پر جمیل کا کوئی حق نہیں تھا۔ مرچوار کے ٹیم بھی یہ اڈا میں چلاتا تھا۔ میں اپنے گروہ کا اڈا اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اُدھر جمیل بیٹھا حقہ گڑگڑ کرتا ہے اور ادھر آدمی ہاتھ سے نکلتا ہے۔ اُدھر جمیل منہ پھلائے گردن ڈالے بیٹھا ہے اور ادھر سالا کوئی جالا بُنتا ہے۔ اڈے کو زنگ لگ گیا تھا لاڈلے! میں نے استاد سے بار بار کہا پر استاد نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے اڈا لے لیا تب بھی استاد منہ پہ تالا ڈالے رہا۔"

"زبان سنبھال کے بات کر گھوشی! اب استاد جمیل کے لیے تو نے ایک لفظ بھی نہیں منہ سے نکالا تو تیری زبان کاٹ لوں گا۔ بے کار کے بتنگڑ مت کر۔ یہ اڈا میں نے استاد جمیل کو دیا تھا۔ تو اُس سے چاقو کے بل پر ہی واپس لے سکتا تھا۔ تو نے شرافت کی تو اچھا لگا ہے گھوشی! جمیل نے تیرے ساتھ کیا زیادتی کی تھی؟ وہ تجھے اپنا سب سے قریب کا آدمی سمجھتا تھا۔ تیری آنکھ میں سور کا بال ہے۔ تو بیمار ہو جائے یا بوڑھا ہو جائے تو کیا تیرے ساتھی تیری زندہ لاش نوچنے لگیں۔ تو استاد جمیل کو بوڑھا کہتا ہے۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اس کا بڑھاپا دکھاؤں گا۔ جمیل کے اور تمام اڈے بھی تیرے ہو جائیں گے لیکن تجھے تیری ماں کی قسم ہے، تو جا کے بات [illegible]۔ جمیل پر چاقو اٹھا۔ ہم میں سے کوئی نہیں بولے گا۔ چل۔" میں نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تو بات کی اَڑی کر رہا ہے۔" وہ پیچھا چھڑاتے ہوئے بولا۔ "میں کیوں جاؤں؟ جمیل کو آنا ہوتا تو خود آتا۔ تو اُس کے حق میں نہیں بولے گا تو اور کون بولے گا۔ پر میری بات سن لاڈلے! [illegible] میری جگہ تو ہوتا تو تو بھی یہی کرتا۔ جمیل کا دم جا چکا ہے۔"

"جمیل کا دم جا چکا ہے اور تو نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ تیرے ساتھ احسان کرنے والے کا دم کیوں جا رہا ہے۔ تو گدھ کی طرح اُس کے قریب منڈلا رہا کہ کب استاد گردن ڈالتا ہے۔ گھوشی! جو کبھی نہیں ہوا تو نے وہ کیا ہے۔ اب تیرا کیا خیال ہے؟ اڈا واپس کرتا ہے جمیل کو یا مجھے؟ اور سن لے اب وہ جامو بھی آ گیا ہے [illegible]۔ میں کوئی اور بات سننا نہیں چاہتا۔ تو نے برا کیا ہے۔ جو اپنی غلطی مان لے وہ بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اڈا واپس کر دے۔ جمیل کو یہاں آنے کی

تکلیف نہ دے۔ تو خوار ہو گا۔ پانی بھی نہیں دے گا گھوشی! اب ہم میں سے کوئی تجھ پر چاقو نہیں اٹھائے گا۔ استاد جمیل ہی تجھ سے نمٹے گا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" وہ تندی سے بولا۔

"تو سمجھنا نہیں چاہتا ورنہ میری بات بالکل صاف ہے۔ میں تیرے پاس آیا ہوں، تجھے سمجھ جانا چاہیے۔ چل میرے ساتھ چل اور استاد سے معافی مانگ لے۔ وہ تجھے معاف نہیں کرے گا لیکن میں اس سے کہوں گا تو وہ میری بات ٹالے گا بھی نہیں۔ جلدی سے فیصلہ کر لے۔"

کچھ دیر بعد ہم اڈے پہنچ گئے۔ میری تلاش میں کئی آدمی دوڑ چکے تھے۔ میں نے گھوشی کو جمیل کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جمیل نے منہ پھیر لیا۔ "اسے معاف کر دو جمیل بھائی!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اسے اسی لیے لایا ہوں۔ میری خاطر معاف کر دو۔"

"لاڈلے!" جمیل چلانے لگا۔ "تو اس کمینے کے پاس کیوں گیا تھا؟"

"گھوشی سے غلطی ہو گئی جمیل بھائی! غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم سب اپنی زندگی میں اتنی غلطیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ جو واپس آ جائے اس کے لیے دل کھلا رکھنا چاہیے۔ گھوشی نے میری بات کا لحاظ کیا اور میرے ساتھ چلا آیا۔"

"اگر تو نے اسے بخش دیا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔" وہ کرب سے بولا۔ "پر تو ایسی باتیں مت کیا کر۔"

گھوشی نے تیزی سے بڑھ کے جمیل کے پیر پکڑ لیے۔ جمیل بگڑتا رہا۔ گھوشی بلکنے لگا۔ جمیل نے اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ گھوشی اُس کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ "قسمت کا اچھا ہے گھوشی کہ لاڈلا تیرے پاس پہنچ گیا۔ میں جامو کو تیرے پاس بھیجنے ہی والا تھا۔ ذرا شہر والوں کو بھی پتہ چل جاتا کہ استاد جامو کون ہے۔ جامو! اب اسے تو ہی سنبھال۔" جمیل نے اُسے ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔ دوسری طرف سے جامو نے گھوشی کو بڑھ کے گلے سے لگا لیا۔

دوپہر کو ڈاکیے نے ایک خط جمیل کے سپرد کیا۔ جمیل نے اُسے میرے حوالے کر دیا۔ وہ زرین کا خط تھا۔ زرین نے جمیل کو آداب و تسلیمات کے بعد اُس کی خیریت پوچھی تھی اور لکھا تھا کہ "میری عزت ظہیر کے نام بمبئی سے ایک خط آیا ہے۔ میں نے خط کھول کے نہیں دیکھا ہے اور اسے کسی ذریعے کے بغیر آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ خط کسی [illegible] نے لکھا ہے۔ یقیناً ظہیر بمبئی میں رہتے ہوں گے۔ آپ چاہیں تو اسے کھول لیں۔ شاید ظہیر اس طرف آنے ہی والے ہیں۔ انھوں نے اسی خیال سے میرا پتہ دیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ کلکتے میں آپ کے پاس پہنچ گئے

ہوں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے فوراً مطلع کیجیے اور اُن سے میرا آداب کہیے۔
آپ کی بیٹی۔ ثوبیہ"

خط کے ساتھ میرے نام ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے جلدی سے اُسے چاک کر کے دیکھا۔ وہ انگریزی میں ایک دو سطری خط تھا۔ جولین کا خط۔ سلام کے بعد اُس نے لکھا تھا: "میں یہ چیک واپس کر رہی ہوں۔ دعاؤں کے ساتھ۔ جولین"

جولین نے چیک واپس کر دیا تھا۔ وہ خط بھی اُس کے ہمراہ تھا جو میں نے وکیل کی ہدایت پر بینک کو لکھا تھا تاکہ جولین کو اپنے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کراتے ہوئے کوئی پریشانی نہ ہو۔ میں نے دونوں خط ریزہ ریزہ کر دیے اور میرا جی چاہا کہ میں خود کو بھی ریزہ ریزہ کر لوں۔ کاش میں اُسے اپنے ہاتھ سے یہ چیک دے کے آتا یا کوئی ایسی ترکیب کرتا کہ رقم اُس کے نام منتقل ہو جاتی اور اُسے اطلاع بینک کے ذریعے ملتی۔ مگر کوئی کسی کی چیز لینے پر تیار نہ ہو تو کون اُسے مجبور کر سکتا ہے۔ جولین نے نہ جانے کیا سمجھ کے چیک واپس کر دیا۔ اب میں اُسے کس طرح سمجھا سکتا تھا۔ وہ تو اتنی دُور جا چکی تھی۔

جمیل دہلی ایک دن اور ٹھہرا۔ اسٹیشن پر نصیب میاں لانے تھے، شمائل، گھوڑشی اور جانو موجود تھے۔ ہمارے ساتھ بہت مختصر سامان تھا۔ ایک بستر بند اور ایک سوٹ کیس۔ جمیل سفید کرتے پاجامے اور واسکٹ میں ملبوس تھا۔ اُس نے مراد آباد کا ٹکٹ خرید لیا۔ میں نے منع کیا کہ مراد آباد جانا بے سود ہے کیونکہ وہاں میں ایک ایک آدمی سے مولوی شفیق کے بارے میں معلوم کر چکا ہوں مگر جمیل نے میری بات نہیں سُنی۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ اس عرصے میں مولوی صاحب واپس آ گئے ہوں یا اُن کے کسی عزیز کو اُن کا اتا پتا معلوم ہو گیا ہو۔ جیسے جیسے مراد آباد قریب آ گیا میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دوسرے دن تین بجے سہ پہر کو ہم مراد آباد اسٹیشن پر اُترے۔ جیسا کہ میں دیکھ چکا تھا اسٹیشن کے سامنے ہی مسافر خانہ تھا۔ جمیل ساتھ نہ ہوتا تو میں اسٹیشن سے سیدھا مولوی صاحب کے محلے کی طرف نکل پڑتا۔ جمیل کو شیو بنانے اور کپڑے تبدیل کرنے میں دیر لگ گئی۔ میں نے یہ کام ٹرین میں کر لیا۔ چائے میں اور وقت لگ گیا۔ مسافر خانے کے باہر تانگوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ ہم دونوں پیدل تانگے میں بیٹھ گئے۔ اسٹیشن سے نبیض گنج کا راستہ دو ڈھائی میل کے قریب ہوگا۔ وہ راستے سے بڑا مختصر تھے اس لیے اسٹیشن روڈ کی سڑک پر خاصی بھیڑ تھی۔ مغرب کی اذان کے وقت ہم نبیض گنج میں داخل ہوئے۔ مجھے وہ گلی اچھی طرح یاد تھی جہاں مولوی شفیق رہتے تھے۔ گلی میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ میونسپلٹی کا ... سیڑھی پر چڑھ کے بتی جلا رہا تھا۔ مولوی شفیق کے مکان میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔ جمیل نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میرے اشارے پر اُس نے دروازہ پر دستک دی۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ وہ بھلا کیوں ہوتے۔ اُس مکان کے بعد ہم نے کئی مکانوں پر دستکیں دیں۔ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا۔ اُن کے اعزا مولوی صاحب کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ رات کو دس بجے ہم مسافر خانے واپس آ گئے اور صبح ہوتے ہی پھر نکل کھڑے ہوئے۔

ہم نے شاہی بازار میں برتنوں کی مختلف دکانوں پر بھی مولوی صاحب کے متعلق معلوم کیا۔ مدرسہ امدادیہ، جامعہ قاسمیہ اور مراد آباد کے تمام بڑے مدرسوں میں جا جا کے پوچھا۔ تین دن تک ہم اسی طرح کوچے کوچے پھرے۔ مولوی صاحب کی عادتیں، اُن کے مشاغل اور اُن کے مزاج وغیرہ کے بارے میں تو بہت کچھ معلوم ہو گیا لیکن کسی شخص نے پلٹ کے اُن کی خبر نہ لی کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ برتنوں کی کچھ دکانوں سے کئی شہروں کے دکان داروں کے پتے ضرور معلوم ہو گئے جہاں سے مولوی صاحب برتنوں کے آرڈر بُک کرتے تھے۔ جمیل نے ایک سادہ کاپی اور قلم خرید کے مجھے دے دیا تھا۔ کوئی خاص بات ہوتی تو وہ مجھے نوٹ کرنے کا اشارہ کر دیتا۔

مراد آباد سے چلتے ہوئے میں نے جمیل سے کچھ روپے لے کے ارجمند بیگم کی بیٹی فرخ کے لیے مٹھائی اور دیگر چیزیں خریدیں لیکن ... یہ خیال آیا کہ پتہ نہیں ارجمند بیگم کس حال میں ہیں۔ اب تو مجھے بھول بھی گئی ہوں گی اور بھول گئی ہوں گی تو بھولے ہی بیٹھے رہنا چاہیے۔ جتنے کم لوگوں سے ملا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے مٹھائی مسافر خانے کے باہر کھڑے ہوئے فقیروں کو دے دی اور فرخ کے کھلونے بھی انھی میں تقسیم کر دیے۔ رات کو ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جمیل کا خیال تھا کہ اب مولوی صاحب کو اُن علاقوں میں تلاش کیا جائے جو ہجرت سے دُور ہیں۔ مولوی صاحب کو اپنی تمام باتیں یاد ہی ہوں گی اس لیے وہ اُسے لے کے کسی ایسی جگہ منتقل ہوئے ہوں گے جہاں اُن کے کسی جاننے والے کے پہنچنے کا امکان نہ ہو اور جہاں کرامتی کی تلاش میں پیچھے آنے والے ہجرت کے لوگوں سے بھی دُور رہے۔ ہم دلی آ گئے اور دلی سے مدراس جانے والی ریل میں بیٹھ گئے۔ جمیل سے جرح کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مولوی صاحب کہیں بھی ہو سکتے تھے۔ مدراس شہر میں میں نے بھی مولوی صاحب کو تلاش کیا تھا مگر جمیل نے چند نئے پتے بتائے تھے۔ اُس کا خیال یہ بھی تھا کہ مولوی صاحب نہ کسی گاؤں میں ہوں گے نہ کسی بڑے شہر میں۔ وہ ایک اوسط درجے کے شہر میں ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی بڑے شہر میں ہوتے تو مراد آباد کے کسی شخص کو اس مدت میں ضرور دکھائی دیتے کیونکہ برتنوں کی تجارت کے سلسلے میں مراد آباد کے لوگ ہندوستان کے تقریباً تمام شہروں میں جاتے رہتے ہیں۔ مولوی صاحب کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنی گزر بسر کے لیے کوئی نہ کوئی صورت ضرور اختیار کی ہوگی اور کرامتی کی حفاظت کی وجہ سے وہ کوئی بڑا کاروبار بھی نہیں کر سکے ہوں گے نیز انھوں نے محنت مزدوری کا پیشہ بھی نہیں اپنایا ہوگا کیونکہ یہ اُن کی عمر اور مزاج کے خلاف ہے۔ وہ کوئی پُروقار اور سنجیدہ کام کرتے ہوں گے۔ مثلاً کسی مدرسے میں پڑھاتے ہوں گے، کسی مسجد میں امام ہوں گے اور اُن کی کوئی چھوٹی موٹی دکان بھی ہو سکتی ہے یا وہ کشیدہ کاری کا کام کر رہے ہوں گے۔ جمیل پہلے انھیں جنوبی ہند کے تمام چھوٹے شہروں میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ مدراس اُس کی منزل نہیں تھی۔

ہم دو مہینے تک مدراس، ترچناپلی، کوئمبٹور، میسور، بنگلور اور آس پاس کے تمام شہروں میں گھومتے رہے۔ جنوبی ہند کے چند شہر چھوڑ کے باقی میں مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی برابر تھی۔ یہاں جتنے مدرسے تھے، مسجدیں تھیں اور مسلمانوں کے دوسرے ادارے تھے، وہ سب ہم نے دیکھ لیے تھے۔ ہر قسم کے تاجروں سے بھی بات کر لی تھی۔ میسور سے ہم اورنگ آباد آ گئے۔ کرنول، رائے چور، اودنی، گلبرگہ، بیدر، نظام آباد اور کریم آباد، سکندر آباد وغیرہ سے گزرتے ہوئے ہم تیسرے مہینے حیدرآباد دکن پہنچ گئے۔ جنوبی ہند کی شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی بستی رہ گئی ہو جہاں ہم نہ گئے ہوں۔ ان شہروں میں آقا جان کا بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ اتنے طویل سفر کے بعد بھی جمیل کے چہرے پر تھکن نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کئی بار کہا بھی کہ وہ کہاں تک اُن کھوئے ہوئے لوگوں کی تلاش میں اپنا وقت برباد کرے گا۔ وہ واپس چلا جائے مگر جمیل نے ہر بار مجھے جھڑک دیا۔ پھر میں نے کہنا ہی بند کر دیا۔

راستے میں ہمیں طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔ بنگلور میں ہمارا بستر بند چوری ہو گیا۔ کئی جگہ لوگوں نے ہماری جیب کاٹنے کی کوشش کی۔ ہمیں غلط راستوں پر ڈال دیا گیا۔ کالج کے طلبہ کے ایک گروہ نے جو پکنک منانے حیدرآباد جا رہا تھا، ریل میں جمیل کا مذاق اُڑایا اور اُسے سیٹ سے اُٹھا دیا۔ غرض چاقو نکالنے کی ضرورت کئی جگہ پیش آئی مگر جمیل تو جیسے چاقو اپنے ساتھ لایا ہی نہیں تھا۔ وہ دعاؤں اور پیاروں سے دُور دُور رہا۔

میں حیدرآباد پہلے بھی آ چکا تھا لیکن جب ہم اس طرف آ ہی نکلے تھے تو ایک بار پھر قسمت آزما لینے میں کیا حرج تھا۔ حیدرآباد خاصا بڑا شہر اور مسلمانوں کا مرکز تھا۔ جمیل کسی شہر میں داخل ہوتے ہی جس انداز سے انھیں ڈھونڈتا تھا، اُس سے ہر جگہ اُمید کی ایک کرن لہراتی تھی۔ یہ بات تو اب بالکل طے ہو گئی تھی کہ حیدرآباد سے پہلے جنوبی ہند کے تمام علاقے میں مولوی صاحب اور آقا جان نہیں تھے۔ ہم نے جگہ جگہ لوگوں کو اپنا پتہ بھی دے دیا تھا کہ اگر انھیں کوئی ایسا شخص نظر آئے تو وہ فوراً مطلع کریں۔ پتے کے ساتھ ہم نے ٹکٹ لگے ہوئے لفافے بھی کثیر تعداد میں تقسیم کیے تھے۔ حیدرآباد میں ہمیں ٹھہرے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے مرحلے میں ہم نے تمام مدرسے، مسجدیں اور خانقاہیں دیکھ لی تھیں۔ پھر شہر کے نواح میں گولکنڈا کا علاقہ، حسین ساگر، قطب شاہی مزارات کے قریب کی تمام مسجدوں میں بھی جا کے پوچھا تھا۔ گنجان آبادی والی بستی میں بھی احتیاط کا ہوئے تھے۔ اب ہم دکانیں اور بازار دیکھتے تھے۔ اُس دن تمام دن ہم چار مینار سے شاہ گنج کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں بڑی چھوٹی دکانیں تھیں۔ ہر روز ہم درجنوں دکانوں سے گزرتے، ہر ایک کے نام انھیں پڑھتے۔ جمیل ایک بازار کی ایک قسم کی دکان منتخب کر لیتا۔ مثلاً چمڑے کی کوئی دکان، برتنوں کی، جنرل مرچنٹ کی دکان۔ مولوی صاحب کسی بھی قسم کا کاروبار کرتے ہوں اُس سے متعلقہ دکان داروں سے اُن کا رابطہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ہم دکانوں میں جا کے انتظار کرتے کہ گاہک نہ ہوں یا ہم دکان میں ہیں۔ بعض اوقات بیسیوں بار ... جاتی تھی۔ پھر ہمیں کوئی معمولی چیز خریدنے کے بہانے دکان والے سے بات کرنے کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ بعض دکان دار ہماری پوری بات ہی نہیں سنتے تھے جیسے ہم اُن کے پاس بھیک مانگنے آئے ہوں۔ وہ بڑی بے رخی سے کہتے تھے کہ بابا اگر کچھ کام ہے تو سودا خریدنے کے وقت آؤ۔ البتہ بعض دکان دار بہت شرافت سے پیش آتے تھے۔ جمیل ایک بازار میں ایک قسم کی کام کی دو دکانوں پر ضرور جاتا تھا۔

ہم نے شاہ گنج کا بازار تقریباً سارے کا سارا دیکھ لیا تھا۔ یہاں سے ہم حلوائیوں کے بازار محبوب کی منڈی آ گئے۔ جب ہم ایک بالا خانے کے نیچے سے گزر رہے تھے تو آگے ہمیں شور سنائی دیا۔ گلی کے موڑ کی ایک دکان کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی اور ہا ہو مچی ہوئی تھی۔ لوگ اُچک اُچک کر ہجوم کے درمیان دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم ایسے ہجوموں پر ہمیشہ ایک سرسری نظر ڈال لیتے تھے۔ چاہے وہ مداری کا تماشا ہو یا بازار کا جھگڑا۔ ہم وہاں پہنچے تو ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ وہ دو نوجوان لڑکے تھے۔ ایک کی عمر بمشکل کوئی پندرہ سولہ کی ہوگی، دوسرا اکیس بائیس کا ہوگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ اُن کی زبانوں سے گالیاں بھی جاری تھیں۔ لوگ بیچ بچاؤ کی کوشش کی مگر جب انھیں ناکامی ہوئی تو وہ تماشا دیکھنے لگے۔ چھوٹے لڑکے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے بڑے لڑکے کے بال پکڑ رکھے تھے اور بڑا لڑکا اُس کے پیٹ میں ... مار رہا تھا۔ مجمع کو ایک نظر دیکھنے کے بعد جمیل نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن میرے قدم وہیں جم گئے تھے۔ پتھر کے ہو گئے تھے۔ میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

چھوٹا لڑکا جہاں گیر تھا۔ میں کس کا چہرہ بھول سکتا تھا؟
وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔

میں نے جمیل کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مجمع کے درمیان میں کود پڑا۔

جہانگیر کی پیشانی سے خون پھوٹ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کے لڑکا چیخا۔ وہ درمیان میں دخل دینے کی تلقین کر رہا تھا لیکن اُس کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی میں نے اُس کے گلے پر ٹھوکر مار دی تھی۔ میں جہانگیر کو گھسیٹ کر اُس سے علیحدہ کرتا تو لڑکا اس دوران میں اُسے دو چار ضربیں اور لگا دیتا۔ جہانگیر مزید ضربوں کا متحمل معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے میں نے جاتے ہی اُسے جہانگیر سے دُور کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر گر گئے۔ جہانگیر بھی اُس کی جھونک میں زمین پر آ گیا تھا کیونکہ اُس نے ابھی تک لڑکے کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ میں نے اُس کی گردن پکڑ کے کھینچا تو اُسے بال چھوڑنے پڑے۔ میں اُسے لے کے جلد سے جلد بھیڑ سے دُور ہو جانا چاہتا تھا مگر لڑکے نے ایک لمحے میں پھرتی سے اُٹھ کے میری کمر پر پوری طاقت سے سر مار دیا۔ اگر سامنے ہجوم نہ ہوتا تو میں اوندھے منہ سڑک پر جا گرتا۔ لوگوں نے مجھے سنبھال لیا مگر شخص اپنی بول بول رہا تھا۔ بس کر بس کر جانے دے۔ تو لے آ ایک طرف سے کسی بڑھے کی چیختی ہوئی آواز گونجی۔

لڑکے کا نام مولا تھا۔ ہجوم میں بہت سے لوگ اُسے جانتے تھے۔ وہ بار بار اُس کا نام لے کے اُسے سمجھانے بجھانے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے مگر کسی نے اُس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ مولا نہیں مانا۔ مجھے ڈر تھا کہ جہانگیر نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے یا معاملہ بڑھتا ہوا دیکھ کے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے بہت احتیاط کی تھی۔ یہ شاہراہ عام تھی اور علاقہ بھی بالاخانوں کا تھا۔ مولا کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں موجود ہو سکتے تھے لیکن مولا کے لیے میری ضرب ناکافی ثابت ہوئی۔ جہانگیر کی پیشانی سے خون اُبل رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ مجھے سامنے کی چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مولا دھاڑتا ہوا دوبارہ میرے پیچھے لپکا اور اُس نے پشت سے میری واسکٹ پکڑ لی۔ میں نے جہانگیر پر اپنی گرفت قائم رکھی تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے خود کو چھڑانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ تھامے تھامے میں نے مولا سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اِس اثنا میں جمیل بھی ہجوم چیر کے آگے آ چکا تھا اور خاموش کھڑا تھا۔ میں نے جہانگیر کو اُس کی طرف دھکیل دیا اور پلٹ کے قدم بڑھائے کہ مولا کو کمر سے پکڑ کے زمین پر پٹخ دوں مگر جمیل میرے اور اُس کے درمیان آ گیا۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے میرا بازو جکڑ لیا۔ مولا نے دیوانہ وار جمیل کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور کچھ دیکھے بغیر وحشت زدہ انداز میں اُس کی ٹھوڑی پر مکا مارا۔ وہ بُری طرح گالیاں بک رہا تھا۔ جمیل نے حرکت نہیں کی۔ وہ مجھے اور جہانگیر کو اپنی آڑ میں لیے ہوئے جما کھڑا رہا۔ مولا نے جمیل کے سینے پر پے در پے گھونسے مارے۔ "اِسے چھوڑ دے چاچا!" اُس نے چلا کے کہا۔ "اِس رنڈی کے جنے کو چھوڑ دے۔" میرے کانوں میں آگ بھڑک اُٹھی۔ میں نے جمیل کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کے اُس کی طرف جھپٹا مگر جمیل نے ٹانگ مار کے مجھے زمین پر گرا دیا اور دوبارہ پکڑ کے کھڑے کر لیا۔ مولا خود ہی اچانک رُک گیا۔ وہ جمیل کو چند ہی گھونسے مار سکا۔ شاید جمیل کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے پیچھے ہٹتے ہی ہجوم میں سے بہت سے لوگ ہماری جانب بڑھے۔ بعض نے جہانگیر کی پیشانی صاف کرنی چاہی مگر جمیل نے انہیں روک دیا اور جہانگیر کا ماتھا اپنے دامن سے خشک کیا۔ جمیل جہانگیر کی طرف متوجہ تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ہی میں نے مولا کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے ذرا سی دیر ہو گئی۔ مولا فرار ہو چکا تھا۔

اُوپر بالاخانوں پر کھڑی ہوئی عورتوں میں سے کسی نے کپڑا پھینک دیا تھا۔ جمیل نے اپنے ہاتھ سے جہانگیر کے پٹی باندھی۔ آگے کچھ دُور بکرا کوہ ایک انگریزی شفاخانہ تھا۔ ہمارے ساتھ کئی آدمی چلے۔ پھر ابھی کمپوڈر جہانگیر کی مرہم پٹی کر رہا تھا کہ ایک برقع پوش عورت بے تابی سے مطب میں داخل ہوئی اور نقاب اُلٹ کے جہانگیر سے لپٹ گئی۔ "یہ کیا ہو گیا رے تجھ کو!" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

وہ اکیلی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر اُس کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں نے اُسے جہانگیر سے جدا کیا۔ دونوں آدمیوں کی وضع قطع سے اُن کے پیشے کا صاف پتہ چلتا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے غور سے عورت کو دیکھا مگر وہ فرخ، فریال یا نادرہ میں سے کوئی نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ اُس کا ناک نقشہ ترشا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر خاندان کی کوئی ایسی عورت میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھی۔ وہ جہانگیر کو "تو" کے نام سے مخاطب کر رہی تھی۔ یک بارگی خیال آیا کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا ہے مگر اتنا بڑا دھوکا میری آنکھیں نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ یقیناً جہانگیر تھا۔ میرا چھوٹا بھائی۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو اُس کی عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میرے ذہن میں اُسی کا چہرہ تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ سولہ سترہ سال کا دبلا پتلا لمبا سا لڑکا۔ اُس کا قد میری طرح اُٹھ رہا تھا لیکن اُس کی آنکھیں ابھی تک ویسی ہی تھیں۔ وہ بٹ بٹاتی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورت اُس کے برابر بیٹھی ہوئی اُس کے کپڑوں سے گرد جھاڑ رہی تھی اور شکایت کر رہی تھی کہ وہ اُسے اطلاع دیے بغیر گھر سے کیوں نکلا۔ "میں مولا اور اُس کے حمایتیوں کو دیکھ لوں گی۔ دیکھ لینا وہ پھر کبھی اِس گلی میں نظر نہیں آئیں گے۔" وہ بلند آواز سے کہہ رہی تھی۔ "تو مجھے نہیں جانتا ہے رے تو! میں نواب بادشاہ کے کروڑوں تو عمر بھر جیل میں سڑواتی ہے تم... تم نے اُس بدمعاش کی بات پر کان ہی کیوں دھرے تھے۔ تم راستہ بدل دیتے یا سر جھکائے چلے آتے۔"

"وہ خود ہی میرے سامنے آ گیا۔" جہانگیر نے شکستہ آواز میں کہا۔

"نیراب کے وہ بچ کے نہیں جائے گا۔" عورت غصے سے بولی۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ جہانگیر کے ماتھے پر پتھر کا کوئی کونا لگ گیا تھا اور زخم کی گہرائی بن گئی تھی۔ کمپوڈر مرہم پٹی سے فارغ ہو گیا تو عورت نے ریشمی رومال میں بندھے ہوئے پیسے نکالے مگر جمیل ڈاکٹر کو پہلے ہی فیس ادا کر چکا تھا۔ عورت کی آنکھیں ممنونیت سے چھلکنے لگیں۔ جہانگیر نے سرگوشی میں اُسے بتا دیا تھا کہ ہمی دونوں نے درمیان میں پڑ کے معاملہ رفع کرایا ہے۔ عورت نے لمبے لمبے لفظوں میں ہمارا شکریہ ادا کیا۔ جب وہ جہانگیر کو اپنے ساتھ لے جانے لگی تو میں نے جمیل کی طرف نظر کی۔ جمیل نے آنکھیں میچ لیں۔ چلتے وقت جہانگیر نے ہم دونوں کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ میں اُسے گھورتا رہا۔ مطب کے اندر کئی مریض موجود تھے اور باہر ابھی تک گلی کے چند لڑکے کھڑے تھے۔ گلی میں آتے ہی عورت نے نقاب ڈال لیا اور اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ ایک طرف چل دی۔ جب وہ کچھ آگے بڑھ گئی تو ہم بھی کچھ فاصلے سے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ گلی میں خاصی چہل پہل تھی۔ جمیل ساتھ نہ ہوتا تو میں جہانگیر کو عورت کے ہاتھ سے ضرور چھین لیتا۔ کچھ دُور جا کے جہانگیر نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور عورت کو کوئی اشارہ کیا۔ عورت نے تیزی سے گردن گھمائی۔ پیچھے ہم آ رہے تھے۔ اُس کی چال میں ذرا سی لرزش پیدا ہوئی مگر وہ چلتی رہی۔ جمیل کے نپے تلے قدموں سے آگے بڑھتی رہی۔ اس کے بعد اُن میں سے کسی نے منہ پھیر کے ہمیں دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ "کیا یہ وہی ہے؟" جمیل نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں وہی۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "وہ جہانگیر ہے مگر اُس کے ساتھ جو عورت ہے اُسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ عورت دوسری گلی میں مڑ گئی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اِس علاقے میں چھوٹے بڑے ننھے مکانات موجود تھے۔ تین منزلہ مکانات تھے۔ جس گلی میں عورت داخل ہوئی تھی وہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ہمارا اور اُس کا فاصلہ بھی کم ہو گیا تھا۔ کوئی دو سو قدم چلنے کے بعد وہ ایک حویلی نما مکان کے پاس جا کے ٹھہر گئی۔ مکان کا روغن تازہ تھا۔ اوپر کی دونوں منزلوں پر شہ نشینیں بنی ہوئی تھیں۔ مکان کے آس پاس بھی کئی مکانات تھے جو تقریباً ایک ہی طرز کے تھے مگر گلی میں اُس سے نمایاں کوئی اور مکان نہیں تھا۔ ہم دُور ہی سے دروازہ دیکھ کے دوسری طرف نکل گئے۔ جمیل نے میری آنکھوں میں اپنی انگلیاں چبھا رکھی تھیں۔ میرے ہاتھ سرد پڑے ہوئے تھے۔ جمیل مڑ کے پھر چوڑی گلی میں آ گیا اور جدھر جہانگیر کو ہم نے پہلی بار مولا سے دست بگریباں دیکھا تھا اُس جگہ سے نزدیک ایک تنگ ہوٹل میں آ بیٹھا۔ ہوٹل ایک دکان میں واقع تھا۔ بیٹھنے کے لیے ادھر اُدھر تپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیواریں کالی تھیں۔ دیگچوں کے پاس بیٹھے ہوئے ہوٹل کے آدمی نے ہمیں پہچان لیا اور مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے ہوئے بیرے کو میز صاف کرنے کا حکم دیا۔ ہماری آمد پر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے کئی لوگوں کی نگاہیں ہماری جانب اُٹھنے لگیں۔ ممکن ہے اُن میں سے بعض نے ہمیں کچھ دیر پہلے دیکھا ہو۔ "تم یہاں کیوں آ گئے؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"ذرا دیر ٹھہر۔" وہ درشتی سے بولا۔

"کہیں وہ پھر نہ نکل جائے۔"

"نہیں۔" جمیل اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔ "اتنی جلدی نہیں۔"

"تم نے اُس عورت سے بات کیوں نہیں کی؟" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"لاڈلے!" وہ تنک کے بولا۔ "چین سے بیٹھا رہ۔"

شاید جمیل کو میرے یقین پر شبہ تھا۔ آٹھ سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن گھر کے ایک ایک آدمی کا چہرہ میری آنکھوں میں نقش تھا۔ بیت رہے برسوں میں بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی اسی لیے جہانگیر مجھے نہیں پہچانا۔ اُس کا جتنا زمانہ میں نے اُسے دیکھتے ہوئے گزارا تھا اُتنا وقت اُسے نہیں ملا تھا۔ وہ مجھے بھول سکتا تھا مگر میں اُسے کیسے بھول جاتا۔ یہ وہی جہانگیر تھا جس کے کپڑے گندے ہو جاتے تھے تو میں انہیں بدل دیتا تھا۔ میں اکثر اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا تھا۔ وہ روز مجھے اپنا سبق سناتا تھا۔ جب بھی گلی میں نکل جاتا تو میں اُس کے کان پکڑ کے اُسے گھر واپس لاتا۔ وہ مجھ سے روٹھ جاتا تھا۔ اِسی سے وہ میری بہنوں کی شکایت کرتا تھا۔ جب کوئی گھر میں آتی تھی تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ ہر وقت اُن کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ مجھے یاد آیا امی نے تو کہا تھا وہ ہمیشہ کے لیے کوڑا کر کے اپنے گھر میں روک لے۔ اس نے کوڑا گڑیا بابی کا لقب دے رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنی ذہانت کی باتیں کرتا تھا کہ امی اور ابا جان دنگ رہ جاتے تھے۔ اُسے یہاں اِس بازار میں دیکھ کے میرے ذہن میں ہر لمحے ایک نیا وسوسہ اُٹھ رہا تھا۔ جمیل کو علم نہیں تھا کہ مجھے ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔ بیرا لاپرواہی سے بھری ہوئی چائے کی پیالیاں میز پر رکھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں پیالی جمیل کے منہ پر مار دوں۔ اُسے اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

جمیل نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میری چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ جمیل نے دو تین گھونٹوں میں پیالی حلق میں انڈیل دی تھی۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سامنے کی تپائی سے ایک شخص سرکتا جھجکتا ہمارے پاس آیا۔ "کیا پردیسی ہو حضرت؟" اُس نے لونڈا چباتے ہوئے کہا۔ جمیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ وہ پردیسی سیاں ہو۔" وہ تیزی سے بولا: "لڑکا باؤ کو۔ کیا یا حضرت! مولا نے بے ہوش کر کے دم لیا۔ ادھر کسی میں اتنا زور نہیں تھا کہ پیپے شاہ کے مرغے پہ ہاتھ ڈالتا۔ زعو کی قسمت اچھی تھی کہ آپ لوگ وقت پر پہنچ گئے۔ ایک بات بولیں؟" وہ اچانک جھکتے ہوئے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا: "آزو بازو سے ہوشیار رہنا۔ مولا نے کبھی تماشے جا کے بولا ہوگا۔ بھروسا نہیں کہ کبیر کلدار بھی کے جیب میں بیٹھا ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" جمیل نے بھاری آواز میں کہا۔

"کام کی بات کرتا ہوں سرکار! چکر میں ادھر آ کے پھنس گیا ہوں۔ بیس سال ادھر مغز مارتے ہوئے ہو گیا۔ یہ زبان کسرا یاروں سے چپک گیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔ اس حرف آگ پوری سانپ کیسے شاہ کا سگا بیٹا ہے۔ ابا بھی نہیں جیتا۔ کلدار بھی نہیں جیتا۔" وہ ادھر ادھر دیکھ کے ہنس کر بولا۔ حیدرآباد میں ریاستی سکوں کو حالی اور انگریزی چھاپ کے سکوں کو کلدار کہتے تھے۔ دونوں سکے ایک ساتھ رائج تھے۔ ہمیں کلدار کہنے سے اُس کی مراد تھی کہ ہم ریاست سے باہر کے لوگ ہیں۔

"اور یہ لڑکا کون تھا؟" جمیل نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ دیکھو تھا وہ جو نواب زادہ شرلی خانم کا بیٹا۔"

"شرلی خانم! نواب زادہ!" جمیل الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں شرلی خانم!" وہ اشتیاق سے بولا: "خانم کا نام اب شرلی خانم ہی پڑ گیا ہے۔ وہ کوئل کی طرح کوکتی ہے۔ نواب خانم اب بہادر نے اُسے شرلی خانم کا خطاب دیا تو یہی نام پڑ گیا۔ اب میں قسمت والوں ہی کو شرلی کے گلے کا جادو دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا وہ محفل نہیں سجاتی؟"

"ہے ہے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "جب سے اُس نے گانا بند کیا ہے ادھر بازار اُدھار ہو گیا ہے۔ اب وہ صرف دربار سرکار میں جا کے گاتی ہے۔ میں کیا بولوں۔ ایک زمانہ تھا کہ دُور دُور سے لوگ اُس کا جلوہ دیکھنے اور اس کی آواز کی شراب پینے آتے تھے۔ خانم نے کئی سال ہوئے اپنی دکان بند کر لی ہے۔ ایسا جھن ڈال ہے کہ لوگ دیدار تک کو ترس جاتے ہیں۔ اب تو صرف نظر آتا رہی ہی رہ گیا ہے۔ پھر اب بھی لگ ہیں۔" وہ کسمسا کے بولا: "بازار کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس پنجرے میں روز نیا نیا پنچھی آتا ہے۔ ابھی بولو حضرت! کہیں چلنا ہے؟" وہ زیرِ لب مسکراہٹ سے بولا: "آج کل تو بازار میں رونق آئی ہوئی ہے۔ کل ہی بنارس سے ایک نئی مینا آئی ہے۔"

"کیا یہ لڑکا رجو، خانم کا بیٹا ہے؟"

جمیل کے استفسار پر اُس نے منہ بنایا: "لوگ ایسا ہی بولتے ہیں شرلی خانم بھی اُسے بیٹا ہی کہتی ہے۔ ابھی کوئی ڈیڑھ سال ہوئے بازار کے لوگوں نے اس لڑکے کو خانم کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہوگا کسی نواب کا کے نطفے سے۔ شرلی نواب سے کم کسی کو منہ لگاتی نہیں نا لالتی...۔ صورت شکل سے بھی یہ تو نواب زادہ لگتا ہے۔ بچے کی ناک نیچی ہی رہتی ہے۔ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ زیادہ تر گھر میں پڑا رہتا ہے۔ خانم نے اُسے پڑھانے لکھانے کا بھی گھر ہی پہ انتظام کیا ہے۔ صبح ایک مولوی اور شام کو پتلون کوٹ پہنے ہوئے ایک عیسائی ماسٹر آتا ہے۔ عرصے سے خانم مہینوں مہینوں کے لیے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں نوابوں کے بلاوے پر گانے کے لیے جاتی رہی ہے۔ وہیں کسی نواب سے آشنائی ہو گئی ہوگی۔ لوگ بولتے ہیں کہ شرلی نے اُسے اپنی ماں کے پاس بھوپال میں رکھا ہوا تھا۔ ماں مر گئی تو لڑکے کو پھر ادھر اپنے پاس لے آئی۔ پہلے چھپاتی تھی۔ اب اُسے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر کے ہاں سے اُسے اتنا مال جاتا ہے کہ کئی پشتیں چلا سکتی ہے۔ کچھ چھری مار کے بھی بولتے ہیں کہ خانم کی ہاتھی جوانی نے انگڑائی لی ہے۔ لڑکے کو تیار کر رہی ہے۔ اندر کا مال نیلی چھتری والا جانتا ہے۔ لڑکے کی اٹھان....."

"بس کرو۔" جمیل نے ترشی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"کیا حضت!" وہ ناگواری سے بولا: "آپ ہی کی بات کا جواب بول رہا تھا۔"

"کیا خانم اکیلی رہتی ہے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

لیکن جمیل اُس کا جواب سننے سے پہلے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اُس نے کرتے کے اندر بنڈی کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کے اُس شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور مٹھی بند کر دی۔ وہ انتہائی تیزی سے جھک جھک کے لگا۔ اُس نے جھک کے دو مرتبہ ہمیں سلام کیا۔ ہم ہوٹل سے باہر آ گئے تو وہ بھی تیزی کے ساتھ ہو ترسے سے کر گیا: "کہیں چلیے گا نہیں؟" وہ مذبذب سے بولا۔

"نہیں۔" جمیل نے سر جھٹک کے انکار کر دیا۔

"پھر رات کو آئیے گا؟" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"ہاں شاید آ جائیں۔"

"میں اسی ہوٹل کے آس پاس ملوں گا۔" اُس نے گردن خم کرتے ہوئے مدھم آواز میں کہا: "نہیں نظر آؤں تو خلیفہ جما کا پوچھ لیجیے گا۔ یہاں سب ہی... اسی نام سے پکارتے ہیں۔ فشاں میں حاضر ہو جاؤں گا۔ تکلف نہ کیجیے۔ نوکری ان کی دیجیے گا۔ ویسے یاد رکھیے گا کہ کسی نام خلیفہ جما سے ملاقات ہوئی تھی۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہوا ہمارے ساتھ چلتا رہا اور ہم سے ہوٹل کا پتہ پوچھنے لگا۔ جمیل نے کچھ نہیں بتایا اور جب بڑی بے رخی کا اظہار کیا تو وہ واپس ہو گیا۔

ہم جب کی منڈی کے علاقے سے نکل آئے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ بس اسٹینڈ پہنچتے پہنچتے کھمبوں کی روشنیاں جل گئیں۔ جمیل کے کرتے کے دامن پر جہاں گیر کے خون کے دھبے چھپے ہوئے تھے۔ اُس نے

کپڑے بدل لیے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں اُس کی صورت دیکھتا اور اپنی بوٹیاں نوچتا رہا۔ راستے بھر اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اب اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا سارا جسم پھوڑے میں پھنسا ہو اور ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ خانم کے ہاں جانے میں جمیل کے لیت و لعل کی وجہ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید جمیل بیڑ لگا کر رکھا تھا کہ وہاں جانے کے بعد مجھے اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کچھ وقت گزر جائے گا تو سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے میری آمادگی بڑھ جائے گی۔ لیکن مجھ پر یقین نہیں رہا تھا کہ میرا سینہ بہت کشادہ ہے وہ پھیلنے کا نہیں۔ نتی کو بھری محفل میں سارنگی والے کے ٹوٹے بیٹھے دیکھ کے بھی میری آنکھوں نے بینائی نہیں کھوئی تھی۔

کمرے میں جمیل کی گہری سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہمیں آئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ جہاں گیر کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ وہ مجھ سے چند ہی میل دُور تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد کہیں اُس کی صورت نظر آئی تھی جب پیروں میں گٹے پڑ گئے تھے اور اُمید کے چراغ کی لو روز بہ روز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب بھی مجھے اُس کی صرف ایک جھلک نصیب ہوئی تھی۔ میں اُسے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ جمیل وہاں سے واپس چلا آیا تھا اور اب دوبارہ جانا ہوا بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ پاؤں پھیلائے پلنگ پہ لیٹا ہوا تھا لیکن سو نہیں رہا تھا۔ بہت دیر بعد اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو مجھے کرسی پہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا دیکھ کے کروٹ بدلنے لگا: "تو بھی کچھ کمر سیدھی کر لے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ میں نے ہنکاری بھری۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا: "کیا سوچ رہا ہے رے!"

"کیا سوچ سکتا ہوں؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "کیا تمہیں اب بھی شبہ ہے کہ وہ جہاں گیر نہیں ہے؟"

"مجھے پہلے بھی شبہ نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا ہے۔ تم وہاں سے واپس کیوں چلے آئے؟"

"اندھیرا ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں وہاں جانا ٹھیک نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا کوئی ہمیں روک لیتا؟"

"تیری تو مت ماری گئی ہے لاڈلے!" وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "جہاں گیر ایک گھر میں رہتا ہے سڑک پہ نہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت خانم ملنے سے انکار کر دیتی اور اُسے معلوم ہو جاتا کہ ہم وہی لوگ ہیں جنھیں اُس نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا تو وہ شبہ کرتی۔"

"تو کیا ہوتا؟"

"کچھ نہ ہوتا یا بہت کچھ ہو بھی سکتا تھا۔"

"کیا ہو سکتا تھا؟ ہم بتا سکتے تھے کہ ہم جہاں گیر سے ملنے آئے ہیں۔"

"لاڈلے! تو اب بڑا ہو گیا ہے۔ کیسی ننھی منھی باتیں کرتا ہے۔" وہ جھنجھلا کے بولا: "ابھی ہمیں صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ جہاں گیر خانم کے ہاں رہتا ہے اور تُو نے خلیفے کی زبان سے سُن ہی لیا ہے کہ خانم اُس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ یہ آدمی زمین پہ اپنی جگہ گھیرتا ہے لاڈلے! کوئی بڑی کوئی چھوٹی۔ آدمی پیڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ پھر آدمی کی جڑیں بہت نیچی ہوتی ہیں کسی کی اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں۔ پیڑ اکھاڑنے سے پہلے اُس کی جڑوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں وہاں طریقے سے جانا چاہیے۔ پھر وہ جیسی ہیں نہیں سوچ سمجھ کے۔ کیا یہ ٹھیک ہوتا کہ ہم ایک دو گھنٹے بعد ہی وہاں چلے جاتے۔ خانم بازار میں بیٹھتی ہے۔ بازار کی عورت کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ فرض کر خانم اُس وقت ملنے سے انکار کر دیتی تو کیا ہم چادر نکال لیتے؟ پیل پڑ جاتے؟ تماشا کرتے؟ کیا اس طرح جہاں گیر پہ اچھا اثر پڑتا؟ بہو آتیں سامنے کی ہیں انھیں کیوں پوچھتا ہے۔ خانم کو شیشے میں ڈالنے سے بات خراب ہو سکتی تھی۔ زبردستی ایک ایسی عورت کی۔ بازی نہیں ہونی چاہیے جس نے جہاں گیر کو پناہ دی ہے اور اُسے اپنے بیٹے کی طرح رکھتی ہے۔"

"کیا معلوم! وہ کس طرح اُس کے پاس ہے۔"

"یہی بات تو میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ پہلے ہمیں کچھ پتہ ہونا چاہیے۔ میں پہلے جہاں گیر سے ملنا چاہتا ہوں لیکن ہم وہاں جہاں گیر کے باہر نکلنے کی آس میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ جگہ دوسری ہے اور ہمارا مطلب کچھ اور ہے۔ اندھیرے میں اندھا ہی جا سکتا ہے۔ ابھی ہمیں نہ جانے اور کہاں کہاں جانا پڑے۔ وقت جیب میں رکھا ہوا نہیں ہوتا۔ پیسے جیب میں رکھے ہوئے پیسے سے زیادہ سنبھال سنبھال کے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پتہ ہے لاڈلے! تیرے دل پہ آری چل رہی ہے پر جانی! یہ آری تو چلتی ہے۔ گل ساری زندگی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سکھ پل بھر سے زیادہ نہیں ہوتا اور زندگی میں پل پل بھر ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ آئی تیرے دماغ کی انگیٹھی میں؟"

میں چپ رہا۔ کچھ ایسی ہی باتیں میرے ذہن میں بھی آئی تھیں لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔ ہو سکتا ہے خانم نے جہاں گیر کو بہت کچھ سمجھ لیا ہو۔ مجھے امی یاد آ رہی تھیں۔ امی کی زرد بہت بے کل ہوں گی۔

"لیکن خانم کے دروازے پہ جانے کے بعد کل بھی یہی صورت پیش آئی تو؟ ..." میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"شاید ایسا نہ ہو۔"

"فرض کرو ایسا ہی ہوا؟"

"تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

"جو کل سوچنا ہے وہ ابھی کیوں نہیں سوچ لیتے؟"

"لاڈلے! کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے جہاں گیر کو کھوج لیا ہے۔"

اور بھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میرا مغز مت کھا۔ جا کچھ آرام کر لے۔ کیا تم نہیں کھاؤ گے؟ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم کھا لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"چھوڑو، پھر میں بھی نہیں کھاتا۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا۔"

اُس نے چاول دال لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ اُس نے کروٹ نہیں بدلی۔ میں نے دروازہ کھول کے بیرے کو آواز دی اور اُس سے کھانا لانے کے لیے کہا۔ کھانا آ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ جاگ ہی رہا تھا۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھ کے روٹی اپنے منہ میں ٹھونستا رہا۔ اُس نے بریانی کی پلیٹ میرے آگے کر دی۔ میں نے چند لقمے اُسے بھی حلق سے اُتار لیا۔ میری طرح وہ بھی ساری رات بستر پر کسمساتا رہا لیکن صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ تجمل نے میرے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً اُس کے ذہن میں کچھ اندیشے بھی پل رہے تھے۔ صبح ہوئی تو اس نے اُٹھنے میں دیر لگا دی حالانکہ روز وہ سویرے سویرے اُٹھ جاتا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے دھوپ چڑھ آئی۔ بس میں جانے کے بجائے اُس نے نام پلی سے محبوب کی منڈی کا طویل راستہ پیدل ہی طے کیا۔ ہم بازار میں داخل ہوئے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ تجمل کا رُخ خانم کے مکان کی جانب تھا۔ اُس کی گلی میں پہنچتے ہی میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ رگوں میں سنسنی بجلی سی دوڑنے لگی۔ تجمل کے اشارے پر میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ممکن ہے اندر سے جہانگیر برآمد ہو جائے لیکن وہ نہیں آیا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا وہ اُنھی میں سے ایک تھا جو کل خانم کے ساتھ دواخانے آئے تھے۔ ہمیں دیکھ کے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے متجسس انداز میں ہمیں سلام کیا۔ "خانم ہیں؟" تجمل نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"خانم اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

"اُن سے بولو کہ دو پردیسی ملنے آئے ہیں۔ کچھ کام ہے۔"

"لیکن خانم نے ملنا جلنا بند کر دیا ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم خانم کو جا کے بولو۔ ہم کو یہیں سے جواب مت دو۔"

"آپ وہی لوگ ہیں نا جنھوں نے کل رجّو میاں کی مدد کی تھی؟" اُس نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کو خانم سے کیا کام ہے؟"

"اُن سے بولو کہ ایک ضروری کام ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم کل خانم کے بیٹے سے ملے۔ اب وہ کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔ ہلکا سا بخار ہے۔"

"پھر ہم انھیں بھی دیکھ لیں گے۔ جاؤ، تم کھڑے کیوں ہو؟" تجمل نے ترشی سے کہا۔ "ہمیں اُمید ہے کہ تم جا کے بولو گے تو خانم ہم سے ضرور ملیں گی۔"

"مگر... مگر میں اُوپر جا کے کیا بتاؤں۔ خانم ناراض ہوتی ہیں۔ آپ کام بتا دیں، میں اُن سے جا کے بول دوں گا۔"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ ہم نے خانم کا بہت ذکر سُنا ہے۔ کیا وہ پردیسیوں سے ملنے سے انکار کر دیں گی؟ ہم خانم کا زیادہ وقت نہیں لیں گے اور نہ ہم خانم سے کل رجّو میاں کی مدد کرنے کی اُجرت لینے آئے ہیں۔ اس بات سے بے فکر رہو۔"

"اب خانم کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ اگر ایسا کوئی کام ہے تو میں یہیں سے جواب دے دیتا ہوں۔ خانم صرف چند خاص بیٹھکوں پر جاتی ہیں۔"

"ہم کو یہ جان کاری ہو گئی ہے۔ ہم خانم کو کہیں چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم بحث مت کرو۔ اُن سے جا کے بولو کہ ہم حیدرآباد آئے ہیں تو اُن سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔"

اُس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اُس نے کھڑے کھڑے کئی پہلو بدلے اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر انتظار کرتے رہے۔ اچانک میں نے تجمل کا بازو پکڑ لیا۔ مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ تجمل میری کمر تھپکنے لگا۔ واپس آنے میں اُسے کئی منٹ لگ گئے۔ اُس نے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا اور ہمیں ڈیوڑھی سے ملحق ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھ کے میری سانس پھولنے لگی۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ خانم کے آدمی نے روشن دان کھول دیے۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ چھت اور دیواروں پر پچّی کاری کی گئی تھی اور ان میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے ٹکڑے روشنی میں چمکنے لگے تھے۔ سامنے ایک تخت پر قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ باقی تین اطراف مونڈھے اور آرام کرسیاں تھیں۔ تخت کے اُوپر دیوار میں گھڑی نصب تھی۔ وہ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ تجمل میرے برابر ہی بیٹھا تھا۔ "او لڑکے! اچانک تو باز آ" وہ سرگوشی میں بولا۔ "زبان اپنے منہ ہی میں رکھنا۔"

کوئی چند منٹ بعد قریب ہی کہیں سے چوڑیاں بجنے کی آواز آئی۔ میں سنبھل کے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد تخت کے قریب کے دروازے سے خانم نمودار ہوئی۔ اُس کے پیچھے وہ آدمی بھی تھا۔ خانم نے گردن خم کر کے اور ہاتھ اُٹھا کے آداب کیا۔ آج وہ کل سے بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سفید غرارہ اور نیلا قمیص پہنے ہوئے وہ کوئی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا سر ریشمی دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کانوں میں آویزے جھلملا رہے تھے۔ وہ پاؤں لٹکا کے تخت پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس نے کئی بار ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ "معاف کیجیے آپ کو زحمت ہوئی۔ کل میں رجّو میاں کو دیکھ کے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ آپ کا شکریہ بھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکی۔ اگر آپ وقت پر نہ پہنچ جاتے تو اُس

کم بخت نے کسر کسی سی چھوڑ دی تھی۔" وہ متانت سے بولی۔ اُس کی آواز بہت اچھی تھی۔

"ہم رجّو میاں کا شکریہ وصول کرنے نہیں آئے۔" تجمل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "اُس وقت رجّو میاں کی جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی شاید ہم یہی کرتے۔"

"اس محلے میں کوئی اور ایسا نہیں کرتا۔" خانم افسردگی سے بولی۔ "ملاّ رجّو سے خار کھاتا ہے۔ پہلے وہ ہمیں میرے پاس ملازم تھا۔ بچپن ہی سے اُس نے عادتیں بگاڑ لیں۔ روز تنگ کرتا تھا۔ رجّو میاں ہر وقت اُس کی شکایت کرنے کے میرے پاس آتے تھے۔ میں نے اُسے نکال دیا۔ اُس وقت سے وہ اور شیر ہو گیا۔ میں کبھی رجّو میاں کو تنہا باہر نہیں بھیجتی تھی حالانکہ وہ اس بات سے بہت گھٹتا ہے۔ کہتا ہے 'امّی میں بچّہ تو نہیں ہوں۔ مجھے اکیلا جانے دیجیے۔' مگر یہ ماحول تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں بھی نہ جانے کس مجبوری میں یہاں ٹکی ہوئی ہوں۔ جلد ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ ملاّ کو اس علاقے کے ایک بدمعاش شاہ کبیر نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ شاہ کبیر بہت سنگدل آدمی ہے۔ پہلے بھی وہ ایک بار ملاّ رجّو کو پریشان کر چکا ہے۔ اس بار تو حد ہو گئی۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اپنے آپ کو اس چار دیواری میں بند کر لیا ہے۔ وہ ایک ہی جگہ آنا جانا ہوتا ہے۔ شاہ کبیر مجھ سے اس بات پر بضد ہے کہ میں اُس کے بلانے پر اُس کے گھر کیوں نہیں جاتی۔ میں نے کئی بار عاجزی سے کہا کہ مجھے اب معاف کرو لیکن یہاں اس علاقے میں شاہ کبیر کا حکم چلتا ہے۔ وہ تو کچھ نواب بہادر کی بات ہے اور کچھ میں بھی ان لوگوں کا خیال رکھتی ہوں۔ بہت مشکل سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "معاف کیجیے میں نے ایک ساتھ اتنی باتیں کر لیں اور آپ سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ بس دل بھرا ہوا تھا۔ زبان نہیں رُکی۔ ارے شجاعت میاں!" اُس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کو مخاطب کیا۔ "کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ مہمانوں کے لیے کچھ چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ یہ تو کھانے کا وقت ہے۔ آپ لوگوں نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا ہو گا؟"

"نہیں نہیں۔ کھانے وانے کا تکلّف مت کرو بی بی خانم! ہاں چائے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔

شجاعت اُٹھنے لگا تو خانم کی آواز نے اُسے پھر روک لیا۔ "خاصدان بھی لیتے آئیو اور ذرا ادھر شبنم سے کہیو کہ وہ رجّو میاں کو دوا دے دے۔ وقت ہو گیا ہے۔"

شجاعت کو حکم دینے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئی لیکن اُس کے کچھ کہنے سے پہلے تجمل نے کہا۔ "کیا رجّو میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"نہیں خدا نخواستہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مگر احتیاط بہتر ہے۔ اچھا ہے وہ تین خوراکیں پی لیں۔ یہ انگریزی دوا اثر بھی تیز کرتی ہے۔ کل تک اللہ نے چاہا تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"تم رجّو میاں سے بہت پیار کرتی ہو۔"

"رجّو میاں میری زندگی ہے۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "اُس کے لیے میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ نواب بہادر کے مجھ پہ احسانات ہیں اس لیے میں اُن کا کہنا نہیں ٹال سکتی۔ رجّو میاں کے بعد مجھے کوئی شے عزیز ہے تو صرف موسیقی۔ میں اب بھی ریاض کرتی رہتی ہوں لیکن میں نے نواب بہادر سے کہہ دیا ہے کہ میری جائداد کا انتظام کر دیجیے۔ اب میں رجّو میاں کو لے کے زیادہ دنوں تک اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ وہ ٹال رہے ہیں۔ ایک دن ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر مجھے کچھ سکون مل جائے گا۔"

"رجّو میاں اچھا ہے.... تمھارے...." تجمل نے جھجک کے کہا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔" خانم نے تیزی سے اُس کی بات مکمل کر دی۔ "مجھے امّی کہتا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یوں تو اپنے بچّوں کی سبھی تعریف کرتے ہیں۔"

"وہ بہت اچھا ہے اور بہادر بھی ہے۔ ملاّ اُس سے ڈیڑھ گنا ہے پر رجّو خوب زور کر رہا تھا۔"

"جی کی کیا پوچھیے، بس جی ہی جی ہے۔ دھان پان ہے اور روز بہ روز بانس ہوتا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تم ذرا اپنی جان بناؤ۔ تب یہ جی داری بھی اچھی لگے گی۔ مسکرا کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کھانا تو بہت ہی کم کھاتا ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے۔"

"کیا سوچتا رہتا ہے؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتا ہے۔ میں ایک بار شملے گئی ہوں۔ سوچتی ہوں کچھ دنوں کے لیے اُسے وہیں لے جاؤں گی لیکن یہاں سے تو جان چھوٹے۔" وہ کچھ کھوئی کھوئی سی پھر چونک کر بولی۔ "اے۔ میرا دماغ بھی ٹھکانے نہیں ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم کلکتے سے آئے ہیں۔" تجمل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کلکتے سے؟" اُس نے دہرایا۔ "کیسے کیسے زحمت کی؟"

"بس خانم تم سے ملنے چلے آئے۔" تجمل نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "تمھارا بہت چرچا سنا تھا۔"

"میرا کیا چرچا۔ رسوائی کا ذکر سنا ہو گا۔"

"رسوائی کیسی؟ ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ جو جہاں ہے پتہ نہیں وہ وہاں کیوں ہے۔ خانم! تم بہت سمجھدار عورت ہو۔ تمھارے رنگ روپ کی طرح تمھارا دل بھی صاف ہے۔ تمھیں دیکھ کے دل کو اچھا لگا۔"

"آپ کا حسنِ نظر ہے۔" خانم کی نظریں جھک گئیں۔ "میرے اس کا

وہ ٹھنڈا ڈھلک گیا تھا وہ اس نے فوراً درست کر لیا۔ "آپ لوگوں کا مشغلہ؟ یہاں کہاں قیام ہے؟ جیدہ آپ کب آنا ہوا؟ مجھے بھی اتنی دیر بعد یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔"

"یہاں آئے ہوئے کئی دن ہو گئے۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور رہا کام ۔۔۔ آرزو خانم کام نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟ بھلا آپ ایسا کون سا کام کرتے ہیں؟"

"ابھی تو گلی گلی گھومنا ہی کام ہے۔"

"دنیا کی سیر کر رہے ہیں، سب سے خوب صورت کام ہے۔"

"ہاں دنیا دیکھ رہے ہیں۔"

"ویلی آپ کا مستقل مشغلہ؟ اگر بتانا مناسب سمجھیں؟"

"کیا بولیں۔ نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ کبوتر اڑاتے ہیں۔ بازیاں کھیلتے ہیں زور آزوری اپنا کام ہے۔ جہاں زبان کام نہیں کرتی وہاں ہتھیار چلاتے ہیں۔ بس یہی اچھل کود اکھاڑ پچھاڑ کرتے رہتے ہیں۔"

"خوب۔ ضرور کوئی جاگیردار ہوں گے۔ آپ بہت بذلہ سنج ہیں۔ سب کچھ بتا کے بھی کچھ نہیں بتایا اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟"

"یہ میرا رجّو ہے۔" تجمل نے میری کمر تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" وہ کسی قدر تعجب سے بولی۔ "یعنی یہ آپ ۔۔۔ یہ آپ کے ۔۔۔"

"تم اسے یہاں میرے ساتھ دیکھ کے حیران ہو گئی ہو جو لوگ آگے پیچھے اور ایک دوسرے سے چھپ کے کہیں آتے ہیں وہ ساتھ آئیں تو

کیا بُرا ہے میرا اس کا معاملہ کچھ دوسرا ہے خانم!"

"جی۔" خانم کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔

"اسے اچھی طرح دیکھو خانم! میں اسے تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔"

"میرے سپرد کرنے؟"

"ہاں خانم! اسے بھی رجّو میاں کی طرح سمجھو۔ ساری بات سمجھنے ہی کی ہوتی ہے۔ اس کی بہت سی عادتیں رجّو میاں سے ملتی جلتی ہیں۔ یہ بھی اکیلا اکیلا رہتا ہے۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس کی پیشانی اور آنکھیں رجّو میاں سے کتنی ملتی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"میں کوئی بہت عجیب بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے رجّو کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گا۔ یہ بھی رجّو کے لیے کل سے مچل رہا تھا۔ یہ بھی اچھا لونڈا ہے۔ ذرا ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ غصہ جلدی آ جاتا ہے۔ یہ دونوں مل جائیں گے تو شاید ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔"

"بھلا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ان حالات میں میں یہی بول سکتا ہوں خانم! میں نے اس پر

بہت سوچا اور یہی فیصلہ ہوا کہ میں اپنے لاڈلے کو تمہارے سپرد کر دوں۔ جو ایک سے دو ہو جائیں گے۔ تمہارے دو جوان بیٹے۔ کیا یہ بات اچھی نہیں ہو گی؟ خانم! مجھے پتہ ہے کہ تم رجّو کے لیے کیا کیا سوچتی ہو گی۔ اس کی خوشی کے لیے تم بڑے سے بڑا کام کر سکتی ہو۔ رجّو میاں کو بھی بلاؤ اور پوچھو کہ کیا اسے یہ دوسرا بھائی پسند ہے؟ میرا خیال ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔"

خانم کا چہرہ لال ہو گیا۔ "خدا کے لیے آپ صاف صاف بات کیجیے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "وہ کبھی مجھے پہیلیاں بجھاتی تھی کبھی تجمل کو۔"

"میں بہت صاف بات کر رہا ہوں خانم! اس میں کوئی لاگ لپیٹ چھل فریب نہیں ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں میں اپنے اوسان میں ہوں۔ بس تم سے یہ نہیں بول رہا ہوں کہ تم رجّو میاں کو میرے حوالے کر دو۔"

اسی لمحے شجاعت رنگین خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے اندر آیا۔ اس نے ٹرے خانم کے آگے رکھ دی۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ خانم نے اسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ شجاعت چلا گیا تو وہ سراسیمہ آواز میں بولی۔ "بے شک آپ یہ نہیں کر رہے ہیں مگر کوئی اس طرح کیسے کہہ سکتا اور کر سکتا ہے۔"

"میں طرح میں کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔"

"معاف کیجیے۔" وہ ترشی سے بولی۔ "یہ دل آزاری ہے۔"

"نہیں خانم! ایسا مت بولو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہم کل رات بھی تمہارے پاس آ سکتے تھے پر نہیں آئے۔ مجھ کو شبہ تھا کہ اس وقت تم شاید نہ طرح سمجھا کے کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لو جو رجّو میاں کے لیے اور ادھر اپنے لاڈلے کے لیے اور خود تمہارے لیے اور پریشانیاں کھڑی کر دے۔ ان معاملوں میں ایسی گھبراہٹیں ہو جاتی ہیں۔ مجبوراً میری کیا کوشش ہونی چاہیے تھی کہ مجھے تم سے بات کرنے اور تم کو سمجھانے کا موقع مل جائے۔ خانم! تم رجّو میاں کو ہمیشہ دیواروں پردوں اور حجرے میں بند نہیں رکھ سکتیں۔ تمہیں اپنے اوپر بھروسا ہونا چاہیے کہ تم نے رجّو میاں سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اس کو سچ ہی سچ دیا ہے۔ اب ایک اچھی صورت سامنے آئی ہے۔ ذرا سوچو رجّو میاں کتنے خوش ہوں گے اور اسے دیکھو یہ اسی کا لال کتنا بے تاب ہے۔ رجّو میاں شریف زادے ہیں۔ وہ اس عورت کو کیسے بھول سکتے ہیں جس نے ان کے سکھ کے لیے اپنے سکھ چھوڑ دیے ۔۔۔ خانم! بھلا اس میں جھجکنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

خانم کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"رجّو میاں کو بلاؤ خانم! بلاؤ نا خانم! اسے آواز دو۔" خانم نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکنے لگی۔

"میں تم سے رجّو میاں کو لینے نہیں آیا ہوں۔" تجمل نے کہا۔ "میں نے پہلے بول دیا ہے۔ تمہیں پتہ نہیں ہم کہاں کہاں سے گھومتے ہوئے آئے ہیں کچھ میرے لاڈلے کا بھی خیال کرو۔ رجّو میاں کی خاطر اس کی خاطر تمہارے لیے برات سے بڑی ہے۔"

"کیا ۔۔۔ کیا یہ رجّو میاں کے ۔۔۔؟" خانم پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں خانم!"

"مگر ۔۔۔ مگر رجّو میاں نے مجھے کبھی نہیں بتایا؟"

"یہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ خانم پتھر کی طرح گنگ ہو گئی تھی۔ تجمل کی آواز پر وہ جیسے سوتے سوتے چونک پڑی۔ "کیا سوچنے لگیں خانم؟"

"کچھ نہیں۔" وہ نیم جانی انداز میں بولی۔

"کیا مجھے کچھ اور بولنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں نہیں۔" خانم نے روتے ہوئے کہا اور ایک دم تخت سے اٹھ گئی۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور بوجھل قدموں سے اندر چلی گئی۔ میری سانس سینے میں اٹکنے لگی اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی۔ تجمل نے میرا سر پکڑ کے جھنجھوڑ دیا۔ خانم فوراً ہی واپس آ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جہاں گیر اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"چائے بناؤ خانم!" تجمل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

خانم نے بڑبڑا کے کسی معمول کی طرح تھال سے سرپوش ہٹایا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ اس نے پھلوں خشک میووں اور نمکین چیزوں کی پلیٹیں ہمارے سامنے رکھ دیں اور چائے بنانے لگی۔ خانم سکڑ گھل رہی تھی۔ اندر سے دفعتاً کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جہاں گیر ہی تھا۔ وہ تیزی سے آ رہا تھا مگر ہمیں دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے ہم دونوں کو سلام کیا اور خانم کے برابر تخت پر بیٹھ گیا۔ "کیوں آپی! اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

"ہاں!" خانم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔" خانم نے نگاہیں اٹھا کے ہماری جانب اشارہ کیا۔

"اچھا۔" وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ "مگر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کچھ پریشان پریشان ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" خانم نے مرتعش ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔ "تم مہمانوں سے بات کرو۔ دیکھو یہ کہتے ہیں یہ تمہارے لیے ایک اچھی خبر لائے ہیں۔"

"کیسی خبر؟" وہ مچل کے بولا۔ "ضرور مولا کی بات ہو گی مگر آپی! میں اس سے خود نمٹوں گا ورنہ ۔۔۔ ورنہ مجھے۔" وہ ہمیں دیکھ کے کچھ کہتے کہتے

چپ ہو گیا اور چند ثانیے ٹھہر کے بولا۔ "مگر آپ کیا خبر لائے تھے؟"

"خبر کیا، ہم تو تمہیں دیکھنے آئے تھے رجّو میاں!" تجمل نے کہا۔ "اس سے ملو یہ لاڈلا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملانے لایا تھا۔ کل اس نے تمہیں دیکھا ہے۔ یہ تمہارا حال پوچھنے اور تمہیں دیکھنے کو آیا تھا۔"

"اچھا۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "میں تو کل بھی ان سے ملنے کو جا رہا تھا۔ میری وجہ سے انھیں بہت تکلیف ہوئی۔ کیا نے ان کی کمر میں کئی بار زور سے مارا تھا اور اس نے آپ پر بھی ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں نے آپی سے رات بھی کہا تھا۔ آپی افسوس کر رہی تھیں۔ آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں رجّو! ایسے اپنے سالے گریبان رفو کیے بیٹھے ہیں۔"

"ہاں!" وہ حیرت سے بولا۔ "پھر آپ ہر جگہ اسی طرح درمیان میں آ جاتے ہوں گے۔ کیا پہلے بھی آپ کو مولا جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے؟" تجمل آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ جہاں گیر چونکتے لہجے میں بولا۔ "مگر مولا ذلیل ہے۔ وہ بدمعاش ہو گیا ہے۔ کس دن میں اسے ۔۔۔ میں اسے ۔۔۔۔"

"جانے دو اس ذکر کو رجّو میاں! اتنا غصہ نہیں ہوتے۔ اسے معاف کرو۔" تجمل کی آواز اس پر غالب آ گئی۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"پورا نام؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔ "مظفر علی۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا مگر جہاں گیر نے اپنا نام مظفر علی ہی بتایا تھا۔ میں نے بے چینی سے تجمل کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"اور ابا کا نام؟" تجمل نے مسکرا کے پوچھا۔

"کیوں ۔۔۔؟" وہ تندی سے بولا۔ "یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ویلی ہی ممکن ہے وہ ہمارے کوئی جاننے والے ہوں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"کیا تمہارے ابا سے ہماری جان پہچان نہیں ہو سکتی؟ بتاؤ تو۔"

"منوّر علی۔" اس نے تیزی سے کہا۔ میرا سر پھٹنے لگا۔

"کیا کہا؟ منوّر علی؟" تجمل نے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ جی نہیں۔" وہ حواس باختہ سا ہو گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "منوّر علی۔ میں نے منوّر علی کہا ہے۔"

"میں نے سن لیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔" تجمل نے ہنس کے کہا اور میرا شانہ پکڑ کے بولا۔ "چلو بابر زماں خاں! یہاں جہاں گیر نہیں ہیں۔ تو رجّو میاں ہیں۔"

جہاں گیر اچھل کے تخت سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ۔۔۔ بابر زماں خاں ہیں؟" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ کسی بچے کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میرے قریب آ کے مجھے گھورنے لگا۔ اس کی

آنکھیں پھٹ گئی تھیں، وہ پچھاڑ کے گرا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بڑھ کے
اُسے سنبھال لیا اور اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ میرا سینہ گرجنے لگا۔ میں
نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے لیکن مجھے خود پہ اختیار نہیں رہا۔
پتہ نہیں کتنی دیر بعد خانم نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔
جہاں گیر کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں، اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بڑا بے کل
تھا۔ کبھی میرے ہاتھ چومتا تھا کبھی انھیں آنکھوں سے لگاتا تھا۔ میں
اُسے زور کھسوٹ رہا تھا۔ خانم ہماری کمر پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہمیں تخت
پہ لے آئی۔ اُس نے اپنے دوپٹے سے میرا اور جہاں گیر کا چہرہ خشک کیا۔
جہاں گیر نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور زار و قطار
رونے لگا۔ خانم اُسے سمجھانے لگی۔ اُس نے ہم دونوں کو پانی پلایا
اور ہمارے سر اپنے سینے پہ رکھ کے خود بھی سسکنے لگی۔
تجمل اور خانم کی موجودگی میں جہاں گیر نے مجھ سے کچھ نہیں
پوچھا اور نہ خود کچھ بتایا۔ وہ تو بار بار میری صورت دیکھتا اور سکتے میں
رہ جاتا تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں ہوں۔ اس کی تصدیق
کے لیے اچانک وہ میرے ہاتھ زور سے پکڑ لیتا اور میرے سینے سے
چمٹ جاتا۔ جو اُس کا حال آج تھا وہ میرا کل سے تھا۔ میں نے اپنی
آنکھوں میں آنسو کب سے بند کر رکھے تھے۔ تمام رات بستر پہ لوٹتا رہا تھا۔
تمام رات میں نے اُس کی آنکھیں محسوس کی تھیں۔ خانم ہمیں اوپری منزل کے
ایک آراستہ کمرے میں لے آئی۔ اُس نے شجاعت کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان
ہوٹل سے لے آئے۔ تجمل نے منع نہیں کیا۔ نہ جانے کس وقت خانم نے
ڈھیر ساری مٹھائی منگوائی تھی۔ نیاز کے بعد اُس نے ہم سب کا منہ میٹھا کرایا۔
خانم اور تجمل کمرے سے چلے گئے تو جہاں گیر میری صورت دیکھ
کے پھر بلکنے لگا۔ میں نے اُس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔ اُسے چپ کرانے
کی میں نے بہت کوشش کی مگر اُس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ "چپ
ہو جاؤ! میں اب آ گیا ہوں۔" میں اُسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا،
اُس کی آنکھیں اتنی ہی امڈ آتی تھیں۔ اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا
کہ وہ خانم کے ساتھ گھر میں اکیلا ہے۔ میرے ذہن میں اور بے شمار باتیں
بھی سر اٹھا رہی تھیں مگر میں نے جہاں گیر سے کچھ پوچھنے کی جلدی نہیں کی۔ ان
کے جوابات سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اُسے کریدا
تو سب سے پہلے وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں ان سب کو چھوڑ کے گھر سے کیوں
چلا گیا تھا؟ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ جو ایک خوف زدہ سی گڑیا اُس رات گھر
میں آ رہی تھی وہ مجھے لے گئی تھی۔ وہ ڈھونڈ کے کہیں بھی نہیں، مجھے اکیلا
چھوڑ گئی۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ میں کہاں رہا۔ میں نے اتنے بہت سے
دن کہاں گزارے۔ ... کر کے گھر سے نکلا تو میری بات اس
کی سمجھ میں آتی۔
میرے کان بج گئے جب جہاں گیر نے ہچکیوں کے درمیان میں
خود ہی مجھے بتانا شروع کیا کہ اُس کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا۔ وہ کوئی تین
سال پہلے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا۔ ایک سال وہ شہروں شہروں گلی گلی انھیں
ڈھونڈتا رہا۔ پھر اُس کے پیروں نے جواب دے دیا اور وہ بھوپال کے
ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گیا۔ نواب اُس کا خیال رکھتا تھا۔ وہیں خانم
سے اس کی ملاقات ہوئی اور خانم نے اُسے نواب سے مانگ لیا۔ اس کے
بعد وہ خانم کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس دوران میں بھی وہ مسلسل ابا جان کی
تلاش میں لگا رہا مگر وہ اُسے کہیں نظر نہیں آئے۔ ابا جان نے اس کے
گھر واپس آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ایک دن جب وہ
گھر کے کسی کام سے باہر نکلا تو شہر میں ہنگامہ مچ گیا۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جہاں گیر
کو گھر جانے کا راستہ نہیں ملا۔ پولیس نے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ شہر میں
گولیاں چل رہی تھیں اور جا بجا گھر پھونکے جا رہے تھے۔ جہاں گیر پولیس اور
بلوائیوں کے ڈر سے شہر کی حدود سے باہر آ گیا۔ وہاں سے اُسے ایک
مشتعل بلوائی پھر اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے جہاں گیر کو سخت اذیتیں
پہنچائیں۔ اُسے تین دن تک بھوکا رکھا اور ننگا کر کے بہت مارا۔ وہ اُسے
مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا مگر ایک دن جب اُس بلوائی کو پولیس پکڑ کے
لے گئی تو جہاں گیر کو وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس اثنا میں ابا جان
گھر چھوڑ کے جا چکے تھے۔ وہ محلے میں ہر ایک سے اُن کا پتہ پوچھتا پھرا لیکن
ابا جان محلے میں کسی سے ملتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنا پتہ بتا کے بھی نہیں گئے۔
انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ جہاں گیر فسادات میں مارا گیا۔ ممکن ہے انھوں نے
اُسے تلاش کیا ہو مگر جب اُس کا کوئی پتہ نہ چلا ہو تو وہ مایوس ہو گئے ہوں۔
وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ تین مہینے اس شہر میں، چار مہینے اُس
شہر میں۔ یہ شہر میں آئے ہوئے انھیں دو مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ یہی
میں مولوی اکرم نے جو باتیں ابا جان کے متعلق بتائی تھیں جہاں گیر بھی
وہی دہرا رہا تھا۔ ابا جان ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور دن رات کاغذات
پہ جھکے انھیں پڑھتے یا کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ان کے اردگرد موٹی موٹی کتابیں
پھیلی پڑی تھیں۔ کھانے پینے کا انھیں کوئی ہوش نہیں تھا۔ مگر کوئی ذرا
ان سے شکایت کرتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بس چند دنوں کی بات اور ہے
پھر سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہم ایک محل بنائیں گے۔ آگے پیچھے ملازموں
کی فوج ہوگی۔ ایک دن آئے گا کہ ہمیں دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ ابا جان
رات کو دیر سے کمرے سے نکلتے اور پلنگ پہ آ کے بھی یا تو گم سم رہتے یا
بڑبڑاتے رہتے۔
جہاں گیر نے نیچی نظروں اور دبے دبے لہجے میں مجھے نمی کے گھر سے
غائب ہو جانے کا واقعہ بھی بتایا۔ ابا جان اس کے بعد بہت چڑچڑے ہو
گئے تھے۔ ہمیشہ فرخ، زرگل اور نادرہ کو جھڑکتے رہتے تھے۔ اگر اُن کے
سامنے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ انھوں نے اسکول کی کتابیں گھر میں لا کے رکھ
دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ خود پڑھایا کریں گے مگر انھیں کبھی فرصت نہیں ملی۔

پہلے فرخ سب بہن بھائیوں کو پڑھاتی تھی۔ وہ چلی گئی تو یہ سلسلہ بھی بند ہو
گیا۔ ابا جان کبھی کبھی گھر سے نکلتے تھے۔ واپس آتے تو اُن کے ساتھ کتابوں کا
ڈھیر ہوتا۔ وہ کتابیں گھر میں اُن کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کبھی واپس
آتے تو اُن کی جیب میں ایک بڑی سی رقم ہوتی۔ فرخ اور زرگل دن رات اُن
سے کہتیں کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں تو وہ کان دھرتے اور ایک پہر کے لیے
گھر سے نکل جاتے۔ اُن کا خبط بڑھتا جا رہا تھا۔ کپڑے گندے ہو جاتے تھے
انھیں خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں سب کو ہدایت تھی کہ شہر والوں سے زیادہ
میل جول نہ رکھا جائے۔ کوئی ملنے آئے تو اُسے دروازے ہی سے ٹال دیا
جائے۔ انھوں نے فرخ، زرگل اور نادرہ پہ کڑی پابندیاں عاید کر دی تھیں۔
جس محلے میں وہ رہتے، لوگ انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے۔ کئی مرتبہ سب
نے طے کیا کہ اب کے ابا جان باہر جائیں گے تو وہ یہ کاغذات جلا دیں گے
پھر نہ کاغذات ہوں گے نہ ابا جان ان میں سر کھپائیں گے مگر ابا جان کے
خوف کی وجہ سے کوئی ایسا نہیں کر سکا۔ انھوں نے بہت دعائیں مانگیں۔
فرخ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھی۔ اُس نے بہت سی منتیں بھی مان رکھی
تھیں۔ ابا جان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ وہ روز بہ روز اور زیادہ مستغرق
رہنے لگے۔ بار بار گھر اور شہر بدلنے کے سبب اُن کے پاس سامان بھی
بہت کم رہ گیا تھا۔ ابا جان کی رازداری کے خیال سے جہاں گیر نے خانم
کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا تھا۔ ابا جان کا نام بھی غلط بتایا تھا اور اپنے گھر سے
بچھڑنے کی ایک فرضی داستان سنا دی تھی۔
جہاں گیر کہہ رہا تھا کہ وہ ان تین برسوں میں کبھی پوری نیند نہیں سویا۔
اُسے بُرے بُرے خواب آتے ہیں۔ راتوں کو وہ ہڑبڑا کے اٹھ جاتا ہے
اور چیخنے لگتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ شریفن خانم ایک طوائف ہے اور گانا
سنانے کے لیے نواب صاحب کے ہاں مہمان ہے لیکن ایک خانم ہی تھی
جس نے اُس پہ سب سے زیادہ توجہ دی۔ اُس نے اُس کے کپڑے بنوائے۔
ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ وہ ہر وقت اُس کا خیال رکھتی تھی اسی لیے وہ خانم
کے ساتھ چلا آیا۔ اُس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور جیب میں ایک دمڑی
نہیں تھی۔ نواب صاحب کے ہاں سے اُسے کھانا مل جاتا تھا اور چار آنے روز۔
ان چار آنوں میں نہ تو وہ کہیں جا سکتا تھا، نہ کھا سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا۔
اُس نے پیسے جوڑ جوڑ کے رکھے۔ نواب صاحب کبھی کبھی اُسے دیتے تھے۔
یہ سب خانم نے دیکھا تھا۔ جب خانم نے اُسے بلا کے اُس کے بارے میں
پوچھا تو وہ رونے لگا۔ خانم نے اُسے بہت پیار کیا اور اسی وقت کہا "اب
تم میرے ساتھ چلو گے۔" جہاں گیر خانم کی باتیں کرتے نہیں تھکتا تھا۔
جیسے میں اُسے ڈانٹوں گا کہ وہ ایک طوائف کے ساتھ کیوں چلا آیا۔ اُسے
معلوم نہیں تھا کہ فرخ اُس کی بہن بھی ایک ناچنے گانے والی تھی اور اُس
کا بڑا بھائی سات سال جیل میں گزار کے آیا تھا۔ اُس نے کئی قتل کیے تھے۔
اُس نے کلکتے کے ایک بہت بڑے بدمعاش مرجان کو ٹھکانے لگا دیا
تھا اور وہ کئی شہر کے کئی پاڑوں کا استاد رہ چکا ہے۔ اُس کی جیب میں
ہمیشہ ایک چاقو ہوتا ہے۔ جہاں گیر والہانہ انداز میں خانم کا ذکر کر رہا تھا۔
شاید وہ غیر شعوری طور پر مجھے یہ جتانا چاہتا تھا کہ میری زبان سے خانم
کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے اُس کی سبکی ہو۔
کوئی بات ایسی نہ ہو کہ خانم کے سامنے اُسے سر اُٹھانے میں جھجک ہو۔
وہ کہہ رہا تھا کہ اُس نے کئی دفعہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر خانم کے
خیال سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نہ جانے آپی کیا سمجھیں۔ وہ بہت روئیں گی،
کھانا پینا بند کر دیں گی۔ وہ آپی کی نظروں سے ذرا بھی دور ہو جائے تو وہ
پریشان ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ کہیں چلا گیا تو آپی زندہ نہیں رہیں گی۔ اُس نے
آپی سے بہت سے وعدے کیے تھے اور آپی نے اُس سے۔
جہاں گیر کہتا تھا کہ گھر میں کوئی دن بھی ایسا جاتا تھا جب میرا
تذکرہ نہ ہوتا ہو۔ ابا جان نے تو میرے جانے کے چند دن بعد ہی ناراضی
کا اظہار کر دیا تھا۔ کچھ دن اور گزر گئے اور میں گھر واپس نہیں پہنچا تو انھوں
نے اعلان کر دیا کہ میں مر چکا ہوں۔ زندہ ہوتا تو ضرور واپس آ جاتا۔ ابا جان
کا خیال تھا کہ میں جس لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، لوگ اُسے تلاش کر
رہے ہوں گے اور اُس کے ڈھونڈنے والوں نے مجھے مار ڈالا ہوگا۔ وہ
بتا رہا تھا کہ میرے جانے سے امی کا بُرا حال تھا۔ وہ ابا سے ہر وقت
جھگڑتی رہتی تھیں۔ پھر ابا کاغذات میں گم ہو گئے اور انھوں نے میرے گھر
میں دلچسپی لینا کم کر دیا۔ امی ہر وقت اُن سے کہتی تھیں کہ وہ کاغذوں کا پیچھا چھوڑ
دیں اور میری تلاش کے لیے دوڑ دھوپ کریں مگر ابا جان کچھ دن تک
تو مجھے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے پھر گھر میں بند ہو گئے۔ انھوں نے رشتے
داروں سے ملنا بھی منقطع کر دیا۔ امی کی ہمت ٹوٹ گئی۔ وہ بہت دبلی ہو
گئی تھیں۔ ہر وقت مجھے یاد کرتی رہتی تھیں اور آسمان کی طرف تکتی رہتی
تھیں۔ ساری ساری رات وظیفے پڑھتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک
دن میں ضرور واپس آ جاؤں گا۔ پھر وہ ایسی بیمار پڑیں کہ پلنگ سے نہیں
اٹھیں۔ آخری وقت بھی اُن کی زبان پہ میرا ہی نام تھا۔ کہتی تھیں کہ وہ اب
آئے تو کہنا تیری ماں نے بہت انتظار کیا۔ امی کی موت کے بعد چند روز
کے اندر اندر ابا جان نے زمینیں بیچ دیں۔ چپ چپاتے گھر کا سودا کر لیا۔
میں نے جہاں گیر کو روکا نہیں تاکہ جتنے جلے پھپھولے ہیں وہ ایک ہی بار پھوڑ
لے۔ میں نے درمیان میں ایک بات بھی نہیں پوچھی۔ وہ خود ہی سب کچھ
کہتا اور سینہ خالی کرتا رہا۔ امی کے ذکر پہ اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔
کہنے لگا "مجھے خوب یاد ہے امی نے آخری وقت میرا ہاتھ تھام کے کہا تھا
کہ جب تک تیرا بڑا بھائی واپس نہیں آتا، تو اپنے آپ کو اس گھر کا بڑا سمجھنا۔
میں یہ سارا گھر تجھ پہ چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ امی نے یہ بھی کہا کہ
اپنے باپ کا خیال رکھیں اور بھائی کو تلاش کرتے رہیں۔ ایک نہ ایک
دن وہ ضرور مل جائے گا۔ وہ نہ آئے تو اُسے اپنی امی کا واسطہ دے کر گھر

ہی دیکھا ہوا ہو واپس آ جائے گا اور اُس کے ساتھ وہ لڑکی ہو تو اُسے عزت سے گھر لانا۔ امی نے ابو سے بھی کہا تھا کہ وہ اب اس گھر کی مالک ہیں سب کچھ ہے۔ نہ ابو نہ امی کی بات پوری کر سکی ہیں۔" جہاں گیر کہہ رہا تھا۔ "پتہ نہیں اب وہ سب کہاں اور کس حال میں ہوں۔ اگر بہت پچھتا ہے گھر کو سدا کون لاتا ہوگا۔"

معلوم نہیں جہاں گیر نے اور کیا کیا کہا اور کتنے طمانچے مارے۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ شاید اُس کی آواز میں بھی دم نہیں رہا تھا۔ وہ چپ ہو گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں چھلک رہی تھیں اور جسم تھرتھرا رہا تھا: "بھائی جان! آپ کہاں چلے گئے تھے؟" وہ سسکتے ہوئے بولا۔ میں نے اُسے جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے جھنجوڑنے لگا: "آپ کہیں روٹھ گئے تھے؟"

"مت پوچھو منے!" میں نے اس سے فریاد کی۔ "کچھ نہ پوچھو۔ سمجھ لے کہ اس عرصے میں میں مر گیا تھا۔ میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔"

جہاں گیر خاموش ہو گیا لیکن چند ہی لمحوں بعد سسکتے ہوئے لہجے میں بولا: "ایک بات بتائیے۔ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ کھو گئی۔"

"کھو گئیں؟ کہاں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم منے! چپ ہو جا۔"

اُس نے پھر مجھے تنگ نہیں کیا۔ اپنی زبان سی لی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جہاں گیر نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ خانم نے کمرے میں آ کے روشنی کی لو نہیں اُٹھائی کمرے سے باہر نکل گئی۔

باہر کسی مکان سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ نغمے ذہن سے ٹکرا رہے تھے اور طبلے کی تھاپ تیز ہو جاتی تھی۔ خانم کو اس کا احساس ہوا تو اس نے کھڑکی بند کر دی۔ ہم سب اوپری منزل کے صحن میں بیٹھے تھے۔ وہاں کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ سا تھا۔ سائبان کے کھمبوں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور رات کی رانی کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی اور ایک نوجوان خادمہ سامنے چوکی پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا لگا رہی تھیں۔ طرح طرح کے کھانے۔ جہاں گیر کا چہرہ آنسوؤں سے دُھل سا گیا تھا جیسے کئی دنوں کی بارش کے بعد دھوپ نکلے۔ خانم نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ وہ سادہ سی ساڑی میں ملبوس تھی اور خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ خادماؤں کو ہدایت دینے کے کام سے فارغ ہو کے وہ میرے پاس آ بیٹھی اور چپکے چپکے جہاں گیر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ اب اُس کی صحت بہت ٹھیک ہے۔ پہلے تو اس کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ اُس نے اُسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر برہان کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر وہ کچھ اور دیر سے آتی تو جہاں گیر کو دق ہونے کا اندیشہ تھا۔ مجھ سے اُس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں پھوٹا تھا۔ جب ہم کھانا کھا کے بیٹھے چوکی پر آئے تو وہ مجھی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اُس نے قبول سے میری شکایت کی: "ہاتھ پھیلا دیا مانگا پھولوں کو گود میں لے کے روتا ہے دہائی دیتا ہے۔" دوبارہ ہنسی سے بولا۔

"ہاں! بھائی جان! آ جائیں" جہاں گیر چمک کے بولا۔ "میٹھے چاول کی ڈش آپ کو میٹھے چاول بہت پسند ہیں نا!"

اُسے اب تک یاد تھا۔ امی میرے لیے بطورِ خاص میٹھے چاول ڈال دیا کرتی تھیں۔ ممکن ہے خانم نے اُسے بتایا ہو۔ خانم نے چاولوں کی تھال میرے آگے کر دی۔ میرے حلق میں لقمے اٹک رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے امی آج بھی میری بس ہیں اور یہ اُن کی محبت کا لقمہ ہے۔

کھانے کے بعد خانم نے ہمیں تنہا چھوڑا اور رات گئے تک وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ شہر میں اچھے گھریلو ملازموں کا قحط۔ ملازموں کے سلسلے میں اپنے تجربے۔ اُسے شکایت تھی کہ وفاداری اُٹھ گئی ہے اور لوگ بہت سنگ دل ہو گئے ہیں۔ اُس نے میرا پلنگ بھی جہاں گیر کے کمرے میں بچھوایا تھا لیکن جہاں گیر میرے پلنگ پر آ کے اور مجھ سے چمٹ کے لیٹ گیا۔ خانم شاید روزانہ اس کی پیشانی پر بوسہ دے کے رخصت ہوتی تھی۔ شب بخیر کہتے وقت اس نے جہاں گیر کے ساتھ میری پیشانی پر بھی اپنے ہونٹ ثبت کیے اور مسکراتی ہوئی اوجھل ہو گئی۔ آدھی رات تک جہاں گیر خوابیدہ لہجے میں مجھے گھر کی باتیں سناتا رہا۔ پھر میرے بازو پر سر رکھ کے سو گیا۔ میں اُس کے بال سنوارتا اور اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بالکل آٹھ سال پہلے کے منّے کی طرح۔ میں نے اس کے بہت سے پیار لیے۔ مجھے یاد تھا کہ وہ سونے میں ٹانگیں بہت مارتا تھا۔ جب وہ ایسا کرتا تو میں جھنجھلا کے اُسے اٹھا کے امی کی چارپائی پر ڈال دیا کرتا۔ اب بھی وہ ٹانگیں چلا رہا تھا۔ میں نے اپنا رُخ بدل لیا۔ اُس کی ٹھوکریں میرے منہ پر پڑی گویں چاہیے تھیں۔

ابھی میں گہرا اندھیرا طاری تھا کہ مجھے دروازے پر دستک کا احساس ہوا۔ میں یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ چلتے ذہن میں سوچتا رہا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ جو تھی با تجریں دستک پر میں نے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہاں خانم موجود تھی۔ "کیا وہ جاگ گیا ہے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں وہ سو رہا ہے۔" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔

وہ سیدھی کمرے میں چلی آئی اور جہاں گیر کے سرہانے بیٹھ کے اُس کے گال تھپ تھپانے لگی۔ جہاں گیر فوراً ہی اٹھ گیا۔ "آپی! آج آپ آ رہی ہیں؟"

اس نے خانم کے گلے میں بانہیں ڈال کے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہیں بالکل نہیں شہامت اُٹھ چکا ہے۔ بستر چھوڑو گے تو نیند بھاگ جائے گی لیکن جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" خانم نے اُس کے بازو ہلاتے ہوئے اُسے بستر سے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا تو خانم چلی گئی۔ جہاں گیر نے مجھے جاگتا دیکھ کے سو جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد واپس آ جائے گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ روز صبح کسی ملازم کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا ہے۔ جب وہ منہ دھو کے باہر آیا تو میں بھی تیار ہو گیا تھا۔ میں نے شہامت کو منع کر دیا اور اُسے اپنے ساتھ لے کے گھر سے نکل گیا۔ ہم چار مینار تک آ گئے۔ اُس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنا قد بڑا اور وزن زیادہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک دن میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ راستے میں جہاں گیر مجھے عمارتوں اور راستوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ "یہ خلوت مبارک ہے۔ یہ مکہ مسجد ہے۔ وہ سامنے چار کمان ہے اور شفا خانہ نظامیہ ہے۔" میں ان راستوں سے پہلے بھی گزر چکا تھا لیکن میں نے اُس کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار نہیں کیا۔ جیل سے چھوٹنے کے کچھ دنوں بعد ہی میں مولوی محمد شفیق کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور میں نے کوئی گلی نہیں چھوڑی تھی۔ اخبار میں اشتہار بھی چھپوایا تھا۔ اُس وقت بھی جہاں گیر یہیں ہوگا۔ کاش وہ مجھے اُسی وقت نظر آ جاتا مگر میں ہر گھر میں گھس کے تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسے ہی کسی گھر میں کر ابھی چھپی ہوئی ہوگی۔ باہر سے کسی کو کیا خبر ہو سکتی ہے کہ اندر کون ہو سکتا ہے۔ ہم نے حیدر آباد کی تمام بستیوں میں انھیں ڈھونڈا تھا۔ ممکن ہے آپا جان کی طرح کوئی اور مولوی صاحب نے بھی اپنا نام تبدیل کر لیا ہو اور وہ خود بھی نہ جانتے ہوں کہ کوئی تلاش کر رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ گئے ہی نہ ہوں۔ ممکن ہے آپا جان کی طرح مولوی صاحب نے بھی مجھے مرا ہوا سمجھ لیا ہو اور کسی کو بھی یاد نہ کرتا ہو پر پھر گئے ہوں؟ کیسے زندہ رہی ہوگی جس طرح امی جان مر گئیں وہ بھی.... وہ بھی؟ نہیں نہیں! میں نے اپنا منہ کھسوٹ لیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ جہاں گیر بھی میرے ساتھ ہے اور ہم سڑک پر چل رہے ہیں۔ وہ پریشان ہو گیا اور حیرانی سے پوچھنے لگا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

میری تکالیف اُسے مطمئن نہیں کر سکی۔ وہ اور مضطرب ہو گیا اور گھر واپس چلنے پر اصرار کرنے لگا۔ اُس نے خانم کا عذر کیا کہ اب وہ اپنی صبح کی ریاضت سے فارغ ہو گئی ہوگی اور ہماری راہ تک رہی ہوگی۔ لیکن ابھی اندھیرا چھٹ گیا تھا اور ہمیں واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ محبوب کی مہندی کے علاقے میں پہنچتے پہنچتے اکا دکا دکانیں کھل گئی تھیں۔ خانم ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہی تھی اور بیٹھک میں قبول کو دیکھ کے یک گونہ اس طرح تخت پر بیٹھا تھا جیسے اُسے یہاں آئے ہوئے بہت دن گزر گئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ خانم نے قبول کے لیے حقے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ یقیناً حقہ وہاں پہلے سے موجود ہوگا یا گھر کا کوئی ملازم شوق کرتا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ خانم نے ہماری نام موجودگی میں دو بکرے ذبح کرائے ہیں۔ دھوپ چڑھی اور آ گئی۔ قبول دن بھر گھر ہی میں پڑا رہا۔ خانم کو کہیں وہ باہر نکلا۔ اس نے جہاں گیر کو بھی ساتھ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ گھر سے باہر آنے میں اُس کا کوئی مقصد ہوگا مگر وہ جہاں گیر کا ہاتھ تھامے شہر کے خوب صورت علاقے عابد شاپ روڈ، باغِ عامہ کا ایک عام چکر کاٹ کے اور نامپلی کے ایک مدراسی ہندو کی دکان سے چاٹ مسالا لے کے گھر چلا آیا۔

خانم کے ہاں ٹھیرے ہوئے ہمیں کئی ہفتے گزر گئے۔ اس دوران میں ایک رات نواب عالم جاہ نے اُسے اپنے محل طلب کیا۔ خانم نے معذرت کر لی کہ اُس کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ نجابت کا کہنا تھا کہ خانم نے نواب بہادر کے ہاں جانے سے پہلی بار انکار کیا ہے۔ صبح شام جب ہم گلیوں سے گزرتے تھے تو چھجوں، کھڑکیوں اور نشستوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں ایک دوسرے کو اشارے کرتی تھیں۔ اُن میں سے کئی عورتیں کی خانم کے ہاں آمد و رفت تھی اور جہاں گیر بھی اُن سے خوب واقف تھا۔ وہ آتے جاتے ہوئے اُنھیں سلام کرتا تو وہ مسکرا کے جواب دیتیں۔ کچھ دعائیں دیتیں اور کچھ اُس سے اپنے گھر میں آنے کے لیے اصرار کرتیں۔ بازار کے بہت سے لوگ بھی جہاں گیر کو جانتے تھے اور اُس کے سلام کا جواب نہایت گرم جوشی سے دیتے تھے۔ رات گلیوں میں دن کا سا ہو جاتا تھا۔ گلیاں پھولوں سے مہک جاتی تھیں۔ طرح طرح کے رنگ برنگے کپڑے بدل لیتی تھیں۔ اُن کے کپڑوں میں ٹنکے ہوئے ستارے ٹمٹماتے ہوئے وفور میں دمکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے روشنی اُن کے چہروں سے پھوٹ رہی ہو۔ اُن کے لبوں پر اور آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ رات کو ہم باہر نکلنے سے پرہیز کرنے لگے۔ میں نے قبول سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اب اُس کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں غور و خوض کر رہا ہوگا مگر اُس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ میں جہاں گیر کو جلد سے جلد یہاں سے لے جانا چاہتا تھا مگر خانم کے خیال سے میری زبان نہیں کھلتی تھی اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے لے کر کہاں جاؤں گا۔

ایک دن شام کو گھر واپسی کے وقت قبیلہ بنو نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اُس نے جہاں گیر کے سامنے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیں۔ "کب حضرت! آپ نے تو بالا ہی بالا کام کر لیا؟" اس نے مجھ سے پوچھتے ہوئے کہا اور آنکھ مار کے بولا: "کن سا منتر پھونکا تھا جادوگر والا نے! ادھر ہم بے کار ٹکریں مار کے بھاگ گئیں ہیں۔" قبول نے جب تک اس کی منطق کی وہ مجھے نہیں سکھائی اس کی زبان کو تالا نہیں لگا۔ ہم اُس سے صاف کھل کے مسکراتے رہے اور اُس کی معنی خیز نظریں دور تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ اُسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اس کی ان آخری کی باتوں سے ظاہر تھا کہ بازار میں خانم کے اجنبی مہمان کے متعلق حیرانی ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں صبح کے سوا باہر نہیں نکلا کروں گا۔ صبح بازار میں بہت سکون ہوتا تھا۔ گلیاں تقریباً سنسان پڑی رہتی تھیں مگر قبول نے آنا جانا بند نہیں کیا۔ وہ جہاں گیر کو لے کے کسی وقت بھی گھر سے چل پڑتا تھا۔ نتیجتاً مجھے بھی اُس کے ساتھ جانا پڑتا۔ گھر سے باہر

کے لیے ان گلیوں کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔
دن میں خانم کے ہاں کئی لڑکیاں آتی تھیں۔ جہاں گیر نے مجھے بتایا تھا کہ خانم ان لڑکیوں کو گانے کا ریاض کراتی ہے۔ جب سے ہم آئے تھے خانم نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں اب بھی آتی تھیں مگر وہ دن بھر گھر کے کاموں میں لگی رہتیں یا ایک کمرے میں بند ہو کے خود ہی مشق کیا کرتیں۔ ایک لڑکی کا نام نیساں تھا۔ وہ دن بھر ہماری خاطروں میں لگی رہتی۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ رنگ ٹپی تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانت تھے۔ وہ ہر ملے اس طرح شرماتے اور بدن چراتے ہوئے لہراتی تھی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو یا جیسے کسی نے اُسے گدگدی کر دی ہو یا کسی نے اُس کے کان میں کوئی بے حجاب بات کر دی ہو۔ جوڑے بالوں کی چوٹیاں اُس کے شانوں پہ لہراتی رہتی تھیں۔ اُس کا قد ذرا بڑھا ہوا تھا نہ چھوٹا۔ وہ بہت شائستہ تھی۔ جب وہ گھر آتی تو سب سے پہلے جمیل کو تسلیمات کرتی، پھر خانم کو، پھر مجھے، پھر جہاں گیر کو۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی جاتی۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں ایک کمی کا احساس ہوتا تھا۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ نیساں سے بات کروں۔ کیا وہ بھی بڑی ہو کے اپنے پیروں میں گھنگرو باندھے گی؟ ابھی تو وہ اس قدر شرماتی ہے، چھپاتے مردوں میں کیسے بیٹھے گی۔ اس کے حلق سے تو آواز بھی نہیں نکلے گی لیکن ننھی بھی تو نیساں کی طرح تھی۔
ہمیں یہاں آئے ہوئے دس دن سے اُوپر ہو چکے تھے۔ راستے میں کئی بار مولا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کے اس کی نگاہوں میں چمک آ جاتی تھی لیکن وہ چپ رہا۔ اس لیے میں نے بھی ہاتھ اُٹھانا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ میرے ذہن سے وہ گالی نہیں نکلی تھی جو اُس نے جہاں گیر سے لڑائی کے دوران میں اُس کو دی تھی۔ جمیل بھی کئی مرتبہ اُسے ادھر اُدھر بازار میں بیٹھا ہوا دیکھ چکا تھا اور اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں ان گلیوں سے کان بند کیے اور نظریں جھکائے ہوئے گزرا کروں۔ میں نے یہی کوشش کی تھی اور جمیل نہ کہتا تب بھی جہاں گیر کے ساتھ بازار میں گزرتے ہوئے مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ چلتے وقت اگر موقع ملا اور بعد میں خانم پر کوئی آنچ آنے کا اندیشہ نہ ہوا تو میں مولا سے ضرور ملوں گا۔ ان دنوں مولا کے متعلق جہاں گیر اور خانم نے اتنی باتیں بتا دی تھیں کہ مجھے خود ہی اُسے راستے میں روک لینا چاہیے تھا۔
میں نے بہت ضبط کیا مگر مولا سے ضبط نہیں ہوا۔ جس صبح میں جہاں گیر کے ساتھ سیر سے واپس آ رہا تھا وہ تین دن سے مسلسل مجھے ایک بچو بیٹھا ہوا نظر آتا۔ اس دن سویرے سویرے مولا نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ ہم اُس کے قریب سے گزرے تو اُس نے بیڑی پھینک کر ایک گالی دی اور زمین پہ تھوک دیا۔ گالی ذومعنی تھی۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی۔ میں نے جان بوجھ کے اسے کانوں کا دھوکا سمجھا لیکن پھر اُس نے اونچی آواز میں خانم کے متعلق ایک پھبتا ہوا گندہ فقرہ چست کیا۔ میرے قدم رکنے لگے۔ جہاں گیر کے کان بھی تیز تھے۔ اُس نے بھی فقرہ سن لیا ہو گا۔ میں نے صرفِ نظر کیا لیکن دوسری صبح مولا حسبِ معمول پھر اپنی جگہ بیٹھا تھا مگر جو جہاں گیر نے اُس روز گلی کے دوسری طرف سے گھر واپس آنے کو کہا تھا لیکن میں نے راستہ نہیں بدلا۔ ہم اُسی گلی سے گھر کی طرف آ رہے تھے۔ مولا دروازے پہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے ہمیں دور سے دیکھتے ہی منہ سے سیٹی بجائی اور جب ہم اُس کے سامنے پہنچے تو اُس نے پھر اپنی زبان گندی کی۔ مجھ سے آگے بڑھنا دوبھر ہو گیا۔ مولا چاہتا بھی یہی تھا کہ میرا خون آزمائے۔ تاہم خانم کی رسوائی نے میرے ہاتھ کھینچ لیے۔ ادھر جہاں گیر نے بھی میرا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ہم کوئی چھ سات قدم آگے چلے ہوں گے کہ ایک دم جہاں گیر بلبلانے لگا۔ مولا نے پیچھے سے چھرا مارا تھا۔ چھرا جہاں گیر کی گردن پہ لگا اور خون پھوٹ پڑا۔ میں نے جہاں گیر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے روکنے لگا۔ مولا اکیلا نہیں تھا۔ جب اُس نے سیٹی بجائی تھی تبھی مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کے دو ساتھی اور بھی تھے جو اس سے کچھ دور ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے پلٹتا دیکھ کے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان کے آنے کا انتظار کیا۔ "کیا سمجھا؟ آنکھیں دکھا رہا ہے؟" مولا نے اپنا سر جسم سے آگے کر کے ہنستے ہوئے کہا۔
میرا اُن کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی بھی اُس کے آزو بازو کھڑے ہو گئے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے باری باری اُن کی طرف دیکھا۔ جمیل نے جیل میں مجھے بتایا تھا کہ مقابل کی جگہ تبدیل کرانا ہو تو نگاہوں سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنی جگہ سے ضرور حرکت کرے گا اور جب وہ نسبتاً موافق موقع پہ آ جائے تو اپنی نگاہ ٹھہرا لینی چاہیے۔ میں نے یہی کیا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ دونوں ساتھی مولا کے کچھ اور قریب ہو گئے۔
"کیا چاہتا ہے مولا؟" میں نے اپنی آواز پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔
"یہ معشوق اپنا کا ہے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ اُس کا اشارہ جہاں گیر کی طرف تھا۔ میرا خون رگوں میں اُبلنے لگا۔ مجھے اُس سے کوئی بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے سوچا جیب سے چاقو نکال کے اُس کی زبان کاٹ لوں۔ "اُس دن کے دھوکے میں مت رہنا بچو! وہ تیرا باپ جھڑوا بیچ میں آ گیا۔" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مار بھول گیا کیا؟ ڈر کر چھوڑ دے تو ڈرا بھی خود بھی......"
جہاں گیر نے میرا کرتا پکڑ لیا تھا۔ میں نے چیخ کر اُسے ایک جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ مولا کی آواز حلق میں رہ گئی۔ میں دونوں ہاتھ سیدھے کیے ہوئے اُس کی گردن کی طرف جھپٹا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے دونوں ساتھی آگے بڑھ کے میرے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کریں گے لیکن میرا ارادہ مولا کی گردن پکڑنے کا نہیں تھا۔ میں نے مولا کے قریب پہنچ کے اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے کے لیے جھٹکا دیا۔ دونوں ہاتھ اُس کے ساتھیوں کی گردنوں پہ ایک ساتھ پڑے۔ دونوں زمین پہ گر گئے۔ اُن کی طرف دیکھے بغیر میں نے تیزی سے مولا کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ دائیں بائیں اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی چوک کر بیٹھا تھا اور غضب میں آ کے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ گھٹنا لگتے ہی وہ پیٹ پکڑ کے زمین پہ بیٹھ گیا۔ وہ اکہری ہڈی کا تھا۔ میں اُسے کمر سے پکڑنے کے لیے دوبارہ آگے بڑھا مگر اُس کا ایک ساتھی زمین سے اُٹھ گیا۔ اُس کی گردن پہ ضرب شاید ٹھیک طرح نہیں لگی تھی۔ اُس نے بائیں جانب سے میرے جبڑے پہ گھونسا مارا۔ یہ دیکھ کے مولا کی ہمت بھی بڑھی۔ اُس کے اُٹھنے سے پیشتر ہی جہاں گیر اُس کا گریبان پکڑ کے اُس سے اُلجھ گیا تھا۔ جہاں گیر کو اُس سے علیحدہ کرنے میں چند لمحوں کے لیے میری توجہ ہٹ گئی اور مولا کا ساتھی مجھے دو تین ضربیں لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا تھا اور مجھے گرانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں نے اُس کی خواہش پوری کی اور اُسے ساتھ لے کے زمین پہ آ رہا۔ ایسے موقع پہ سب سے پہلے نیچے پڑے ہوئے آدمی کے گھٹنے اور سر پہ زور دے کے اُسے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے میری ٹھوڑی پہ ہتھیلی سے دباؤ ڈالا اور دوسرا ہاتھ گلے لگانے کے لیے آزاد رکھا۔ اُس نے اپنا جسم زیادہ اوپر نہیں اُٹھایا تھا۔ اُٹھاتا تو میرے دونوں کھلے ہوئے ہاتھ زیادہ آسانی سے کام کرتے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُسے خوب بھینچا اور نزدیک کر لیا اور اُس کی کمر بازوؤں سے جکڑ لی۔ اب اُس کی میری حالت ایک جیسی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نیچے تھا اور وہ اوپر۔ مجھے جلدی تھی۔ جہاں گیر اور مولا میری نظروں سے اوجھل تھے۔ مولا کے ساتھی کے لیے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری ٹھوڑی پہ رکھا ہوا اُس کا ہاتھ ہم دونوں کے سینے کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اُس نے ٹھوڑی چھوڑ دی تھی اور اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے میرے کان پر گھونسے مار رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے اپنے دائیں شانے پہ زور دیا۔ وہ سمجھا کہ میں اس جانب سے پلٹنا چاہتا ہوں چنانچہ اُس نے بھی اپنا سارا زور اسی طرف صرف کر دیا لیکن مجھے بائیں شانے سے پلٹنا تھا۔ ہم دونوں جھونک میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تین چار لڑھکنیاں کھا گئے۔ اُس کا وزن کم تھا۔ جہاں جھونک کمزور پڑی میں نے وہیں اپنے آپ کو ٹھیرا لیا۔ نیچے آنے سے وہ اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا۔ اُس نے اُچھل کود شروع کر دی۔ اُس سے یہی توقع تھی۔ میں نے دوبارہ اُسے اپنے جسم سے نہیں چپٹایا بلکہ اُس کے پنجوں میں پنجہ ڈال کے اُس کے پیٹ پہ جم کے بیٹھ گیا۔ میں کچھ اوپر اُٹھا تو اُس نے یہ جانا کہ میں کھڑا ہو رہا ہوں لیکن جسم ڈھیلا چھوڑ کے میں دوبارہ کہیں اوپر سے گرنے کے انداز میں اُس پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر سہارا نہیں رہا۔ میں نے یہ عمل کئی بار دُہرایا۔ وہ چیخنے چلانے لگا۔ اُس کی انتڑیاں پچک گئی ہوں گی۔ اُس کی آنکھیں اُبلنے لگیں تو میں نے اُسے چھوڑ دیا۔
چند ثانیوں کی تاخیر ہو گئی۔ اُدھر مولا نے جہاں گیر کا دانت توڑ دیا تھا۔ جہاں گیر کی توجہ میری ہی طرف ہو گی ورنہ وہ اتنی جلدی مار کھانے والا نہیں تھا۔ کوشش میں اُسے اپنے بارے میں پہلے بتا دیتا۔ میں نے مولا کو پیچھے سے پکڑنے کے بجائے جہاں گیر کو اُس سے دور ہونے کی ہدایت کی۔ جہاں گیر دور ہو گیا تو میں نے مولا کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ جیسے ہی میری طرف پلٹا، میں جھک گیا اور اُسے لیے ہوئے اوپر اُٹھا۔ پھر میں نے اُسے زمین پہ لوٹنے میں دیر نہیں کی۔ اُس نے کھڑے ہونے کی ہمت کی۔ میری ٹھوکروں نے اُس کا توازن بگاڑ دیا۔ میں نے اُس کے منہ پہ اتنے طمانچے مارے کہ خون کی دھار بہ نکلی۔ میں اُسے وہیں ختم کر دیتا اگر جہاں گیر درمیان میں نہ آ جاتا۔ مولا کے ساتھی بھاگ گئے تھے۔ اور گرد تماشا دیکھتے ہوئے راہ گیروں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا حالانکہ مولا تڑپ رہا تھا مگر اُس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔
جہاں گیر نے راہ گیروں میں سے کوئی آدمی جمیل کو بلانے کے لیے گھر کی طرف دوڑا دیا تھا۔ جمیل نہیں آیا مگر جب ہم گھر والی گلی میں داخل ہوئے تو خانم تمام احتیاط کے ساتھ تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ زمین پہ پڑے رہنے کی وجہ سے میرے تمام کپڑے گرد سے بھر گئے تھے۔ جہاں گیر کے منہ سے خون جاری تھا لیکن اس کے پیر ٹیک رہے تھے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑتا جا رہا تھا۔ خانم نے گلی ہی میں واویلا شروع کر دیا۔ جہاں گیر اُسے گھر میں لے گیا۔ بیٹھک میں جمیل حقہ پی رہا تھا۔ "میں نے کہا تھا خانم! مت جاؤ۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "وہ آتے ہی ہوں گے۔ سب ٹھیک ہے نا؟" اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔ "تمہیں مارنے حرام کے بچے۔"
"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔
"چل کپڑے بدل لے۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
"وہ بھی تھے آپی!" جہاں گیر حیرت بھری آواز میں بولا اور خانم کو ساری داستان سنانے لگا۔ خانم نے آنکھیں بند کر کے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔
"اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھیروں گی۔" وہ وحشت سے بولی۔
"پتا ہے اس گھر کا انتظام ہو یا نہ ہو۔ میں اسے ابھی یاد ہی کو سے دوں گی۔ مجھے پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا۔"
"خانم!" جمیل کی آواز گونجی۔ "جلدی مت کرو۔ اطمینان سے چلیں گے۔"
"کیسا اطمینان؟" وہ خود آئی انداز میں بولی۔ "آپ نے دیکھا نہیں کہ یہ کس طرح واپس آئے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"
"انہیں کیا ہوا ہے؟" جمیل نے غنودہ آواز میں کہا۔
"اور کیا کسر رہ گئی تھی۔ معاف کیجیے آپ تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو جاتا! آپ اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ میں ایک عرصے سے

ہیں رہتی ہوں۔"
"خانم! اتنا نہیں گھبراتے۔" تجمل دھیمے لہجے میں بولا۔
"ہر کیسے گھبراؤں، تو جو وہ بین تھے کل کچھ ہو سکتے ہیں، پرسوں دن۔ بازار میں کوئی اُن کے منہ نہیں لگتا۔ سب کو معلوم ہے کہ اس کو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"
"جیسے تمہاری مرضی خانم! ہم تو کب سے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "تم جیسا چاہو کرو، پر جلدی میں نقصان ہو سکتا ہے۔ میں تم سے اتنا ہی بول سکتا ہوں۔"
"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" خانم نے لجاجت سے کہا۔
"جو میں بولتا ہوں، وہ تم بھی سمجھا کرو۔"
خانم نے تجمل کی طرف سراسیمگی سے نگاہ اُٹھائی، اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے مگر لرز کے رہ گئے۔ وہ تجمل کی بات سے مطمئن نہیں تھی۔ اُن کے درمیان ہونے والی باتیں میرے لیے تو تھیں، انھیں سُن کے مجھے بے کلی ہونے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ تجمل کے اتنے دنوں تک یہاں ٹھہرے رہنے کا کوئی سبب ہوگا۔ اسی لیے میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جب بھی میں اس سلسلے میں سوچتا تھا میرا دماغ بند ہونے لگتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ تجمل کا بھی یہی حال ہوگا۔ میرا کوئی ٹھکانا ہوتا اور جہاں گیر سے ملنے کے بعد گھر تک پہنچنے کی کوئی صورت نکلتی تو میں یقیناً خانم سے درخواست کرتا کہ وہ ہمارے ساتھ رہ لے، جو کہ وہ پہلی ملاقات میں بازار کی زندگی ترک کرنے کا اظہار کر چکی تھی اور اس نے اپنے گھر کے دروازے تماشائیوں کے لیے بند کر دیے تھے۔ خانم کہیں جانے کی بات کر رہی تھی لیکن کہاں؟ اتنے کے بعد کچھ دیر کے لیے مجھے اور تجمل کو تنہائی کا موقع ملا، میں اُس سے پوچھ سکتا تھا مگر اب تک میں نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا تو اب بھی کیا ضرورت تھی۔ تجمل نے جو کچھ طے کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح نیساں بیٹھک میں آئی تو اُس کا چہرہ بیمار دن جیسا لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ہوگئی۔ تجمل نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا اور مضطرب آواز میں پوچھا: "کیا بات ہے نیساں بیٹا! یہ تو نے جلدی اپنے گالوں پر کیوں مل لی ہے؟"
نیساں سسکنے لگی۔ تجمل ذرا تحت سے اُتر کے اُس کے پاس گیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے پوچھنے لگا: "کیا کسی نے تجھے کچھ کہہ دیا ہے؟ تیری ماں سے لڑائی تو نہیں ہوگئی؟"
وہ سر جھکائے اور شدت سے رونے لگی۔ "کیا بات ہے؟ بھلا مجھے نہیں بتائے گی؟ تو تو مجھے بابا کہتی ہے۔" وہ اُسے اپنے بازو میں سمیٹتا ہوا شفقت سے بولے: "بتا، شہزادی!"
نیساں نے بمشکل تمام سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سامنے تجمل سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے فدشہ ہوا کہ وہ یہاں گھر کی کوئی بات ہوگی۔ میں اُٹھنے لگا تو تجمل نے مجھے بیٹھا لیا اور نیساں سے بولا: "لاڈلے کے سامنے ہی بول دے، مت گھبرا۔ میرا اس سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ بتا بچہ! تو تو جب بولنے پر آتی ہے تو مینا کی طرح بولتی ہے۔"
"اَپی نے اری ماں سے جھگڑا لے لیا ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولی۔
"اچھا! پھر کیا ہوا؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔
"ابھی ابھی اری اپی واپس گئی ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اس نے تمام سامان سمیت مکان کا سودا کر لیا ہے۔ میں نے اُن کی باتیں سُن لی ہیں۔ تین چار دن میں وہ باقی پیسے دے دے گی پھر اپی چلی جائیں گی۔ میں نے اپی سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اَپی کے بغیر میرا جی نہیں لگے گا۔ آپ ہی اُن سے کچھ کہیے بابا! آپ کی بات وہ بہت مانتی ہیں۔ میں اُنھیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ جو وہ کہیں گی کروں گی۔ میں نے اُن سے بہت کہا لیکن وہ کہتی ہیں کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔"
تجمل چپ ہو گیا پھر افسردگی سے بولا: "اَپی ٹھیک بولتی ہیں نیساں!"
"آپ بھی یہی کہتے ہیں؟"
"ہاں نیساں! تیری ماں ابھی زندہ ہے وہ کس طرح تجھے خانم کے ساتھ بھیج دے گی؟ یوں بھی تو کب تک اپنی اَپی کے ساتھ رہے گی۔ لڑکیاں پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔"
"مگر مجھے معلوم ہے کہ مجھے کسی گھر میں نہیں جانا۔"
تجمل نے جواب نہیں دیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے نیساں!" تو دُکھی سے بولا۔
"کیوں ممکن نہیں ہے بابا؟"
"نیساں، تُو اب اتنی بچی نہیں ہے۔"
"بابا! میں آپ لوگوں کے ساتھ بالکل ایک لونڈی کی طرح رہوں گی اور کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کروں گی، آپ مجھے ساتھ لے چل کے دیکھیے۔ منع مت کیجیے گا، میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔"
"میں تجھ سے کیا بولوں، میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"
"اَپی بھی یہی کہتی ہیں مگر آپ چاہیں تو مجھے لے جا سکتے ہیں۔"
"کیسے؟ کیسے نیساں؟" تجمل نے شکستہ لہجے میں کہا۔
"آپ مجھے خرید لیجیے بابا! میں عمر بھر آپ لوگوں کی خدمت کروں گی۔"
تجمل گم سم ہو گیا۔ "کیا کہہ رہی ہے رے تو!"
"ہاں بابا! آپ مجھے خرید سکتے ہیں۔"
"نہیں نہیں۔" تجمل تیزی سے سر ہلانے لگا۔ "ایسے خواب مت دیکھ۔ جو تو سوچ رہی ہے وہ دوسرے بھی اسی طرح سوچیں، تجھ کیا یقین ہے؟"
"تو آپ کیوں نہیں سوچتے؟ آپ تو میری اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔"
"تو بہت اچھی ہے نیساں!" تجمل الجھ کے بولا۔ "پر میں کیا سوچوں۔ میں خانم سے بات کروں گا، میں تجھ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ اب مجھ سے کچھ مت پوچھنا، تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"
وہ ہچکیاں لینے لگی اور اُس کے آنسو بہتے رہے۔ تجمل نے ہامی نہیں بھری۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "نیساں مت رو۔" میں نہ جانے کیوں بیچ میں بول پڑا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ تجمل نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ دروازے پر کسی کی آہٹ ہوئی تو نیساں گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور چہرہ ہاتھوں سے منہ چھپائے بیٹھک سے چلی گئی۔ مہمان گیا اور آیا تھا، اُسے تجمل کے پاس چھوڑ کے میں اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر گر پڑا۔ میرا جسم اچانک ٹوٹنے لگا تھا اور سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ بہت دیر ہوگئی تو خانم مجھے پوچھنے کے لیے کمرے میں آئی۔ مجھے اُس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اُس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا تو میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ میرا حال پوچھنے لگی اور کبھی کبھی کہ لا ے جھگڑے کے دوران میں مجھے کوئی اندرونی چوٹ آگئی ہے۔ میں نے اُس سے نیساں کے متعلق بات کرنا چاہا مگر لفظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ مجھے اُس سے کیا کہنا چاہیے اور آخر کس بنیاد پر میں اُس سے نیساں کا ذکر چھیڑوں۔ تجمل نے نیساں کو منع کر دیا تھا۔ خانم پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ میرے درمیان میں دخل دینے کا کیا محل تھا۔ ٹھیک ہے، نیساں کی قسمت میں جو لکھا ہے، اُسے کون روک سکتا ہے۔ قسمت میں جو لکھا تھا وہ پورا ہوا۔ میں نے قسمت کی بات کبھی نہیں مانی تھی لیکن اب اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خانم میری طبیعت کی طرف سے مطمئن ہو کے چلی گئی۔ میں دیر تک کمرے میں لیٹا رہا۔ میرا جسم گھٹ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میرے جسم پر بہت سی مکڑیوں نے جالے بُن لیے ہوں۔ جہاں گیر کے ملنے کے بعد مجھے اور ناراحتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے وقت میرا دل بیٹھنے لگتا تھا اور سر میں دھواں سا بھر جاتا تھا۔ نیساں نے کمرے میں آ کے دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی۔ میں نہ جانا تو خواہ مخواہ کا تماشا بنتا۔ کھانے کی چوکی پر نیساں بھی ہمارے ساتھ بیٹھی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ کوئی دلہن معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی چنری سر سے آگے کر لی تھی کہ کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے مگر وہ اپنے ہاتھ نہیں چھپا سکی۔ اُس کی لانبی لانبی انگلیاں بے قرار تھیں۔ سہ پہر کو تجمل قیلولہ کے لیے لیٹ گیا اور جہاں گیر دوسرے کمرے میں ماسٹر سے پڑھنے چلا گیا۔ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوا اپنے ناخن کریدتا رہا۔
پھر مجھ سے بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے ایک ارادہ کر لیا تھا۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی وہ میرے ذہن پر اور اُبھرتا جاتا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنا سامان ٹٹولا، کپڑے پہنے اور کسی کو بتائے بغیر باہر آ گیا۔ مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ جب میں زینہ طے کر کے دوسری منزل پر پہنچا تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں حرکت آرا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے دروازے سے ملحق ایک کمرے میں لے گئی۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ گلابی تھا۔ چند منٹ بعد ہی صاف ستھرے لباس میں گندمی رنگ کی ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ اُس نے مجھے تسلیمات کی اور ساڑھی کا پلو شانے پر درست کر کے بولی: "فرمائیے کنیز کو کیسے یاد فرمایا ہے؟"
میں نے کہا: "میں نیساں کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"خدا کرے آپ نیساں کی شکایت لے کے نہ آئے ہوں۔"
"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ جھجھکتی ہوئی بولی اور تعجب آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "فرمائیے! پھر بھلا نیساں کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"
"آپ نیساں خانم کو دے دیجیے۔" میں نے جھجک کے کہا۔
"وہ خانم ہی کی ہے۔" اُس نے بے ساختہ جواب دیا۔
"آپ کو معلوم ہے کہ خانم جلد ہی یہاں سے جانے والی ہیں۔ نیساں کی خواہش ہے کہ وہ خانم کے ساتھ ہی چلی جائے۔"
اُس نے ایک گہری سانس لی اور پہلو بدلنے لگی۔ "میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی؟" اُس کی آواز بھی بوجھل تھی۔
"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نیساں کو خانم کے حوالے کر دیں اور اُس کی جو قیمت آپ کے ذہن میں ہو مجھے بتا دیں، میں ادا کر دوں گا۔"
اُس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ "اچھا! یہ بات ہے، کیا خود خانم نے آپ کو بھیجا ہے؟" وہ مجھے کن آنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"نہیں، خانم کو نہیں معلوم کہ میں یہاں آیا ہوں اور شاید خانم آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا مناسب سمجھیں۔ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔"
وہ کچھ سوچنے لگی اور بوجھل آواز میں بولی: "میں نے نیساں کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا، میں معذرت کرتی ہوں۔"
"لیکن نیساں کے لیے آپ نے ایک بات تو ضرور سوچ رکھی ہے کہ آپ دو ایک سال بعد اُسے محفل میں بٹھائیں گی۔"
"ہاں، نیساں خانم سے اسی کی تربیت لے رہی ہے۔ اُس کی اُٹھان اچھی ہے اور اللہ نے اُسے آواز کے حسن سے بھی خوب نوازا ہے۔ خانم نے اُس پر بہت محنت کی ہے مگر میں اُسے خانم کو کیسے دے سکتی ہوں۔ خانم تو ایسی دس لڑکیاں حاصل کر سکتی ہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہو گا کہ خانم نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے اور اب وہ مکمل طور پر یہ زندگی ترک کر رہی ہیں۔ نیساں کو یہاں سے لے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسے آپ سے چھین کے خود فائدہ اُٹھایا جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نیساں کے ساتھ ایسا نہیں ہو گا، نیساں خود بھی یہ نہیں چاہتی۔ نیساں سے آپ کی جو توقعات وابستہ ہیں، وہ میں پیشگی پوری کیے دیتا ہوں کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ نیساں کسی گھر میں بسے؟"

"کہاں! کہاں میاں!" وہ اُداسی سے بولی۔ "اب یہ باتیں پُرانی ہو گئی ہیں لیکن پھر اب بھی اچھی لگتی ہیں۔"

"آپ جس طرح چاہیں یقین کر لیں سب سے بڑا یقین وہ قیمت ہے جو میں آپ کو ادا کر سکتا ہوں کچھ اور مت سمجھیے۔ مجھ پر اعتبار کیجیے۔"

"میاں! آپ کی عمر ابھی کم ہے۔ آپ نے زمانہ نہیں دیکھا۔ آپ پہلے کچھ اور سوچ لیجیے پھر میرے پاس آئیے گا اور ویسے بھی میں نیساں کو اس طرح کیسے کسی کو دے سکتی ہوں۔ میری تمام آرزوئیں اُس سے بندھی ہوئی ہیں۔ ابھی مجھے اپنے لگائے ہوئے پودے کی بہار تو دیکھ لینے دیجیے۔ مجھے اس بات پر مجبور مت کیجیے جو میرے اختیار میں نہ ہو اور جس کا تصور بھی میرے خواب و خیال میں نہ ہو۔ نیساں کو ابھی اپنی تربیت پوری کر لینے دیجیے پھر دیکھیے گا۔ نیساں چار صاحبانِ ذوق کے درمیان بیٹھے گی تو مجھے بھی اُس کی قیمت کا اندازہ ہو گا۔ ابھی نہ میں آپ سے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ آپ اُس کی قدر و قیمت صحیح طور پر کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات نہیں رہنے دیجیے۔ ویسے خانم کے لیے میری جان حاضر ہے آپ اُس کے مہمان ہیں تو میرے بھی سر آنکھوں پر۔"

"میں فیصلہ کر کے آیا ہوں اور مایوس واپس جانے نہیں آیا۔ لیکن ہے آپ کے ذہن میں کوئی اور بات ہو وہ نکال دیجیے۔ بہتر ہے آپ نیساں کو نیلام پر نہ چڑھائیں۔ نیلام کی آخری بولی آپ اپنے تصور میں طے کر لیجیے میں مول تول نہیں کروں گا اور دوبارہ آپ سے التجا کروں گا کہ نیساں اگر یہ زندگی پسند نہیں کرتی تو آپ بھی اُس پر رحم کیجیے۔"

"میاں! میرے لیے یہ بات بڑی اچانک ہے مجھے سوچنے کے لیے وقت دیجیے میں اس طرح کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بھلا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کوئی اس طرح کیسے جدا کر سکتا ہے۔"

"اور جگر کے ٹکڑوں کو اس طرح دکان پر بھی نہیں سجایا جاتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ہم یہاں بیٹھ کے اور کیا سوچ سکتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتی آپ کون ہیں کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں کیا کرتے ہیں آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر اتنی ڈھیر ساری باتیں کر دیں۔"

"خانم! آپ ٹالنے والی باتیں نہ کریں۔ آپ یہاں تجربے نہیں دیکھتیں سیب دیکھتی ہیں۔ پھر یہ تمام باتیں پوچھنا بے کار ہے۔ نیساں بازار میں بیٹھے گی بازار میں بکنے والی ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے وہ مجھے بتا دیجیے اور ادھر اُدھر کی بات مت کیجیے آپ کا ارادہ نیساں کو بازار میں لانے کا نہیں ہوتا تو میں آپ کے پاس نہ آتا۔"

"آپ بہت بہت عجیب نوجوان ہیں۔" وہ ترشی سے بولی۔ "فرض کیجیے میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نیساں کے بارے میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

"میں جانتا ہوں آپ کا انکار محض حجت ہے۔ جو قیمت آپ کو رفتہ رفتہ ملے وہ ایک ساتھ مل جائے تو یہ سودا بُرا نہیں ہے۔ فرض کیجیے نیساں ہی انکار کر دے۔"

"اُس کی یہ جرأت نہیں۔" وہ خفا ہو کے بولی۔

"لیکن کسی دوسرے میں یہ جرأت ہو سکتی ہے۔"

"آپ دھمکی دے رہے ہیں؟" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"دھمکی کیسی! میں آپ کو منہ مانگی رقم ادا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"آپ نے بھلا اس کے لیے کیا سوچا ہے۔" وہ بے رخی سے بولی۔

"یہ بتانا آپ کا کام ہے۔"

"میں نے آپ سے کہہ دیا۔ میں نے کچھ نہیں سوچا۔"

"تو سوچ لیجیے میں یہیں بیٹھا ہوں۔"

"نہیں آپ پھر کسی وقت آئیے۔"

"آپ بتا دیجیے کسی جھجک کے بغیر بتا دیجیے۔"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ سر جھٹک کے بولی۔

"کچھ بھی جو آپ مناسب سمجھیں میں آپ سے کسی رعایت کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ خانم کا خیال بھی مت کیجیے۔"

"مجھے تنگ نہ کیجیے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"تو مجھے بتائیے؟"

"یہ کیسی زبردستی ہے۔"

"کوئی زبردستی نہیں آپ کچھ کہہ کے تو دیکھیے۔"

"آپ...... آپ پچاس ہزار دے سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو ساٹھ ہزار دوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "سودا پکا۔ نیساں اب میری ہے۔ میرے پاس نقد رقم نہیں ہے لیکن میں چیک دے رہا ہوں آپ کل صبح کسی بھی بینک میں یہ چیک داخل کر دیجیے اور بینک والے سے کہہ دیجیے کہ وہ جلد از جلد یہ چیک بمبئی بھیج دے۔ بمبئی سے تار سے جواب آ سکتا ہے کہ میرا چیک ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہم بھی چار پانچ روز تک یہیں ہیں اُس وقت تک آپ کو رقم مل جائے گی۔ نیساں اب یہاں واپس نہیں آئے گی اور جب تک آپ کو رقم نہیں مل جائے ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ نیساں سے خانم کے ہاں آ کے مل سکتی ہیں۔" میں نے چیک بک جیب سے نکالی اور چیک بھر کے اُس کے

ہاتھ میں تھما دیا۔ شوکت آرا کے ہاتھوں پر کپکپی طاری تھی۔ اُس کی آنکھیں بجلی کے ساکت ہو گئی تھیں۔ میں چلنے لگا تو وہ حواس باختہ انداز میں اُٹھی اور لڑکھڑاتی زبان میں مجھے روکنے لگی۔ میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔

❁ میں واپس پہنچا تو بیٹھک میں سبھی میرا انتظار کر رہے تھے حالانکہ مجھے آنے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا جیسے ہی مرتضیٰ علا میں نے نیساں سے کہہ دیا کہ وہ آج سے اپنے گھر نہیں جائے۔ اُس کی پتلیاں جگمگانے لگیں مجھے شک تھا کہ شوکت آرا خانم سے ملنے نہ آ جائے مگر وہ نہیں آئی۔ اندھیرا ہونے تک نیساں موجود رہی تو خانم نے آگے ٹوکا۔ نیساں کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ خانم نے اُسے بُرا بھلا کہا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ "چلی جائے گی آپی!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ابھی یہ تین چار روز یہیں رہے تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں لیکن شوکتی نہ جانے کیا سوچے گی۔"

"نیساں نہیں پہنچے گی تو وہاں سے خود کوئی لینے آ جائے گا۔"

"بھئی تم کہاں گئے تھے؟" مجھل نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہیں قریب ہی گیا تھا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

ابھی مجھل کچھ اور کہنے والا تھا کہ نجابت ہانپتا ہوا اندر آیا اور خانم کے پاس جا کے کہنے لگا۔ "شاہ کبیر آیا ہے۔"

"کبیر!" خانم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "وہ کیوں آیا ہے؟" وہ ہماری طرف سراسیمگی سے دیکھنے لگی۔

"پتہ نہیں۔ پوچھتا ہے خانم سے ملنا ہے۔"

"اکیلا ہے؟"

"نہیں وہ تینوں بھی ساتھ ہیں۔"

"کہنا اِس وقت خانم باہر گئی ہوئی ہیں۔ تم نے کہہ تو نہیں دیا کہ میں اندر گھر میں موجود ہوں۔"

"نہیں میں نے کہا میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

"تم اُن سے جا کے یہی کہہ دو کہ میں کہیں گئی ہوئی ہوں۔"

"مل آؤ خانم! پوچھ لو کہ وہ کیا بولنا چاہتا ہے۔" مجھل نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں جاؤ گی تو وہ دوبارہ آئے گا۔"

"میں پہلے ہی ڈر رہی تھی۔" وہ میری طرف دیکھ کے بولی۔ "موئے نہ جانے کیا کیا کان بھرے ہوں گے۔ میں اس کے دوبارہ آنے سے پہلے پھر رقم بھجوا دوں گی۔ پھر شاید وہ نہیں آئے۔"

"رقم دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے اُس سے جا کے بات کرو۔ بولو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" مجھل نے نرمی سے اُسے سمجھایا۔

"میں آپ سے بار بار کیا کہہ رہی ہوں۔ یہ لوگ بہت شرّی ہیں۔ ان میں فتنہ بھرا ہوا ہے۔ بات بات پہ چاقو نکال لیتے ہیں اور زبان پہ تو انھیں تالو ہی نہیں۔ اب نواب بہادر سے کہہ کے سبھی کی ... نہیں پڑے گا۔ میں نے دو مرتبہ ان کا ہرکارہ واپس کر دیا ہے۔ اب ... کے سامنے جانا مناسب نہیں اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے اس وقت کسی طور سے یہ بلا ٹل جائے تو بہت ہے۔"

"خانم! جتنا ڈرو گی اتنی ہی بات خراب ہو گی مجھے ساتھ نہیں لے جاتیں مت لے جاؤ تم خود جا کے بات کرو۔"

"اُف خدا!" خانم اپنا ماتھا پکڑتے بیٹھی رہی۔ پھر ... بولی۔ "اگر اُس نے بار بار میاں کو پوچھا اور جو میاں کو لایا تو آپ ... ہیں کہ دونوں کی دونوں گھر پہ نہیں ہیں جب تک میں نہ آ جاؤں آپ سب یہیں رہیے۔"

"نہیں وہ بلائے تو انھیں بلا لینا" جو بات ہو وہ ایک ہی بار ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ انھیں کھا نہیں جائے گا۔"

"وہ بہت بُرا ہے۔"

"تو یہ بھی آدمی کے بچے ہیں۔"

"چند روز تک اب چند روز ہی کی تو بات ہے۔"

"نہیں خانم!" مجھل نے بیل بار سختی سے کہا۔

"اچھا آپ یہیں بیٹھے رہیے جیسا کچھ ہو گا میں کسی ... میں آ کے آپ کو بتاؤں گی۔" خانم سٹ پٹا کے اُٹھی اور وہ شجاعت کے ساتھ بیٹھک سے باہر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی مجھل نے نیساں سے کہا وہ دیکھ کے آئے کہ خانم نے شاہ کبیر کو کس جگہ بٹھایا ہے۔

"برابر والی چھوٹی بیٹھک میں ہی وہ اُسے بٹھا سکتی ہیں۔" نیساں کی آواز میں لرزش تھی۔ مجھل کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اِس سے قبل کہ مجھل سے پوچھا کہ کیا میں خانم کے پاس چلا جاؤں، اُس نے انکار کر دیا۔

"بیٹھے رہو لاڈلے۔" وہ سختی سے بولا۔

نیساں بیٹھک سے چلی گئی تھی کچھ ہی دیر بعد وہ حواس باختہ بھاگی ہوئی آئی۔ "وہ کہتے ہیں کہ باہر بھائی کو جا کے سامنے لاؤ۔ آپا شمس کو ... ہیں۔ شاہ کبیر بہت غصّے میں معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کے اُن کی کچھ باتیں سُنی ہیں۔ وہ اونچی آواز میں بول رہا ہے اور خانم کی کوئی بات نہیں سُن رہا ہے۔"

مجھل کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا جان گیر ... ہم چلنے لگے۔ مجھل نے اُسے منع کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ ہم تینوں ایک ساتھ چھوٹی بیٹھک میں داخل ہوئے۔ خانم تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہونٹ ... موجود تھے۔ اُن کے درمیان جو شخص سب سے نمایاں تھا وہ شاہ کبیر ہو گا۔ اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اوپر اُٹھی ہوئی اور آنکھیں ... لمبے بال پیچھے کی طرف لوٹے ہوئے تھے اور کن گدّی ... پر جھول رہی تھیں۔ گلے میں سونے کی زنجیر کلائی میں ...

چاقو کا نشان تو زیادہ بڑا نہیں تھا مگر جسم بھٹکا ہوا تھا۔ اس نے ململ کا ڈھیلا کرتا اور لٹھے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ رنگ سُرخی مائل سیاہ، لمبی ناک اور بڑا منہ۔ ہم پہ نظر پڑتے ہی خانم لڑکھڑا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ اور اس کے ساتھیوں نے گردن موڑ کے ہمیں دیکھا اور ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔

"کیا بات ہے خانم؟" جُگل نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، یہ شاہ کبیرا ہیں۔" وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس علاقے کے خاص آدمی۔ ملنے کے لیے آئے ہیں اور یہ.... یہ میرے مہمان ہیں۔"

"ان میں وہ لڑکا تو نہیں جس نے مُولا اور اس کے ساتھیوں پہ ہاتھ اٹھایا تھا؟" شاہ کبیرا کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تم اس سے ملنا چاہتے تھے شاہ؟" جُگل نے پوچھا۔

"ہاں اس لونڈے کی صورت دیکھنا ہے۔"

"دیکھ لو شاہ، خوب اچھی طرح دیکھ لو، یہی ہے وہ۔"

"آپ لوگ اندر بیٹھیے، میں ابھی آتی ہوں۔" خانم نے التجا کی۔

"خانم بات کرو، شاہ کبیرا کیا چاہتا ہے۔" جُگل نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاہ کبیرے! خانم نہیں بتائے گی تم بولو۔"

"نُزری خانم!" شاہ کبیرا نے منہ بنا کے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ میرے مہمان ہیں، یہ آپ لوگوں کو نہیں جانتے۔" وہ گھگیا کے بولی۔ "اسی لیے....."

"خانم! ہم اپنے آپ کو جنوانے آئے ہیں۔"

"آپ اندر چلیے، میں مہمان سے بات کرتی ہوں۔"

"ایسی کیا بات کر رہی ہو؟"

"خدا کے لیے آپ چلے جائیں۔" خانم عاجزی سے بولی۔

"تم ہی بولو شاہ کبیرے، عورت سے کیا بات کرتے ہو۔"

"بول دے بھئی۔" شاہ کبیرا نے بے پروائی سے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ "انھیں بھی بول دے۔ خانم کے مہمانوں کا کچھ تو خیال رکھنا پڑے گا۔ قصہ ختم کر۔"

شاہ کبیرا نے جس آدمی کو اشارہ کیا تھا وہ بھن بھنانے لگا۔ "شاہ کبیرے کے کسی آدمی پہ پہلی بار بازار میں ہاتھ اٹھایا گیا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کے غصے سے بولا۔ "اسے بازار میں سب کے سامنے شاہ، مُولا اور اس کے ساتھیوں سے معافی مانگنی پڑے گی۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

"ورنہ اسے اٹھا لیا جائے گا۔"

"اور کوئی بات؟"

"اور خانم مکان کے سودے کا پندرہواں حصہ شاہ کبیرے کو دے گی۔ یہاں بکنے والے تمام مکانوں کا یہی ہوتا ہے اور جانے سے پہلے خانم شاہ کبیرے کے ہاں مجرا کرے گی۔"

"اور کچھ؟"

"بس یہی۔"

"نہیں کوئی اور بات ہو تو بولو۔"

"بس یہی۔"

"اور اگر خانم ان سب سے انکار کر دے۔"

شاہ کبیرا ہنسنے لگا۔

"نہیں نہیں بولو، پھر کیا ہوگا؟"

"پھر بُرا ہوگا۔"

"کیا بُرا ہوگا؟"

"پھر خانم کا یہاں سے نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس چھوکرے کا مُکھڑا بھی داغ دار ہو جائے گا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ کس برتے پہ یہ بات کر رہے ہو؟"

شاہ کبیرا دوبارہ ہنسنے لگا۔ اس کا ساتھی جلدی سے بولا۔ "شاہ کبیرا یہاں کا بادشاہ ہے۔ بادشاہ کس برتے پہ بات کرتا ہے۔" اس نے چاقو نکال کے اچھالا اور اس کی دھار پہ انگلی پھیرنے لگا۔

"میں خانم کی طرف سے تمھاری تمام باتوں سے انکار کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" خانم ہذیانی انداز میں بولی۔

"تم کون ہوتے ہو خانم کے معاملے میں بولنے والے؟"

"ہم اس علاقے کے لوگ ہیں۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔" شاہ کبیرے نے اپنے ساتھی کو جھڑک دیا۔ "میں نے بول دیا ہے کہ تم کو خانم کے مہمانوں کا خیال کرنا چاہیے۔"

"جاؤ شاہ کبیرے! جو ہو سکے کرو۔ خانم کی طرف سے میں نے جواب دے دیا ہے۔"

خانم نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔

"کیوں خانم کیا یہی تمھارا جواب ہے؟"

"نہیں۔" خانم چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے تمھاری سب باتیں منظور ہیں۔ میں پندرہواں حصہ بھی تمھیں دے دوں گی اور یہاں سے جانے سے پہلے تمھارے ہاں ایک دن مجرا کرنے آؤں گی لیکن..... میں تم [illegible] کو مت بلاؤ۔"

"نہیں خانم! ہم ان سے ایک یہ رعایت بھی کیوں لے رہی ہو۔" جُگل نے تنک کے کہا۔ "شاہ کبیرے! ہم کو تمھاری تیسری بات بھی منظور ہے۔ اب تم کیا بولیں؟ ہم بھی خانم کے مہمان ہیں، کچھ اس کا حق بھی ہم پہ ہے۔ بولو تم کہاں لے جانا چاہتے ہو، کس کو لے جانا چاہتے ہو؟"

شاہ کبیرے کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ تیکھی نظروں سے جُگل کو گھورنے لگا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے اس کا ساتھی نفرت سے بولا۔ "ہیرا کے ہوٹل پر چلیں۔"

"چلو، چل بھئی لاڈلے! شاہ کبیرا کی بات مان لے۔ مان لے حلقی! تم گرم چلتا ہے، ہم کو کون سا ادھر رہنا ہے۔ خانم! تم بے فکر رہو۔ ہم لوگ شاہ کے ساتھ جاتے ہیں اور ابھی واپس آ جاتے ہیں۔ شاہ کا آج نخرہ رہنے دو، چلو شاہ!"

"نہیں شاہ۔" خانم رو پڑی۔

شاہ کبیرا کچھ متذبذب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ "مجھے! مولا کو ہیرا کے ہوٹل پہ لے کے آ۔ ان دونوں اٹھائی گیروں کو بھی ساتھ پہنچا لا۔"

خانم نے شاہ کبیرے کا دامن پکڑ لیا۔ "خانم! ایک بات مانگو۔" جُگل نے چیخ کر کہا۔ "ہم مرنے نہیں جا رہے ہیں۔ شاہ کبیرا زبان کا اتنا ڈھیلا نہیں ہوگا۔ لاؤ لاؤ، ہاتھ اٹھا کے اور دو لفظ منہ سے بول کے صحیح سلامت واپس آ جائے گا۔ شاہ کبیرا کی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں اس کی ناک کا سوال ہے۔ شاہ بھی کی ناک سارا [illegible] ہوتی ہے، کیوں شاہ! یہی تمھاری خواہش ہے؟"

شاہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

جُگل دروازے پہ آ گیا تھا۔ شاہ کے تینوں ساتھی بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے جہاں گیر کو تسلی کے ساتھ وہیں ٹھیرنے کی تاکید کی۔ ہم سب گھر سے باہر آ گئے۔ ہوٹل سے کچھ آگے ایک تنگ چور راستہ تھا۔ کبیرے کا ایک آدمی پچھلی گلی سے مڑ گیا تھا۔ آگے آگے شاہ، اس کے پیچھے اس کے ساتھی اور ان کے پیچھے ہم چل رہے تھے۔ جہاں جہاں سے شاہ گزر رہا تھا لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا اور نظریں چرانے لگے۔ بہت سوں نے اسے سلام کیا۔ جواب میں شاہ نخوت کے انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔ بالاخانوں پہ کھڑی ہوئی عورتیں اندر چھپ گئیں۔ جو باہر رہیں وہ ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگیں۔ کسی نے شاہ کو آواز دینے کا ارادہ کیا۔ کسی نے نشانہ لگا کے ایک پھول اس کے چہرے پہ مارا۔ گلی کے تقریباً تمام لوگ ہم سے واقف ہو گئے تھے۔ صبح مُولا سے جھگڑے کی خبر بھی شاید سارے ہی بازار میں پھیل گئی ہوگی۔ لوگ پہلے شاہ کو دیکھتے تھے پھر ہمیں۔

ہیرا کے ہوٹل پہ آ کے شاہ کبیرا رک گیا۔ ہوٹل کے [illegible] مالک نے فوراً ایک کرسی گلی میں ڈال دی۔ اس کے باقی دو ساتھی تپائی پہ بیٹھ گئے۔ ہم نہیں بیٹھے اور نہ شاہ کبیرا نے ہمیں اس کا حکم دیا۔ ہم ہوٹل کے آگے ٹاٹ کے سائبان کے نیچے کھڑے رہے۔ ہوٹل کا ایک بیرا شاہ کے پیر دابنے لگا۔ گلی کے دونوں اطراف بالاخانے تھے اور یہ حصہ سب سے زیادہ آباد تھا۔ نچلی منزلوں کے دروازوں، کھڑکیوں اور کوٹھوں پہ لوگ تماشا کرنے لگے تھے۔ ہوٹل میں موجود گاہک بھی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کے چبوترے پہ کھڑے ہو گئے تھے۔ ہوٹل کے مالک نے آنکھوں آنکھوں میں شاہ کے ساتھی سے پوچھنے کی کوشش کی کہ شاہ کی برہمی کا کیا سبب ہے۔ اس پر وہ [illegible] ہو کے کہنے لگا۔ "شاہ کبیرے کا ہر آدمی شاہ کبیرے کی جگہ ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی شکایت ہو تو اپنے باپ شاہ کبیرے سے بولو۔ اس سے پہلے اپنے آپ فیصلہ کرنا شاہ کبیرے کی بے عزتی ہے۔ یہ چھوکرا حرام زادہ شاہ کے آدمی مولا کے آگے آیا ہے۔"

"ٹھیک بولتے ہو کالے، واہ واہ! ادھر سالا گلی کا سارا لوگ اس بات [کا] خیال رکھتا ہے۔ ابھی اپن نے تو خود کو شاہ کو بولا ہے۔ شاہ نے [illegible] دم برہم اپن کی بات سنتا۔" ہوٹل کا مالک خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "[illegible] ابھی شاہ چھوڑ دو، اس کو معاف کر دو۔"

"جان بچ گیا لاڈو بیٹھ ورنہ سالے کا تو [illegible] بھی دکھائی نہیں دیتا۔" [illegible] شخص جس کا نام ہوٹل والے نے کالا بتایا تھا، تھوک کے بولا۔

ہم نے کچھ نہیں کہا۔ شاہ کے آدمی گندی گندی گالیاں بکتے جا رہے تھے۔ وہ چاروں طرف دیکھتے تھے جیسے سب سے مخاطب [illegible] ان کا نشانہ ہیرا لگا تھا۔ پہلے تو لوگ ہمیں دور دور سے دیکھ رہے تھے [illegible] کی جانب سے ان کے گھیرے پہ کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا [illegible] رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ بازار کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ بازار [illegible] والے تماشائی بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ گلی میں شاہ کے [illegible] کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہوٹل کا گراموفون بند کیا جا چکا تھا۔ [illegible] پولیس والے بھی آ گئے۔ شاہ نے صرف اپنی ہتھیلیوں کو جنبش دی تھی [illegible] گئے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور کسی کسی جگہ روشنیاں جل گئی تھیں۔ [illegible] واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ مُولا اور کئی آدمی تھے۔ ان میں وہ لڑکے موجود تھے جو صبح مُولا کے ساتھ نظر آئے تھے۔ مُولا نے اپنے [illegible] گلا نہیں ہوا تھا۔ باقی گردن سے لگے ہوئے کپڑے میں اس کا [illegible] جھول رہا تھا۔ دوسرے ساتھی کا بھی یہی حال تھا۔ انھیں شاہ کے [illegible] کر دیا گیا۔ شاہ کی پشت پر بھی بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک [illegible] نے مُولا کی کرسی کے پیچھے لا کے آگے [illegible] ہونے ہی [illegible] گرتے گرتے بچا۔

"یہی تھا وہ؟" کبیرے کے ایک دوسرے آدمی نے میری طرف انگلی اٹھا کے پوچھا۔ "اسے پہچان لے۔" مُولا نے مردنی سے [illegible] کبیرے کا آدمی مڑ کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چھوکرے! آگے بڑھ [illegible] بازار کا مجمع ہو گیا ہے۔"

"شاہ کبیرے! اپنا لاؤلشکر ہٹا لو۔" جُگل نے اونچی آواز [illegible]

"بولتا ہے اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ شاہ سے لڑتے لڑتے [illegible] دے دوں۔"

شاہ کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اس نے جُگل کے کرسی [illegible] جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس کے سا[illegible]

اُس کے ساتھ چند قدم آگے بڑھے۔ "ٹھیرو شاہ!" تجمل نے چیخ کر کہا۔ "یہ ہوتا ہے شاہ جھوٹا شاہ ہے۔ اس میں دم خم نہیں ہے۔ خالی پیلی ٹنگ ہوتا ہے۔ نہ اُس سے چاقو چلانا آتا ہے اور نہ علاقہ سنبھالنا۔ اُس نے علاقے کے سارے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہوتا ہے کہ شاہ کو اس جگہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" ابھی تجمل نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ میں نے چاقو نکال لیا۔ "اس کا کہا مان لو شاہ! یہ تمھیں بھرے بازار میں دھمکی دے رہا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ پیر کاٹ لو۔ اور یہ کوئی غلط بات نہیں کر رہا۔ تم نے بھی کبھی اسی طرح یہاں کھیل تماشا کیا ہوگا۔ یہ ہوتا ہے کہ شاہ کو مجھ سے معافی منگوانی ہے تو چاقو کے زور پہ منگوالے۔ بات ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ ابھی تم اس کو سمجھو میرے قابو میں نہیں ہے، لیکن ایک بات سن لو۔ تمھارے جواب دینے سے پہلے تمھارے کسی آدمی نے کوئی بھول کی تو یہاں خون ہی خون ہوگا۔ تم میں سے ایک بھی واپس نہیں جا سکے گا۔" تجمل کا لہجہ اکھڑ گیا تھا۔ "شاہ بولو! کیا بولتے ہو؟"

شاہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس کے دو تین آدمی چاقو کھولے ہوئے مجھ پہ جھپٹنا چاہتے تھے وہ تجمل کی آواز سن کے ٹھیر گئے۔ "کیوں شاہ؟ اپنے تمام آدمیوں کو حکم دو کہ وہ اس کی بوٹی بوٹی کر دیں تاکہ سب کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ شاہ کبیر کس برتے پہ بادشاہت کرتا ہے۔ بے عزتی ہی ہونا ہے تو شاہ پھر اس مانتی کیوں نہ ہو بازار کے لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ شاہ نے ایک چھوکرے کو کس طرح ملایا۔"

"چپ ہو! اس پہ چاقو اُٹھانا بے عزتی ہے۔" شاہ کبیر گرج کے بولا۔

"تو مجھ پہ اُٹھاؤ، پر اس کی حسرت دل میں باقی رہے گی۔ بہتر ہے شاہ پہلے اسے ختم کر دو، پھر مجھ کو دیکھنا۔"

"چھوکرے سے بولو، مان جائے۔"

میں نے جیسے ہی شاہ کی طرف چاقو لہرایا، جہاں گیر جھپٹ کر کاٹتا ہوا آکے میرے بازو سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے دھکیل دیا۔ "میں ان کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

تجمل نے جہاں گیر کو کھینچ لیا اور اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ "کیوں شاہ قبول ہے؟ جلدی بولو یا پھر اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ بازار کے لوگ اسے بھی تمھاری بڑائی سمجھیں گے۔"

"میں اس کی حسرت ضرور پوری کروں گا۔" شاہ غرانے لگا۔

"لیکن پہلے اپنے آدمیوں سے وصیت کر جاؤ۔"

"تو اس چھوکرے سے پوچھ لے کہ اس کی کوئی آخری خواہش ہے؟"

شاہ کبیر نے بھیڑ کے کہا: "اسے پانی پلا دو۔"

"یہ لال پانی پینے کا عادی ہے۔"

"نہیں شاہ!" مجمع میں سے ایک لرزتی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ وہ خانم تھی۔ خانم مجمع کے بیچ چلی آئی تھی۔ وہ شاہ کے پیروں پہ گر گئی۔ شاہ نے اسے ٹھوکر مار دی اور ایک جھرجھری لی جیسے جانور جسم کی دھول جھاڑ رہا ہو۔ پھر میری طرف سینگ مارنے کے انداز میں آیا۔ وہ مجھ سے اتنا قریب ہو گیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ چند انچ رہ گیا ہوگا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے میرا سینہ ٹھوکا۔ میں نے بھی یہی عمل کیا۔ شاہ کبیر ایک جھٹکے میں مجھ سے دور ہو گیا۔ اُس نے ایک طرف ہاتھ پھیلایا، کسی نے چاقو اُچھالا جو شاہ نے اس طرح اُچک لیا جیسے شکرا اپنا شکار جھپٹ لیتا ہے۔ وہ چاقو تانے میرا انتظار کرنے لگا۔

اس لمحے تجمل نے چاروں طرف نظر گھما کے بالاخانوں پہ اور گلی میں کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: "تم سب آنکھیں کھلی رکھنا اور شاہ کو جتنا دیکھنا ہے دیکھ لو، اس کے بعد یہ صورت تمھیں نظر نہیں آئے گی۔ مجھ کو پتہ ہے تم سب اسے دوبارہ دیکھنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

شاہ نے تجمل کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ شاہ نے اپنا چاقو ہتھیلی اور کلائی سے اس طرح چپکا لیا تھا کہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجمع میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ میں نے پہل کی اور شاہ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میں پلٹ کے دوبارہ یہی عمل دہرا رہا، شاہ پھر جھکائی دے گیا۔ میرا مقصد وار کرنا نہیں تھا۔ صرف شاہ کی پھرتی کا اندازہ لگانا تھا۔ اس میں اچھی خاصی پھرتی تھی۔ اس نے بھی پہل کرنے کی جلدی نہیں کی۔ میں نے زیادہ چستی اس لیے نہیں دکھائی تھی کہ شاہ فوراً میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ اس کی خواہش یقیناً یہ ہوگی کہ وہ پہلے ہی ہلے میں میرے ہاتھ سے چاقو چھین لے مگر جہاں اتنے لوگ موجود ہوں وہاں یہ بے احتیاطی نہیں کی جا سکتی۔ شاہ اپنی خواہش کے باوجود ہر احتیاط کا خیال رکھے گا۔ میری نظریں پوری طرح شاہ اور اُس کی ایک ایک حرکت پر مرکوز تھیں۔

شاہ کے آدمیوں کے لیے شاہ کے خلاف فوراً کوئی فیصلہ ہونا اُن کی برہمی کا سبب بن سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے داؤ کا موقع ملنا چاہیے تھا کہ شاہ کے ساتھی بعد میں کسی قسم کا شکوہ نہ کریں۔ شاہ نے دو تین بار اُچھل کے میرے وار بہ آسانی خالی دے لیے تو میں اس سے کچھ دوری پر کھڑا ہو کے اسے گھورنے لگا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور شاہ پہ یہ ظاہر کیا کہ میں چاقو مارنے کا دائرہ وسیع کر رہا ہوں اور میری کوشش اس کے بچنے کی جگہ تنگ کرنا ہے۔ یہ کوئی چوڑی گلی نہیں تھی۔ لوگوں کے گھیرے کے درمیان جو جگہ چھوڑی تھی وہ کم تھی۔ اس طرح آگے بڑھنے میں شاہ کا رد عمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میرے بازوؤں کے دائرے میں چلا آئے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکوں، وہ خود ہی جھٹکے

میرے سینے پر چاقو رکھ دے۔ میں نے دو قدم ہٹ کے تیور کو اس کے مقابل کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ آگے آنے کا خطرہ مول نہ لے اور کسی دوسری طرف نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ شاہ کو لمحوں میں اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں جو بات مجھے سمجھانی تھی اُس نے اُسے اسی طرح سمجھا جس طرح میں چاہتا تھا۔ اس میں اس کے لیے خطرہ کم میرے لیے زیادہ تھا۔ کوئی بھی یوں اپنی تنگ جگہ پہ ہاتھ کھول کے مقابل کو براہ راست سینے تک آنے کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے اُسے اس کا موقع دیا تھا کہ وہ مجھ سے تیز آگے بڑھ سکے اور یقین کرے کہ جب وہ میرے سینے میں چاقو کی نوک پیوست کرے گا تو میں اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کے اس کے گرد لپیٹ کر چاقو نہیں مار سکوں گا۔ اس وقت میری گرفت کمزور پڑ جائے گی یا میں بوکھلا جاؤں گا۔

وہ میرے اس پھیلاؤ داؤ کو یقین کر چکا تھا کیونکہ ابھی تک میرے بارے میں اس کی رائے بھی نہیں تھی۔ اُسے میری کوشش فہمی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا۔ اُس نے چاقو بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اپنا ایک ہاتھ ۴۵ ڈگری کے زاویے سے اُٹھاتے ہوئے مجھ پہ لپکا۔ اس کا رُخ سیدھا میری چھاتی کی طرف تھا لیکن اگر میں اسی داؤ پہ قائم رہتا جس کا تاثر میں نے شاہ کو دیا تھا تو اُسے نشانہ لگانے میں دیر نہ ہوتی۔ اس صورت وہ کسی قدر ترچھا ہو کے اور جسم کو خم دے کے چاقو مارتا تاکہ میں جوابی وار کروں تو میرے چاقو بردار بائیں ہاتھ کی رسائی اس کے جسم تک نہ ہو سکے اور میں کوئی پینترا بدل لوں تو وہ آسانی سے دائیں جانب نکل جائے۔ وہ ہر طرح مطمئن ہو کے جست لگا کے آگے آیا۔ ادھر وہ بڑھا اُدھر میں لیکن وہ جھک کے میرے سینے پہ چاقو گھونپنے ہی کو تھا کہ میں بھی اچانک جھک گیا اور میں نے نیچے سے اُس کا چاقو والا پہنچا پکڑ لیا۔ شاہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں پڑ گیا پھر چھڑانے لگا۔ اس نے اپنا پہنچا چھڑانے کی بہت تگ و دو کی۔ میرا چاقو والا ہاتھ آزاد تھا۔ شاہ نے اسے معذور کرنے کے لیے میری کلائی پکڑ لی اور میری نس پہ ناخن کا دباؤ ڈال دیا۔ میں نے بھی اس کا پہنچا مروڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ نے اپنا ناخن نس سے ہٹا لیا۔ میں پکڑی ہوئی کلائی کے باوجود اس کے شانے پر نوک ضرور چبھو سکتا تھا مگر میں نے یہ نہیں کیا۔ میرے جی میں آئی کہ اپنا چاقو پھینک دوں لیکن اس طرح اس کی ساری توجہ میری گرفت سے اپنا پہنچا چھڑانے پر مبذول ہو جاتی اور فیصلہ جلد ہی ہو جاتا۔ شاہ کو مجھ سے اتنی تیزی کی توقع نہیں ہوگی۔ فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اتنے کم فاصلے پہ زاویہ بدل لوں گا۔ وہ اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ میری ماں اور بہنیں اتنی بے چاریاں ہو گئی تھیں کہ کوئی بھی انھیں گالی دے دیتا تھا۔ شاہ اپنا پہنچا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ چاقو پر اُس کی گرفت مضبوط تھی مگر وہ مجبور تھا۔ تیواڑی میں نے اُسے دھکیل کے اُس کا پہنچا چھوڑ دیا۔

مجھے یقین تھا کہ شاہ کے حملوں میں شدت آ جائے گی اور وہ شور بھی زیادہ مچانے لگا۔ لوگوں کو اس بات پہ حیرت ہوئی ہوگی کہ میں شاہ کے پنجے سے اتنی آسانی سے کیوں دست بردار ہو گیا۔ میں نے تجمل کی طرف نظر کی تھی، اُس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ شاہ مجھ پہ پے درپے وار کرنے لگا۔ میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کبھی نیچے جھک کے، کبھی ہاتھ کے مبنی کے پھینکا انتاد کی طرح اُسے دائرے میں گھما رہا۔ وہ ہواؤں میں ہاتھ مار رہا تھا۔ اُس کی سانس پھول گئی تھی اور ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ بار بار چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا اور مجھے فریب دینے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ چیتے کی طرح دھاڑ کے جھپٹتا لیکن اُس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ بے شک اُس نے میری آستین پھاڑ دی تھی لیکن وہ چاقو میری جلد تک نہیں پہنچا سکا۔ "بس لاڈلے! آنکھیں تھک گئی ہیں۔" مجھے تجمل کی آواز سنائی دی۔ "جلدی کر، لوگوں کو کام پہ بھی جانا ہے۔"

"کیا کروں؟" میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا کیونکہ اُس دوران میں صرف ایک شخص دیکھا جا سکتا تھا اور وہ تھا شاہ کبیر۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں کھڑا ہے؟ جہاں گیر اور خانم کا کیا حال ہے؟ شاہ کا پہنچا چھوڑنے کے بعد میں نے ایک ہی لمحے کے لیے تجمل کو دیکھا تھا۔ جہاں گیر اور خانم میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

"کاٹ دے۔" تجمل نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

یہ سن کے میں نے مدافعت ختم کر دی اور اُس کے وار سے پہلو بچا کے ایک کونے میں چلا گیا۔ تجمل نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ آسان نہیں تھی۔ میرے سامنے کوئی اور شخص نہیں، شاہ کبیر تھا، اس علاقے کا سب سے چابک دست آدمی۔ تجمل کی ہدایت پر مجھے بہت احتیاط سے عمل کرنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھرکتی ہوئی دھار کا چاقو تھا اور وہ اچھے خاصے داؤ پیچ بھی جانتا تھا۔ درمیان میں خود ہی داؤ پہ داؤ نکل آتے ہیں لیکن تمام امکانی داؤ نظرانداز کر کے کسی ایک داؤ کا موقع تلاش کرنا مشکل کام ہے۔ اس اثنا میں ذرا بھی کوئی بے بس ہو جائے تو سارا معاملہ اُلٹا ہو سکتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اس کا چاقو چھیننا تھا۔ اس کی تدبیر ایک تو وہی تھی جو میں نے تیواڑی کے ساتھ کی تھی کہ اپنا چاقو پھینک کے اس کا دھیان بٹا دوں مگر چاقو ایک بار ہاتھ سے نکلنے کے بعد دوبارہ حاصل کرنے میں دشواری پیش آ سکتی تھی اور مجھے چاقو کی ضرورت تھی۔

شاہ کبیر کچھ سوچ کے سنبھل گیا تھا۔ اب کے میں اس کی طرف گیا۔ کبیر نے مجھے بڑھنے دیا مگر میں درمیان ہی میں رُک کے آگے قدم

اپنی جگہ لوٹ آیا۔ کبیر نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے چاقو آگے کر لیا تھا۔
میں جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی تیزی سے ترچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقفے میں کبیر وار کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اس نے مدافعت کا انتہائی آخری حربہ اختیار کیا تھا۔ اس نے پیچھے اور دائیں بائیں کچھ جگہ اپنے لیے محفوظ رکھی تھی تاکہ اسے حرکت کرنے میں آسانی ہو۔ اس کا دوسرا ہاتھ لٹکا ہوا تھا۔ مجھے ہر طور اس کا دراز ہاتھ پکڑنا تھا اور یہ تبھی ممکن تھا جب میری جانب سے اس کے دماغ میں کسی اور داؤ کا شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ میں نے چند فٹ آگے بڑھ کے فاصلہ کم کیا اور چاقو اس انداز میں تان لیا جیسے اس پر صحیح نشانہ لگانے کے لیے تول رہا ہوں اور قریب جانے کے بجائے اپنی جگہ ہی سے اس پر چاقو اچھال دوں گا۔ اسے مجھ سے اس گھٹیا حرکت کی توقع نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن وہ خود اوچھا آدمی تھا۔ اس نے یہی جانا کہ میرا ارادہ اب دُور ہی سے تاک کے چاقو پھینکنے کا ہے۔ جواب میں وہ خود ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ پہلے ہی دراز تھا۔ ایسا کرنے کے لیے اسے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے نشانہ بھی قائم کرنا تھا۔ اس نے اسی پر عمل کیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ پیچھے کی طرف گیا، میں نے جست لگائی اور آناً فاناً چاقو دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ شاہ کبیر گڑبڑا گیا۔ یہ دیکھ کے اس نے اپنا ہاتھ پھر آگے کرنا چاہا لیکن میں نے اس کے سینے کی طرف چاقو سیدھا کر کے دوسرے ہاتھ سے اس کا پہنچا پکڑ لیا تھا۔ اس نے بھی میرا چاقو والا ہاتھ گرفت میں لے لیا تھا اور اسے اپنے سینے سے دُور کرنے کی فکر میں تھا مگر نوک اس کے سینے میں پیوست تھی۔ اس کے لیے اسے اپنے جسم کو کوئی جنبش دینے میں اندیشہ تھا۔ میں نے دباؤ بڑھایا تو اس نے اپنا چاقو چھوڑ دیا اور غیر متوقع طور پر میری ناک پر مکا مارا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میری ناک سے خون نکل آیا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ چاقو نہیں اٹھانے دیا۔

ہتھیار سے محروم ہو جانے کے بعد بھی شاہ کبیر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے اپنا چاقو پھینکنے سے احتراز کیا۔ اصولاً یہ لازم بھی نہیں تھا حالانکہ جی چاہتا تھا۔ شاہ کبیر کے دونوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ وہ دوبارہ میرا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو اپنے دونوں ہاتھوں کا زور ڈال سکتا تھا۔ میں اس کے قریب ہوتا رہا اور اس کے اچھلنے کودنے کی جگہ محدود کرتا رہا تاآنکہ ایک جگہ میں نے دانستہ اپنا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ میں نے چاقو چھوڑ دیا لیکن چاقو زمین پر نہیں گرا۔ وہ میرے دوسرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ میں نے اسے اس کے پیٹ میں چبھو کے جھٹکے سے کھینچا۔ اس کا آزار بند کٹ چکا تھا۔ جنگل نے یہی کہا تھا۔

شاہ کبیر یک لخت زمین پر بیٹھ گیا۔
زمین پر جیسے ایک گٹھڑی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بُری طرح اپنا جسم سکوڑ لیا تھا۔ میں اس کے پاس چاقو لیے کھڑا رہا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ چند لمحوں تک وہ اسی طرح سمٹا اور دبکا رہا۔ پھر گلی کے فرش سے اٹھا، مڑا، پھر اچانک کسی دیوانے کی مانند اٹھا اور ایک طرف مجمع میں جا گھسا۔ لوگ اس کے لیے جگہ چھوڑتے گئے۔ ایک دو سر پگڑیں گرے۔ اس کے بعد مجھے اس کی صورت نہیں دکھائی دی۔

کسی نے میرا شانہ ہلایا تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ جنگل میرے پیچھے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں شاہ کبیر کا چاقو تھا۔ اس نے چاروں طرف گھوم کے چاقو دکھایا کہ کوئی شخص آگے نہیں آیا۔ پھر ادھر جنگل نے چاقو پھینکا، اُدھر ایک ساتھ کئی چاقو جنگل کے پیروں پر گرے اور ہجوم میں ایک شور اٹھا۔ ہوٹل کے مالک نے دوڑ کے میری انگلیاں پکڑ لیں: "واہ مائی باپ! آدھا پنا مرا تے ہوئے لوٹا۔ اپنی کرچ تا مارو۔" وہ اپنے گالوں پر چانٹے مارنے لگا: "اپنی کرنتی وہ وادا!"

اس نے نہ جانے اور کیا کہا۔ جہاں گیر آکے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ پاس ہی خانم بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنا بازو پھیلا دیا۔ وہ میرے پہلو سے لگ گئی اور میرے شانے پر سر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ کالے دادا جنگل سے گلے مل رہا ہے اور مُلا ہوٹل کے چبوترے کے نزدیک بے ہوش پڑا ہے۔ پھر کسی ایک کا چہرہ دکھائی دینا مشکل ہو گیا۔ بالاخانوں کی عورتیں چیخ پکار مچا رہی تھیں اور ادھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ خانم کی موجودگی کی وجہ سے وہ میرے نزدیک آ کے ٹھہر گئے۔ کوٹھوں پر کھڑی ہوئی کئی عورتوں نے اپنے کانوں اور بالوں سے پھول نوچ کے میری طرف پھینک دیے تھے اور ایک ساتھ کئی عورتوں کا غول چھجے کا زینہ اتر کے آگیا تھا۔ انھوں نے خانم کو گھیر لیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ خانم چیختی چلاتی ان سے کھنچتی ہوئی باہر نکل آئی لیکن ہمارے پیچھے لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہوا۔ اچانک مجھے جنگل کا خیال آیا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ میرے قدم منجمد ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے مڑ کے دیکھا۔ وہ آ رہا تھا اور شاہ کبیر کے آدمیوں کی جلو میں آ رہا تھا۔

لوگ ہمارے ساتھ خانم کی گلی تک چلے آئے۔ بڑی بیٹھک کھول دی گئی۔ جنگل کئی آدمیوں کے ہمراہ وہاں جا کے بیٹھ گیا۔ خانم مجھے اوپر لے گئی۔ میری قمیص کبیر نے چیر دی تھی۔ مجھے کچھ احساس ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے خانم کے سامنے کُرتا اتار دیا۔ خانم میرے بازو ٹٹولنے لگی لیکن جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کی کپکپاتی ہوئی انگلیاں میری گردن اور بالوں میں چل رہی تھیں۔ جہاں گیر میرے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا رہا تھا

جیسے میری شکل بدل گئی ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک کبھی تیز ہو جاتی، کبھی مدھم پڑ جاتی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ تو بس ٹکر ٹکر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، اس سے کون نبٹے! آنکھیں بند کر لے۔ اس طرح مت دیکھ، جہاں گیر۔ ابھی گھر سے نکلے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ جو آدمی گھر میں دیر سے پہنچتا ہے وہ باہر جلدی سمجھ لیتا ہے، جہاں گیر۔ میں بھی بہت سمجھ گیا تھا۔ اب اس کی مونچھیں پھوٹ رہی تھیں اور گالوں پر روئیدگی ابھر رہی تھی۔ اس نے اپنے طور پر بہت کچھ قیاس کر لیا ہوگا کہ اس کا بھائی اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اس نے مجھ سے اس بابت پوچھا بھی تھا مگر میں نے ٹال دیا تھا۔ اب وہ ضرور کڑھتا رہا ہوگا۔ میں نے سوچا، اسے بتا دوں کہ میں نے جیل میں تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ میری فرسٹ کلاس آئی تھی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی کہ جہاں گیر مجھ سے خوف زدہ تو نہیں ہو گیا ہے۔

نیساں گرم گرم چائے لے آئی تھی۔ میں نے جہاں گیر کی نگاہیں منتشر کرنے کے لیے نیساں سے پوچھا کہ میرے پیچھے اس گھر سے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ نیساں نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے جواب سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ خانم مجھے کچھ دیر آرام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی لیکن میں نیچے چلا آیا اور جہاں گیر کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ بیٹھک میں جنگل اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے لپکے۔ ان میں کالے دادا بھی تھا۔ اس نے مجھے زور زور سے بھینچ لیا۔ میرے گالوں کو بوسے دیے اور میری انگلیاں چومیں۔ اس نے جہاں گیر کو بھی اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ رات کا کھانا بھی ان سبھوں نے خانم کے ہاں کھایا اور جنگل سے صبح اڈے پر آنے کا وعدہ لے کے رخصت ہو گئے۔ وہ اڈے اور شاہ کبیر کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن جنگل نے غالباً جہاں گیر کی وجہ سے ہر بات آنے والی صبح پر ملتوی کر دی۔

دوسرے دن صبح حسبِ توقع خانم سحر خیزی کے لیے ہمیں اٹھانے نہیں آئی۔ وقت پر میری آنکھ خود ہی کھل گئی اور میں حسبِ معمول جہاں گیر کو لے کے نکل گیا۔ رات کو بھی سوتے وقت وہ گم صم رہا تھا۔ خانم نے بھی کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ کھانے کے دوران بھی خاموشی طاری رہی تھی۔ خانم بہت گھبرائی گھبرائی نظر آتی تھی۔ شاید اسے خدشہ لاحق ہوگا کہ شاہ کبیر مشتعل ہو کے واپس نہ آ جائے اور کوئی دوسری واردات درمیان میں پیش نہ آ جائے۔ میں اس سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ کبیر کی واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ اب نہیں آئے گا۔ وہ ضرور پوچھتی کہ میں یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

راستے میں کئی بار میں نے جہاں گیر سے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن سارا راستہ یوں ہی گزر گیا۔ آج تو اپنی گزرگاہ نہیں تھی۔ گلیوں میں ایسے کئی آدمی ملے جنھوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہم دونوں کا حال پوچھا۔ اس دن ہم زیادہ دُور نہیں گئے تھے۔ جلدی گھر واپس آ گئے۔ خانم پریشان تھی۔ سویرے سویرے شاہ کبیر کے چند آدمی جنگل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ خانم نے مجھ سے کہا بھی کہ میں ذرا جا کے دیکھوں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ جلد ہی واپس آ جائے گا۔ ناشتے کے بعد نیساں نے چپکے سے میرے کان میں آ کے بتایا کہ اس کی ماں آئی ہوئی ہے۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ اگر وہ واقعی ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دے۔ وہ سمجھے گی اور اگر وہ اپنی ماں کے سامنے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتی تو مجھ سے کہے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ نیساں کی سمجھ میں میری بات کچھ آئی کچھ نہیں آئی۔

میں نے نیساں کو سمجھا کے بھیج دیا۔ شوکت آرا کے آنے کی اطلاع سے مجھے خواب سے چونکا گئی تھی۔ سارے بازار میں یہ بات گشت کر گئی تھی کہ خانم کے ہاں ٹھہرے ہوئے مہمانوں میں سے ایک نے شاہ کبیر پہ چاقو اٹھایا ہے۔ جب شوکت آرا کو یہ پتہ چلا ہوگا کہ یہ وہی جوان تھا جو ایک دن پہلے اسے چکمہ دے گیا تھا تو اس نے میرے بارے میں اپنی رائے بدل دی ہوگی۔ رات بھر اس نے سوچا ہوگا۔ آمادہ تھی۔ آخر وہ نیساں کی ماں ہے۔ نیساں کے سلسلے میں کوئی فیصلے کا حق اسے یا خود نیساں ہی کو ہے۔ نیساں میں جرأت نہیں ہے کہ وہ بھی گھر واپس جانے کی ہمت نہیں تھی ورنہ وہ گھروں کی زنجیر توڑ کے چل جاتی مگر جاتی کہاں۔ ایسی لڑکیاں پھر کہاں جا سکتی ہیں۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ شاہ کبیر کے واقعے کے بعد نیساں کی ماں اپنی رائے بدل سکتی ہے لیکن کبیر سے معافی مانگنے کے بجائے رہنا زیادہ بہتر تھا۔

معلوم نہیں کہ وہ کیوں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نیساں کو لینے آئی ہو یا یہ بھی ممکن تھا کہ رات بھر شوکت آرا نے حساب کتاب لگایا ہو۔ وہ جلدی میں کہیں گھاٹے کا سودا تو نہیں کر گئی۔ اگر ایسا ہے تو میں رقم میں اضافہ کر دوں گا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ خانم سے محض تسلی کے لیے آئی ہو۔ خانم ان جانے میں کچھ بھی کہہ سکتی ہے۔ کاش میں اسے پہلے ہی بتا دیتا۔ میں نے طے کیا کہ اگر بات نہیں بنتی تو اسے کرشاہی کی ساری دولت شوکت آرا کو دے کر میں اپنی جگہ کر دوں گا۔ ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔ یہ سب کچھ دوسری خوشی کا نہ کر کے گئے تھے۔
ابھی نیساں کو گئے دیر نہیں ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ خود ہی دیوان میں جا کے دو ٹوک بات کر لوں۔ خانم مجھے آواز دی

ہوئی وحشت زدہ سی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جہانگیر
بھی اسٹل پر مولوی صاحب سے پڑھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا
ہی تھا۔ خانم آتے ہی خفگی سے کہنے لگی: "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے بھی
نہیں بتایا!" میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اُس کی آواز تیز ہو گئی: "آخر تم نے
اتنی بڑی رقم اُسے کیوں دے دی؟"

میں نے آہستگی سے کہا: "آپا! اُس نے یہی طلب کیا تھا۔
میں نے اپنی طرف سے کچھ روپے بڑھا دیے۔"

"ایسا ہی تھا تو تم مجھ سے کہتے اور دیکھتے کہ میں اُسے کیسے کہتی ہوں
تیار کر لیتی۔ تم وہاں اکیلے کیوں چلے گئے؟"

"اب چھوڑیے آپا! آدمی کی قیمت روپوں میں نہیں لگائی جا
سکتی۔ نیساں بہت پیاری لڑکی ہے، وہ بہت معصوم ہے اور یہاں
رہنا نہیں چاہتی۔ جو شوکت آرا کی قسمت میں لکھا تھا، وہ اُسے مل گیا۔
وہ اُس کی ماں بھی تو ہے۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ وہ اپنی بیٹی کی جدائی کے لیے
تیار ہو گئی ہے۔" میں نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماں!" وہ چیخ کے بولی: "کس کی ماں۔ وہ ماں ہوتی تو اپنی بیٹی
کے لیے اتنی جلدی یہ فیصلہ نہ کرتی۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو اس طرح جدا
نہیں کرتی۔ نیساں کی ماں نہ جانے کہاں ہوگی۔" میں حیرت سے اُس کا
چہرہ دیکھنے لگا۔ "میں اُس سے چیک واپس لے رہی ہوں۔" خانم نے
برہمی سے کہا۔

"نہیں آپا! میں اُس سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"مگر تم نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اچھا بھی نہیں لگتا تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ
سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر آپ نیساں کو ساتھ رکھنے پہ تیار
نہیں ہوں گی تو میں اُسے کہیں اور چھوڑ آؤں گا۔ آپ جہانگیر، تجمل
بھائی اور نیساں کو کچھ مت بتائیے گا۔ نیساں ہمیشہ اپنے آپ کو بوجھ
سمجھے گی۔ روپے کا کیا ہے۔ روپے اور آجائیں گے۔ اگر شوکت آرا اپنی
مرضی کے مطابق نیساں کو محفل میں بٹھاتی تو کیا وہ اس سے زیادہ حاصل
نہیں کر سکتی تھی؟"

"کر سکتی تھی۔" خانم نرمی سے بولی: "مگر بعد میں نیساں کے تمام
دُکھ بھی تو آپ کو اُٹھانے پڑتے۔ وہ مول پوچھی تو کمی رہتی۔ وہ نیساں پر
خرچ بھی کرتی اور کچھ دنوں بعد نیساں ہی اس کے ذہن و دولت کی ضامن
ہوتی۔ نیساں کی زبان اور دیدے کھلنے تو شوکتی کے دل پہ آنے بھی تو
چلنے محفل میں بیٹھی ہوئی لڑکی پہ ہزار نظریں پڑتی ہیں اور کسی وقت بھی
کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہاں کوئی ایک آدمی نہیں آتا۔ تم نے نہ جانے اُس
سے کس طرح بات کی۔ تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ تم نے یہ کیا کر دیا؟"

"جانے دیجیے آپا! دیکھیے نیساں آپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔
وہ ہمارا کتنا خیال رکھتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے جہانگیر کے کپڑے بھی
وہ دھوتی ہے۔ اس دن مرزا سے جھگڑے کے درمیان جہانگیر کی قمیص
پھٹ گئی تھی تو اسی نے اُسے سی دی تھی۔"

"لڑکیاں گھر کا کام کرتی ہی ہیں۔"

"اور لڑکیاں گھر ہی کا کام کرتے ہوئے اچھی بھی لگتی ہیں۔"

خانم نے مجھ پہ بہت زور دیا کہ میں چیک منسوخ کر دوں اور شوکت
آرا سے نئے سرے سے بات کرے گی۔ میں نے خانم سے التجا کی کہ اب وہ
اس سلسلے میں شوکت آرا سے کوئی بات نہ کرے۔ خانم بہت جز بز ہوئی اور
مجھے شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ میں دریچے میں نیساں کا انتظار
کرنے لگا۔ بہت دیر ہو گئی۔ نیساں نہیں آئی۔

تجمل سہ پہر کو تھکا ہوا سا گھر واپس آیا۔ شاہ کبیر کے واقعے کو ایک
دن گزر چکا تھا۔ خانم اور جہانگیر کے ابھی تک رخسار مرجھائے ہوئے تھے۔
شام کو کالے داد بخاری کے نوکروں سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوا۔ خانم
بھی وہیں بیٹھی تھی۔ کالے داد اُس سے معافی مانگنے لگا۔ خانم کے
ہونٹوں پہ لرزہ طاری ہو گیا۔ کالے داد نے فوراً اپنا پاؤں نکال کے خانم
کے پیروں میں رکھ دیا اور بولا کہ خانم اس کے بیٹے کو جو سزا تجویز کرے وہ
اُس کے لیے تیار ہے۔ خانم نے اپنے پیر ہٹا لیے اور سر جھکائے چپ
بیٹھی رہی۔ کالے داد نے اس سے درخواست کی کہ وہ کچھ دن اور ٹھہر
جائے۔ خانم نے لب نہیں کھولے۔ وہ خود ہی کہنے لگا کہ بیعانہ واپس کیا جا
سکتا ہے۔ ہم جگن ارجی بائی کو روک دیں گے لیکن خانم نے ہامی نہیں بھری۔
اُس نے کالے داد کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ کالے داد مایوس
ہو کے تجمل کے پیر دبانے لگا۔

اُسی رات خانم نے اپنا ہلکا پھلکا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اُس
نے اپنے بہت سے کپڑے لوگوں میں بانٹنے کے لیے علیحدہ کر دیے۔
نیساں اُس کی مدد کر رہی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ
چل رہی ہے۔ اُس کے قدم زمین پہ نہیں پڑتے تھے۔ وہ پورے گھر میں
اس طرح بھاگی بھاگی پھر رہی تھی جیسے بہت دنوں بعد اپنے میکے جا رہی
ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کے شرمانے لگتی تھی۔ یا پھر لاؤن جانے والی لیلن
لاؤن جب بھی اُسے میرے سامنے آنے کا موقع ملتا، وہ یہی تکرار کرتی رہتی۔
میں ہر بار اُس سے کچھ نہ کچھ منگوا لیتا تھا۔ کام کرکے اُس کا شہابی رنگ
دہکنے لگتا تھا۔ اُس کی سانس ہمیشہ پھولی پھولی رہتی تھی۔ چُنری اِدھر جاتی

تھی، بال اِدھر بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ اتی تی کو ایسی حالت میں دیکھ
کے ہمیشہ ٹوکتی تھیں۔ کتنی تھیں تمہاری دیوانی! اذا دوپٹا تو سر سے کھسکا کے
رکھا کرو اور یہ کیسی اُلٹی سیدھی چلتی ہے۔ اوسان ہیں روا کر۔ تی بھی ہرنی
کی طرح گھر میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔

دوسرے ہی دن ارجی بائی نے خانم کو مکان کے باقی روپے
یک مشت ادا کر دیے۔ اُسے شبہ ہو گیا تھا کہ دیر ہو جانے سے خانم
کا ارادہ بدل سکتا ہے۔ اُس دن نواب بہادر کا ہرکارہ اُن کا ایک پیغام
لے کے خانم کے پاس آیا۔ اُس نے نواب بہادر کی طرف سے پہلے خانم
کو ایک طشت پیش کیا۔ طشت میں طلائی تاروں سے ٹکا ہوا ریشمی جوڑا،
سونے کی چوڑیاں، گلوبند، سرخ نگینے کی انگوٹھی اور گلاب کے تازہ پھول سجے
ہوئے تھے۔ نواب بہادر نے خانم کو بلایا تھا اور یہ وضاحت کر دی تھی
کہ وہ گانے کے لیے نہیں بلا رہا ہے بلکہ خانم سے چند ضروری باتیں کرنا
چاہتا ہے۔ خانم نے نواب کے تحائف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے طشت
ہرکارے کو واپس کر دیا اور بولی: "کنیز پہ پہلے ہی نواب بہادر کے بہت
احسانات ہیں۔ اب کنیز کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر کو
میری تسلیم کہنا اور کہنا کہ میں انھیں کبھی نہیں بھولوں گی لیکن کنیز نے اپنے
بارے میں ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ خدا نواب بہادر کا اقبال قائم رکھے۔ کہنا کہ
اُن کی تمام باتیں بہت دل پر نقش ہیں مگر کنیز اپنی حیثیت سے خوب
واقف ہے۔"

مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ کوئی آیا تھا اور خانم نے اُسے واپس کر دیا۔
میں اُس وقت کمرے میں تجمل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ نیساں پچھلے
کمرے میں آ گئی اور جیسے ہی موقع ملا، مجھے باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔
میں اُدھر چلا آیا۔ نیساں زینے سے ملحق کوٹھری میں میرا انتظار کر رہی تھی۔
اُس نے ہانپتے کانپتے یہ تمام باتیں مجھے بتائیں اور پریشانی سے کہنے لگی:
"اگر نواب بہادر نے آپا کو روک لیا تو..... ! وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"ہوا کریں!" میں نے ترشی سے کہا۔

اندھیرے کی وجہ سے میں نیساں کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ زینے
میں کوئی بھی آ سکتا تھا۔ میں اُس کا شانہ تھپتھپا کے نیچے اُتر آیا۔
بیٹھک میں خانم تجمل سے اصرار کر رہی تھی کہ اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں
سے چلنا چاہیے۔ تجمل نے اُسے تحمل کی تلقین کی اور کہا کہ ایک دو دن
تک اُس کا یہاں رہنا کچھ ضروری ہے مگر خانم کا اصرار بڑھتا گیا۔ ابھی
بینک سے کم سے کم ایک دن اور لگنا چاہیے تھا۔ میں نے شوکت آرا سے
وعدہ کیا تھا کہ جب تک اُسے بینک سے رقم مل جانے کا یقین نہیں ہو
جائے گا، میں نیساں کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا لیکن یہ تو میری اور شوکت آرا
کی بات تھی۔ تجمل یہاں اور ٹھہرنے کو کیوں کہہ رہا تھا؟ یقیناً اُسے یہ
کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ خانم کے اچانک اصرار پہ تجمل کچھ گھٹا گھٹا سا نظر
آ رہا تھا اور خانم پر جیسے ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں
لرزش تھی۔ تجمل کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اُس نے شجاعت کے ذریعے کالے
داد کو اوپر سے بلوا لیا اور اُسے بتایا کہ ہم سب ابھی اسی گاڑی سے
جانا چاہتے ہیں۔ کالے کو یقین نہیں آیا۔ وہ ابھی کچھ دن اور ٹھہرنے کے لیے
تجمل سے ضد کرنے لگا۔ میں نے بیچ میں روکنا چاہا کہ کل تک کے لیے
جانا ملتوی کر دیا جائے۔ کل تک شوکت آرا کے چیک کا جواب بینک سے
ضرور آ جائے گا۔ جانے جانے کی خبر راز نہیں رہ سکتی تھی۔ شوکت آرا
کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ نیساں کے لیے آ سکتی ہے۔ مگر خانم
بھی کسی سبب ہی سے گھر سے جلد از جلد نکل جانے پہ زور دے رہی تھی۔
شاید نواب کے ہرکارے سے کوئی ایسی بات ہوئی تھی جسے نیساں بھی
نہیں سن سکی۔ گاڑیوں کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ خانم کو اس کا بھی احساس
نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنی بات اپنے آپ تک محدود رکھی۔ اب یہی
ہو سکتا تھا کہ شوکت آرا دانے تو میں ایک دن کے لیے رک جاؤں۔
تجمل چاہے کچھ کہے میں نیساں کے ساتھ اُس کے گھر ٹھہر جاؤں گا
اور جہانگیر تجمل کے ہمراہ چلے جائیں، ممکن ہے مجھے ایک دن کے
بجائے دو دن لگ جائیں۔ ایک دو دن بعد یہاں وہ بتائیں گے میں اُن
کے پاس آ جاؤں گا۔ میرا چیک بالکل درست تھا۔ دستخط میں نے ملا
کر لیے تھے اور رقم کے اندراج میں پوری احتیاط برتی تھی۔ شوکت آرا
نے زیادہ فیل مچایا تو مجھے بھی اب نرمی سے پیش آنے کی ضرورت نہ
تھی۔ وہ شاہ کبیر کے واقعے کا حال سن چکی ہوگی اور مجھ سے زیادہ بحث
نہیں کرے گی۔ پھر خود نیساں اُس کے ہاں رہنے پہ کہاں آمادہ تھی۔

خانم نے ارجی بائی کو بلوا کے گھر کی چابیاں اُس کے حوالے کر دیں۔
کالے داد اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارا مختصر سامان اپنے ہاتھوں میں
اُٹھا لیا۔ نیساں اور خانم دونوں نے سیاہ برقعے پہن رکھے تھے۔ کالے برقعے
میں نیساں کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ گلیوں میں اس وقت بہت
بھیڑ تھی۔ ہر طرف سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہمارا
سامان آگے چلا گیا تھا۔ پیچھے پیچھے ہم روانہ ہوئے اور بازار کے باہر
ہی روڈ پہ کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ ان موٹروں کا انتظام
کالے داد ہی نے کیا تھا۔ چلتے وقت خانم کی بوڑھی ملازمہ خانم کے
گلے لگ گئی تھی۔ اُس کی بیٹی الفت بھی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔
خانم کے دونوں ملازم شجاعت اور رامتی موٹر تک ہمیں پہنچانے آئے تھے۔
خانم نے انھیں وہیں سے واپس کر دیا حالانکہ وہ اسٹیشن چلنا چاہتے تھے۔
خانم نے اُن سب کو معقول رقم دے دی تھی۔ جب موٹریں روانہ ہوئیں تو
میرے اوسان بحال ہوئے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ شوکت آرا دہلیز

ہیں آ جائے گی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ گاڑی کے انتظار میں ہمیں اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑے۔ اس کا بھی امکان کم تھا۔ جگنو نے کالے دادا کو حکم دیا تھا کہ اس وقت جو بھی گاڑی حیدرآباد سے باہر جاتی ہو، ہم اسی سے روانہ ہو جائیں گے۔ بیٹھک میں کالے دادا اور جگنو کے درمیان ہونے والی گفتگو سے پہلی بار مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ جگنو دلی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ دلی کی گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ کاچی گوڑا اسٹیشن سے ہمیں اورنگ آباد کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ وہاں بمبئی سے آنے والی گاڑی ہمیں دلی کی طرف لے جاتی۔ ہم کاچی گوڑا اسٹیشن پہ اتر گئے لیکن ابھی ہم پلیٹ فارم پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ پولیس کی ایک گاڑی تیزی سے آ کے رکی۔ اس کے پیچھے ایک بڑی سیاہ موٹر کار تھی۔ لمحوں میں پولیس والے گاڑی سے اتر گئے اور سیدھے ہماری طرف جھپٹنے لگے۔ دفعتہ خانم کی چیخ نکل گئی۔ "نواب بہادر!" اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "آخر انھیں خبر ہو گئی۔"

"کیسے خبر ہو گئی؟" جگنو نے چونک کے پوچھا۔

"وہ۔ وہ یہاں آ گئے ہیں۔" خانم نے حواس باختگی سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ پولیس ہمارے اطراف آ کے ٹھہر گئی تھی۔ چند ثانیوں بعد موٹر سے سفید شیروانی میں ملبوس ایک دراز شخص برآمد ہوا۔ اس کا جسم بھاری نہیں تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ سر پہ ترکی ٹوپی۔ چال میں وقار۔ عمر پینتالیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے ساتھ دو شخص اور تھے جو اس کے خاص ملازم معلوم ہوتے تھے۔ نواب بہادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ خانم نے اپنی نقاب اٹھا دی تھی۔ "آپ!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولی۔ "آپ یہاں کیسے آ گئے؟"

"ہم تمھیں لینے آئے ہیں خانم!" نواب نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" خانم سٹپٹا کے بولی۔

"محل میں۔" نواب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیا ہرکارہ آپ کے پاس نہیں پہنچا؟ میں نے آپ کو پیغام بھجوا دیا تھا۔ اور اپنی معذوری ظاہر کر دی تھی۔"

"ہمیں معلوم ہو گیا ہے لیکن ہم تم سے اس سلسلے میں کچھ بات کرنے کے خواہش مند تھے اس لیے خود یہاں چلے آئے۔"

"میں نے پیغام رساں پہ سب بات واضح کر دی تھی۔" خانم ترشروئی سے بولی۔ "آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"ہم تمھارے لیے بہت سی زحمتیں اٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ کی نوازشیں مجھ پر بے پناہ ہیں لیکن کنیز نے جو عرض کیا ہے اسی پہ قائم رہنا چاہتی ہے۔ کنیز اس شہر سے رخصت ہو رہی ہے۔"

"ہم دیکھ رہے ہیں۔" نواب نے ہماری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بھلا ہمیں چھوڑ کے تم اس طرح اچانک ہم سے دور ہو سکتی ہو؟"

"مجبوری کچھ ایسی ہی ہے۔" خانم نے مدھم آواز میں کہا۔

"ہم وہی تو جاننا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں نہیں بتاؤ گی؟"

"آپ نہ پوچھیے اور ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔"

"پھر بھی ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ تم نے ہمیں اطلاع دیے بغیر اتنی عجلت میں یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ جہاں تک بازار ترک کرنے کا تعلق ہے ہم کون سا اسے پسند کرتے تھے۔ ہم نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم جب چاہو چلی آنا۔ ہمارے دروازے کھلے ملیں گے۔ تم ادھر کیوں نہیں آئیں؟ آخر ہم سے کون سی لغزش ہو گئی ہے؟"

"ہے ہے۔ آپ سے کوئی لغزش کیوں ہوتی۔ للہ ایسی باتیں مت کیجیے۔ خدا گواہ ہے کہ کنیز کے دل میں آپ کا کیا مرتبہ ہے۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"تو پھر تم نے ہم سے یہ بے اعتنائی کیوں برتی خانم! اس کا کوئی سبب تو ضرور ہو گا۔ ہم فردِ جرم سننے آئے ہیں۔ اگر تم ہمیں کچھ بتائے بغیر چلی گئیں تو ہمیں چین نصیب نہیں ہو گا اور تم ہمیں کس کے آسرے چھوڑ کے جا رہی ہو؟ کیا تمھیں یاد نہیں رہا۔ ہم نے اپنے بارے میں تم سے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم تمھاری ہر مجبوری ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم تمھارے لیے نہ جانے کیا کیا کر سکنے پہ قادر ہیں۔"

"اس قدر نادم نہ کیجیے۔ کنیز کے شانوں پہ پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔"

"ہمیں بتاؤ خانم! ہم سے کچھ مت چھپاؤ۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"کوئی خوف مت کرو۔ ہم تمھارا خوف ہی تو دور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم ہر دیوار ڈھا دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ فیصلہ تمھارا نہیں ہو گا۔"

"میرا ہی ہے۔" خانم تیزی سے بولی۔ "کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔ "ہم کس طرح یقین کر لیں؟"

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

"ہمیں رشک ہے کہ یہ تم کہہ رہی ہو خانم! ہم بھی کچھ ارادہ ہی کر کے آئے ہیں۔ ہم تمھیں یوں کیسے جانے دیں ورنہ جو چند لوگ اس شہر میں ہمارا نام لیتے ہیں انھیں ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ تمھاری بیزاری اگر ہمارے لیے ہی نہیں تو ہمیں اپنا نام بدل لینا چاہیے۔ خانم! گھبراؤ مت، احتیاطاً ہم اسی لیے پورے انتظام سے آئے ہیں۔ یہ لوگ۔" نواب بہادر نے ہمارے اطراف کھڑے ہوئے پولیس کے لوگوں پہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ ہمارے اشارے کے منتظر ہیں اور ہم تمھارے اشارے کے۔ تم یہی کر سکتی تھیں۔ کہو تو اس سے زیادہ بھی کر گزرنے کے لیے آمادہ ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"ہم کچھ بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔" نواب نے کہا۔ "صرف اتنی بات کہہ رہے ہیں کہ ابھی ہم اس شہر میں موجود ہیں اور ہم نے زندگی صرف اپنے محل میں مقید ہو کے نہیں گزاری ہے۔ خانم! تم نادان نہیں کہ لوگ تو ہمیں مجبوراً بعض ناروا باتوں کے لیے قدم اٹھانا پڑے گا۔ تمھاری ذلیل بندی کی صورت میں ہم یہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اتنا اختیار حاصل ہے اور ہم زندہ ہیں۔ جن لوگوں نے تمھیں اس اقدام پہ مجبور کیا ہے انھیں ہم سے ہمارے تعلق کا پاس رکھنا چاہیے اور اگر انھوں نے نہ رکھا تو ہم بھی نہیں رکھیں گے۔"

"اگر آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں تو غلط ہے۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ایما پر ہے۔ میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا۔"

"لیکن.... لیکن ہم اسے تمھارے لیے بہتر نہیں سمجھتے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے متعلق بہتر ہی سوچا کرے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم تم سے بے خبر ہیں؟ تم سامنے نہیں ہوتیں تو کیا ہم سے دور ہو جاتی ہو۔ ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کن الجھنوں میں الجھ گئی ہو۔ ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ اپنے عزیز لوگوں کے لیے بسا اوقات ناپسندیدہ رویے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں۔"

"جو آپ سوچ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ میں کہہ رہی ہوں ایسا نہیں ہے۔"

"گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی ہے۔" دفعتہ جگنو نے ایک قدم آگے بڑھ کے نرم آواز میں خانم کو ٹوکا۔

"گاڑیاں روز جاتی ہیں۔" نواب نے درشتی سے کہا۔ "ہمارے حکم کے بغیر گاڑی حرکت میں نہیں آ سکتی اور ہم اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔"

"خانم بھی اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔"

"آپ خدا کے لیے نوازش کیجیے۔" خانم جگنو سے عاجزی کے ساتھ بولی۔

"خانم! ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم کیسی باتیں سننے کے عادی ہیں اور ہمیں کون سا لہجہ پسند ہے۔" نواب نے برافروختگی سے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ جو ہم نہیں چاہتے تھے، وہ ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔ ہمیں معاف کر دینا۔ اگر ہمیں یہ یقین نہ ہوتا کہ تم بعد میں ہمیں معاف کر دو گی تو ہم الٹے قدموں واپس چلے جاتے۔" نواب نے یہ کہتے ہی گردن خم کر کے پولیس کو اشارہ کیا۔ خانم چیخ پڑی۔ ایک ساتھ کئی پولیس والے ہماری جانب لپکے۔ انھوں نے دیکھتے دیکھتے دونوں اطراف سے کالے دادا اور اس کے تین ساتھیوں کے شانوں کے علاوہ میرے شانے بھی زور سے پکڑ لیے۔ جگنو نے اچانک اپنے کندھے زور سے جھٹکے اور اس سے پہلے کہ پولیس والے دوبارہ قابو میں کرتے نواب کی چھاتی میں جگنو کا چاقو چبھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے نواب کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ نواب کی آنکھیں پھٹ گئیں اور ان میں انگارے سے دہکنے لگے۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن جگنو کی گرفت سے اپنا بازو نہیں چھڑا سکا۔ ادھر کئی پولیس والوں نے پیچھے سے جگنو کو کھینچنا چاہا۔ جگنو کھنچا مگر نواب بہادر بھی ساتھ کھنچا چلا آیا۔ "ہٹ جاؤ۔" جگنو نے گرج کے کہا۔ "نواب صاحب! انھیں روک لو ورنہ...." پولیس خود پیچھے ہٹ گئی۔ "نواب بہادر! ابھی یہ نہیں چاہتے تھے۔" جگنو نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر ہمیں بعد میں خانم کے معاف کر دینے کا یقین نہ ہوتا تو ہم لوٹ جاتے۔ آپ نے خانم کی بات سمجھنے اور سننے پہ دھیان نہیں دیا۔ آپ عزت دار ہیں۔ عزت والے اس طرح سے نہیں آتے اور اپنی بات یوں نہیں منواتے۔ پہلے ان لوگوں سے بولو کہ یہاں سے چلے جائیں پھر ہم سے بات کرو۔ اگر آپ اپنی عزت شان گنوانے ادھر آ سکتے ہو تو نواب! اپنے پلے بھی کچھ ہے اور جن کے پاس کم ہوتا ہے انھیں اس کے جانے کی اتنی فکر بھی نہیں ہوتی۔ جتنی پر کسی ہونی چیز کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ ان کو حکم دو کہ یہاں سے دور ہو جائیں۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دل میں آپ کے لیے بہت درجہ ہے۔ خانم نے ہم کو اپنا ہی بولا تھا۔ خانم کے کہنے سے چلی آئی ہے نواب! یہ دکان بند کرائی ہے۔ اب اس سے کوئی بات بولنی ہے تو اس کا خیال کر کے بولو۔"

"ہم خانم ہی کے خیال سے ادھر آئے ہیں۔ بلا خانم کا رشتہ دکان کا رشتہ نہیں ہے۔" نواب نے مشتعل لہجے میں کہا۔ "ہمارے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم اس گستاخی کی سزا کا تصور نہیں کر سکتے جو تم کر رہے ہو۔"

"ہم کو اس کا دکھ ہے پر ہم کو ایسی گستاخیاں کرنے کی عادت ہے۔ ہم نے آپ کی شان کا پورا لحاظ کیا ہے۔ آپ بھی ہم بے شان بے عزت لوگوں کا کچھ لحاظ کرو۔ ابھی ہماری ایک بہت ضروری آخری بات۔ گاڑی چلنے والی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی کھٹکا ہے تو ہم خانم کو آپ کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ اس سے علیحدہ میں بات کر لو لیکن اس سے پہلے ان لوگوں کو یہاں سے ہٹاؤ۔ دوسری بات کہ اس کے بعد بھی خانم پہ کوئی جبر کیا تو ہم وہ کریں گے جس کا تم ابھی تصور نہیں رکھتے۔ خانم کو ہاں کہہ رہی ہے تو ہم تمھارے پیروں پہ سر رکھ دیں گے پھر تم جو چاہے ہمارا کرنا۔ ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ ہماری طرف سے خانم ابھی طرح آزاد ہے۔"

نواب گنگ ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں خانم کو گھورتا رہا پھر کہیں دور سے آتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں خانم! یہ ہم کیا

سُن رہے ہیں؟"
خانم پر غشی طاری تھی۔ جہاں گیر نے اُسے سنبھالے رکھا تھا۔ اسٹیشن پر چاروں طرف بہت سے لوگ کھڑے ہوئے ہم لوگوں کو ایک ٹک حیرت سے دیکھ رہے تھے اور پولیس کی وجہ سے اِدھر آنے سے ہچکچائے ہوئے تھے۔ نواب نے مخصوص انداز میں پولیس والوں کو اسٹیشن سے جانے کا اشارہ کیا۔ تجمل نے اُس کی چھاتی سے چاقو ہٹا لیا۔ "جاؤ خانم! نواب صاحب سے بات کرو۔"
خانم کو بات کرنے کا یارا نہیں تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ نواب بہادر کی نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ خانم کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ تجمل نے ہم سب کو پلیٹ فارم سے جانے کا حکم دیا اور خود بھی کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ جہاں گیر نے اُس کا حکم نہیں مانا۔ تجمل نے اُسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ میں بھی گیٹ کے پاس ٹھہر کے دُور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ نواب بہادر خانم کے روبرو ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اُن کے درمیان شاید کوئی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد نواب نے شیروانی کے بٹن کھولے اور موتیوں کی مالا گلے سے اتار کے خانم کے ہاتھوں پر ڈال دی اور تیزی سے پلٹ کے واپس جانے لگا۔

نواب کی حویلی کے بڑے دروازے پر آ کے تانگا ٹھہر گیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ ہمیں شام ہی کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر گاڑیاں ہر جگہ تاخیر سے روانہ ہوئی تھیں۔ حویلی کی سڑک پر اور گرد و پیش سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بوڑھا پہرے دار اونگھ رہا تھا۔ تانگے کی آواز سے وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے لاٹھی سنبھال لی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ ودّو تھا۔ استاد جامو نے اپنے ایک پرانے ساتھی کو حویلی کی چوکیداری پر تعینات کر دیا تھا۔ دن میں وہ جامو کے اڈے پر لڑکوں کو کشتی کراتا تھا۔ سب سے پہلے تجمل تانگے سے اُترا۔ ودّو نے جیسے ہی اُسے دیکھا، لاٹھی چھوڑ کے تجمل کی طرف دوڑا اور اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔
ہم تین دن سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔ حیدرآباد میں تجمل کی دِلّی جانے کے ذکر ہی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے کوئی اعتراض اس لیے نہیں کیا تھا کہ مجھے کہیں نہ کہیں تو جانا ہی تھا۔ جیسے جیسے منزلیں کم ہوتی جا رہی تھیں، میرے اعصاب تنتے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر لوٹ رہا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد آج میں پھر اُس حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ بڑی حویلی جو اُس نے میرے نام کر دی تھی۔ زرّیں اب نہ جانے کیسی ہو گئی ہو گی۔ ممکن ہے وہ بدل گئی ہو۔ تین چار مہینے پہلے جب میں کلکتے میں تھا تو اُس نے جولین کا خط روانہ کیا تھا۔ خط سے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بمبئی میں کانتے بھی ہر وقت اُس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہو گی۔ میں نے اُسے اپنی خیریت کا ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ ودّو نے بڑا دروازہ پورا کھول دیا اور عمارت کے اندر کی طرف چیخ پکار کرتا ہوا بھاگا۔ حویلی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی میرے دل پر عجیب سا طاری ہونے لگا۔
عمارت کا دروازہ کھلنے سے پہلے آواز آئی: "کون ہے؟"
وہ اُسی کی آواز تھی۔ اضطراب آمیز، مرتعش سی۔ "کون ہے؟" اُس نے دوبارہ پوچھا۔
"دروازہ کھولو زرّی بٹیا! دیکھو کون آیا ہے۔" ودّو نے اونچی آواز میں کہا۔ "تمھارے بابا آئے ہیں، تجمل بھائی۔"
"میں ہوں زرّی بٹیا!" تجمل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔
دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور ہلکی روشنی میں زرّیں کا کانپتا ہوا سراپا نمودار ہوا۔ وہ ایک لمحے کو وہیں مبہوت کھڑی رہی۔ پھر وحشت سے تیز تیز سیڑھیاں اُترتی ہوئی آ کے تجمل کے سینے سے لگ گئی۔ "بابا! آپ!" وہ سراسیمگی سے بولی۔
"ہاں زرّی!" تجمل نے اُس کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا، تُو مجھے پہچانی نہیں۔"
"آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"
"تُو خواہ مخواہ پریشان ہوتی۔ بار کچھ ٹھیک نہیں تھا۔" تجمل اُس کے بازو دباتے ہوئے بولا۔ "اور یہ تُو کیسی ہو گئی ہے؟ [illegible] اور کمزور [illegible] کتنی دُبلی ہو گئی ہے۔ سب خیریت تو ہے؟ تُو نے میری بات نہیں مانی۔"
"بابا! آپ اتنے دنوں تک کہاں تھے؟" وہ [illegible] لگی۔
"شکایتیں بعد میں کرنا۔ دیکھ میں تیرے لیے کس کو لایا ہوں۔"
"منیر کہاں ہیں؟" وہ بے تابی سے بولی۔
"لاڈلا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ بھی آیا ہے۔"
"سچ!" وہ لفظ ناپتے ہوئے بولی اور تجمل سے جدا ہو کے ہم لوگوں کی طرف جھپٹی۔
"ارے بیٹے کیوں منہ چھپائے کھڑا ہے، سامنے آ لاڈلے [illegible]!" تجمل نے زور سے کہا۔ زرّیں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کے چونک کے رک گئی۔ اُس کی پلکیں تھرتھرا رہی تھیں۔ "اِس سے تو بعد میں ملنا۔ اِدھر دیکھ یہ خانم ہے۔" تجمل کی آواز پر وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں خانم کی طرف مڑ گئی اور اُس نے خانم کو جھجکتے، اٹکتے ہوئے آداب کیا۔ "اور یہ نٹ کھٹ چھوکری نیلاں ہے۔" نیلاں شرم سے دُہری ہو گئی۔
"اور اسے پہچان۔" تجمل جہاں گیر کو اپنے پہلو میں بھینچتے ہوئے بولا۔
"یہ..... یہ بھلا کون ہو سکتا ہے؟" جہاں گیر نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔
زرّیں اُسے حیرت بھری نظروں سے تکنے لگی۔ "چلیں! اندر چلیں۔" تجمل ایک جانب سے اُسے، دوسری جانب سے جہاں گیر کو سمیٹتا ہوا اُوپر چڑھ گیا۔
حویلی کی ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ زرّیں کی خادمائیں اور ملازم بھی شور سُن کے جاگ گئے تھے۔ وہ بوڑھی ملازمہ میری بلائیں لے رہی تھی جو کلکتے میں زرّیں کے ساتھ فلیٹ میں رہتی تھی۔ ہم سب ایک بڑے کمرے میں آ گئے تھے۔ زرّیں نے حویلی خوب سجا کے رکھی تھی، خود بکھری ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ نیا نیا تھا۔ کارنس پر تمام چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ چھت میں ایک بڑا فانوس لٹک رہا تھا اور فرش پر سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ تجمل دیوان پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ خانم اور نیلاں سامنے ایک ساتھ، ایک دوسرے سے چپکی ہوئی بیٹھ گئی تھیں۔ زرّیں نے اندر جاتے ہی حکم دینے شروع کر دیے تھے۔ "بابا! آپ نے کچھ تو نہیں کھایا ہو گا؟" وہ کئی بار یہ پوچھ چکی تھی۔ عجب اُوٹ پٹانگ سی باتیں کر رہی تھی۔ کہنا کچھ چاہتی تھی، منہ سے کچھ اور نکل جاتا تھا۔
"بیٹھ جا، تسلّی سے بیٹھ جا۔" تجمل نے جب کئی بار ٹوکا تو کہیں اُس کی زبان تھمی لیکن پھر اُس نے چائے بنانے کا حکم دیا۔ "بابا کا حقہ بھی تیار کر لینا۔ تمباکو رکھے رکھے سوکھ گیا تھا۔ میں نے تین دن پہلے ہی منگوایا ہے۔ بابا! آج صبح ہی سے مجھے لگ رہا تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔"
"روز تجھے ایسا لگتا ہو گا۔"
"بابا! میں ہر دوسرے تیسرے روز کلکتے خط لکھتی تھی۔ جامو بھائی اور کالے خاں برابر یہی جواب دیتے تھے کہ بس وہ آنے ہی والے ہیں۔ پھر ایک مہینہ ہوا کہ اُن کا خط بھی کم کم آنے لگا۔" میں نے زرّیں کو اتنا بولتے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی پتلیاں متحرک تھیں۔ نظروں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی مجھے دیکھتی تھی، کبھی جہاں گیر کو، کبھی خانم کو اور کبھی نیلاں کو۔ صبح تک کوئی نہیں سویا۔ زرّیں نے نہیں پوچھا کہ تمہارے ساتھ کون کون ہے۔ تجمل نے اُن کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ میں تیرے لیے ایک بڑی اور ایک چھوٹی بہن لایا ہوں۔
نیند کا پتہ ہی نہیں چلا۔ فیض آباد اسٹیشن پر اُتر کے سب کے چہروں پر تھکن سوار تھی۔ بیٹھے بیٹھے نیلاں اور خانم کی پنڈلیاں دُکھنے لگی ہوں گی۔ میں تو ہر اسٹیشن پر اُتر کے مسافروں کو دیکھنے لگتا تھا۔ میرے ساتھ جہاں گیر بھی ہوتا، کبھی کبھی تجمل بھی۔ شاید ہی کوئی ایسا مسافر ہو جس پر میری نظر نہ گئی ہو۔ میں ہر ڈبے میں جھانک کے بھی دیکھ لیتا تھا۔ ہر شہر میں یہ طے کرتا کہ اب کے نہیں جاؤں گا لیکن جیسے ہی کوئی اسٹیشن آتا، میں پھر نیچے اُتر جاتا۔ ہر جگہ یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید اُن میں سے کسی کی صورت دکھائی دے جائے لیکن تمام آدمی کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ ایسا ہوتا تو پھر کسی کو کسی کا ڈھونڈنا اتنا عذاب نہ ہوتا۔
نیلاں کی بوجھل آنکھیں زرّیں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ زرّیں کو اس طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی دُلھن کو دیکھتا ہے۔ خانم بہت کم سم بیٹھی رہی۔ زرّیں کو اچانک اُس کا خیال آیا تو وہ اُن دونوں کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جب وہ واپس آئیں تو اُن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ خانم نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور زرّیں کے پاس بیٹھی چپکے چپکے نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ نیلاں کان لگائے سُن رہی تھی۔ کبھی میری جانب اُس کی نگاہ اٹھتی تو آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگتے۔ جب زرّیں کو یہ معلوم ہوا کہ جہاں گیر اُس کا چھوٹا بھائی ہے تو پہلی مرتبہ تو اُسے اعتبار ہی نہیں آیا۔ پھر جب اُس نے جہاں گیر کو غور سے دیکھا تو اُس کے چہرے کے رنگ تیزی سے بدلنے لگے۔ جہاں گیر میں [illegible] کی بڑی مشابہت تھی اور یہ بڑی قیامت تھی کہ زرّیں نے بے شمار مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کی لاش اسی کمرے [illegible] میں رکھی گئی تھی۔ جہاں گیر زرّیں کی نگاہوں کا ہدف بنا، سہما سہما اور جھینپتا رہا۔ خانم نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ زرّیں اور خانم کے درمیان سکڑ کے بیٹھ گیا۔ میں وہاں سے اُٹھ کے باہر آ گیا۔
دن نکل آیا تھا۔ صبح کی دُھند اور [illegible] حویلی کے در و دیوار پر چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں کی ایک ایک جگہ معلوم تھی۔ آگے باغ تھا۔ میں نے باغ میں جانے کا ارادہ کیا لیکن میرے قدم خودبخود کمرے کی طرف اُٹھ گئے جہاں کبھی میں رہتا تھا۔ کمرے کی ترتیب وہی تھی۔ سامنے وہی پلنگ تھا جس پر میں سویا کرتا تھا۔ بستر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کے پاس تپائی پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر وہی بڑی گھڑی تھی جس کا گھنٹا اس کمرے میں محسوس ہونے لگتا تھا اور میں حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔ مجھ پر باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے۔ میں نے کمرے کی [illegible] سے [illegible] مجھے فوراً احساس ہو گیا۔ یہاں اب زرّیں سوتی ہے۔ اُس کی خوشبو بستر میں بسی ہوئی تھی۔ میں نے بے اختیار تکیے میں منہ چھپا لیا لیکن پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اندر آ رہا ہے۔ میں جلدی سے باہر دالان میں چلا آیا اور کرسی پر اونگھنے لگا۔
تھوڑی ہی دیر میں زرّیں کی خادمہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔ اُس نے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچا تو تجمل زرّیں سے کہہ رہا تھا۔ "بٹیا! اتنے دنوں میں [illegible] ہو گئی ہے۔ [illegible] اور کھانے کی پہچان بھی نہیں رہی۔" ہمارے درمیان ایک دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ زرّیں نے بنانے کیا کیا منگوایا تھا۔ "تاہم سب [illegible] کے کہا۔ "ہم نے ابھی چائے نہیں پی تھی۔" ایک ملازم نے [illegible] آنے کی خبر دی۔ زرّیں نے بتایا کہ وہ تو جامو کے مجھے پوچھنے [illegible]

کی خاطر اب کہیں آنے جانے کی بات نہیں کروں گا۔ اس نے یہاں آ کے اب تک جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ شاید مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ کھوئے ہوئے لوگ اچانک سے مل جاتے ہیں۔ کرشنا جی نے تمام دنیا میں خط لکھے تھے کیا نتیجہ نکلا؟ قبیل نے اتنی دوڑ دھوپ کی کیا حاصل ہوا؟ صرف جہاں گیر ملا، وہ نہیں ملی۔ جہاں گیر کو تو میں پہلے بھی چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ ہزاروں کا سینہ اس کی آنکھیں اس کے پاس ہوتی ہیں اور اس آدمی کی آنکھوں اور سینے میں کیا کچھ ہوتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے۔ میں یہاں بیٹھا لوگوں کی صورتیں دیکھتا رہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا سینہ بجھ گیا ہے۔ قبیل مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرتا تھا کرشنا جی بھی یہی کہتے تھے [illegible] انہیں کیا اندازہ تھا کہ ان کی باتیں سننا بھی میرے لیے سب سے بڑا صبر ہے۔ اگر لوگ میری جگہ ہوتے تو ان کے جگر پھٹ جاتے۔ جگر بھی میری جگہ [illegible] کہیں؟ تین پانچ ہزار میں بک گئی تھی۔ نیساں کی قیمت ساٹھ [illegible] تھی۔ کاش اس کی بھی کوئی قیمت ہوتی۔ پھر میں کہیں ڈاکہ ڈال لیتا۔ میں کچھ بھی کر لیتا۔ ایسا ہوتا تو کتنا آسان ہو جاتا۔

اب اس کے لیے محنت کرنے کو میرے پاس ایک ہی چیز رہ جاتی تھی اور وہ بھی بار بار ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ شاید کبھی وقت مہربان ہو جائے اور اس کا سایہ کہیں نظر آ جائے۔ یہاں اس طرح گھر میں بیٹھا میں اپنے بالوں کی جوئیں ہی تو گن سکتا تھا۔ جو لمحے ادھر اُدھر ضائع ہو گئے۔ اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔ وہ سنے گی تو مجھے معاف کر دے گی۔ اپنی طرف سے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اب جتنی دیر ہو رہی تھی ہر وقت یہ دھڑکا رہتا تھا کہ اور دیر نہ ہو جائے۔ قبیل بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ اچھی طرح یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس وقت اس سے کی جانے والی بات بے سود نہیں جائے گی میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تم کیا بولے گا کہ کل پرسوں چل دیں گے۔" وہ پرسکون انداز میں بولا۔ "یہی بولنا چاہتا تھا؟"

"ہاں، مگر تم میرے ساتھ کیوں جاتے ہو؟"

"کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے تمہارا ہی خیال ہے تمہیں اڈے سے دور ہوئے بہت دن ہو گئے۔ تمہیں اب واپس جانا چاہیے۔"

"اڈے کی بات مت کر، یہ کہو کہ تو اکیلا ہی جانا چاہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "غلط مت سمجھو۔"

"پھر ساتھ چلیں گے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سانس لے کے کہا۔ "تمہاری مرضی مگر کب چلو گے؟"

"میں نے بول دیا نا کل پرسوں۔" وہ ناگواری سے بولا۔ میں چپ ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے گزرنے کے بعد وہ کہنے لگا کہ اب دکن کی طرف جانے کا ہے اس کی رائے تھی کہ اب بھی ہمیں پروگرام بنا کے چلنا چاہیے۔ ہم جنوبی ہند سارے کا سارا دیکھ چکے تھے۔ اگر حیدرآباد میں جہاں گیر نہ ملتا تو ہم حیدرآباد سے اوپر کی طرف ہی جا سکتے تھے۔ قبیل کا خیال تھا کہ مولوی محمد شفیق شمالی ہند میں مراد آباد سے قریب کہیں بھیجے تو کسی نہ کسی کو ضرور نظر آتے۔ اسی کے پیش نظر اس نے جنوبی ہند کے انتہائی دور دراز حصوں میں سفر کیا تھا۔ قبیل نے وسطی ہند جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرے لیے ہر جگہ یکساں تھی۔ وہ کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ دوسرے دن صبح قبیل نے مجھ کو بتا دیا کہ وہ کل یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ گھر میں بھی خبر ہو گئی اور زرین نے بھی سن لیا۔ سب کے چہروں پر بادل سے چھا گئے۔ جہاں گیر قبیل کے پاس آ کے رونے لگا۔ دوپہر کے کھانے پر خانم نے قبیل سے درخواست کی کہ وہ ابھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دے۔

"تم لوگ بولتی ہو تو میں رک جاتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے گا۔" قبیل نے ملائمت سے کہا۔ "جتنی جلدی ہم جائیں گے اتنی جلدی واپس آ جائیں گے۔" خانم نے اس کے بعد اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کو میں باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ نیساں میرے پاس آ گئی اور جھکی جھکی پلکوں سے وہی بات دہرانے لگی جو خانم نے قبیل سے کہی تھی۔ میں نے اُسے پاس بٹھا کے سمجھایا کہ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں نے اُسے تاکید کی کہ زرین اور خانم کی کوئی بات اسے بُری لگے تو وہ دل پر میل نہ لائے۔ گھر میں کسی نہ کسی سے کوئی بُری بات ہو ہی جاتی ہے۔ وہ کبھی خانم کی شکایت زرین سے یا زرین کی شکایت خانم سے نہ کرے۔ نیساں بولی کہ مجھے تو خود ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ میری کوئی بات آپی یا خانم کو بُری نہ لگ جائے۔ میں نے کہا۔ "پگلی! آپی اور خانم بہت سمجھ دار ہیں۔ بڑوں کا کام نظر انداز کرنا اور معاف کرنا ہوتا ہے اور ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اُداس مت ہو جانا۔ چھوٹوں کو ذہن کے رہنا اور انہیں بڑی سمجھ کے چپ ہو جانا۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔" نیساں شکایت کرنے لگی کہ زرین باجی مجھے کام نہیں کرنے دیتیں۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہی کرتی ہیں۔ گھر میں نوکر اور نوکرانیاں موجود ہیں تو تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے لیے پڑھنے کا کام کیا کم ہے۔ اس سے فرصت پاؤ تو خوب کام کرنا پھر زرین بھی منع نہیں کرے گی۔" بولی۔ "میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں ہر وقت زرین باجی کے پاس بیٹھی دعا کروں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ پھر آپ کے کام

پوچھنے لگی کہ کیا آپ ان سے ناراض ہیں؟" میں نے کہا "نہیں ناراض ہوتا تو میں تمہیں یہاں کیوں لاتا۔" کہنے لگی "مجھے ایسا ہی لگتا ہے تو پھر آپ ان سے بات کیوں نہیں کرتے؟" میں نے کہا "کرتا کیوں نہیں ہوں۔" بولی "ایسے بات تھوڑی کرتے ہیں وہ تو ہر وقت آپ کا خیال رکھتی ہیں۔" بتانے لگی کہ زرین نے میرے لیے بہت سے کپڑے بنوائے ہیں بہترین کپڑے کی شیروانیاں، اچکن کے کرتے وہ خود اپنے ہاتھ سے سی رہی ہے۔ نیساں مجھے بتانے لگی کہ جب بھی میرا ذکر آتا ہے "زرین خاموش ہو جاتی ہے یا بات بدل دیتی ہے یا وہاں سے اٹھ کے ہی چلی جاتی ہے۔" میں نے اس سے پوچھا کہ میں اس کے لیے کیا لاؤں؟ اس نے جواب دیا کہ بس آپ آ جائیں۔ ساتھ کر کے آپ جس کام کے لیے جا رہے ہیں اس میں پوری کامیابی ہو۔ میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ نیساں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہنے لگی "بابر بھائی! میں آپ کے لیے روز دعا کروں گی۔" میں نے کہا "بہت سے لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔" کہنے لگی "دیکھیے گا میری دعائیں بہت قبول ہوتی ہیں۔ میں نے آپ کے گھر دعا مانگی تھی، دیکھیے قبول ہو گئی۔"

میں اسی لیے دن بھر بار بار بیٹھک میں بیٹھا رہا تھا یا پھر باغ میں آ گیا تھا کہ ایک ہی دن کی بات ہے۔ گھر کے لوگوں کے سامنے کم سے کم آیا جائے مگر مجھے نیساں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی۔ قبیل اس دن آدھے نہیں گیا۔ لوگ اس سے ملنے آتے رہے۔ رات کو کھانا بھی قبیل نے بیٹھک میں نہیں کھایا۔ ان لوگوں کو یہیں بھجوا دیا گیا۔۔۔ ادھر ہم سب ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاں گیر، قبیل اور میں ایک طرف اور وہ تینوں دوسری طرف۔ کسی سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔ ہم سب اُداس سے بیٹھے تھے۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے ان کی خاموشی کی وجہ میں ہوں۔ میں یہاں سے اُٹھ آیا۔ ایک رات اور باقی تھی کل کسی وقت جانا ہی تھا۔ کیا پتہ پہلی ہی منزل پر وہ مل جائے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے عالی شان محل میں بیٹھی ہے کنیزیں باندیاں اس کی خدمت میں حاضر ہیں مگر فوراً مجھے احساس ہوا اگر وہ کسی محل میں ہوتی تو میری رسائی اس تک کس طرح ہو سکے گی۔ پر وہ محل ہی ہو یا جھونپڑی میں۔ جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ اس کے دروازے پر کون کھڑا ہے تو وہ ہزار بندھن توڑ کے دوڑ کر بھاگتی ہوئی میرے پاس آ جائے گی اور میں جب اسے دیکھوں گا۔ میں نے کتنی بار سوچا تھا کہ جب وہ میرے سامنے آئے گی تو میرا کیا حال ہوگا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہا جائے گا میری آنکھیں جل جائیں گی۔

کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ میں جیسے سوتے سے چونک پڑا۔ زرین اندر آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں تھیں۔ وہ اس نے میز پر ایک طرف رکھ دیں اور میرے نزدیک آ کے آہستگی سے بولی۔ "یہ سامان ساتھ لیتے جانا۔"

وہ اِدھر اُدھر جانے لگی۔ "بیٹھو۔" میں نے جھجک کر کہا۔

"رات خاصی ہو گئی ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"اچھا۔" میں نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔ "کیا بہت وقت ہو گیا؟

"کیا تم سو گئے تھے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے بے دھیانی سے کہا۔ "میں جاگ رہا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"کیسے؟" میں نے متعجب ہو کے کہا۔ "بیٹھو۔"

اس نے پلکیں اٹھا کے مجھے دیکھا۔ میں اسی لیے یہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زرین کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے ہوئی ہوں گی، میرے جانے سے اور بھر آئیں گی۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ یہ کپڑے اس کے بدن پر بہت سجتے تھے۔ تنگ موری کا پاجامہ، پشواز اور سر پر دوپٹا۔ اس کے کانوں میں آویزے لٹک رہے تھے۔ یہ آویزے اسے خانم نے دیے تھے۔ خانم نے مہندی لگوا کے اس کی کلائیاں چوڑیوں سے بھروا دی تھیں اور نیساں نے اس کے ہاتھوں پر مہندی سے نقش و نگار بنائے تھے۔ ٹھوڑی پر کالا تل بھی نیساں ہی نے بنایا ہوگا کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے۔ وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی جیسے ایک رنگین مجسمہ ہو جیسے ابھی اس میں جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہو۔ [illegible] کا قد بھی اتنا ہی بڑا ہوگا [illegible] سے بچھڑ کے [illegible] سے کہیں زیادہ [illegible] میں وہ ہو [illegible] ضرور [illegible] اس کے ہاتھ تھام لوں گا اور ان سے اپنا چہرہ چھپا لوں گا اس طرح رات بھر [illegible] بیٹھی رہے گی [illegible] کہ وہ میرا [illegible] دے یا اپنے سینے میں چھپا لے تاکہ میں خوب روؤں لیکن میں اس کی صورت دیکھتا رہا میرا گلا بند ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر جب جانے لگی تو میں اسے روک بھی نہیں سکا۔ تمام رات [illegible] ذہن میں بے شمار باتیں منڈلا رہی تھیں، میری زبان پر جیسے تالا لگ گیا تھا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے اسے آواز دینا چاہا۔ دروازے پر جا کے اس نے ایک بار مڑ کے دیکھا میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ابھی دالان ہی میں ہوگی میں نے اس کے پیچھے بھاگنے اور اس کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا مگر اسے روک کے مجھے کیا کہنا چاہیے کہ میں نہیں جاتا؟ میں کہاں جا رہا ہوں یا میں اسے یہ اطمینان دلانے کی کوشش کروں کہ جلد واپس آ جاؤں گا اور اس بار خیریت کے خط بھی لکھتا رہوں گا یا میں رو دیا۔ انتظا

کرتی ہے اور آپ سے میری قسم کہ ایک آنسو بھی نہ بہائے۔

میں دروازے کی جانب تیزی سے بڑھا۔ اُس کی چوڑیوں کی بازگشت دالان میں گونج رہی تھی۔ وہ دالان سے گزر کے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی لیکن باہر آ کے میرا جسم پھر ٹھٹھر کے رہ گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ہم فیض آباد سے چل کے گونڈا اور گونڈا کے راستے سے جھانسی آ گئے۔ جھانسی سے للت پور، گوالیار، شیوپوری، گونا، اُجین، اجمیر، اندور، امراوتی، ناگپور... نام بھی یاد نہیں۔ ہم تقریباً چار مہینے تک وسطی ہند کے کونے کونے میں پھرتے رہے۔ آپا جان بھوپال کے علاوہ اجمیر اور گوالیار میں بھی ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد اُن کا کوئی نشان نہیں ملا۔ جزیرہ ہند کی طرح ہم نے اپنی دانست میں کوئی بستی نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں ریلوں کے راستے نہیں تھے، وہاں ہم نے لاری سے سفر کیا۔ جہاں لاری بھی نہیں جاتی تھی، وہاں ہم گھوڑوں اور چھکڑوں پر چلتے رہے۔ جہاں مسجدیں اور مدرسے تھے، جہاں بھی کوئی چھوٹی سی بستی تھی، وکٹوریہ لائبریریاں، محلوں کے چودھری اور مدرسوں سے پوچھ گچھ کی۔ جہاں جہاں بھی اُن کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا ہم وہاں وہاں گئے۔ پھر ایک دن تجمل نے اچانک وسطی ہند میں اور آگے جانے کے بجائے شمال مشرق کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ ٹکرسی پی سے راج گڑھ قریب تھا۔ ہم دوسرے راستوں سے ہوتے ہوئے پھر اجمیر واپس آ گئے۔ تجمل نے اس بار بھی وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاں حاضری دی اور ایک دن تک مزار کے احاطے میں پڑا رہا۔ اجمیر سے ہم جودھ پور آ گئے۔ جودھ پور سے بیکانیر اور بیکانیر سے جیسلمیر۔ جیسلمیر راج پوتانے کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو عصر کا وقت تھا۔ سامنے جو مسجد نظر آئی ہم اُس کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ نمازی باہر آ رہے تھے۔ ہم نے اُنھیں روک کے پہلے آپا جان کا حلیہ بتایا۔ آپا جان برقع ہمیشہ کہیں نہیں لیتے تھے۔ نمازیوں نے ایسے حلیے کے کسی شخص کو جاننے سے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے پھر ابو کا حلیہ بیان کیا اور بتایا کہ اُن کے ساتھ تین لڑکیاں بھی ہوں گی مگر وہ آپا جان یا گھر کے کسی دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ پھر میں نے اُن کے سامنے مولوی محمد شفیق کا نام لیا۔ اُن کا رنگ، قد اور ناک نقشہ بتایا۔ مولوی محمد شفیق کا حلیہ سن کے سب ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے اور ایک بزرگ شخص نے بڑی بھاری آواز میں کہا: "میاں! تم اُنھیں کیسے جانتے ہو؟"

میرا دل گھبرانے لگا۔ یکایک تجمل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھینچ لیا اور خود اُن کے سامنے ہو کے بولا: "بڑے صاحب! کیا وہ یہیں ہیں؟"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" بزرگ آدمی نے متانت سے کہا۔ "میں نے پوچھا تھا کہ آپ اُنھیں کیسے جانتے ہیں؟"

"ہم اُن کے کچھ لگتے ہیں۔" تجمل نے جھجک کے کہا۔

"میں یہی تو پوچھ رہا ہوں بھائی کہ آپ اُن کے کیا لگتے ہیں؟"

"ہم اُن کے رشتے دار ہیں۔"

"رشتے دار ہیں؟" بزرگ نے اپنے ساتھی نمازیوں کی طرف دیکھ کے دہرایا۔ اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کیا رشتے داری ہے آپ کی جناب؟"

"بڑے صاحب! آپ ہمیں یہ بتائیے کہ وہ کہاں ہیں؟ یہیں ہیں یا کہیں اور؟" تجمل نے بڑی نرمی سے کہا۔

"آپ اُن سے کب سے نہیں ملے؟" ایک دوسرے شخص نے پوچھا۔

"بہت دن ہو گئے، برس بیت گئے۔ آٹھ برس سے بھی زیادہ۔" تجمل کے لہجے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ "لیکن آپ لوگ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ ہماری بات کا جواب دو؟"

"آپ کی بات کا کیا جواب دیں؟" بوڑھے آدمی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"مراد آباد سے۔"

"جیسلمیر کب آئے؟"

"ابھی دیر ہوئی ہے۔"

"آپ کو اُن کا پتہ کس نے دیا تھا؟"

"ہم اُنھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ نکلے ہیں۔"

مجھے اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگ دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ تجمل نے میرے پہلو میں سختی سے اپنی انگلیاں چبھا رکھی تھیں۔ وہ لوگ پولیس والوں کی طرح نہ جانے کیسے کیسے سوال کر رہے تھے۔ جیسے ہم مولوی صاحب کے بارے میں نہیں کسی مجرم کے بارے میں پوچھ رہے ہوں۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ "آپ بتاتے کیوں نہیں؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مولوی صاحب کہاں ہیں؟"

"تم چپ رہو۔" تجمل نے زور سے میرا بازو مروڑ دیا اور جھکتے ہوئے بولا: "کیا اب وہ یہاں نہیں رہتے؟"

"نہیں بھائی!" بزرگ آدمی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: "آئیے، میرے ساتھ آئیے۔ آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"ابھی کہیں نہیں اور نہ کہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ ہم صرف مولوی صاحب سے ملنے آئے تھے۔ آپ اُن کا پتہ جانتے ہیں تو ہمیں بتا دو۔"

"خدا بہتر جانتا ہے، بڑی لمبی کہانی ہے۔ آئیے، میرے ساتھ گھر چلیے۔ آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں تو ہمارے بھی عزیز ہیں۔ وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا، اُن کے دوست اور بہی خواہ یہاں کم نہیں ہیں۔ میں کچھ کو کیا بتاؤں۔ چلیے، گھر چلیے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

تجمل نے گردن جھکا لی۔ "آؤ چلیں۔" اُس نے میری کمر پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی کی۔ "سنبھل کے رہو، یہ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔"

بزرگ آدمی کا گھر مسجد سے کوئی پچاس قدم دور ہوگا۔ کئی نمازی بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ میری آنکھیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ چھوٹی اینٹوں سے بنا ہوا قدیم طرز کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ بزرگ نے اندر جا کے چند لمحوں بعد بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ وہاں زیادہ سامان نہیں تھا۔ اونچے پایوں کا ایک پلنگ، طاقوں میں چند کتابیں، تین چار شکستہ کرسیاں۔ ہم بیٹھے تو معاً اُس کمرے کا سناٹا مجھے یوں لگا جیسے کسی نے نچوڑ دیا۔ بوڑھا آدمی چارپائی پر بیٹھ کے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں اور زیرِ لب کوئی آیت تلاوت کی۔ پھر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا: "آپ حضرات کا نام؟"

"اس کا نام حمید اور میرا اکبر خاں ہے۔" تجمل نے تیزی سے کہا۔

"میرا نام منیر علی ہے۔ مولوی صاحب مجھ پر بہت کرم کرتے تھے۔ وہ میرے پڑوسی بھی تھے، مرشد بھی۔ وہ برابر والے مکان میں رہتے تھے۔ آپ ہماری باتوں کا بُرا مانتے ہوں گے لیکن پچھلے دنوں ایسی ہی بات تھی جو آپ سے اتنا کچھ پوچھا گیا۔ کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ کوئی بات ناگوار گزری ہو تو مجھے معاف کریے۔"

"کچھ نہیں بڑے صاحب!" تجمل نے دھیمی آواز سے کہا۔ "یہ غم گرم جوشی رہتا ہے۔ آپ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

"کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں۔" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔ "آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔" میری سانس اکھڑنے لگی۔ "گزشتہ رمضان کی بات ہے، شاید دسواں روزہ تھا۔ سحری کے بعد مولوی صاحب معمول کے خلاف نماز پڑھانے نہیں آئے۔ نماز کے بعد ہم چند لوگ اُن کی خیریت دریافت کرنے اُن کے گھر پہنچے کہ خدا نخواستہ اُن کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ مولوی صاحب نے ناغہ کیا ہو۔ جب سے یہاں آئے تھے پابندی کے ساتھ وقت پر پہنچ جاتے تھے۔ ہم نے آوازیں لگائیں، اندر سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ ہمیں تشویش لاحق ہوئی۔ کنڈی کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے پھر بھی آوازیں دیں مگر اندر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ ایک چھوٹی بچی کو ہم نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے ڈرتے ڈرتے مکان میں بھیجا۔ وہ سہمی ہوئی واپس آئی اور پھر جب ہم نے خود اندر جا کے دیکھا تو سارا گھر اُجڑا ہوا تھا۔ سامان تتر بتر تھا اور کوئی ذی نفس وہاں موجود نہیں تھا۔ نہ جانے کیا حال ہوا۔ رات کو تراویح کے بعد ہم ساتھ ہی گھر واپس گئے تھے۔ تراویح سے سحری کے دوران یہ سب کچھ گزر گیا۔ مولوی صاحب بہت..."

منیر علی کا گلا رندھ گیا۔

"اور پھر اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا؟"

منیر علی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "نہیں بھائی! اِدھر اُدھر کئی جگہ آدمی دوڑائے، کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

"اُن کے ساتھ اور کوئی بھی رہتا ہوگا؟" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں میاں! اُن کی ایک بیٹی بھی اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ آپ تو اُسے جانتے ہوں گے۔ کیسی نیک سیرت بچی تھی۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔ ہمیشہ جھکی ہی دیکھیں۔"

"کیسی تھی وہ؟" میرا سارا جسم کپکپانے لگا تھا۔ میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا: "وہ... اُس کا نام؟..."

تجمل نے اُٹھ کے میرے شانے پر زور سے دبا کے مجھے دوبارہ مونڈھے پر بٹھا دیا۔ "اس کا مطلب ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "اب تو وہ ابھی بڑی ہو گئی ہوگی۔"

"ماشاء اللہ۔ خدا اُس کا نگہبان ہو۔" منیر علی نے جھجکتے ہوئے کہا اور مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"وہ دونوں ہی چلے گئے؟" تجمل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"چلے کیا گئے، کیا کہا جا سکتا ہے۔ جانا اسے کہتے ہیں بھلا؟ خدا اُنھیں اپنی امان میں رکھے، جہاں رہیں خوش رہیں۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ طرح طرح کے خیال آتے ہیں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رات کو ہم سے خوب اچھی طرح باتیں کرتے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ مسجد کی چٹائیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں، اُنھیں بدلوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ ہم سے ناراض ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور کوئی بھلا اس طرح اچانک ناراض ہوتا ہے۔ جب سے گئے ہیں، مدرسہ بھی ویران ہو گیا ہے۔ بچے بالے سب پھر بھٹک گئے ہیں۔ اُن کی پڑھائی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی دوسرے کا پڑھایا ہوا اُن کے پلے ہی نہیں پڑتا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ جانا ہوتا تو مجھ سے ذکر ضرور کرتے۔ اور بھائی! صاف بات تو یہ ہے کہ کوئی یوں گھر سے نہیں نکلتا، وہ بھی جوان بچی کے ساتھ۔"

"وہ اپنے بارے میں کیا بتاتے تھے؟" تجمل نے آہستگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہاں آئے تھے تو بچی ساتھ تھی۔ تھوڑا سا سامان تھا۔ سب سے پہلے مجھ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے کہا کہ میں یہاں اس شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے۔ میں نے کہا بسم اللہ، برابر کا مکان خالی ہے، دیتا ہوں، آپ یہیں رہیے۔ بس رہنے لگے۔ مجھ سے کہا کہ مجھے کوئی روزگار بھی فراہم کر دو۔ میں نے اپنے ایک شناسا عبداللہ بھائی سے بات کرا دی۔ عصر کے بعد وہاں چلے جاتے تھے۔ مغرب کی نماز وہیں پڑھتے تھے اور عشاء سے پہلے واپس آ جاتے تھے۔ حساب کتاب کا کام تھا۔ عبداللہ بھائی نے چند ہی مہینوں میں تنخواہ بڑھا دی۔ اِدھر ہم لوگوں نے اُن کا کچھ انتظام مدرسے سے کرا دیا تھا۔ امامت کا وہ ایک پیسہ نہیں لیتے تھے۔ کبھی اُن سے کچھ نہیں کہا۔ قسم ہے جو کبھی ایک حرف بھی شکایت کا ادا کیا ہو۔ عبداللہ تو اُن کے پیچھے مرید ہو گئے تھے۔ وہ اُنھیں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے لیکن مولوی صاحب آمادہ نہیں ہوتے۔ میری بچی اُن کی لڑکی کی ہم عمر ہے اور دونوں ہم جولیاں تھیں۔

بیٹا جو ہر وقت اُس کی یاد میں روتی رہتی ہے۔ میں اُسے کیا سمجھاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے اور کب واپس آئے گی؟"

"نرجس! کیا اُس کا ... اُس کا یہی نام تھا؟" میں نے سرگوشی سے پوچھا۔

"ہاں۔ مولوی صاحب اُسے نرجس ہی کے نام سے پکارتے تھے۔" منیر علی نے جواب دیا۔ "نرجس کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور تمام صفاتِ حسنہ بھی اُسے ودیعت کر دی تھیں۔ وہ مولوی صاحب کی آنکھوں کا سکون تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مولوی صاحب زندہ ہی اُس کے لیے ہوں۔ مسجد، مدرسے اور علالت سے جو وقت بچتا تھا مولوی صاحب بچی کے ساتھ گھر ہی میں گزارتے۔ اُن کو بس نہیں چلتا تھا کہ مزید وقت کہاں سے نکال کے گھر میں گزاریں۔ ملنے جلنے میں وہ بہت محتاط تھے۔ تقریبات میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بستی کے لوگوں کو شکایت بھی ہوتی لیکن مولوی صاحب ایسے لہجے میں اُن سے معذرت کرتے کہ پھر کچھ کہا نہیں جاتا تھا بلکہ خود شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ بچی کا بھی یہی عالم تھا۔ دو تین گھروں میں جانے کے سوا وہ گھر سے قدم نہیں نکالتی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ محلے کی بچیاں خود ہی اُس سے ملنے اُس کے یہاں آجاتی تھیں۔ ہم لوگوں نے کئی بار اشارۃً مولوی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی کہ آپ نرجس کو جانے کیوں نہیں بھیجتے، وہ مسکرا کے رہ جاتے تھے۔ کہتے تھے بھیا! تم کچھ اور سمجھنا لیکن اُسے ایک لمحے کے لیے اپنے سے جدا کرنا مجھے گوارا نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم اُن کے مزاج کے عادی ہو گئے تھے۔ ہم نے اُن سے شکوہ کرنا ہی ترک کر دیا تھا۔ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ ہماری ایسی باتوں سے وہ اُداس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اور سب کچھ برداشت تھا مگر اُن کی پیشانی پر بل نہیں دیکھے جاتے تھے۔"

منیر علی بولتے بولتے رُک گئے اور معذرت کر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے ساتھ چوڑیوں کی آواز بھی آئی تھی۔ اُن کے جاتے ہی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے مولوی صاحب کی باتیں شروع کر دیں۔ فیصل خاموشی سے سنتا رہا۔ منیر علی جس لڑکی کا ذکر کر رہے تھے میرا دل کہتا تھا وہ نرجس کے سوا کوئی نہیں ہو گی۔ مولوی صاحب نے یہاں آکے اُس کا نام بدل دیا ہوگا۔ میرے گلے میں کرب کا کانٹا سا چبھ رہا تھا۔ وہ اس بیٹھک میں آتی ہوگی۔ مجھے یہ سب ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور میری رگیں جیسے کوئی کھینچے لے رہا تھا۔ منیر علی واپس آئے تو اُن کے ہاتھوں میں مٹھائی اور نمکین چیزوں سے بھری ہوئی تام چینی کی دو پلیٹیں تھیں۔ اُنھوں نے پلیٹیں سامنے رکھ دیں اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کچھ کھائیں۔ فیصل نے دال سیو وغیرہ لیے لیکن مجھ سے ہاتھ نہیں بڑھایا گیا۔ منیر علی نے زیادہ اصرار کیا تو فیصل نے آہستگی سے کہا: "بڑے صاحب! اِن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نصیبِ دشمناں کیا بات ہے؟" منیر علی تشنگی سے بولے۔ "آب و ہوا بدلنے سے ہی ہوتا ہے۔ یہ علاقہ بھی کم لوگوں کو راس آتا ہے مگر یہ تیل میں تلی

بڑی چیزیں نہیں ہیں۔ گھر کی ہیں۔ کچھ کھائیں میاں! اُٹھتے جاؤ تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"نہیں نہیں" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"آپ لڈو کھائیے اور تل کے ہیں میری بیٹی نے بنائے ہیں۔ مولوی صاحب بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔" منیر علی نے پلیٹ میرے آگے کر دی۔

"نہیں نہیں۔" میری آواز رندھنے لگی۔ "آپ ... آپ کیا بتا رہے تھے؟"

"مولوی صاحب جیسلمیر کب آئے تھے؟" فیصل نے نرمی سے پوچھا۔

"تین سال سے کچھ زیادہ ہوئے ہوں گے۔" منیر علی نے تذبذب سے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے کہا۔ "مجھے خوب یاد ہے تین رمضان تو اُنھوں نے یہیں گزارے۔ یہ تیسرا ہی تھا نا؟" دوسرے لوگوں نے سر ہلا کے تائید کی۔

"آپ لوگوں نے اُنھیں کہاں کہاں ڈھونڈا؟" فیصل نے پوچھا۔

"اِدھر اجمیر، بیکانیر، جے پور اور اُدھر میرٹھ، [illegible]، حیدرآباد، نزدیک دُور جتنے شہر تھے، جہاں جہاں لوگ جاتے رہے، اُنھیں تلاش کرتے رہے۔"

"آپ نے پولیس کو بھی بتایا؟"

"ہاں بھائی! یہ بھی کیا۔ کئی بار تھانے والوں کے چکر لگائے۔ ریاست کے با اثر لوگوں کو درمیان میں ڈالنے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر اُن کا سامان ایک کوٹھری میں بند کر کے تالا ڈال دیا گیا۔ میں نے ابھی تک اُن کے لیے مکان خالی رکھا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے جی ہول آتا ہے۔ میری بیٹی روز وہاں جھاڑو دیتی ہے۔ بیگم کہتی ہے کہ وہ لوگ اچانک آگئے تو کیا کہیں گے کہ گھر کتنا گندا رکھا تھا۔"

"جس دن سویرے مولوی صاحب دکھائی نہیں دیئے اُس سے پہلے آپ لوگوں نے اُن کے پاس کسی کو آتے جاتے تو نہیں دیکھا تھا؟"

"پولیس نے بھی ہم سے یہ سوال کیا تھا مگر ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں دیکھا۔ تین سال کی مدت میں اُن سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ دونوں مکانوں میں ایک دیوار ہی تو حائل ہے۔ اس طرف کی اونچی آواز اُس طرف پہنچتی ہے۔ بیٹھک میں خواتین کے آنے جانے کے لیے کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ کوئی آتا تو ہمیں ضرور خبر ہوتی۔"

"اور یہاں مولوی صاحب سے کن کن لوگوں کا ملنا جلنا تھا؟"

"جہاں تک میرے علم میں ہے مسجد کے نمازیوں، محلے کے لوگوں اور عبداللہ بھائی کے ہاں آنے جانے والوں کے سوا اُن کا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ خود ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ میں تو کہوں گا کہ وہ کترانے کی حد تک لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ جشن تقریبوں میں اُنھیں بہ مجبوری کیا گیا۔ شاید وہ ایک ہی بار گئے ہوں۔ بس رسمی طور پر شریک ہوتے تھے۔ تین سال میں صرف ایک بار وہ بھی ڈھائی دن کے لیے باہر گئے۔ یہ اُن کے جانے سے کوئی ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ میرے اصرار پر ایک دفعہ اجمیر شریف چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال تھا، نرجس کو

ہمیں چھوڑ دیں گے مگر اُنھوں نے نرجس کو بھی ساتھ لے چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ لہٰذا میں نے گھر سے اپنی دونوں بچیوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم حاضری دے کے پرسوں ہی واپس آگئے تھے۔"

"جانے سے ڈیڑھ مہینے پہلے؟" فیصل نے تکرار کی۔

"جی ہاں۔" منیر علی نے آنکھیں میچ کے جواب دیا۔

"اور اجمیر شریف کے سوا آپ کہیں نہیں گئے؟"

"نہیں کچھ وقت تو آنے جانے میں گزرا۔ باقی اجمیر شریف میں۔" منیر علی نے جھجک کے کہا۔ "سفر سے واپسی پر وہ بہت خوش تھے۔ مجھ سے کہا کہ اب گھر سے باہر نکلا کیجیے طبیعت بہل جائے گی۔ اُنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ عید کے بعد ہم ساتھ دلی چلیں گے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پہ حاضری دیں گے۔"

فیصل خاموش بیٹھا کچھ دیر تک سر جھکائے رہا اور اندر سے آیا ہوا دودھ کا شربت پیتا رہا۔ پھر گلاس رکھ کے اٹھنے لگا۔ "بڑے صاحب! اب ہم پھر کسی وقت آئیں گے۔ آپ کا ہم نے بہت وقت لیا۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

"واہ صاحب! دوبارہ آنے کا کیا سوال۔ آپ یہیں میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ گھر جیسا ہے آپ کا ہے، میں آپ کو کہیں اور نہیں ٹھہرنے دوں گا۔ آپ کا سامان کہاں رکھا ہے؟"

"تھوڑا سا سامان تھا، وہ ہم نے ایک ٹھکانے پر رکھوا دیا تھا۔ آپ کی مرضی ہے، ہمیں جانے دیں تو ہم پھر آئیں گے۔"

"نا صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ جیسلمیر میں ٹھہرے تو میرے قریب خانقاہ پہ ٹھہریں گے۔ میرے آپ سے کئی رشتے نکلتے ہیں۔ ایک تو آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔ اس شہر میں مجھ سے زیادہ کوئی اُن سے قریب نہیں تھا۔ دوسرے آپ میرے ہم وطن ہیں۔ تیسرے سب سے پہلے آپ کی مجھ سے بات ہوئی ہے۔ انکار کیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے کسی لائق نہیں سمجھا۔"

فیصل نے بہت منع کیا مگر منیر علی ضد کی حد تک اپنی بات پر اڑے رہے۔ فیصل بہ مشکل رکنے کو آمادہ ہو گیا۔ منیر علی نے اُسی وقت ہم سے دکان کا پتہ پوچھ کے ایک آدمی روانہ کر دیا کہ وہ وہاں سے ہمارا سامان اُٹھا لائے۔ باقی لوگ رات کرنے کا کہہ کے رخصت ہو گئے۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جب منیر علی اندر چلے گئے تو فیصل میرے قریب آگیا اور مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا: "میں جانتا ہوں تجھے کیا لگ رہا ہوگا پر ذرا اپنے آپ کو تھام کے رکھ۔ جانا تو اب تیری طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی بات اُوپر تلے ہو گئی تو اُسی کی بدنامی ہوگی۔ لوگ اچھا بُرا سوچنے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔"

"میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتہ ہے پر یہ پانی آنکھوں ہی میں بند رکھ۔"

"یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے تجھ سے کچھ الگ نہیں سنا ہے رے!"

"یہاں سے چلے چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ تم یہاں ٹھہر کیوں گئے؟"

"کیا اُس کے گھر سے اتنی جلدی چلا جائے گا؟"

"پر وہ ہے کہاں۔ اُس کا ملنا میرے نصیب میں نہیں ہے۔" میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "وہ نہیں ملیں گے، کبھی نہیں ملیں گے۔" میں نے بکھرے ہوئے انداز میں کہا۔

"کچھ سوچا سمجھا کر لاڈلے! تجھے تو اس کے خوش ہونا چاہیے کہ وہ خیریت سے ہے۔ عزت سے رہ رہی تھی۔ یہاں آکے بھی اُس کا کھوج چلتا تو ہم کیا کر لیتے۔" دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فیصل نے جلدی سے پونچھے اور میرا زانو تھپ تھپاتے ہوئے بولا: "اپنا نہیں تو کچھ اُن کا خیال کر لے۔"

"چائے پی لیجیے۔" منیر علی چائے کی پیالیاں لیے ہوئے بیٹھک میں آگئے۔

"آپ بہت تکلیف کر رہے ہیں بڑے صاحب! اجازت کریں۔" فیصل نے اُٹھ کے اُن کے ہاتھ سے چائے لے لی۔

"تکلیف کیسی جناب! یہ تو میں راحت ہے۔ آپ نے سنا نہیں ... باتوں باتوں میں مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ سفر کی تکان سے آپ کو چائے کی طلب ہوگی۔ آپ مولوی صاحب کے وطن کے ہیں۔ آپ حضرات چائے شوق سے پیتے ہوں گے۔ مولوی صاحب بتاتے تھے کہ لکھنؤ میں چائے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ یہاں بھی اب بہت سے گھروں میں یہ رسم چل پڑی ہے۔ مولوی صاحب پابندی سے صبح و شام چائے پیتے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہمارے گھر کے بچے بھی عادی ہو گئے ہیں۔" منیر علی کہتے کہتے رُک گئے اور رومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگے اور ماحول بدلتے ہوئے بولے: "دیکھیے صاحب! اگر کوئی تکلف کریں گے تو شکایت ہوگی۔ گھر میں سب کچھ لایا ہوا رکھا ہے۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف کہیے گا۔" منیر علی ہمیں گھر کا نقشہ سمجھانے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ اُن کی بیوی پانچ سال پہلے گزر چکی ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بھی فوت ہو گیا ہے۔ دوسرا لڑکا کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ ایک لڑکی کی شادی ہو گئی ہے وہ بھی جے پور میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک بارہ سالہ لڑکا اُن کے ساتھ ہیں۔ منیر علی کی ایک بچی بچپنے میں چل بسی تھی۔ تھوڑی بہت زمینیں بھی تھیں، اُن سے بہت کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ مولوی صاحب سے صرف دس روپے مکان کا کرایہ لیتے تھے۔ یہ بھی اُن کی ضد پر۔ مولوی صاحب کرائے کے بغیر رہنے کو تیار نہیں تھے۔ منیر علی ہر ایک بات اپنے اپنے میں بتلاتے رہے۔ اس دوران میں اُن کا آدمی ہمارا سامان لے کے آگیا تھا۔ منیر علی مغرب کی نماز کو چلے گئے۔ اُنھوں نے ہم سے نماز کے لیے نہیں پوچھا۔ گھر کی بوڑھی ملازمہ نے آکے لالٹین جلا دی اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ دوسری جانب سے گھر میں کھلتا تھا اور شاید اسی خیال سے بنایا گیا تھا کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

منیر علی نماز پڑھ کے واپس آئے تو فیصل منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے بستر کی کمر لگا رہا تھا۔ منیر علی نے اپنے چھوٹے لڑکے کی مدد سے دوسری چارپائی بھی بیٹھک میں ڈال دی اور بوڑھی ملازمہ نے لالٹینیں

پر سفید بستر لگا دیے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس دوران میں تجمل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی جیسے میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ منیر علی واپس آئیں گے تو کسی طرح خود ہی اُن سے کورا کا ذکر چھیڑیں گا لیکن انھیں آتے ہوئے دیر ہو گئی۔ اُن کے سامنے اُس کا نام میری زبان پر نہیں آ سکتا۔ مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ نہ جانے وہ اُس کے بارے میں کیا بتائیں۔ میں گم سم بیٹھا اپنی انگلیوں کی کھال چھیلتا رہا۔ میرا جسم خود مجھے بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کئی بار دل میں آیا کہ تجمل کو وہیں چھوڑ کے باہر بھاگ جاؤں۔

"- کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟" دفعتاً منیر علی نے میرے پاس آ کے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟ کچھ دیر آرام کر لو اور کوئی بات چیت کرو۔ بات چیت کرو گے تو جی بہلے گا۔ تمھاری عمر میں تو ہماری زبان کو قرار نہیں ہوتا تھا۔ کہیں پڑھتے ہو؟"

"- جی نہیں۔" میں نے زیرِ لب جواب دیا۔

"- پھر کیا مشغلہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"- کچھ تو کام کرتے ہو گے؟"

میں نے تجمل کی طرف دیکھا: "اِس نے ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔" میرے بجائے تجمل نے جواب دیا۔

"- صاحب زادے ہیں ماشاء اللہ؟"

"- ہاں نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔" تجمل بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"- اچھا!" منیر علی ہنسنے لگے۔ "اولاد تو واقعی کبھی کچھ ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟"

"- سوا جیسے پلے پاس کیا ہے وڈے نے۔"

"- اچھا اچھا۔" منیر علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "آپ کم عمری میں ہی بہر ریہ عالم فاضل ہوئے۔ بھئی چاہے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے تو نظر انداز کر دینا عزیز میاں۔" میں نے سر جھکا لیا۔

"- اور ہر امتحان میں پہلے نمبر آیا ہے۔" تجمل نے بتایا۔

"- خوب خدا ہر بچے کو ہر قدم پر کامیاب کرے۔" منیر علی مجھے دعائیں دینے لگے پھر کچھ توقف کے بعد بولے: "مولوی صاحب مرحوم سے آپ کا کیا رشتہ نکلتا ہے؟"

تجمل کو جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ "قریب کا ہی کچھ ہو لیجیے ملنے ملانے سے کیا ہوتا ہے۔ رشتہ تو سمجھنے کا ہوتا ہے۔ اب آپ کا اُن سے کون سا رشتہ تھا؟"

"- بے شک سب سے بڑا رشتہ تو آدمیت کا ہے۔ پھر بھی وہ آپ کے کیا لگتے تھے؟ معاف کیجیے مولوی صاحب سے تعلقِ خاطر کی وجہ سے جاننے کا اشتیاق ہے۔"

"- بھائی کہہ لو۔"

"- بھائی!" منیر علی نے تعجب سے کہا۔ "مگر... مگر..."

"- مگر کیا؟" تجمل نے چونک کے پوچھا۔

"- مولوی صاحب فرماتے تھے کہ اُن کا کوئی بھائی نہیں ہے۔"

"- بھائی صرف سگے ہی ہوتے ہیں؟"

"- نہیں نہیں۔" منیر علی ندامت سے بولے۔ "میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ ایک دفعہ میں مولوی صاحب سے اُن کی پچھلی زندگی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اوّل تو وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں تھے مگر اُس دن نہ جانے کس عالم میں تھے۔ بہت سی باتیں کہہ گئے۔ کہتے تھے کہ قریبی عزیزوں میں بس صرف ایک بہن تھی۔"

"- انھیں ایسا ہی کہنا چاہیے تھا۔"

"- کیا مطلب! میں سمجھا نہیں۔"

"- نہ ہی سمجھو تو بہتر ہے بڑے صاحب!"

"- کوئی خدانخواستہ نہیں۔" منیر علی تیزی سے بولے۔

"- آپ نے غور نہیں کیا؟ اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اُن کے نہیں تو اُس کے تو کچھ عزیز ہو سکتے ہیں۔ وہ فضول گئے۔ چند دنوں کے لیے تو انھیں بھولنے کی پابندی نہیں تھی۔"

"- نہیں جناب، بالکل نہیں۔" منیر علی نے تردد سے کہا۔ "میں آپ سے متفق ہوں اور کچھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں مگر آپ کو اتنی مدت بعد اچانک اُن کی یاد کیسے آ گئی؟"

"- ہم انھیں مدت سے کھوج رہے ہیں۔"

منیر علی پیر بدلنے اور سر ہلانے لگے: "آپ کی باتوں نے عجب اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ شروع شروع میں مولوی صاحب کی موجودگی میں بھی کچھ یہی اُلجھن ہوتی تھی۔ انسان کا ذہن ہے۔ آدمی جو نہیں سوچنا چاہتا وہ بھی سوچتا ہے۔ مولوی صاحب جب یہاں تشریف لائے تھے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ بعد میں اُن کے حسنِ اخلاق اور شرافتِ نفس نے سب کو چپ کر دیا۔ مولوی صاحب کی گوشہ نشینی اور خاموشی ہی لوگوں کے لیے اُلجھن کا باعث ہوتی تھی۔ میں آپ سے نہیں پوچھوں گا کہ وہ آخر کیا بات تھی حالانکہ ایک آدمی ہونے کی حیثیت سے مجھے تجسس ہے مگر یہ معاملہ آپ کا ہے جب تک آپ خود نہیں بتائیں گے میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔" منیر علی تاسف سے بولے۔ "زرینہ بھی انھی کی طرح خاموش اور الگ تھلگ رہتی تھی زرینہ... آہ زرینہ، کیا بتاؤں وہ کیسی لڑکی تھی۔ خدا گواہ ہے میں نے اُسے اپنی زہرہ اور نگو سے کم بھی نہیں سمجھا۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح میرا لحاظ کرتی تھی۔ مجھے ابا جان کہتی تھی۔ گھر میں زہرہ اور نگو کے لیے کوئی نئی چیز آئے تو اُس کے لیے شامل کیے بغیر نہیں آتی تھی، کبھی کوئی ایسی چوک ہو جاتی تو زہرہ مجھ سے لڑتی۔"

ہم سے کلام پوچھتے بیٹھے تھے کہ منیر علی اچانک کھڑے ہو گئے۔ کوئی شخص ننگے پاؤں بیٹھک میں داخل ہوا تھا۔ اُس کے کپڑے گندے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی میٹھی میٹھی نگاہوں سے ہمیں گھورنے

لگا۔ منیر علی نے تیزی سے بڑھ کے اُس کا شانہ تھام لیا اور کمزور کانپتی ہوئی آواز میں بولے: "ارشد میاں! کہاں چلے گئے تھے؟"

"- یہیں تھا۔" آنے والا بھی بھری آواز میں بولا۔

"- کہاں چھپے بیٹھے تھے؟ پتہ ہے تین دن ہو گئے، سارا شہر چھان مارا۔ خدا کے لیے مجھ بوڑھے پر تو رحم کرو۔ بتا کے جایا کرو چاہے کتنے ہی دن کے لیے جاؤ۔ میرے اعصاب میں اب اتنا دم نہیں ہے۔ آئینے میں صورت دیکھی ہے اپنی۔ ذرا کپڑے تو دیکھو۔"

ارشد نگاہیں نیچی کیے سنتا رہا۔ میں نے اُسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ سرخ آنکھیں باہر نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ قد بھی خاصا بڑا تھا مگر وہ بیمار بیمار نظر آتا تھا۔ "میرا بھانجا ہے بی اے کر چکا ہے۔" منیر علی نے تجمل سے کہا۔ پھر ارشد سے بولے: "یہ ہمارے مہمان ہیں۔ تجمل صاحب اور ان کے بیٹے عزیز میاں۔ یہ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔"

"- مولوی صاحب کے عزیز؟" نوجوان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"- بہت مہربان لوگ ہیں میری درخواست قبول کر لی اور یہاں قیام پر آمادہ ہو گئے۔"

"- مولوی صاحب!" ارشد نے سٹ پٹاتے ہوئے پوچھا "اُن کا کوئی ہے؟..."

"- نہیں بیٹے! یہ خود اُنھیں تلاش کرتے ہوئے آئے ہیں۔" منیر علی مایوسی سے بولے۔ "جاؤ تم اندر جا کے بہن بھائیوں کو صورت دکھاؤ۔ وہ سب بہت پریشان ہیں۔ کپڑے بھی بدل لینا۔"

ارشد دزدیدہ نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔ منیر علی نے دوبارہ اُسے ٹوکا۔ وہ اندر چلا گیا۔ "بہت سعادت مند لڑکا ہے۔" اُس کے جانے کے بعد منیر علی رنجیدگی سے بولے۔ "کچھ عرصے سے اس کی طبیعت میں عجیب انقلاب آیا ہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پہننے کا۔ کسی سے بات کرتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔ آپ نے حالت دیکھی؟ رات رات بھر اور دن دن بھر گھر سے غائب رہتا ہے۔ لوگ ڈھونڈ تلاش کر کے لاتے ہیں۔"

"- کیا وجہ ہے؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"- وجہ کچھ نہیں بس قسمت کا پھیر ہے۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے اسے۔" منیر علی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اداسی سے بولے۔ "اچھا بھلا تھا۔ میں پہلے نظر کا قائل نہیں تھا لیکن اب میرا بھی یہ خیال ہے کہ اسے نظر لگ گئی ہے۔ بہت سنبھالا لیکن روز بروز حالت بگڑتی ہی گئی۔ باپ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ماں بھی گزر گئی تو میں اسے یہاں لے آیا۔"

"- کب سے ایسا ہے؟" تجمل نے بیزاری جتاتے ہوئے پوچھا۔

"- کئی مہینے سے۔" منیر علی بے چینی سے بولے۔ "کئی مہینے سے۔"

تجمل نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا اور نہ منیر علی نے کچھ بتایا۔ نوجوان ارشد بیٹھک میں واپس نہیں آیا تھا۔ اسی اثنا میں عشاء کی اذان ہو گئی۔ منیر علی نماز کو چلے گئے۔ بیٹھک میں خاموشی چھا گئی اور تجمل ننگے پاؤں ٹہلنے لگا۔ پھر اچانک

میرے پاس رک کے اُس نے مجھے گردن سے اٹھایا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "لاڈلے!" اُس کی آواز بھنچی ہوئی تھی۔ معاً میرے گال زور زور سے تھپتھپانے لگا۔ "پرسوں بھینچے لاڈلے اپنے کچھ پیچھے سامان کو پہ اتنا زحمت ڈال۔ اپنا نہیں تو اُس کا خیال کر لے۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر پورا کہہ بھی نہ پایا اور منیر علی کے بچے لڑکے نے آ کے دسترخوان لگانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں منیر علی بھی دوسروں کے ساتھ واپس آ گئے۔ اُن میں سے ایک شخص شام والا ساتھ تھا۔ تجمل نے مجھے دسترخوان پر بٹھایا۔ میں چپ چاپ سب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کھانے میں قسم قسم کی چیزیں تھیں۔ بیٹھک میں روشنی بھی کم تھی۔ میں ہاتھ چلاتا رہا۔ منیر علی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے مجھے معلوم تھا۔ میں جتنا انکار کروں گا کھانا اتنا ہی بڑھتا رہے گا۔ منیر علی کا اصرار اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ پتہ نہیں اُن چیزوں میں بھی کیا کیا تھا۔ اُس کا ہاتھ زور سے لگے گا۔ وہ یہاں بچے کی بھی آتی ہوگی۔

کھانے کے دوران میں وہ سب باتیں کرتے رہے۔ مولوی صاحب کی عادات و صفات کے متعلق باتیں۔ تجمل زیادہ تر سنتا رہا۔ وہ لوگ رات گئے واپس ہوئے۔ منیر علی نے رخصت چاہی لیکن تجمل نے اُسے روک لیا۔

"اگر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو کچھ دیر اور بیٹھو۔"

"- بسر و چشم۔" منیر علی شگفتگی سے بولے۔ "مجھے تو آپ ہی کا خیال تھا ورنہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ رات بھر آپ سے باتیں کرتا رہوں۔"

"- بڑے صاحب! آپ بھلے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب یہاں بہت خوش تھے اور اُن کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر اچانک کیا ہو گیا؟ میرا مطلب ہے آپ نے اُن کا سامان بھی دیکھا؟"

"- دیکھا جناب! جس رات وہ واقعہ پیش آیا، تمام سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اور زہرہ نے سامان دوبارہ ترتیب سے رکھ دیا۔ پھر شاید میں نے آپ کو بتایا تھا۔ سب سامان ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔"

"- کیا آپ مجھے وہ سامان ایک نظر دکھا سکتے ہیں؟"

منیر علی کسمسانے لگے۔ پھر بولے: "میں اُسے اُن کی امانت سمجھتا ہوں۔"

"میں صرف دیکھنے کی بات کر رہا ہوں بڑے صاحب! شاید کوئی کام کی بات مل سکے۔ شاید کوئی کاغذ ہی مل آئے۔"

"- آپ چاہیں تو دیکھ لیں۔" منیر علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے آپ کی نگاہ کسی ایسی چیز پر چلی جائے جو میری نظر سے رہ گئی ہو۔ میں دو بار سامان کھنگال چکا ہوں لیکن دیکھیے... آپ نے فرمایا ہے کہ آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔ اُن کے سامان میں بظاہر ایسی کوئی خاص چیز نہیں تھی پھر بھی... معاف کیجیے آدمی کو..."

"- ہاں ہاں! آپ کا خیال ہے کہ کچھ کاغذ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔"

"- بدگمانی نہ کیجیے۔" منیر علی نے کسی قدر تندی سے کہا۔

نے کوئی یادداشت نہیں لکھی تھی۔ ڈائری نما ایک کاپی پر جا بجا چیدہ چیدہ اشعار درج تھے۔ فارسی اور عربی شعروں کی کثرت تھی۔ میں نے جستہ جستہ انھیں پڑھا۔ کوئی پرزہ ایسا نہیں تھا جو میں نے غور سے نہ دیکھا ہو کہ شاید کہیں کوئی نشان مل جائے یا کہیں میرا ذکر ہو لیکن مولوی صاحب کے کاغذات میں منتخب احادیث، اشعار، اقوال، مختلف تفسیریں، بعض مسائل کی شرح، بعض منطقی موضوعات کے خلاصے اور حکایتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کتابوں میں انگریزی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ دس بارہ انگریزی ناول، انگریزی اردو ڈکشنری، انگریزی الفاظ و معانی کی کاپی، شیکسپیئر کی چند کتابیں اس بات کی غمازی کرتی تھیں کہ مولوی صاحب نے فرصت کے اوقات میں انگریزی سیکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی انگریزی تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ انھوں نے اچھی خاصی مہارت بھی حاصل کر لی ہے۔ ابتدائی کتابوں کے علاوہ اگلے درجوں کی کئی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

اُس کی مسہری کی زرانہ پر دھول کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے الماری کے خانے سے بے خیالی میں آئینہ اٹھایا کہ شاید اس میں کوئی عکس محفوظ رہ گیا ہو۔ آئینے کے پیچھے مجھے ایک کنگھی دکھائی دی۔ میں نے اسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اُس میں کوئی خوشبو بسی ہوئی تھی اور دندانوں میں اُس کے چند بال اٹکے ہوئے تھے۔ وہی ہری مائل سیاہ بال۔ لکھنؤ میں جب ہم دونوں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جائیں گے کیا کریں گے تو وہ اپنے بال ایک چوکے پہ بکھیر لیتی تھی۔ مجھے وہ خوشبو اب تک یاد تھی۔ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک سامان دیکھتے رہے۔ میرا جی وہاں سے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن منیر علی ایک ایک کر کے صندوق میں تالے ڈالتے گئے اور پھر میرے دیکھنے کو کچھ نہیں رہا۔ جمیل واپس ہونے لگا تو مجھے بھی کمرے سے نکلنا پڑا۔ منیر علی نے دروازے پر تالا لگا دیا اور چلتے چلتے دوسرے کمرے میں جھانک کے دیکھا۔ وہاں ارشد موجود نہیں تھا۔ ہم لوگ باہر آئے ہی تھے کہ منیر علی کے گھر کے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ منیر علی کا چھوٹا بیٹا اندر سے دروازے کی کنڈی لگانے کے لیے مکان ہی میں رہ گیا۔ ہم تینوں باہر چلے آئے۔ جمیل کے چہرے پر دھندلی سی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک میں آکے بھی وہ چپ چاپ رہا۔ "آپ نے کیا اندازہ لگایا جناب؟" منیر علی نے سانس تازہ ہوتے ہی مضطرب لہجے میں پوچھا۔

جمیل نے جواب نہیں دیا۔ منیر علی دیر تک اُس کی صورت دیکھتے رہے اور تپائی پر رکھی ہوئی خشک میوے کی پلیٹ سے کشمش ٹونگتے رہے۔ اسی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ میں نے بے چینی سے چاروں طرف نگاہ گھمائی تو سامنے کے روشن دان کی جالیوں سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں اس کا پورا چہرہ نہیں دیکھ سکا لیکن اس کا رنگ سفید سا تھا۔ وہ جالیوں کے پاس سے فوراً ہٹ گئی۔ منیر علی نے بھی شاید دیکھا مگر روشن دان خالی ہو چکا تھا۔ وہ منیر علی کی لڑکی زہرہ ہی ہو سکتی تھی کہ کرا کی ہم عمر تھی۔ دیکھنے آتے ہوئے ساتھ میں کرا نے اس سے کیا باتیں کی ہوں گی۔ کہتے ہیں سہیلیوں میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ کرا کے بارے میں جتنا وہ جانتی ہوگی کوئی اور نہیں جانتا ہوگا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، کرا کے عزیز کیسے ہیں۔ وہ بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوگی۔ ہو سکتا ہے کرا نے اسے میرے بارے میں بھی کچھ بتایا ہو۔ صبح آنے کے وقت بھی مجھے روشن دان میں کسی سائے کا گمان ہوا تھا مگر اس وقت اتنی روشنی نہیں تھی۔ منیر علی کچھ دیر تک جمیل کے ردِ عمل کا انتظار کرتے رہے مگر جمیل نے کچھ نہیں کہا تو انھوں نے ہم سے معذرت چاہی کہ انھیں چھوٹے لڑکے کو مدرسے چھوڑنے اور اپنے چند کام نمٹانے کے لیے باہر جانا ہے۔ وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے واپس ہو جائیں گے۔ اس دوران کوئی بھی ضرورت ہو تو بے تکلف دستک دے دیجیے گا۔ ملازم بھی گھر پر موجود ہے اور اگر آپ میرے ساتھ چلنا چاہیں تو بصد شوق۔

"نہیں چچا صاحب، ہم یہیں رہیں گے۔" جمیل پہلے لہجے میں بولا۔

منیر علی شاید خود بھی ہمیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے، بس یوں ہی پر انھوں نے کہا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد جمیل اور میں بیٹھک میں پھر تنہا رہ گئے۔ منیر علی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ آنکھیں دوبارہ مجھے روشن دان پر چمکتی ہوئی نظر آئیں جیسے ہی میں نے نگاہ اٹھائی اُس کے چہرے کے سفید رنگ کا ایک جھماکا سا ہوا اور معدوم ہو گیا۔ پھر بار بار میری نگاہ خود ہی روشن دان کی طرف اٹھنے لگی مگر وہاں کوئی نہیں آیا۔ جمیل گاؤ تکیے سے سر لگائے آنکھیں نیم وا کیے لیٹا تھا۔ میں اسے چھوڑ کے باہر آ گیا۔ بیٹھک میں ہوا بند بند سی تھی۔ گلیوں میں دور دور تک آگ برس رہی تھی لیکن ادھر ادھر گرد سے بھری لگانے والوں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ میں محلے کی مسجد سے بھی آگے نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر سبزی منڈی تھی اور اس کے پاس ہی آڑھت۔ میں یوں ہی بے غرض پھلوں میں گھومتا رہا۔ اب مولوی صاحب انجان یا مہمان کی طرح گھر کا کوئی آدمی ملنے کا امکان نہیں تھا۔ میں پہلی بار یہ شہر دیکھ رہا تھا۔ منیر علی نے پہلے ہی انکار کر دیا تھا کہ ملیح آباد کے علاوہ وہ کسی آدمی سے واقف نہیں ہیں۔ میرا دماغ خالی خالی تھا اور مجھے اپنا جسم کھوکھلا لگ رہا تھا۔ میں جلدی ہی گھر کی طرف واپس ہونے لگا مگر راستے میں ایک جگہ میرے پیر رک گئے۔ سامنے سے کندھے جھکائے اور منہ اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ ارشد آ رہا تھا۔ میں نے سوچا اسے روک کے کچھ پوچھوں، تھوڑی دور تک میں نے اس کا پیچھا بھی کیا۔ اُسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ اُس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ اسے گھر سے باہر دیکھ کے میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ ارشد آگے نکل گیا تھا۔ میں ایک گھر چلا آیا۔ بیٹھک میں جمیل اسی طرح نیم دراز غنودہ پڑا ہوا تھا۔ میں دروازے پر دستک دینے کے لیے بڑھا لیکن میرے ہاتھ کواڑوں کو چھوتے ہی رک گئے۔

میں کرسی پر بیٹھ کے ہانپنے لگا۔ "چنڈال لا پائے؟" میرے کانوں میں جمیل کی آواز گونجی۔ میں کرسی سے اچھل پڑا۔ وہ کروٹ بدلے مجھی کو دیکھ رہا تھا۔

"بھول گیا۔ لے آتا ہوں۔"

"جب جائے تو لے آنا، ابھی کچھ نہیں۔"

"تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اونچی آواز میں کہا "بس ذرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ سالا ادھر کا موسم بدن کو ٹھیس لگ رہا ہے۔"

"تو چلے چلو۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔"

"کچھ دیر اور ٹھہر لینے میں حرج نہیں ہے۔"

"ٹھہرو۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "کیا فائدہ، طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔ لگتا ہے لو لگ گئی ہے۔ جو دانہ پانی ادھر کا ہے وہی رنگ ہے۔ ہوا کے اوپر تلے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اسی میں برکت بھی ملتی ہے۔"

"میں تمھارا سامان کمرے والے لاتا ہوں۔ سبزی منڈی میں ایک گلی میں میں نے بھی دیکھے تھے، کہو تو وہ بھی لے آؤں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "تیرا تو بہت دن ٹکنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"میں تو تمھاری وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

جمیل کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں اس کی بات سنے بغیر لپک کر وہاں پہنچا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ سے کھل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے سرکاری بھری ہوئی اس کے ہاتھ میں رکھی ہوئی چنیل کی ٹرے میں پلیٹیں کھڑکھڑانے لگیں۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ لباس سادہ تھا۔ تنگ موری کا پاجامہ اور قمیص، دوپٹا سر سے ڈھلکا ہوا۔ کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں۔ قمیص تنگ تھی۔ چہرہ ستواں، نقش دلکش، جمیل قد نکلتا ہوا۔ میں اسے ایک ہی نظر دیکھ سکا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وقت سکتے سا ہو گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ٹرے گر گئی اور برتنوں کا چھناکا ہوا۔ وہ بدحواسی میں ایک طرف بھاگی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں پیچھے ہٹنا چاہتا تھا مگر ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ مجھ سے دروازہ بھی بند نہیں کیا جا سکا۔ سامنے منیر علی کے گھر کا صحن اور دالان کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ نگاہ سے جمیل کی طرف دیکھا۔ وہ گاؤ تکیے میں منہ چھپائے چت لیٹا ہوا تھا۔ آخر ہمت کر کے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ پھر واپس آئے گی لیکن بہت دیر ہو گئی۔ دروازے پر دوبارہ دستک نہیں ہوئی۔ شاید اس نے ملازم کو بھیجا ملا کہ وہ اسے اندر بھیج سکتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ خود دستک دے کے معذرت کر لوں۔ منیر علی کی واپسی کا ابھی وقت ہے۔ ملازم کہیں باہر گیا ہے تو وہ بھی واپس آ سکتی ہے۔ میں وہاں تک گیا بھی لیکن پھر لوٹ آیا۔ اس اثنا میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے جو طے کیا تھا سب ذہن سے نکل گیا اور میں دروازے کے پاس گم صم کھڑا رہا۔ دوسری دستک پر میں نے کھنکار کے اپنی موجودگی کی تصدیق کی۔ "یہ ...... یہ لے لیجیے۔" اندر سے سہمی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔

میں نے آہستگی سے ایک جانب کا پٹ کھول کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے مس ہوئی تو میں نے اُسے تھام لیا۔ "معاف کیجیے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

اُس طرف خاموشی طاری رہی مگر چوڑیاں بجنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی دروازے کے پاس کوئی موجود ہے۔ "...... آپ زہرہ ہی ہیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی ہیں نا؟" اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کی خاموشی ہی جواب سمجھی۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔ "زہرہ کے بارے میں۔ صرف اس کے بارے میں آپ مختصراً کچھ مجھے بتا دیجیے۔ بڑے صاحب سے میں بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتا اور نہ وہ اتنا جانتے ہوں گے جتنا آپ۔ مجھے معلوم ہے آپ کے لیے بہت مشکل ہے۔ آپ ایک پردے والی ہیں اور میں آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن زہرہ کے رشتے سے آپ مجھے اتنا دوست سمجھ کر بھروسا کیجیے جتنا آپ خود پر کر سکتی ہیں۔ آپ زہرہ کی سہیلی ہیں۔ سو میرے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی زہرہ کی کوئی سہیلی ہو سکتی ہے۔" میں نے سانس لینے کے لیے ایک لمحے توقف کیا۔ "بتائیے ..... اب نہیں تو پھر کسی وقت ذرا نکل کے، آپ سوچ لیجیے مگر جلدی سے سوچیے گا۔ آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا، صرف منت کر سکتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑے صاحب کو ہماری باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ آپ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہیں۔ آپ خود کہیں، اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ زہرہ کے لیے، اس کے لیے جسے آپ بہت عزیز سمجھتی تھیں۔ مجھے صرف زہرہ ہی کی بات کرنی ہے، کچھ اور نہیں۔" میں نے اپنی زبان روک لی۔ ادھر سے کچھ آہٹ نہیں ہوتی تھی جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں اور میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں وہیں ٹھیرا رہا۔ وہ شاید بات سنے بغیر چلی گئی تھی۔ خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور ٹرے جمیل کے آگے رکھ دی۔

کوئی پانچ دس منٹ کے اندر منیر علی واپس آ گئے۔ جمیل پلنگ سے اٹھ گیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کے بعد جب منیر علی دالان سے میٹھے تو شہر کے حالات بتانے لگے۔ اسی دوران جمیل نے اچانک ان سے پوچھا۔ "بڑے صاحب، آپ نے مولوی صاحب کو ارشد میاں کے بارے میں کچھ لکھا تھا؟"

"جی ۔۔" منیر علی نے حیرت سے کہا۔ "آپ ...... آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"میں آپ سے جو پوچھ رہا ہوں وہی میری مراد ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" منیر علی نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

"ارشد میاں کو دیکھ کے! میرا خیال ہے آپ نے ان سے ضرور بات کی ہوگی۔ پھر وہ کیا بولے؟ مجھ سے کچھ نہ چھپائیے، بتائیے۔"

"مگر ... مگر آپ اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"میں اندازے کی بات بول رہا ہوں۔"

"مگر یہ بہت بڑی بات تھی جو میں نے بیٹے کے اور مولوی صاحب کے

درمیان ہوئی تھی۔ آپ کا اندازہ... نہیں نہیں۔" مولوی صاحب کے لہجے میں لرزش آگئی۔ "بہرحال آپ کا اندازہ بہت خوب ہے۔"

"اور یہ کوئی بری بات نہیں تھی بڑے صاحب! لڑکی والے کا گھر وہ کان ہوتا ہے جہاں ہیرا ہوتی ہے، وہاں گاہک آتے ہی ہیں۔ جس چیز کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں اسی کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ ارشد میاں کے لیے کسی بھی لڑکی کے لیے بول سکتے ہیں، ہر جگہ لڑکیوں کی ہیرا لگی ہوئی ہیں، ہر جگہ یہ دکانیں ہیں، میں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ مولوی صاحب نے آپ کو جواب میں کیا بولا؟"

"آپ اُن کے جواب کا اندازہ بھی کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"وہ مجھ کو معلوم ہے پر مولوی صاحب بولے کیا تھے؟"

"کیا بولتے!" منیر علی کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "انھوں نے ارشد میاں کو اس لائق نہیں سمجھا۔"

"انھوں نے کیا بولا بڑے صاحب!" منیر علی میری طرف دیکھ کے بولے۔

"اس کے سلسلے ہی اُلجھن میں اس سے بہت کم باتیں سمجھتا ہوں" تجمل نے کہا۔

"رات کو کسی وقت گفتگو کریں گے۔" منیر علی نے مذبذب سے کہا۔

"یہ تب بھی درد ہوتا ہے گا۔ آپ اس کی فکر نہ کرو۔" تجمل مسکراتے ہوئے بولا۔ "میری اس کی بچپن والی لڑائی عمر کی ہے۔"

"نہیں صاحب! وہ بچے کی بھی ہے، میں ابتدا سے اس کی تربیت نہ کی ہے۔"

"یہ بات یہ خوب جانتا ہے۔"

"آپ کی مرضی۔" منیر علی نے پلکیں سکوڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے مولوی صاحب قبلہ سے بات کی تھی، حالانکہ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ شروع سے میرا اور بیگم مرحومہ کا خیال تھا کہ ارشد میاں کی نسبت زہرہ سے کر دی جائے گی۔ اس خواہش کی رسمی تکمیل یوں ضروری نہیں تھی کہ گھر کا معاملہ تھا۔ ارشد میاں کی تعلیم کے دوران ہی میری بہن اپنے بیٹے کو دولہا اور میری بیٹی کو دلہن دیکھنے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے چلی گئی۔ ارشد میاں کو میں نے یہاں بلوا لیا۔ جب میں نے اُن کی رغبت مولوی صاحب کے گھر میں دیکھی تو زہرہ کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ارشد اور زہرہ کی بات ہمیشہ سے اور بھی کچھ سو دو تھی۔ زہرہ بھی اپنی بچی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی دو گھر نہیں سمجھے۔ زہرہ کے بجائے زرمین، مجھے یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی گرانی محسوس نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہی ہوئی۔ چنانچہ ایک روز میں نے مولوی صاحب کا مزاج خوشگوار دیکھ کے اس کا ذکر کر دیا۔ میرا خیال تھا انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ارشد میاں کو وہ بھی اپنا بچہ سمجھتے تھے لیکن خلافِ توقع مولوی صاحب نے اُس دن پہلی بار مجھ سے عجیب رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے صاف منع کر دیا۔ ایسے معاملے میں فوراً جواب نہیں دیا جاتا۔ انکار ہو تو مناسب عذر پیش کر دیا جاتا ہے، میں اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے آیندہ کے لیے بھی یہ کہہ کے بات کا دروازہ بند کر دیا کہ زرمین کے سلسلے میں ایسی کوئی بات نہ کی جائے تو بہتر ہے۔"

"پر انھوں نے ایسا کیوں کیا بڑے صاحب؟" تجمل نے بیچ میں دخل دیا۔

"واللہ اعلم۔ اُن سے کچھ پوچھنے کی جرأت تو میری تب نہیں پڑی۔ لیکن میں نے اس کے بعد مولوی صاحب سے اپنے مراسم میں کوئی شکن نہیں آنے دی۔ زرمین بیٹی مجھے کسی طرح عزیز رہی اور مولوی صاحب اسی طرح میرے لیے محترم رہے۔"

"آپ نے بولا نہیں کہ مولوی صاحب تم کو کہیں تو زرمین بی بی کا ہاتھ تھمانا ہے، پھر آخر منع کیوں کرتے ہو؟"

"میں نے آپ سے کہا نا، اصل میں انکار سننے کے بعد مجھے حوصلہ نہیں رہا۔ یوں بھی میں لاکھ زرمین کو اپنی بیٹی سمجھتا، اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار انھی کو تھا۔"

"پر بڑے صاحب! مولوی صاحب ادھر کئی سال سے بیمار ہوتے تھے، آپ کے علاوہ بھی دوسرے لوگوں نے اُن سے ایسی بات بولی ہوگی، کیا انھوں نے سب کو یہی جواب دیا؟"

"ہاں بھائی! ابھی کہ" منیر علی مایوسی سے بولے۔

"ایسا کیوں بڑے صاحب؟"

"ارشد کی بات کے بہت دنوں بعد میں نے ایک دفعہ اشارتاً اُن سے کہا تھا کہ آپ نے ارشد میاں کو اپنی فرزندی میں قبول نہیں کیا، مجھے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن زرمین کے سلسلے میں آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کر لیجیے۔ شہر کے کئی اچھے گھرانوں نے اُن سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مجھ سے اُن کی خاص رفاقت کی وجہ سے چند صاحبان نے تو میرے ہی ذریعے اُن تک بات پہنچائی تھی۔ مولوی صاحب نے کسی میں کوئی تخصیص نہیں کی، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی۔ ان میں ایسے خاندان بھی تھے کہ دولت و شرافت جن کے گھر کی لونڈی ہے۔ کہیں سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوتی تھی تو میں اُن کے سامنے بہت احتیاط سے اس کا تذکرہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی قدر ناراض ہو کے کہہ دیا کہ جب وہ مناسب سمجھیں گے تو مجھے بتا دیں گے۔ اس وقت تک انھیں مجبور نہ کیا جائے۔ پھر میرے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر میرے چپ ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تمام لوگ مولوی صاحب کے مزاج سے واقف نہیں تھے۔ وہ بار بار اپنے اپنے پیام کی تکرار کرتے تھے اور انکار کو اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ میں انھیں سمجھاتا تھا کہ بھائی کوئی ایسی ہی مجبوری ہوگی جو مولوی صاحب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ زرمین اُن کے گھر آیا کرے۔ ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ چاند کو شرماتی تھی۔ بالکل پھولوں جیسی تھی۔ کسی ملک کی شہزادی یا پرستان کی کوئی ملکہ۔ لڑکیاں بالیاں دور دور سے اُسے دیکھنے آتی تھیں۔ وہ تو مولوی صاحب نے ملنے جلنے میں بہت احتیاط رکھی تھی اس لیے لوگ آنے سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ میں ہمیشہ خوف زدہ سا رہتا تھا کہ کبھی کچھ ہو نہ جائے، دل نہ جانے کیوں ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ خدانخواستہ کسی کی نظر لگ جانے کا خیال آتا رہتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی پسند نہیں تھا کہ زرمین سب کے سامنے آیا کرے۔ آخر ایسا ہوا کہ گھر میں آنے

والی کی نظروں سے زہرہ نے اُسے چھپائے رکھا۔ گھر میں اچانک کوئی آ جاتا، خاتونِ خانہ اُسے کمرے میں بند کر دیتی تھی اور چپکے سے کھڑکی کے راستے اُسے اس کے گھر بھیج دیتی تھی۔ اب میں آپ کو کیا کیا بتاؤں۔" منیر علی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بولو بڑے صاحب! بولتے رہو۔" تجمل نے اُن کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں بھائی! یہی کچھ داستان ہے۔" منیر علی گلوگیر آواز میں بولے۔

"آپ نے ارشد میاں کو دیکھا ہے، بڑا گبرو جوان، بہت ہونہار اور سعادت مند بچہ تھا۔ مولوی صاحب ایسے نا سمجھ نہیں تھے کہ اُس کا حال دیکھ کے کچھ اندازہ نہ کر سکتے ہوں۔ بھلا انھوں نے تو توجہ نہیں دی۔ زرمین نے بھی اس سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ چپ چاپ چلی ہی گئی۔ اب ارشد، اللہ رحم کرے، شہر شہر دور دور نکل جاتا ہے، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ آس پاس کے لوگ ملنے والے ہر وقت میرا سینہ جلاتے رہتے ہیں۔ میں تو اس سے مایوس ہو چکا ہوں، اب خدا ہی اس کی کچھ سن لے تو ٹھیک ہے ورنہ......"

"بڑے صاحب! آپ نے خود بھی تو کچھ جانا ہی ہوگا کہ....."

"میں جانتا ہوں آپ کا مدعا کیا ہے۔" منیر علی نے تجمل کی بات پوری نہیں کرنے دی۔ وہ سوچ کے بولے۔ "مجھے یہ جاننے کی ہمیشہ جستجو رہی اور میں کچھ جان لیتا۔ مولوی صاحب کے ملک کی بھی کوشش کی۔ اگر میرے بس میں ہوتا، میں کچھ ہونا۔ لیکن ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ احساس رہا۔ اگر میں کیا جاننا چاہتا ہوں اور میں جان لوں تو کیا ہے۔ مولوی صاحب سراپا سرِ مو تقرب سامنے تھے۔ وہ زرمین کی شادی کہیں کرنا ہی نہیں چاہتے تھے تو کوئی انھیں مجبور کیسے کر سکتا تھا اور وہ اپنے فیصلے کسی کو بتانا نہیں چاہتے تھے تو کوئی کیسے انھیں پابند کر سکتا تھا۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، لوگوں نے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہا۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب تک مولوی صاحب کی ذات کے بارے میں تمام باتیں واضح نہ ہو جائیں، اُن کے پیچھے نماز پڑھنا مناسب نہیں ہے۔ میں نے اُن سے کہا، صاحبو! خدا کے خوف سے ڈرو۔ مولوی صاحب ایک عالم شخص ہیں۔ میں اُن کے ساتھ رہتا ہوں۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو سب سے پہلے تم سے میں کہتا۔ اُن کا انگ انگ گنگ ہے۔ وہ کسی طور بھی اُن پر حرف زنی کا جواز نہیں بنتا۔ بدگمانی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ تمھارے پاس آنکھیں ہیں اور اللہ نے تمھیں سننے کی قوت عطا کی ہے۔ روز مولوی صاحب چار مرتبہ تمھارے سامنے آتے ہیں، تم انھیں اچھی طرح دیکھتے اور سنتے ہو۔ وہ تمھارے بچوں کو درس دیتے ہیں اور گھر والے زمانے کی ساری آلائشوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ میں نے اُن سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی، یا مولوی صاحب کی بے جا طرف داری کا جرم نہیں کیا تھا۔ جو میں سمجھتا تھا، جیسا میں نے انھیں پایا تھا، وہی میں نے کہا تھا۔ لوگ اس فقیر کی عزت کرتے ہیں، میرا بھرم قائم رہا لیکن انسان انسان ہے۔ اہلِ محلہ و صاحبان جو مولوی صاحب سے ایک مستقل رشتہ استوار کرنے کے آرزو مند تھے، ظاہر ہے اُن کے دلوں پر غبار چھایا رہتا ہوگا جس کا وہ

بے شک مولوی صاحب کے سامنے اظہار نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا کرشمہ خلق یا علم حسنی، انھیں اُن کے سامنے بولنے سے روکے رکھتی تھی، مگر پانی تو بہتی رہتی ہوگی، اچھے برے سبھی طرح کے لوگ بستے ہیں، کچھ تو اثر لیتا ہے کوئی کم۔ یہ غبار چھٹ جاتا اگر مولوی صاحب کوئی ایک منتخب فرما لیتے۔"

"آپ سب ٹھیک بولتے ہو بڑے صاحب!" تجمل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "پر تم کو یہ بتا کہ مولوی صاحب کدھر چلے گئے؟"

"جناب!" منیر علی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"میں بولتا ہوں بڑے صاحب! مولوی صاحب غرقے نہیں گئے، تو سے جاتے تو اس طرح سے نہ جاتے، کوئی انھیں لے گیا ہے، پر کون لے سکتا ہے، آپ جانتے ہوں گے کہ کون انھیں لے جا سکتا ہے۔"

"جناب! جناب!" منیر علی لرزتے لہجے میں بولے۔ "میں کیا.... کیا جان سکتا ہوں یعنی یعنی کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں جانتا ہوں؟"

"دیکھو بڑے صاحب! بات بہت سیدھی ہے۔ آپ بولتے ہیں کہ مولوی صاحب نے ہر ایک کو منع کر دیا تھا اور لوگ اُن کی اس بات پر خفا ہونے لگے تھے اور آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب ایک دم اچانک چلے گئے۔ اس صورت میں اُن کو کون لے جا سکتا ہے؟ وہی لے جا سکتا ہے جو سب سے زیادہ خفا ہوگا اور وہ کون تھا، یہ آپ کو پتا ہوگا۔ معاف کرنا ہم کو" تجمل نے کہا۔

"صاحب! میرے بڑھاپے کا کچھ خیال کیجیے۔" منیر علی برگشتگی سے بولے۔

"بڑے صاحب! میں جو بولتا ہوں وہ آپ خوب سمجھتے ہو، میں کسی اور زبان میں نہیں بول سکتا ہوں۔ مجھ کو زیادہ بات مت کرنے دو۔"

"بھائی! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" منیر علی کی آواز بھرا گئی۔

"میں یہ نہیں بول رہا کہ وہ آپ ہی ہو۔ آپ سب جانتے ہوئے بھی انجان ہو۔ تو آپ جو کچھ جانتے ہوئے جاننا نہیں چاہتے۔ مجھ کو پتا نہیں کہ ایسا کیوں ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا اس لیے کہ آپ گھبراتے ہو۔ آپ کس بات سے گھبرا سکتے ہو۔"

منیر علی نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا، اُن کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ تجمل نے اُن کی طرف دیکھے بغیر بھاری آواز میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے جاننے پر شبہ ہو اور آپ نے اپنی چھپ کے لیے اس شبہے کو سہارا بنا لیا ہو۔ آپ نے اپنے آپ کو اسی طرح تسلی دی ہوگی۔ اس کے سوا تیسری بات نہیں ہے۔ آپ کہتے ہو کہ جانے سے پہلے کوئی ایسا ویسا آدمی آپ نے مولوی صاحب کے پاس نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ آپ سے زیادہ اور کوئی اُن کے نزدیک نہیں تھا۔ بار بار جو باتیں کرتا اُدھر آتا جاتا تھا، جن خاندان والوں کے پیام آئے، وہ سب آپ کو پتہ ہیں۔ مولوی صاحب نے اُن کا ذکر آپ سے بھی کیا ہوگا اور اپنے آپ جواب دینے کے بجائے آپ ہی سے کہلوایا ہوگا۔" منیر علی کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہوئے، مگر تجمل نے

بڑی داناکا بھی۔ وہ اپنے مالک کے پیچھے کھڑے کھڑے بنی بنی بھوکریاں تاکتے رہتے ہیں۔ ادھر بھوکری کا بین بجنا شروع ہوا اُدھر ان کے پھیرے شروع ہو گئے۔ بھوکری ابھی وہ تاتھا اُونچی نہیں ہوتی کہ یہ اُس کی بولی بول دیتے ہیں۔ بھوکریاں توگیاں ہوتی ہیں۔ بھوئی سی گٹھری میں آجاتی ہیں۔ بھوم کے بیچنے تو ہاتھ جیسا آدمی اٹھوا لیتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کدھر غائب ہو گیا۔"

"راناکی کتنی بیویاں ہیں؟"

"بیویاں؟" جولا کے منہ سے ہنسی چھوٹ پڑی۔ "کیسا بولتے ہو بابا! وہ تو ایک عورت کو سہاگن بناتا ہے ویسے دو۔ بیویاں ... بیٹے راناکے نام سے بولے جاتے ہیں۔ بولتے ہیں کہ رانا بھوکری کو ایک بار چھو کے دوبارہ ہاتھ نہیں لگاتا۔ کبھی کچھ اور نہیں ملتا تو اُس کے آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کے اُس کے لیے بچیاں اور کنجریاں لے آتے ہیں۔ کنجریاں جا دے۔ راناکو رنڈیاں کی ... ہیں راناکو بس یہی ایک شوق ہے۔ اُدھر حویلی میں اس جیسا ایک اور آدمی کوئی نہیں۔ حویلی میں روز رات کو ناچ گانا دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ ہم تو اُدھر کبھی نہیں گئے لیکن یہی جھینگر لوگ بولتے ہیں کہ رات کو نیلے پیلے قمقمے جگمگ کرتے ہیں۔ اُدھر شہر کے اوکا آدمی اُس کے بہت سے رہا ہوا لوگ اکٹھے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو ولایتی شراب کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ حویلی سے ہر مہینے بھکروی والوں کو پیسہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں راناکی بہن کی منگنی ہوئی تھی۔ بارات نظام حیدرآباد شہر سے آئی۔ پندرہ دن تک میلا ٹھیلا لگا رہا۔ منوں ٹنوں گلال اور ... دیا گیا۔ ہر طرف سے گانے بجانے اور کرتب دکھانے والیاں بلائی گئیں۔ ایک اینڈ بجا اند ... تھی تو ایک بار ... بلوائے۔ رانا نے کئی ہاتھی امیر سے منگوائے تھے۔ بینڈ باجے والے تو تمہارے ولی شہر سے آئے تھے۔"

"راناکے ہاں تم نے کون کون سے خاص خاص آدمیوں کے نام لیے تھے؟" تجمل نے دھیمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم نے بولا اُدھر ایک آدمی نہیں ہے۔" جولا نے بے بسی سے کہا۔ "ایک سے ایک تگڑا ہے۔ اُدھر اُنگوٹھے جانو۔ بڑے فرید خاں ہے جس کا نام رانا نے سہراب خاں رکھ دیا ہے۔ اچھو ہے کالے خاں ہے۔ دل رُکھے جینیا سنگھ ہے۔ آپت سنگھ ہے۔ کس کس کا نام لیں۔ یہاں اور ان سب سے بڑھ کے رستم خاں ہے۔ رستم کا نام پہلے بشیرا تھا۔ رانا نے اُس کا نام بھی بدل کے رستم کر دیا۔ بشیرا رانا کے پاس حویلی میں ہی رہتا ہے۔ اُس سے زیادہ کوئی اور رانا کا منہ چڑھا نہیں ہے۔ رانا اُدھر بھوپال میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں مہمان تھا۔ شکار کھیلتے ہوئے کسی جھگڑے میں اُس نے بشیرے کے ہاتھ کی کلّی دیکھی۔ پھر وہ بشیرے کو ساتھ ہی لے آیا۔ جاتو بشیرے کے ہاتھ میں آکے سالا گُرز سے جیسے چپک جاتا ہے۔ وہ چیتے کی طرح لپکتا ہے۔ جھپٹتا ہے۔ رانا نے ایسا جادو کیا ہے کہ بشیرے کو بوٹا نہیں تو ... باقی لوگ بھی بشیرے کا بہت خیال کرتے ہیں۔ جب کوئی کام خاص ہوتا ہے تو رانا بشیرا ہی سے ہوتا ہے ورنہ وہ سالا حویلی میں اینڈتا رہتا ہے اور رنگ چھوں کو تیل چڑھاتا رہتا ہے۔ رانا نے بشیرے کو گھوڑے کی سواری بھی سکھا دی ہے۔ رانا کا حکم ہے کہ بشیرا جو چیز بھی مانگے اُسے فوراً دی جائے۔ بولتے ہیں کہ بشیرا روز صبح لپنے لیے بادام پستے ڈالا دودھ اور میوے کا جو گوشت جوتا ہے اُس کا ایک گلاس ... تو رانا کر بھجواتا ہے۔ ایک خود بنتا ہے۔ رانا نے اُس کی شادی بھی اپنے ایک پرانے آدمی کی بیٹی سے کرا دی ہے اور بشیرا کی ماں کو بھی بھوپال سے بلا لیا ہے۔ میلے میں اور دُور دُور بشیرا کو جیا تو گرانے والا ہماری جان پہچان میں نہیں ہے۔ ایک بار ہم نے بھی اُسے فرید خاں سے لڑتے دیکھا تھا۔ فرید خاں ڈیل ڈول میں اُس سے ڈبل ہے۔ اُس نے بہت زور کیا لیکن بشیرے نے جاتو اُس کے ہاتھ میں پکڑ جیسے ... سے باندھ دیا تھا۔ ایک دم بیکار کر دیا تھا۔ فرید خاں اُس کے ... سے کچھ نہیں توڑ سکا۔ پھر اُس نے جاتو بشیرے کے پیروں پر پھینک دیا اور بشیرے نے اُس کو گلے لگا لیا۔ اُسی دن رانا نے فرید خاں کا نام بدل کے سہراب رکھ دیا تھا۔ سہراب بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اُس کا کام زیادہ تر یہی ہے کہ وہ رانا کے دوسرے آدمیوں کو ہاتھ چلانا سکھائے۔"

"بس جولا! ہم کو جانا ہے۔" جولا بشیرے کے بارے میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر تجمل نے اُسے روک دیا۔

"کیوں؟" جولا حیران نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا اپنے سے کوئی بات زیادہ ہو گئی؟ ہم نے تم سے کچھ غلط نہیں بولا ہے۔"

"تم نے سب ٹھیک بولا ہے۔"

"پھر کیا ہے؟ تم ایسے کیوں اُٹھنے لگے؟"

"ہم کو اب جانا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بابا! پر تھوڑی دیر بیٹھو اور ابھی اور بہت سی باتیں باقی ہیں۔" جولا بیٹھے بیٹھے ہی بولا۔

"کل ہو سکا تو ادھر آئیں گے۔"

"کل کس نے دیکھی ہے بابا!"

"کل ہو گی تو آنے کی کوشش کریں گے۔"

بیرا قریب ہی موجود تھا۔ تجمل نے اُسے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور دس روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما کے اُٹھنے لگا۔ بیرے نے نوٹ لے لیا تھا لیکن جولا نے جھپٹ کے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ بیرے کو نوٹ وہیں میز پر پھینکنا پڑا۔ تجمل نے اُسے نہیں اُٹھایا۔ جولا بیرے سے اُلجھا ہوا تھا کہ وہ آگے بڑھ گیا اور ہوٹل کے چبوترے سے نیچے گلی میں اُتر آیا۔

ہم ابھی گلی میں کچھ ہی قدم گئے ہوں گے کہ جولا نے ہمیں آلیا اور قریب آکے بولا "کیوں سیٹھ! کچھ خفا ہو گئے؟ ہم اپنی ماں کی قسم کھا کے بولتے ہیں کہ اپنا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔" تجمل نے اُس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ "ابھی اپنا خیال تھا کہ ہم کو پھر تمھارے پاس لے چلیں گے ... سکتے کی ذات سے بھی مل کے دیکھو۔"

"ملیں گے جولا، پھر کبھی ملیں گے۔"

جولا ہم سے ہمارا پتہ پوچھنے لگا کہ ہم کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں اور بولا کہ اگر ہمیں رہنے کی کوئی تکلیف ہو تو اُس کا گھر موجود ہے جہاں اُس کی ایک بیوہ بہن اور اُس کے بچے رہتے ہیں۔ بہن کا شوہر ہوائی میں مارا گیا تھا۔ اُس کی اور بچوں کی دیکھ بھال ہی کے لیے اُسے واپس مسلیم آنا پڑا ہے۔ وہ ہم سے اور بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا لیکن تجمل نے اُسے ٹال دیا اور وعدہ کیا کہ ہمیں رہنے کی بابت اور ایسی ویسی مشکل پیش آئی تو ہم اُسی کے پاس آئیں گے۔ جولا تجمل کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ ہاتھ کے نیچے لگتے ہی پیارا ہمراہ نگ جاتا ہے۔ ادھر کی بات نرالی ہے اس لیے ہم نے یہ سب تم کو بولا تھا۔" راستے بھر وہ مسلسل بکواس کرتا رہا۔ بازار بھی گزر گیا لیکن وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر تجمل نے سبزی منڈی کے نزدیک ایک جگہ ٹھیر کے تیز لہجے میں اُسے واپس جانے کے لیے کہا تب کہیں وہ ہم سے جدا ہوا۔ ہم سیدھے منیر علی کے گھر نہیں گئے بلکہ ایک لمبا چکر کاٹ کے دوبارہ بازار میں آگئے۔ تجمل نے اچانک ایک راہ گیر کو روک کے تارگھر کا پتہ پوچھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی مگر میں نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

تارگھر اور ڈاک خانہ ایک ہی عمارت میں تھا۔ تجمل نے تار کا فارم اندر کھڑکی کے اندر بیٹھے ہوئے ایک بابو سے قلم لے کے مجھے تھما دیا اور کہنے لگا ... وہ بیل گاڑی سے بیکار بیٹھے ہیں۔

"کیوں؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔ یہ لفظ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور تجمل سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔

"کہو! پتہ تو تمہیں یاد ہو گا۔"

میں نے سر ہلایا اور تار کے فارم پر پتہ لکھنے لگا۔

"کیا لکھنا ہے؟"

"جو تم نے کہا ہے۔"

"پڑھ کے سنائیے۔"

"لکھا ہے فوراً ... پہنچو بگڑ یاں کہاں؟" میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اتنا ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تار کب تک پہنچ جائے گا؟"

"ممکن ہے رات تک۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"بابو سے کہو کہ زیادہ پیسے لے کے اسے جلدی بھیج دے۔"

میں نے فارم پر ارجنٹ لکھ دیا۔ بابو کو فارم دے کے اور پیسے ادا کر کے ہم باہر چلے آئے۔ تجمل نے گھر جانے کے بجائے بازار سے کئی چیزیں خرید لیں۔ شیرینی، دو ریشمی گلابی دوپٹے، چوڑیاں، چاندی کے کڑے، شیروانی کا کپڑا اور ایک شال۔ ... ہم سامان سمیٹے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں منیر علی مل گئے۔ وہ بھی کہیں ڈھونڈتے ہوئے نکلے تھے۔ تجمل نے گھر آ کے سارا سامان اُن کے حوالے کر دیا۔ منیر علی نے بہت انکار کیا مگر تجمل نے عورت کے ہاتھوں سامان اندر بھجوا دیا۔ منیر علی یہ جاننے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے۔ تھانے کے بعد جیسے ہی تجمل بیٹھک میں داخل ہوا اور چارپائی پر پاؤں پسار کے بیٹھا منیر علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کہاں کہاں کی سیر کی جناب نے؟"

"یہیں گلی گلی گھومتے تھے بڑے صاحب!" تجمل نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیسے شہر آپ کو کیسا معلوم ہوا؟" منیر علی نے تجسس سے پوچھا۔

"صرف ناموں کی بات ہوتی ہے۔"

"ہاں! آپ سچ کہتے ہیں۔" منیر علی ہنس کے بولے۔ "ہمیں آپ کے خیال میں بستیاں بھی آدمیوں کی طرح ہوتی ہیں مگر صاحب! آدمی آدمی میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب! بستی بستی میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔"

منیر علی نے گھر پہنچتے ہی ہم سے کھانے کو پوچھا تھا۔ ہم نے منع کر دیا تھا لیکن چائے کے ساتھ کھانے ہی کے برابر سامان آگیا۔ مٹھائی، امرود، کیلے، سنگترے، ... کی چاٹ، نمک پارے وغیرہ۔ منیر علی سمجھے تھے کہ شاید ہم تکلف کر رہے ہیں۔ "میں کھانا کھا کے نہیں آیا ہیں" میری سمجھ میں اُن کا قیاس درست تھا کیونکہ میں نے ہوٹل میں چند ہی لقمے لیے تھے۔

چلتے چلتے کچھ ہی دیر بعد تجمل نے اُن سے کہا "ہم کل دن کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔" "کیوں بھلا؟" منیر علی نے حیرانی سے پوچھا جیسے تجمل نے کوئی اُلٹی بات کہہ دی ہو۔

"آپ نے اچانک جانے کا ارادہ کیسے کر لیا؟"

"کیا کریں بڑے صاحب! جانا تو کسی وقت ہے ہی، دو دن تو ہو گئے ہیں۔"

"کہاں! تیسرا ہی دن تو ہے بلکہ تیسرا دن تو اب شروع ہوا ہے نہیں جناب! ابھی آپ لوگ ٹھیریں گے۔" انھوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! ان شاء اللہ پھر کبھی آئیں گے۔"

"ابھی تو آپ کا آنا ہی معلوم نہیں ہوا۔" وہ ناراضی سے بولے "آدمی آتا اپنے بس سے ہے جاتا اپنے بس سے ہے۔ میں آپ کو اتنے جلدی نہیں جانے دوں گا۔ اتنے دور دراز کے سفر کے بعد آپ آئیں اور الٹا یوں ہی کیسے ممکن ہے۔ مجھے تو آپ کی خاطر تواضع کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوگا کہ ہم نے ایک دوست کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں جیسے ارمان تو ارشد میاں نے بے حال کر رکھے ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو تو مجھے معذور سمجھ کے معاف کر دیجیے۔ آپ کو کیا بتاؤں آج وہ میرا ارشد میاں کا بھی وہ دم اٹھا۔ ہم تھوڑا گیا تھا۔ اس کے گھر والوں ... تھے

اور کیا عجب ہیرو جب وہاں پہنچے تو اُس کے ساتھ وہ بھی موجود ہو۔ وہ یونہی خیال ہاتھ آ نہیں آئے گا۔ جمیل نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی ہیرو کو بمبئی سے بلایا ہے۔ وہ بٹوارے کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا استاد تھا۔ اُس کی ذہنی پرواز ہے۔ نگاہ کو بہت تیز ہے۔ ماچھی بھی دیکھ بھال کے قدم اُٹھائے گا۔ اگر اُس میں ہوشیاری نہیں ہوتی تو وہ ہیرو کے اس قدر قریب نہ ہوتا۔ ہیرو اپنا فن اُس کے حوالے کرتا۔ ہزار بار کوئی بھی بہروپ یہ خیال ہوگا کہ بعد میں میرے سامنے منہ دکھانے کی شرمندگی اُٹھانا پڑے۔ وہ عورت سمجھیں گے تو بھی سے اور آدمی بلا سکتے ہیں۔ ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں۔ سامنے مسلسل پیٹ اتنے آدمی نہیں ہوں گے جتنے ہیرو کے ایک پاٹ میں ہوں گے۔ اگر وہ واقعی اُس کے ساتھ گئی ہو تو ابھی انھیں گئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی مگر مجھ سے کچھ پل نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے ہر چیز سے وحشت ہو رہی تھی۔ سینہ بار بار کوئی تڑپے لیتا تھا۔ رگوں میں جیسے برف سی جم گئی تھی۔ میں کبھی باہر جاتا کبھی ہوٹل میں واپس آ جاتا۔ اس طرح شام ہو گئی۔ وہ بمبئی پہنچ گئے ہوں گے اور ہماری طرح حویلی کے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ رات کو بھی میں کھڑکی میں کھڑا باہر اندھیرے کو تکتا رہا۔ ایک دن گزر گیا پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر کوئی چڑھ رہا ہے حالانکہ انھوں نے ایک ہفتے بعد آنے کو کہا تھا مگر وقت کی اتنی پابندی ضروری نہیں وہ پہلے بھی آ سکتے تھے۔ دروازے پر کوئی آہٹ ہوتی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ اے خدا کوثر وہاں مل جائے میں کرشنا جی کی دی ہوئی ساری دولت اُسی وقت لٹا دوں گا۔

ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا۔ پانچواں دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ یکایک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ یہ ہوٹل کے کسی ملازم کی دستک نہیں تھی۔ میں بستر سے اُچھل پڑا۔ دروازے پر تو ہم سمجھتے ہی مجھے پیچھا آنے کو مگر جمیل کے پہنچنے سے پہلے ہی ہیرو نے ڈگمگاتے قدموں سے بھاگ کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہیرو کھڑا تھا۔ پیچھے ماچھی اور دروازہ ان کے پیچھے کوئی اور نہیں تھا اور ان کے چہروں ہی پر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔

"جمیل بھائی!" ہیرو کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اور نہیں ہے۔"

جمیل نے شانے سے تھام کے اندر لے آیا۔ "اور اُس رات ہی رستم خاں نے اُس کو اور مولوی کو فرار کر دیا تھا۔ اپن کچھ ساتھ لے کے نہیں آ سکا دادا! یہ......"

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک ریشمی رومال جمیل کے آگے ڈال دیا۔ اُس میں دو آنکھیں بندھی ہوئی تھیں۔ خون میں لتھڑی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں۔!

اُن کے کپڑے سیاہ ہو گئے تھے اور چہروں پر دھول جمی ہوئی تھی اور وہ مختصر سامان اُن کے ساتھ نہیں تھا جو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جمیل نے دونوں آنکھیں جلدی سے رومال سے ڈھک دیں اور ہیرو کو کھینچ کے پلنگ پر بٹھا لیا۔ "وہ کہاں ہے؟" اُس نے چیخ کر پوچھا۔

"وہ اور نہیں ہے جمیل بھائی!" ہیرو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"پھر...... تم کیا لے آئے ہو؟"

"اپن کر خالی ہاتھ آتے اچھا نہیں لگا۔" ہیرو گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"پھر تم...... تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟" جمیل کا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا۔

"وہاں جاسوسی پھیرنے کی ضرورت نہیں پڑی جمیل بھائی!"

"زبان کھولو ہیرو دادا!" جمیل اُس کا بازو جھنجھوڑنے لگا۔

"کیا زبان کھولوں؟" ہیرو نے خود کچھ کہنے کے بجائے تھکے ہوئے لہجے میں ماچھی سے کہا۔ "تو بول دے ماچھی، جمیل بھائی کو سب بول دے۔"

جمیل نے اپنی سرخ آنکھیں ماچھی کی طرف مرکوز کر دیں۔ ماچھی دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی اپنی کیا بولے۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"بول دے سب بول دے۔" ہیرو نے وحشت زدہ لہجے میں اُسے حکم دیا۔

"اپن اُدھر گیا تھا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد ماچھی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہم رات کو وہاں پہنچے، ہیرو کو آنکھ آ گئی اور اندر سامنے کے راستے سے جانے کا کسی اور جگہ سے۔ اُدھر بیچ کے اور لوگ بہت تھا۔ پھر ہیرو دادا بولا کہ اس طرح اندر جانے اور ڈھونڈنے سے اچھا ہے کہ اپن کو سیدھا رستم خاں کے پاس چل کے دیکھنا چاہیے۔ اندر جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں تھا۔ ہر سال پوچھتا تو خود بتا دیتے کہ اندر گھس سکتا تھا۔ ساری رات اپن دیوار کے نزدیک باغ میں پڑا رہا۔ دادا نے پچھلی دو کو باہر ٹھہرنے کو لیا اور دوسرا دن سویرے سویرے اور گیٹ پہ جا کے کھڑا ہو گیا۔ نوکر آ کر ہم دونوں کے چہرے گھور کے پوچھا، اپن نے رستم کا نام بولا اور اُس کو سب جانتا ہے۔ رستم اپنے کوارٹر پہ ہی تھا۔ اپن نے کنڈی ماری تو باہر آیا اور ان دونوں کو دیکھ کے آنکھیں پھاڑنے لگا۔"

"وہ مت مار، کام کی بات بول۔" ہیرو نے دانتوں کے درمیان سے بول دیا۔

ماچھی کی زبان پھر رکنے لگی تھی۔

"جلدی بکر دو بتا رہا۔" جمیل نے بے چینی سے کہا۔

ماچھی چند قدم آگے بڑھ کے جمیل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اپن رستم سے بولا کہ دور سے آیا ہے اور تم سے کچھ خاص بات کرنا مانگتا ہے۔" اُس کی دلا رفتہ رفتہ ٹھہر رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ ہیں کہ رستم خاں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ وہی جواب دیا کہ وہ اُس سے ملنے کے لیے دور دراز سے آئے ہیں۔ رستم خاں ان کی بات سے مطمئن نہیں ہوا۔ دروازے پر کھڑا ہوا سوچتا رہا۔ پھر وہ انھیں اندر گھر میں لے گیا اور اُس نے ان کے کہنے پر کسی تذبذب کے بعد دروازہ بند کر لیا۔ ماچھی اور ہیرو آتی سمج جان بوجھ کے اُس کے پاس گئے تھے تاکہ گھر میں کسی اور کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ رستم خاں کے گھر میں اُس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا اور وہ لنگوٹ کسے ہوئے ورزش کرنے کی حالت میں تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی ہیرو نے چاقو نکال کے لہرایا اور اُس کے درمیان ورزش پر ڈال دیا۔ رستم خاں چونکا اور خشمگیں نظروں سے انھیں گھورنے لگا۔ پھر اُس نے بھی طاق سے اپنا چاقو اُٹھا کے ہیرو کے چاقو پر پھینک دیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اتنا پتہ پوچھے بغیر انھیں گھر میں نہ لے جاتا مگر وہ رستم خاں تھا۔ راجا مہتاب خاں کا سب سے قابلِ اعتماد آدمی۔ یہ اعتماد اُس نے اپنی بے باکی اور جرأت ہی سے حاصل کیا تھا۔ ماچھی کے کہنے کے مطابق اُس نے گفتگو میں پہل نہیں کی بلکہ اُن سے دو ٹوک پوچھا۔ پہلے وہ ناشتہ کر لیں۔ ہیرو کے انکار پر اُس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ تاہم وہ پوری طرح چوکنا بیٹھا تھا۔ ہیرو نے اُس سے مولوی صاحب اور کوثر کے بارے میں سوال کیا۔ وہ اپنی جگہ اُچھل کے کھڑا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے سنبھل کے صاف منع کر دیا کہ وہ کسی ایسی لڑکی یا آدمی کو نہیں جانتا۔ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ ہیرو نے فوراً دونوں چاقو زمین سے اُٹھا لیے اور رستم کا چاقو اُس کی طرف اُچھال کے دوبارہ یہی سوال کیا۔ رستم خاں انکار کرتا رہا۔ پہلے ماچھی اور ہیرو کا ارادہ تھا کہ کوثر اور مولوی صاحب کی بات کرنے سے پہلے رستم کو گھیرے میں لیں اور اُسے اپنے ٹھکانے پر مجبور کرنے کے بجائے کسی تنہا جگہ لے جائیں جہاں کوئی اُنھیں نہیں اور جلنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرہ بند تھا اور پھر اُن دونوں کے لیے اس اجنبی شہر میں اس سے مناسب جگہ کی تلاش آسان نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ رستم سے مولوی صاحب اور کوثر کا ذکر کر چکے تھے۔ اب رستم خاں کا اُن کے ساتھ باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ انھیں جو بات کرنی تھی، وہیں کرنی تھی۔

ہیرو نے حتمی لہجے میں اُس سے کہا کہ وہ کوثر کا پتہ پوچھے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا۔ رستم خاں وحشی ہو اُٹھا۔ اُس نے ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ اُس کے گھر سے فوراً نکل جائیں ورنہ نتیجہ بُرا ہوگا۔ اُس نے اپنے چاقو کو لہرا کے کہا کہ وہ دونوں حویلی سے زندہ واپس نہیں جا سکیں گے لیکن رستم خاں کی ہیجانی حالت دیکھ کے ہیرو کو یقین آ گیا تھا کہ مولوی صاحب اور کوثر کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ وہاں سے نہیں اُٹھے۔ ہیرو نے رستم خاں کو للکار کے اُس پر وار کر دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ وہ خود رستم خاں سے نمٹنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہیرو نے بہت دنوں سے چاقو نہیں اُٹھایا ہے، ہاتھ کھلنے میں شاید دیر لگے۔ کوئی بھی اُن جیسی بات ہو سکتی تھی مگر ہیرو نے اُسے ایک طرف خاموش بیٹھے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ رستم خاں نے کئی پینترے بدلے مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے سامنے بمبئی کا سب سے بڑا اُستاد ہیرو ہے۔ وہ تین ہی بار لوٹ پلٹ کے ہیرو نے اُس سے چاقو گرا دیا۔ جیسے ہی رستم خاں بے بس ہوا، ہیرو نے اپنا چاقو بند کر لیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رستم خاں جھپٹ کے اُس کے گلے لگ گیا اور اُس کی انگلیاں چومنے لگا اور کچھ کہے سُنے بنا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ رستم چند ہی منٹ بعد واپس آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں پیتل کی ایک لٹیا اور کٹورے تھے۔ قریب سے مشروبات چڑھا ہوا وہ عورت کے اُس نے ایک کٹورا ہیرو کے آگے کر دیا۔ ہیرو نے اُس میں سے چند گھونٹ پیے ہوں گے۔ پیالا رستم نے ایک ہی سانس میں حلق سے اُتار لیا اور ہیرو کا ہاتھ پکڑ کے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہیں اور اُس کا پتہ انھیں کس نے دیا ہے۔ ہیرو نے پھر اپنی بات دُہرائی کہ جب تک رستم اُس کے سوال کا جواب نہیں دے گا، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

رستم نے پھر ضد نہیں کی اور اقرار کیا کہ اُس رات وہ مولوی صاحب اور کوثر کو لے کے آیا تھا۔ وہ پانچ آدمی تھے۔ اِس کام کا منصوبہ انھوں نے کئی دن پہلے بنا لیا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ محلے کے لوگ نماز پڑھ کے جلدی سو جاتے تھے۔ آدھی رات کے وقت وہ مولوی صاحب کے گھر میں اُترے۔ مولوی صاحب نے بساط بھر مزاحمت کی۔ کوثر اُن لوگوں کو دیکھ کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ راجا نے انھیں حکم دیا تھا کہ مولوی صاحب کو ذرا خراش بھی نہ آنے پائے۔ وہ راجا کی ہدایت کے مطابق شہر سے دور اُن کی جاگیر پر واقع ایک حویلی میں انھیں لے آئے۔ یہاں راجا کبھی کبھار سیر و تفریح اور شکار کے لیے ٹھہرتا تھا۔ خاص خاص مہمانوں کے لیے راجا کی نگاہ اسی حویلی پر جاتی تھی۔ حویلی کے آس پاس باغات اور کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب راجا کی ملکیت تھے۔ یہاں آ کے رستم نے پہلی بار کوثر کو غور سے دیکھا۔ کوثر کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک کونے میں سکڑی ہوئی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب بُری طرح رو رہے تھے۔ وہ رستم کے پیروں پر گر گئے اور گڑگڑانے لگے کہ کوثر کسی کی امانت ہے۔ مولوی صاحب نے رستم کو خدا رسول کا، اُس کی ماں بہن کا واسطہ دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا رستم خاں نے انھیں بتایا کہ کوثر کو دیکھ کے اُس کا جی گھبرانے لگا۔ کوثر پھولوں کی طرح نازک تھی۔ وہ اُسے دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب وہ مولوی صاحب اور کوثر کے کمرے کی کنڈی لگا کے باہر کی طرف آیا تو اُسے اپنے قدم بوجھل محسوس ہوئے۔ اُس کا ارادہ متزلزل ہو چکا تھا۔ اُس نے اشارۃً اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے ساتھیوں سے کیا تو دو نے توقع کے خلاف اُس کی حمایت کی۔ وہ اُن کے ساتھ ہی تھے۔ ایک کو راجا کے پاس اطلاع دینے کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا اور اب راجا کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا مگر اُس کی آمد صبح کے بعد ہی متوقع تھی۔

چلتے وقت راجا پہلی بار ملازمت میں فرق کر کے رستم کو رخصت کرنے آیا تھا۔ اس اہتمام سے اُسے یہ بتانا مقصود تھا کہ وہ ایک اہم کام کے لیے جا رہا ہے۔ راجا نے رستم اور اُس کے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر اُن کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ رستم کو اس حقیقت کا پوری طرح احساس تھا کہ راجا اُسے بہت نازک اور عجیب وقت پر طلب کرتا ہے۔ اُس نے رستم کو بطورِ خاص یہ ہدایت کی تھی کہ مولوی صاحب اور کوثر کو خاص کمرے میں رکھا جائے اور رستم کے سوا کوئی کوثر کے بدن کو ہاتھ

ہیں ایک اونچا چبوترا تھا جو کہ اسٹیج کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں رانا کے آدمی ورزش کرتے اور داؤ پیچ سیکھتے تھے۔ اب یہاں فرش پر دری بچھی تھی اور اطراف میں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے سازندے بیٹھے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک ناچنے گانے والی لڑکی تھی۔ رستم نے ان سے کچھ کہے بغیر یہ اہتمام کیا تھا۔ محفل چند ہی لوگوں تک محدود تھی اس لیے کہ چیڑا اور ماچھی نے پہلے ہی رستم سے کہہ دیا تھا کہ انھیں بھیڑ بھاڑ کا پتہ نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد یہ محفل ختم کرنے کی تشویش میں تھے لیکن رستم فرمائش کی فرمائش پر فرمائش کر رہا تھا۔ بہت رات گئے یہ سلسلہ بند ہوا۔ انھیں ایک اور رات ضائع جانے کا افسوس تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی رستم دیر تک انھیں اپنے واقعات اور لڑائی کے تذکرے اور رانا کی باتیں سناتا رہا اور وہ اس سے کرید کرید کے پوچھتے رہے۔ ان کی دلچسپی کا محور صرف رانا کا تذکرہ تھا اور جیسا کہ جوالا نے ہمیں بتایا تھا، رستم نے بھی رانا کے متعلق انھیں وہی باتیں بتائیں۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے کے قریب وہ رانا کو دیکھ سکے۔ رستم انھیں سہراب کے ہاں دو بجے کی دعوت سے پہلے جا رہا تھا کہ رانا سے ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ رانا کو دیکھ کے رستم ٹھہر گیا اور اس نے ان دونوں کو اس کی خدمت میں اپنے مہمان کے طور پر پیش کیا۔ رانا کو شاید ان کی آمد کے بارے میں پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر رستم کے گھر میں تنگی ہو تو انھیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا جائے۔ ماچھی تیار نہ تھا کہ رانا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کے اس کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

وہ سرخ و سپید رنگ کا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ باریک مونچھیں، سیاہ بال پیچھے کی طرف الٹے ہوئے، سفید کرتے اور پاجامے میں وہ ایک نواب لگ رہا تھا۔ رانا ان کے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ اب تک وہ اس کے بارے میں بہت سی باتیں سن چکے تھے اور ان باتوں سے انھوں نے اس کے متعلق جو تصور قائم کیا تھا، وہ ہو بہو اس کے مطابق تھا۔ رانا کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔ ان میں خون کے سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

شام کو وہ زردا سے ملنے کے لیے تنہا شہر جانا چاہتے تھے مگر رستم ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اس سرائے کی طرف جا نکلے جہاں زردا ٹھہرا ہوا تھا۔ زردا نے انھیں دور سے دیکھ لیا لیکن ماچھی کا اشارہ پا کے دور دور رہا۔ ان کا مقصد بھی زردا کو اپنے چہرے دکھانے تھے لیکن جب وہ سرائے سے قریب پان کی ایک دکان پر پہنچے تو زردا ان کے قریب آگیا۔ وہ رستم کے سامنے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے کھڑے رہے۔ پھر چیڑا نے رستم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ماچھی کو زردا سے چند باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے زردا سے کہا کہ کل دوپہر تک اگر وہ اس کے پاس نہ آسکیں تو وہ بمبئی تار دے کے اور لوگوں کو بلا لے اور اگر وہ ان لوگوں کے بمبئی سے آنے کے بعد بھی اس کے پاس نہ پہنچ سکیں تو وہ سب جس طرح مناسب سمجھیں حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کریں اور فرض کر لیں کہ ماچھی اور چیڑا کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ادھر مکیریں میں استاد چھیل اور لاڈلے کو فوراً مطلع کر دیا جائے۔ ان کے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں لیکن جو انھوں نے سوچ رکھی تھیں وہ آسان نہیں تھی۔ وہ تعداد میں صرف دو تھے اور رانا کی حویلی ایک چھوٹے سے قلعے کی حیثیت رکھتی تھی اگر وہ اس قلعے کے اندر بیٹھے تھے۔ دوسری رات رستم خان مجرے کا اہتمام کر رہا تھا۔ انھوں نے اصرار کر کے مجرا دوسرے دن کے لیے ملتوی کرا دیا۔ رستم خان نے اس محفل کے لیے خاص طور پر شیری کے پیالے بنوائے تھے۔ چیڑا اور ماچھی اس تقریب کو ہوتے ہیں رہ سکیں البتہ رستم خان نے خوب پی تھی۔ بھی بے تحاشا کھایا اور جلد ہی اپنے آپ سے دور ہونے لگا۔ پھر بھی رات کے ڈیڑھ دو بجے سے پہلے ماچھی کو رستم کے گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ حویلی میں سرگوشیاں تھی خاموشی تھی۔ چیڑا رستم کے پاس ہی ٹھہر گیا اور ماچھی رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے باہر نکلا۔

انھوں نے رستم کی زبانی رانا کی ایک چھوٹی بہن کے متعلق سنا تھا۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ راستے میں جتنے آدمی آئیں گے ان کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کریں گے اور کسی نہ کسی طرح اندر زنان خانے میں داخل ہونا ایسا مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ وہاں وہ ایک ہی جگہ کی طرح ہو سکتے تھے۔ رانا بہرحال ایک جاگیردار تھا۔ کوئی معیاری موتی سے دربار یا جا نہیں۔ حویلی کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دیوار اور ادھر ادھر دروازوں پر بہت پہرے دار تھے تو اندر رکھوالی کی اتنی ضرورت کہاں تھی مگر جب انھوں نے آپس میں بعد کے مراحل پر غور کیا تو رانا کی بہن کو لانے کا خیال ترک کر دیا۔ اسے بے ہوش کر کے دبوچا جا سکتا تھا لیکن حویلی کی دیوار کے پار لے جانا بھی ممکن تھا جب ان کے پاس زیادہ آدمی ہوتے۔ اپنے دوسرے آدمیوں کی آمد کا انتظار کرنے میں دن بہت لگ جاتے۔ انھیں رانا ہی کے محل کے پاس پہنچنا تھا۔

ماچھی نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اندھیرے میں خود کو چھپاتا ہوا وہ حویلی کے پچھواڑے صحن میں آ گیا اور بارہ دری کی محرابیں اور جالیوں کا سہارا لے کے زنان خانے کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جگہ کی اس نے پہلے ہی نشاندہی کر لی تھی۔ صحن زنان خانے اور مردان خانے کے سامنے درمیانی حصے میں تھا اور حوض کے پاس بارہ دری شاید اس خیال سے بنائی گئی تھی کہ حویلی کے دونوں حصوں کے مکینوں کو وہاں آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔ ماچھی چھت چھت اور منڈیر منڈیر گزرتا ہوا مردان خانے تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ چھت پر ادھر سے ادھر جانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اسے کسی زینے کی تلاش تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس طرح کی عمارتوں کے زینے عموماً کھلے ہوتے ہیں۔ وہ کسی جگہ سے دوبارہ نیچے پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اس طرف جو زینہ نظر آیا

اس کا دروازہ بند تھا۔ ماچھی نے اسے کھولنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہو کے نیچے اترنے کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔ چھت سے موٹے پائپ کی شکل کے کئی پرنالے باہر اٹھے ہوئے تھے۔ اگر اس کے پاس رسی ہوتی تو وہ ان سے باندھ کے نیچے اتر سکتا تھا۔ پرنالا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اور جسم نیچے گرا کے زمین پکڑنے سے ہاتھ پیر ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ چھت بہت اونچی تھی۔ اسی لحاظ سے پرنالے بھی اونچے تھے۔ وہ چھت پر یہاں سے وہاں دبے قدموں کھسکتا رینگتا رہا اور آخر اس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ وہ جس راستے سے اوپر آیا ہے اسی سے واپس چلا جائے اور نیچے ہی کہیں سے مردان خانے میں جانے کا راستہ تلاش کرے۔ مجبوراً وہ بارہ دری کے قریب واپس صحن میں آ گیا اور رکتا جھجکتا درختوں کی آڑ لیتا مردان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے ایک لمبا چکر کاٹ کے عمارت کے سامنے آنا تھا لیکن ایک بار اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں نہ وہ عمارت کے پچھلے ہی حصے میں کسی طرف رستے کا سراغ لگائے۔ کسی کسی جگہ کمروں میں ہلکی روشنی تھی۔ مردان خانے کی عمارت میں پیچھے کی جانب اسے ایک تنگ گلی سی نظر آئی۔ ماچھی اسے گلی گمان کر رہا تھا مگر وہ راہداری ہو گی۔ ماچھی بے آواز چاپوں سے اس کے قریب گیا۔ راہداری دور تک چلی جاتی تھی اور تاحد اس میں بائیں دوسری راہداریاں سے مل جاتی تھی۔ چند قدم چل کے اسے اندازہ ہوا کہ آگے کچھ فاصلے پر راہداری کا دروازہ بند ہے۔ اندر کوئی آواز جھنکار نہیں ہے۔ ماچھی نے لوہے کے جالی دار دروازے سے اندر جھانک کے دیکھا۔ ہلکی روشنی میں چارپائی پر اسے ایک شخص سویا ہوا نظر آیا۔ چارپائی کے سرہانے فرش پر دھیمی جلتی ہوئی لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک لاٹھی بھی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ ماچھی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ اگر وہ اس شخص کو پکارتا ہے تو ضروری نہیں کہ سویا ہوا شخص دروازہ کھول کے باہر نکل آئے اور آہٹ کی تصدیق کرے اور اسی لمحہ میں ماچھی اس کو پکڑ لے۔ وہ اندر ہی رہ کے آوازیں لگا سکتا تھا کہ کون ہے۔ اسے خواہ مخواہ شک میں ڈال کے مزید کوئی الجھن پیدا نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ماچھی نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ عمارت کی دیوار سے چپکتا ہوا وہ کونے تک پہنچ گیا۔ اسے دائیں جانب مڑ کے عمارت کے ساتھ ساتھ ہی چلنا تھا۔ اس نے مڑ کے سر نکال کے دیکھا۔ ادھر کوئی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ چلنے کے بجائے اس نے پنجوں کے بل بھاگنا شروع کر دیا اور چند ثانیوں میں دوسرے کونے پر آ گیا مگر جب اس نے وہاں سے جھانک کے دیکھا تو عمارت کے سامنے کے حصے میں خاصی روشنی تھی۔ اسے بجھتے ہوئے حویلی کے ڈیوڑھی صحن کے سرے پر دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ دو موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رانا کی محفل ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ رات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ اس نے رستم سے سنا تھا کہ کبھی کبھی تو رات رات بھر ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ باہر آدمیوں کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ اندر بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ پتہ نہیں کب یہ محفل ختم ہو۔ ممکن ہے صبح ہو جائے۔ وہ یہیں کھڑا سوچنے لگا کب تک انتظار کر سکتا ہے۔ اس دوران میں کسی بہانے سے یا کسی اور شخص کی نظر پڑ گئی تو وہ اس سے کیسے نمٹے گا۔ اس قسم کے کئی اندیشوں نے ماچھی کو الجھن میں مبتلا کر دیا۔ صحن سے اور درمیان کے درختوں کی آڑ میں آتے ہوئے بڑے دروازے پر بیل بیل کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔ ماچھی نے واپس جانے کا ارادہ کیا تھا کہ واپس مڑتے ہوئے اس کے پیر اٹکنے لگے۔ وہ چیڑا کو کیا جواب دے گا اور کل کا سوچ نہ معلوم کس انداز سے تیور بدلے۔ موقع گزر رہا ہے گیا اور اس نے انتظار کرنے کا عزم کر لیا لیکن کسی ایسی جگہ چھپنا بہتر تھا جہاں سے وہ آنے جانے والوں کو دیکھ سکے اور عمارت کا وہ حصہ بھی قریب رہے جس طرف اسے جانا تھا۔ ماچھی کو ان حالات میں ایک ہی راستہ دکھائی دیا کہ وہ عمارت اور چار دیواری کے بیچ کی کشادہ جگہ عبور کر کے چار دیواری کے ساتھ لگی ہوئی گھنی کیاریوں کی آڑ میں خود کو چھپا لے۔ اس نے یہی کیا اور ایک ایسے مقام پر آکے بیٹھ گیا جہاں اس کی نظروں کے سامنے سب کچھ عیاں تھا۔ آہٹ کے بغیر کوئی اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔ اس طرح وہ زمین پر اُگا ہوا جھاڑی کا ایک تودا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا۔ کچھ دیر بعد ہی شور اٹھا۔ صحن میں ایک ساتھ کئی افراد آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں رانا نہیں تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے ایک لمبے تڑنگے شخص نے ان چند لوگوں کو رخصت کیا۔ سب کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پھر شیروانی والا شخص لوٹ آیا۔ اس کے جاتے ہی سازندوں کی ایک ٹولی اندر سے آ کے صدر دروازے کی طرف چل گئی۔ ماچھی نے اپنی نگاہیں جمائے رکھیں۔ لوگ آئے اور چلے گئے۔ سازندوں کے ساتھ گانے والی نہیں تھی۔ اسے شاید اندر روک لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں بچے کھچے صحن میں خاموشی غالب آ گئی۔ وہ شخص بھی اٹھ کے کہیں چلا گیا تھا جو آخری سرے پر پہرے داری کر رہا تھا۔ باہر کی روشنیاں بھی مدھم پڑ گئی تھیں۔

ماچھی نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ جگہ آنکھوں میں محفوظ کر لی تھی جہاں سے لوگ باہر آئے تھے۔ صحن میں ہر آہٹ معدوم ہو گئی تو ماچھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ صحن میں اب بھی اتنی روشنی ضرور تھی کہ دور سے کوئی بھی اس کی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ ماچھی صحن میں آ کے لوٹتا ہوا عمارت سے قریب ہو جاتا مگر یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل تھا۔ صحن میں ہر طرف کھلا ہوا تھا۔ بڑے دروازے پر پہرے دار اب بھی جاگ رہے تھے مگر وہ بہت دور تھے۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد اس نے خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔ اس نے طے کیا کہ وہ کھلے طور پر صحن میں چلتا ہوا عمارت میں داخل ہو گا۔ دور سے کسی نے اسے دیکھا تو پہرے دار کا گمان کرے گا۔ عمارت

کے کرنے تک وہ دیوار سے چپکتا ہوا آیا اور صحن میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنا جسم سیدھا کر لیا۔ اُس نے چادر اس طرح لپیٹ لی تھی کہ اُس کا جسم کم سے کم معیوب لگے۔ اُس کی چال بھی معتدل تھی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا وہ سارا صحن عبور کر گیا اور ان گنت ستونوں پر ٹکے ہوئے دالان میں آ گیا۔ یہاں اُسے معلوم نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ اُس نے ایک اندازہ لگایا اور ایک کھلے ہوئے محراب نما دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اُس کا خیال درست تھا۔ دروازے کے دونوں اطراف دائیں بائیں راستے جاتے تھے۔ راستوں پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر کمرے بنے ہوئے تھے۔ ماچھی کو کسی روشن کمرے کی تلاش تھی مگر وہاں کئی کمروں کے اُوپر روشن دانوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ماچھی نے پہلے پڑنے والا دروازہ آہستہ سے جا کے دیکھا، وہ بند تھا۔ ماچھی نے جسم کے گرد چادر لپیٹ لی اور ہلکی سی دستک دی۔ دستک کا کوئی جواب نہیں ملا تو اُس نے دروازہ دھڑدھڑایا۔ اندر سے ایک گھبرائی ہوئی آواز اُبھری "کون ہے؟" ماچھی نے دستک جاری رکھی اور اُسے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے کی طرف آ رہا ہے "کون ہے؟" کسی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"رانا جی .... رانا جی .... وہ ...." ماچھی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ اُسے احساس تھا کہ زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔ اُس کا حربہ بہت نمایاں تھا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ ماچھی تیار کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لمحے میں باہر نکلنے والے شخص کا سر دبوچ لیا اور اُس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے لمحے ماچھی کا چاقو اُس کی گردن پر تھا۔ وہ وہی شخص تھا جو رانا کے مہمانوں کو رخصت کرنے موٹروں تک آیا تھا۔ اُس نے شیروانی اُتار دی تھی اور صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گھگھیانے لگا۔ "رانا کے پاس چلو" ماچھی نے اُسے حکم دیا اور کہا کہ اگر اُس نے آواز نکالنے کی کوشش کی تو چاقو اُس کے سینے کے پار ہو گا۔ وہ نڈھال ہونے لگا۔ ماچھی نے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ رانا کا کمرہ اُس شخص کے کمرے کے برابر ہی تھا۔ ماچھی نے پھر اُسے حکم دیا کہ وہ دروازے پر دستک دے اور اپنا نام بتائے۔ وہ شخص جھجکا لیکن چاقو کی نوک اُس کی گردن میں چبھی تو فوراً آمادہ ہو گیا۔ اندر سے رانا کی لڑکھڑاتی ہوئی گرج دار آواز گونجی۔ ماچھی کے دبوچے ہوئے شخص نے اپنا نام منی میاں بتایا۔ رانا نے اندر ہی سے پوچھا "کیا ہے؟" منی میاں نے ماچھی کے ایما پر آواز لگائی "کوئی آیا ہے، دروازہ کھولیے۔"

"نہیں کھولتے۔" رانا نے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

منی میاں نے پھر التجا کی "کھولیے سرکار، کام بے حد ضروری کام ہے۔"

رانا کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کی گونج ماچھی کے کانوں میں پڑی تو اُس نے منی میاں کے کندھے پر گردن کے قریب ضرب لگائی۔ منی میاں وہیں بیٹھ گیا۔ ماچھی پوری طرح مستعد تھا۔ دروازہ کھلا تو رانا ٹھیک اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کا سر ایک شاخ کی طرح لرزا۔ ماچھی نے ایک ہاتھ سے اُس پر جھپٹا مارا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ پر وار کیا۔ تنچا فرش پر گر گیا۔ رانا اتنا مدہوش نہیں تھا جتنا آواز سے معلوم ہوتا تھا۔ ماچھی کی ضرب کھا کے وہ فوراً اُٹھ گیا لیکن جب اُس نے اپنا تنچا ماچھی کے ہاتھ میں دیکھا تو اُس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھر گئے۔ "کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" رانا نے بڑی آواز نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ماچھی اُسے جواب دینے کے بجائے جست لگا کے اُس لڑکی کے پاس جا پہنچا تھا جس نے اُس کے اندر گھستے ہی چیخ بلند کی تھی جو گرد و پلنگ پر سمٹی پڑی تھی۔ رانا جیسے ہی زمین پر گرا، لڑکی اپنا دامن بچھاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ماچھی نے اُسے زیادہ چیخنے چلانے کی مہلت نہیں دی۔ ماچھی کا ایک ہی ہاتھ اُس کی خاموشی کے لیے کافی تھا۔ دوسری جانب ماچھی نیم برہنہ رانا کو تنچا نے پر لیے ہوئے تھا۔ رانا کی بڑی بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ماچھی نے تنچا جیب میں رکھ لیا اور پھل سے اُس کے پیٹ میں اپنا گھونسا گھسیڑ دیا۔ رانا دوہرا ہو گیا۔ ماچھی نے اُسے سر کے لیے اُٹھنے اور سنبھلنے کی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

جب وہ وہاں سے لوٹا تو اُس کے ہاتھ خون میں لت پت تھے۔ رستم نگری نیند سو رہا تھا اور پیرو ماچھی کے اشارے کا منتظر تھا۔ ایک ہی آواز پر وہ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ دونوں شمال کی سمت چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے چلتے رہے۔ وہ پہری انھوں نے کسی جگہ اینٹیں نکلی ہوئی دیکھی تھیں۔ دوسری طرف سے بے نیاز ہو کے وہ اوپر چڑھ گئے اور بچھو کے مانند چار دیواری کی منڈیر سے چپکتے ہوئے خود کو گھسیٹتے رہے۔ اُن کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ وہ دوسری جانب ایسی جگہ کودنا چاہتے تھے جہاں زمین کی سطح اُونچی ہو یا کوئی درخت قریب ہو جس کی شاخ کا سہارا لے کے وہ اُتر سکیں۔ کوشش کے بعد ایک جگہ انھیں کوڑے کا ڈھیر نظر آیا۔ انھوں نے خود کو وہیں گرا دیا۔ اُن کے کپڑے اس قابل نہیں تھے کہ وہ کوئی شہر جا سکیں۔ وہ اندھیری سڑکوں پر بھاگتے رہے۔ پیرو کے کپڑے ماچھی کے کپڑوں سے بہتر تھے اس لیے ماچھی کو دور ٹھیرا کے خود ویرانے سے [illegible] جاگ رہا تھا۔ پیرو کسی بہتر حالت کے دکان سے کسی ساز کی پوٹلی اُٹھا لایا۔ اُن تینوں نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جیسلمیر کی مخالف سمت سفر شروع کیا۔ وہ چلتے رہے۔ [illegible] پھر انھیں ایک چھکڑا مل گیا۔ جیسلمیر سے تیس میل دور [illegible] کے اسٹیشن پہ کے اُنھوں نے سانس لی اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

ماچھی چپ ہو گیا تھا۔ تجمل نے سر نہیں اُٹھایا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور ماچھی اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ستائشی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پیرو نے جھکتے ہوئے تجمل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تجمل چونک پڑا۔ "تجمل بھائی! کیہ گم ہو گیا؟"

"کدھر بھی نہیں۔" تجمل نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیا سوچنے لگا ہے؟"

"کچھ نہیں پیرو!" تجمل نے سنجیدگی سے کہا "تم بمبئی واپس چلے جاؤ۔"

"کیا .... کیا بول رہا ہے؟ اور تم؟"

"ہم کو یہیں چھوڑ دو۔"

"تم ادھر کیا کریں گا تجمل بھائی؟"

"پیرو! تم واپس چلے جاؤ۔"

"وہ تو اپن چلا جائیں گا پر .... پر تم کیا سوچ رہا ہے؟ اپن سے کوئی غلطی ہو گیا ہے؟"

"او رے تجمل بھائی! ایسے چپ کیوں ہو گیا؟"

"تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ غلطی ہم سے ہوئی جو تم کو اتنی دور سے اِدھر بلایا۔"

تجمل اپنے گال تھپتھپانے لگا۔

پیرو نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بھیگی ہوئی آواز میں بولا "تجمل بھائی! ایسا کوئی بات ہے تو اپن کو بولو۔ اپن مرنے کے لیے تیار ہے۔"

"نہیں نہیں پیرو! نہیں تم جاؤ۔ اُدھر بمبئی جا کے اپنا دھندا سنبھالو۔ گھوڑا اپنے جانے بوجھے راستوں پر ٹھیک چلتا ہے۔" تجمل نے جذباتی انداز میں کہا۔ "جاؤ! پولیس یہاں تک بھی آ سکتی ہے۔"

پیرو نے اپنا جوتا اُتار کے اُس کے سامنے کر دیا۔ "سالا جوتا اوپر ایسا بولو اپن گھر کیدھر ہے؟ قسم ہے تجمل بھائی! ہم اپنا گیتا کا قسم کھا کے بولتا ہے اپن نے جان بوجھ کے کوئی غلطی نہیں کیا۔ ایسا ہوا تو اپن ناک کاٹ کے تمھارے پیروں پہ رکھ دے گا۔"

"گیتا کی قسم مت کھاؤ۔" تجمل نے درشتی سے کہا۔ "وہ اُدھر نہیں تھا۔ ہم نے تم کو اتنا ہی بولا کہ اُدھر سے صرف اتنا جان کے آؤ۔ اس کے لیے تم اکیلے کیوں نہیں گئے؟ کسی نے بولا تھا؟ ہم خود بھی اُدھر جا سکتے تھے۔ پیرو! ہم نے تم سے کہا تھا کہ جلا وطن جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ماچھی کو اتنی دیر لگانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں لگتی۔ وہ بھری بستی میں جا کے اُنھیں نکال کے لے آیا۔ تم نے [illegible] کلائی میں مروڑ نہیں ہوگی تھی، سالی آنکھ میں [illegible] پیرو! اُس نے تم کو سب بول دیا تھا۔"

"لیکن بعد میں پتا تھا کہ سالا چلو اس ماچھی اگر کا پتا نے بولا، ایسا کیسے تجمل بھائی کے پاس جائیں گا، اپن کو گنج بھی کام نہیں کرتا تھا تجمل بھائی! اسٹیشن پہ کے تم سلامت ہو گئے جب یقین ہو گیا تب اپن نے ایسا کیا۔"

"تم نے ٹھیک کیا پیرو! ٹھیک کیا۔" تجمل نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پولیس تمھارا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ سکتی ہے۔ تم پہلی گاڑی سے بمبئی چلے جاؤ۔"

"اپن کو پولیس کی فکر نہیں ہے۔ تم اب کیدھر جاؤ گے؟"

"کہیں تو ہم بھی جائیں گے۔"

"پھر کیدھر؟" پیرو ضد ہی سے بولا۔ "اپن کو کیوں نہیں بولتا؟"

"ہم کو پتا نہیں ہے کہ ہم کدھر جائیں گے۔"

"ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گا۔" پیرو نے فیصلہ کن انداز میں کہا "تھوڑے دن کے لیے اُدھر بمبئی چلو۔ نہیں جائیں گا تو اپن بھی تمھارے پاس رہیں گا۔ ایک ساتھ چل چلیں گا تو مزہ آئیں گا بھیا۔"

"پیرو! ضد مت کرو۔" تجمل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تجمل بھائی! اپن کچھ کچھ جان رہا ہے۔ پر اُدھر تم سالا نے ایسا ایسا بات بولا کہ اپن سے یوں ہاتھ نچاتے ہوئے آتا ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ غلطی آدمی سے ہوتا ہے تجمل بھائی! اپن تو تمھارا پیرو ہے۔"

"اسی لیے تو تم کو بلایا تھا پیرو!"

"اپن جانتا ہے تم کھلے سے بھی بہت لوگوں کو بلا سکتا تھا۔ تمھارے پاس آدمی کی کمی تو نہیں ہے۔ یہاں ان کو بولو کہ ابھی کیا کرے؟"

"کچھ نہیں پیرو! اب تمھارا کام ختم ہو چکا ہے۔" تجمل نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اپنی آواز پر مشکل سے قابو پا رہا تھا "کیا ٹائم ہو رہا ہے؟"

"ابھی تین بجے ہیں۔" زندہ دل پارکر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ گاڑی پانچ بجے کے قریب جاتی ہے۔ تم آج کی گاڑی پکڑو۔"

پیرو تجمل کی چھاتی پر سر پٹخنے لگا۔ "ایسا کیسے جائیں گا؟"

"تم جاؤ گے پیرو! مجھے فرصت ملی تو جلد ہی تمھارے پاس آ جاؤں گا۔ بس اس کے بعد کچھ مت بولنا۔"

"تجمل بھائی!" پیرو اُس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ تجمل نے کہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ زندہ دل اور ماچھی نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اُسی لمحے تجمل نے پیرو کے قیام کے لیے کہا۔ حمام آیا تو پیرو اور ماچھی خوشی سے اپنے بال ترشواتے رہے۔ تجمل نے اپنا ادیب کے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا بھی انھیں دلا دیا تھا۔ اسٹیشن پر بھی اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بمبئی کی طرف جانے والی گاڑی ٹھیک وقت پر روانہ ہونے والی تھی۔ ڈبے میں چڑھتے ہوئے تجمل نے پیرو کو بھینچ کے گلے سے لگا لیا۔ اُس کے گال تھپتھپائے لیکن پیرو کچھ نہیں بولا۔ سر جھکائے کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ تجمل نے بازار میں رک کے خریدی ہوئی چیزوں کا تھیلا پیرو کے سپرد کر دیا اور وہ بے کیا کرتے تھے، پیرو نے اُس سے اپنا منہ چھپا لیا۔

گاڑی گئے ہوئے دیر ہو گئی لیکن تجمل وہیں پلیٹ فارم پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیرے لگاتا رہا۔ ہم ہوٹل کا حساب چکا کے آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہمارا مختصر سامان بھی تھا اس لیے ہوٹل واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اُس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ تھک کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے پیچھے میلے کپڑوں کا تھیلا رکھ کے میں بھی کونے میں اُس کے برابر کی طرف بیٹھ گیا۔ وہاں اب کوئی سواری اور گاڑی نہیں تھی۔ ابھی کوئی گاڑی جلد آنے کا امکان نظر آتا تھا۔ اسٹیشن پر بتدریج سکوت طاری ہو گیا تھا۔ مجھے بھی

وہ بھی فرسٹ۔ جیل میں رہ کے میں یہی کر سکتا تھا۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی مگر مولوی صاحب کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ اُن کی نظر سے یہ خبر بھی نہیں گزری گزرتی تو وہ مجھے مبارک باد کے دو لفظ ہی لکھ دیتے اور ایسے میں اتنا پھٹان کے علم میں ہوتا تو یہی معلوم ہوتا کہ میری سزا کتنی مدت کی ہے اور جب میں نے اپنی سزا پوری کر لی ہے تو دوبارہ تفتیش کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ دو سال تین سال پانچ سال۔ اس دوران میں جیل کے بہت سے حکام بدل گئے تھے اور لوگ بھول گئے تھے کہ میں کس معاملے میں جیل آیا ہوں۔ بات پرانی ہو گئی تھی۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد مولوی صاحب کا یہ اندیشہ دور ہو جانا چاہیے تھا۔

مولوی صاحب جیسے شخص کے لیے جیل کا تصور ہی بہت بھیانک ہوگا۔ انھوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ اب میری طرف توجہ دینا خود کو اور الجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ میں جیل سے رہا بھی ہو گیا تو کورا کے لائق نہیں رہا۔ گویا بُرا تو سایہ بھی کورا پر نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے تھے اس لیے کہ اب وہی کورا کے سب کچھ تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے ماضی سے یکسر ناتا توڑ لیا تھا۔ نہ جانے انھوں نے کورا کو کیا بتایا ہوگا۔ بیٹوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے آئے میرے واپس آنے کی تسلی دی ہوگی۔ کہا ہوگا کہ میں کھو گیا ہوں اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کورا کو یہ نہ بتاتے تو روزانہ گلا گھونٹ لیتی۔ چڑیاں جیسی کے کھا لیتی۔ انھوں نے اسی طرح کچھ کہا ہوگا اور یہی اس سے کہنا بھی چاہیے تھا مگر ساتھ میں انھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ وہ کورا کو کب تک یہ دلاسے دے سکتے ہیں۔ کورا نے انھیں ہزاروں بار کریدا ہوگا کہ وہ جیسے آ جان پا آتی کرید کرتیں۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہوگا کہ وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا ہے۔ لیکن پہلے سال دو سال بعد کورا کے دیا تے پوچھتے پر مولوی صاحب نے گھر کوئی خط لکھا ہو اور وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو کیونکہ امی کے انتقال کے کچھ دن بعد ابا جان نے گھر بیچ دیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا ہی میں کہیں مولوی صاحب کا تعاقب محلے کے لوگوں نے کیا ہو جو کورا کی تلاش میں سرگرداں تھے اور مولوی صاحب خطا ہو گئے ہوں کہ اگر کہیں کسی ذریعے سے اُن لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ پھر اُن کے سامنے آ جائیں گے۔ اُن کی گوشہ نشینی کا سب سے بڑا سبب یہی ہوگا۔ انھیں ایسے چند لوگ ضرور راستے میں ٹکرائے ہوں گے اور اُن کی شدت کا بھی انھیں اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ ہر حال میں کورا کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنی طویل مدت کے دوران انھیں کوئی ایسا شخص نظر آ گیا ہو جسے وہ کورا کے لیے سب سے موزوں سمجھتے ہوں۔ اسی لیے انھوں نے باقی تمام لوگوں کو منع کر دیا ہو۔ جب انھوں نے امانت کا لفظ کہا تھا تو اُن کے ذہن میں کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے۔ جیسلمیر آنے سے پہلے وہ متعدد جگہوں پر رہے ہوں گے اور اَن گنت خاندانوں سے اُن کا واسطہ پڑا ہوگا۔ ہو سکتا ہے اُن کی نظر انتخاب کسی شخص پر ٹکی ہو اور وہ اُسی کے انتظار میں ہوں یا پھر یہ ہو کہ کورا کو قبول کرنے کا تصور ہی اُن کے لیے سوہانِ روح ہو۔ ایک طرف انھوں نے کورا سے کہا ہوگا کہ وہ میری کھوج میں ہیں۔ اس صورت میں دوسری طرف آگے مستقل طور پر کسی اور سے وابستہ کرنے کا ذکر وہ اس کے سامنے کیسے کر سکتے ہیں۔ کورا نے انھیں یقیناً کوئی ایسا تاثر دیا ہوگا کہ وہ صرف میرے لیے زندہ ہے جیسے میں اس کے لیے زندہ تھا۔ اس نے ایسا کچھ ضرور کہی ہوگا اور مولوی صاحب کو یہی یقین ہوگا کہ کورا کی رائے نہیں بدل سکتے۔ چاہے صدیاں بیت جائیں اور جب انھیں یقین ہو گیا تھا تو سات سال دو سال ہی تھے۔ اس عرصے میں کورا انھی کے ساتھ تھی۔ لازماً انھیں میری زندگی اور رہائی کی سن گن ضرور ملنی چاہیے تھی جیسے کو دماغ میں بہت سی سوچوں نے جالا بُن لیا تھا۔

ریل گاڑی بھاگ رہی تھی۔ وہ یہی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگے تھے۔ صرف گارڈ جاگ رہا تھا۔ کہیں گاڑی رکتی تو سپاہی چونک کے آنکھیں ملنے لگتے۔ اگلا گاڑی پھر ہوا کر گارڈ کے ساتھ نیچے اُتر جاتے۔ گاڑی چلنے لگتی تو پھر اونگھنے لگتے۔ رات کو کسی وقت اُس نے ہمیں جودھپور پہنچا دیا۔ یہاں سے ہم مختلف لاریوں میں سفر کرتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک جلتے بعد جیسلمیر شہر کا اُونچا قلعہ ہمارے سامنے تھا۔

محلے کی گلیوں میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ ہم نے تیز رفتاری سے طے کیا تھا۔ شاید سارے مرد گھروں سے باہر نکل چکے تھے۔ راستے میں ہمیں جاننے والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ بھاری دستک پر دروازہ منیر علی نے کھولا اور ہمیں اپنے سامنے دیکھ کے ٹھٹک کے رہ گئے۔ اُن کے ہونٹ سُوجے ہوئے تھے اور ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات بھر نہیں سوئے ہیں اور جیسے ایک ہفتے کے دوران وہ پچاس برس کے ہو گئے ہوں۔ "آپ ......" تو بس! تمام اُن کے حلق سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں بڑے صاحب!" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"آپ ...... آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" انھوں نے سٹ پٹا کے لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ دُور سے نہیں۔"

"مگر آپ تو، آپ تو ......"

"ہاں!" تجمل بڑھ کے اُن کے گلے سے لگ گیا۔ "جلدی ہی واپس آنا ہو گیا۔ ادھر جیسلمیر سے گزر رہے تھے سوچا ابا جان کو بھی ہو آ کر لیں۔ آپ کو سلام کرتے چلیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ لگتا ہے کچھ ......" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"آپ اتنے دنوں کہاں کہاں رہے؟" منیر علی نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"ہمیں حیدرآباد سے آگے زیادہ دُور نہیں جا سکے۔"

"حیدرآباد ......" منیر علی کی آواز لرز رہی تھی۔ انھوں نے ہم سے اندر

آنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ ایسی نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے جیسے ہماری شکلیں بدل گئی ہوں یا ہم اُن کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔

"بیٹھک کھول لیجیے بڑے صاحب!" تجمل نے انھیں ٹوکا۔

"جی ...... جی!" وہ حواس باختہ انداز سے سر ہلانے لگے۔ "ایسا ہے ..." اُن کی زبان لڑکھڑا کے رہ گئی۔ "آپ آپ لوگ اندر ہی سے آ جائیے۔" دروازے کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے بولے۔ تجمل نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے بیٹھک کی طرف دیکھا۔ پہلی بار منیر علی اندر پہنچنے کے لیے فوراً دروازے پر آ گئے اور ہمیں گھر کے راستے سے بیٹھک میں لے گئے۔ انھوں نے بیٹھک کا گلی میں کھلنے والا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ اندر چیزیں اُسی طرح رکھی ہوئی تھیں جس طرح ہم چھوڑ گئے تھے البتہ وہ چارپائی نہیں تھی جو بیٹھک کے لیے منیر علی نے اندر گھر سے یہاں ڈلوا دی تھی۔

"بات یہ ہے۔" منیر علی نے سنبھل سنبھل کے کہنے کی کوشش کی۔ "کچھ معاملات کی وجہ سے مترجع ہے۔" اُن کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ ہم سے جھوٹ بول رہے ہیں اور اُن کا مقصد یہ کہنا ہے کہ اب وہ اپنے گھر میں ہمیں ٹھہرانے سے معذور ہیں۔

"ہمارا ارادہ اتنی جلدی اس طرف واپس آنے کا نہیں تھا۔" تجمل نے اُن کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ "بچوں کے لیے بھی کچھ نہ لا سکے۔ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"جی ہاں! اللہ کا فضل ہے۔" منیر علی نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں۔" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"کچھ تو بات ہے۔ ارشد میاں کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہیں لیکن ......"

"لیکن کیا بڑے صاحب!" تجمل نے کہا۔

"کچھ نہیں جناب!" منیر علی کے لہجے میں اضطراب تھا۔ وہ ہمیں دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کچھ ضرور ہے۔ ہم آپ کا بھلا چاہنے والوں میں ہیں بڑے صاحب!"

"بے شک۔ بے شک۔ لیکن کچھ صورت بدل گئی ہے۔" اُن کی آواز اٹک رہی تھی۔ "میں آپ سے منت کروں گا کہ اس مرتبہ کہیں اور ٹھہر جائیے۔ شاید میں پہلے کی طرح آپ کی خدمت نہ کر سکوں۔"

"کیا صورت بدل گئی ہے؟" تجمل نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بہتر ہے آپ کچھ نہ پوچھیے۔"

"پھر کس سے پوچھیں؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے بڑے صاحب؟"

"نہیں جناب! خطاوار میں ہوں۔"

"آپ نے بھلا کیا خطا کی ہے؟ آپ کیا بول رہے ہیں؟"

"آپ کو کچھ پتہ نہیں؟" منیر علی نے بدحواسی کے انداز میں کہا۔

"کس کا پتہ؟"

"آپ کچھ نہیں جانتے؟ مطلب آپ کچھ نہیں جانتے؟"

"کس بارے میں؟"

"وہی رانا کے بارے میں؟" منیر علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"رانا! کیا اُس نے پھر کوئی بات چھیڑی ہے؟"

"نہیں صاحب! کیا آپ کو واقعی کچھ نہیں معلوم؟"

"آپ کچھ بولیں گے تو پتہ چلے گا۔" تجمل نے ملائمت سے کہا۔

"رانا کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ آپ کے جانے کے دوسرے دن پچھلے پہر اُسے اندھا کر دیا۔" منیر علی لرزتی آواز سے بولے۔ "سارے شہر میں ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔"

"رانا کے اندھے ہونے سے آپ کا کیا تعلق؟" تجمل نے حیرت سے پوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے کہ میرا کیا تعلق ہے۔ معلوم نہیں اُسے کیا منظور ہے۔" منیر علی ہانپتے ہوئے بولے۔ "کل رات دو آدمی دیوار پھاند کے اندر گھر میں گھس آئے۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ انھوں نے مجھے پلنگ سے اٹھا لیا۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ کہنے لگے شور مچانے کی کوشش مت کرنا۔ کسی تنہا جگہ چلو جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ میں نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھسیٹتے ہوئے مجھے یہاں تک لے آئے اور پوچھنے لگے کہ کچھ دن پہلے تمھارے یہاں جو دو مہمان ٹھہرے ہوئے تھے وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے۔ مجھے آپ لوگوں نے صرف اپنے نام ہی بتائے تھے۔ میں نے وہی بتا دیے اور کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ پھر پوچھنے لگے کیا مولوی صاحب سے اُن کا کوئی رشتہ نکلتا ہے؟ میں نے جواب دیا ہاں انھوں نے خود کو اُن کا بھتیجا بتایا تھا۔ پھر پوچھا کہ انھوں نے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پوچھا تھا؟ کورا نے مولوی صاحب کی لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ مجھے بہ صد کراہ اقرار کرنا پڑا لیکن وہ اور مشکوک ہو گئے کہ میں جان بوجھ کے آپ کا پتہ چھپا رہا ہوں۔ وہ ڈراتے دھمکاتے رہے اور آپ کے قیام کی مدت اور دیگر باتیں پوچھنے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ سات روز ٹھہرنے کے بعد وہ دونوں مہمان یہاں سے چلے گئے۔ انھوں نے میری داڑھی کھینچی۔ مجھے طمانچے مارے اور گردن دبا کے بولے کہ اُن لوگوں کا پتہ بتا دو اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ وہ صاحبان یہاں ٹھہرے ضرور تھے۔ مولوی صاحب سے تعلق کی بنا پر میں نے انھیں اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ مولوی صاحب اور لڑکی کی باتیں چھیڑیں تو ذرا ذرا صاحب کے بیان کا ذکر کیا۔ وہ صرف تین دن ٹھہرے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ مراد آباد سے آئے ہیں۔ مولوی صاحب کا تعلق بھی شاید وہیں سے تھا لیکن وہ بتا کے گئے ہیں کہ مراد آباد کی طرف نہیں جا رہے ہیں اور واپسی میں پھر یہاں جیسلمیر آئیں گے۔ میں نے جو کچھ کہا تھا اُسے کہنے میں ہچکچاہٹ نہیں کی مگر وہ یہ ضد پہ اڑے تھے کہ مجھے تعلق کے

"زبیر کا ارادہ ہے کہ یہ نام بھر دیں اور اسی سال امتحان دے دیں۔"

میں کیا کہتا۔ میں نے کہا: "بہت اچھا ہے۔"

"لیکن... لیکن کورس بڑا ہے۔" زرین سنجیدگی سے بولی: "کیا یہ ممکن ہو گا کہ ایک سال میں یہ ساری تیاری مکمل کر لیں؟"

میں نے مسکرا کے جواب دیا: "یہ تو اس پر منحصر ہے کہ کورس کیا ہے اور آپ کے بیٹے کتنی جلدی گرفت میں لے لیتے ہیں۔" میں استعداد کہنا چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے نہیں نکلا۔

زرین میری بات سمجھ گئی اور زبیر کی جانب کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی: "زبیر ماشاءاللہ بہت پڑھی لکھی ہیں لیکن کورس میں حساب وغیرہ بھی تو شامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ان کا ایک امتحان لے لیا جائے؟"

"بہت اچھا خیال ہے۔"

"سنا ہے نام جانے کا وقت قریب ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"جہانگیر کے ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔"

"انھی سے صحیح معلوم ہو گا اور وہی ان کا امتحان بھی لیں گے۔"

"مگر کچھ مدد تمھیں بھی کرنی ہو گی۔" زرین فیصلہ کن لہجے میں بولی: "کبھی وقت نکال کے زبیر کو پڑھا دیا کرو۔"

"میں! ... زرین! میں تو ... میں نے کبھی کسی کو نہیں پڑھایا۔ میں تو جیسے سب بھول گیا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا: "آپ مدد تو تم بھی کر سکتی ہو۔"

"میں تو لڑکوں کی ہی گھروں میں بھی کروں گی اور اسد بھائی سے بھی میں نے وعدہ لے لیا ہے۔ تنویر صاحب آئیں گے تو ان سے بھی کہا جائے گا۔ زبیر کو پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔"

"جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا، میں بھی کروں گا۔"

"میں یہی کہنا تھا۔ زبیرہ! تم خود کیوں نہیں کہتیں؟"

زبیرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا: "میں کیا کہوں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

"تم بھی زرا کچھ بولو گی یا تمھاری بات باہر نہیں نکلے گی؟"

"جی!" زبیر نے اپنا چہرہ سینے میں چھپا لیا۔

لیکن زبیر نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے دامن سے ہاتھوں پہ بنے ہوئے مہندی کے نشانات کھرچتی رہی۔ زرین اٹھی تو وہ بھی ہڑبڑا کے کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا بھی کہ کچھ دیر کے لیے انھیں روک لوں لیکن وہ دروازے سے باہر نکل گئیں۔ میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

دوسرے دن رات کو میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پہ کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھلا ہی ہوا تھا۔ زرین ہوتی تو میں اس کی آہٹ فوراً پہچان لیتا۔ وہ ہر رات کو دودھ کا گلاس میز پہ رکھ جاتی تھی لیکن اس رات بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ میری آنکھوں پہ ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی۔ وہ دروازہ بیچ میں رکھ کر کھڑی تھی۔ میں اسے نہ بلاتا تو بڑھ کے آ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں بھی مسکرا دیا۔ زبیرہ تھی۔ یہ بجائے کچھ کہے پہلے دعا دینے لگیں۔ میں اٹھی اور گلاس میز پہ رکھ کے واپس جانے لگی۔ "زرین کہاں ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" زبیرہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا ہو گیا؟ کھانے کے وقت تو وہ بالکل ٹھیک تھیں؟"

"کھانے کے بعد ہی شاید طبیعت کچھ بگڑ گئی۔" زبیر کی آواز میں لرزش تھی۔

"کچھ زیادہ خراب تو نہیں؟"

"نہیں کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ کہہ رہی تھیں سر میں درد ہے اور دل گھبرا رہا ہے۔" زبیرہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

"کوئی دوا وغیرہ دی؟"

"میں نے سر کی مالش کر دی ہے اور گلاب کا عرق پلا دیا ہے۔ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ یہ دودھ رکھا ہے۔" وہ واپس پلٹتے ہوئے بولی۔

"زبیرہ!" وہ دروازے پہ پہنچ گئی تھی۔ میری آواز سن کے رک گئی۔ مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں نے اسے کیوں آواز دی ہے۔ اس نے مڑ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور جھکا کے کھڑی ہو گئی۔ "کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیے۔" میں نے عاجزی سے کہا: "آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟"

اس نے سر ہلا کے "نہیں" کہا۔

"مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے۔ اندر آ کے بیٹھ جائیے۔"

اس کے سامنے میں نے ایک کرسی اٹھا کر رکھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کرسی پہ سمٹ کے کسی بت کی طرح بیٹھ گئی۔

"آپ کو یاد ہو گا۔" میں نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہا: "وہاں گھر میں میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔ کیا آپ کو یاد ہے؟"

وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ جسم کا سارا خون چہرے پہ جم گیا تھا۔ سینہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کے پھر جھکا لیا۔

"یاد ہے نا؟" میں نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنا ہے آپ کا مولوی صاحب کے گھر ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ وہ بظاہر تو دور کے عزیز تھے لیکن تھے ایک ہی۔ مولوی صاحب آپ کو اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے اور آپ نرگس کی سہیلی تھیں۔"

اس کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ "جی!" اس نے زیر لب کہا۔

"بڑے صاحب نے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر آپ نرگس کو ان سے زیادہ جانتی ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں آپ مجھے کچھ بتائیے۔"

"میں کیا بتاؤں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"جو کچھ بھی آپ جانتی ہیں۔ شاید آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہو کہ مولوی صاحب ایک طرح تمام دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین کیوں ہو گئے تھے۔ وہ پہلے کہاں تھے اور وہاں کیوں آ گئے تھے؟"

"وہ مجھ سے بہت کم بات کرتے تھے۔"

"لیکن نرگس تو آپ سے ہر وقت باتیں کرتی ہو گی۔ اس نے آپ سے بہت کچھ کہا ہو گا۔ آپ اس کی رازدار سہیلی تھیں۔ ممکن ہے اس نے آپ کو کوئی قصہ سنایا ہو یا آپ اپنے اور اس کے درمیان ہونے والی باتیں دہرانا مناسب سمجھتی ہوں یا آپ کو کوئی اور جھجک ہو۔ یہ تمہید تو نہ سمجھیے۔ آپ کو اسی کی قسم میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ آپ کسی جھجک کے بغیر سب کچھ بتا دیں۔ مجھ پہ بھروسا کریں۔ یقیناً آپ کو یہ اچھا نہیں لگتا ہو گا مگر اس لیے ضروری ہے کہ شاید نرگس کی بھلائی کا کوئی پہلو نکل آئے اور آپ کی کسی بات سے اس کی تلاش میں مدد مل سکے۔ کوئی ایسی بات جو آپ ابھی تک کسی کو نہ بتا سکی ہوں؟"

"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔"

"یہ آپ کا احسان ہو گا۔"

"آپ یہ مت کہیے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلانا چاہتا ہوں۔"

"آپ مجھے آپ آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اوہ! یوں ہی۔" میں نے خفت سے کہا: "یہ میری غلطی ہے۔"

"مجھے بہت ندامت ہوتی ہے۔"

"تم! اب نہیں کہوں گا۔"

زبیرہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور ہونٹوں پر کپکپی طاری تھی۔ میری سانس رکنے لگی۔ "بڑے ابا (مولوی صاحب) سے میری کوئی بات نہیں ہوتی تھی، بس سلام دعا۔ مجھے دیکھ کے کبھی وہ میری خیریت پوچھتے اور کبھی کسی کھانے کی فرمائش کرتے۔ میرے ہاتھ کے شامی کباب انھیں بہت پسند تھے۔" زبیرہ کی آواز بھرانے لگی۔

"اور نرگس؟" میں نے بےچینی سے کہا۔

"نرگس تو ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ ہم دونوں کا ملنا کبھی ناغہ کیے بغیر نہیں لگتا تھا۔ کبھی مجھے ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑی میری راہ دیکھتی رہتی... اس نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"کچھ نہیں بتایا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بولتی تھی۔"

"پھر تمھاری اس سے کیا باتیں ہوتی تھیں؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"ادھر ادھر کی باتیں۔ تمام دنیا کے قصے کہانیاں۔"

"تین سال سے وہ تمھاری سہیلی تھی۔ تین سال میں تم نے کبھی اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ سب جاننے کی تمھیں جستجو نہیں ہوئی؟"

"شروع شروع میں، میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اس ذکر پہ اداس ہو جاتی تھی بلکہ رونے لگتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ سب چھوٹ گئے۔ اب شاید کوئی نہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں ان کے ذکر سے کیا حاصل۔ پھر ہمیشہ مجھے ڈانٹ دیتی کہ میں اس سے کچھ پوچھوں گی تو وہ رونے لگے گی۔ پھر بھی کبھی کبھی بے ساختہ منہ سے نکل جاتا تھا۔ ایک بار مجھ سے یہ کہتے ہوئے کہ کاش زبیرہ! مجھے کچھ یاد نہ ہوتا، مجھے کچھ بھی یاد نہیں، بیچ ہی میں اس نے اپنی زبان بند کر لی۔"

"لیکن محلے والے گھروں میں آنے والے دوست لگ کر اس سے یہ سوال کرتے ہوں گے۔ انھیں وہ کیا جواب دیتی تھی؟"

"آنے والے طرح طرح کے سوال کرتے۔ تمھاری ماں کہاں ہیں، کوئی بہن بھائی ہے یا نہیں، تم کہاں کی ہو۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ اماں بچپن ہی میں مر گئی تھیں۔ بہن بھائی ہیں ہی نہیں۔ سب کو یہی بتایا تھا کہ ان کا تعلق کبھی مراد آباد شہر سے تھا۔ مجھے بھی کہتی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ مراد آباد اسے یاد نہیں ہے اور وہ مختلف شہروں میں رہی ہے۔ مختلف شہروں کے نام ان کے سامنے لے دیتی۔ لوگ اس سے یہاں آنے کا اظہار کرتے اور ایک بات کے بعد دوسری بات پوچھنے لگتے۔ وہ کبھی ٹال جاتی، کبھی بات بنا دیتی۔ کوئی بہت کریدتا تو تنگ آ کے کہتی مجھے کچھ نہیں معلوم، بابا سے پوچھ لو۔ مجھے احساس تھا کہ یہ ذکر اس کے لیے تکلیف دہ ہے، اس لیے میں بھی اپنی طرف سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے لوگوں کو ٹالنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں نے محلے کی بی بی سے کہہ بھی رکھا تھا کہ وہ اس کی ماں بہن، عزیزوں اور گھر وغیرہ کے متعلق اس سے کچھ نہ پوچھا کریں، اسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اس ذکر سے اس کے پرانے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ بھول جانا ہی اس کے لیے اچھا ہے لیکن لوگوں کی زبانیں کہاں رکتی تھیں۔ وہ اس کے سامنے کوئی ذکر ایسی بات کہہ ہی دیا کرتے تھے۔" زبیرہ سسکنے لگی۔

میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ وہ چپ ہو گئی تھی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے گوشے صاف کر رہی تھی مگر آنسو اس کی آنکھوں میں امڈے ہی چلے آتے تھے۔ "مجھے کچھ اور بتاؤ۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"اور کیا بتاؤں؟" وہ شکستہ آواز میں بولی۔

"تم نے اتنے دن اس کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے اپنے طور پہ بھی کچھ اندازہ کیا ہو گا۔ کیا اس نے تم سے کبھی بھولے سے بھی اپنے کسی عزیز، رشتے دار کسی کا بھی ذکر نہیں کیا؟"

"کبھی نہیں کیا۔" وہ سسکتے ہوئے بولی: "وہ ہمیشہ کوئی کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ ہر وقت گم صم، کچھ نہ کچھ سوچتی ہوئی، یادوں میں کھوئی ہوئی۔ جب سے آنکھ کھلی، خاموش۔ ذرا سے کھٹکے پہ چونک جاتی اور قریب سے شور ہوتا تو سہم جاتی۔ کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا لیکن کوئی آتا تو وہ خوش اخلاقی سے ملتی تھی۔ جب ہمارے گھر میں بیٹھی ہوتی اور کوئی آ جاتا تو اٹھ

بھی اُن کی سب سے بڑی بھول تھی بے شک آنے والا ہر دن اُن کی آنکھوں میں میرے نقش پر کچھ اور گرد ڈال دیتا ہوگا لیکن آنے والے ہر دن کورا کی آنکھوں میں یہ نقش اور اُبھار ہو جاتے ہوں گے۔ مولوی صاحب اُسے یہ باور کرانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے کہ میں نہیں ہوں مر چکا ہوں یا جیل میں ہوں میں نے اُس رات دو آدمیوں کو چھرے مار دیے تھے۔ میں اُسے بھول گیا ہوں گا۔ یہ بھی اُن کی ایک ادا تھی کہ میں اُسے گھر سے لے کے چلا آیا۔ اچھا ہوا کہ وہ اُن کی پناہ میں آگئی میرے ساتھ رہتی تو نہ جانے کیا کیا واقعات پیش آتے اور اب اگر میں اُسے مل بھی جاؤں تو ایک بلا ہوا آدمی ہوں گا اور کورا جیسی لڑکی کے لیے میں کسی طرح موزوں نہیں ہوں گا۔ وہ اُس سے یہی کچھ کہتے ہوں گے۔ نہیں کہتے ہوں گے تو ایسا تاثر دیتے ہوں گے۔ وہ اشاروں کنایوں میں کہتے ہوں گے کہ جب میں اپنے گھر کو نہیں بچا سکا اُس گھر کو جہاں پلا بڑھا تھا تو کسی اور کا کیا ہو سکتا ہوں۔ وہ ایسی باتیں اُسی کی خاطر کرتے ہوں گے۔ کورا کے ساتھ رہتے رہتے انھیں اُس سے یہ ہمدردی ہو ہی جانی چاہیے۔ اُن کی ہمدردی کا اس سے بڑا ثبوت کیا تھا کہ انھوں نے اُس کے لیے ساری دنیا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

انھیں حق تھا کہ وہ کورا سے کچھ بھی کہیں۔ اُس رات وہ نہ ہوتے تو کورا نہ جانے کہاں ہوتی حالانکہ اُس رات دریا کے کنارے چلنے پر اصرار بھی انھوں نے ہی کیا تھا۔ اگر ہم وہاں نہ جاتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ ہم اُن کے ساتھ مراد آباد چلے جاتے یا گھر ہی واپس ہو جاتے۔ ابّا جان مجھے دیکھ کے گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔ ہم دونوں اُن کے پیروں پر سر رکھ کے معافی مانگ لیتے۔ پھر نہ اتنی مرتیں نہ نصیحت کا پرچہ اُٹھتا نہ گھر بکتا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر مولوی صاحب کہیں مل گئے تو میں اُن سے نہیں بولوں گا۔ انھوں نے مجھے اتنا نیچ اور ذلیل کیوں سمجھا تھا۔ جیل میں رہ کے سبھی بدل نہیں جاتے۔ لوگ جیل مجبوری میں جاتے ہیں۔ کس کو جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے۔ مولوی صاحب کو مجھ پر ترس نہیں آیا کہ میں نے کورا کو بچانے کے لیے اور خود انھیں بچانے کے لیے اُن لوگوں کو چاقو مارے تھے۔ میں اور کیا کرتا۔ کیا کورا کو یوں ہی جانے دیتا۔ میں انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں نہیں بچوں گا اور اگر بچ بھی گیا تو مجھے برسوں کی قید ہوگی۔ اتنے سال گزرنے کے بعد جب میں باہر نکلوں گا تو پچھلی تمام باتیں بھول چکا ہوں گا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں نے اُسی کی خاطر وہاں اپنی تعلیم جاری رکھی تھی۔ میں نے اُسی کے لیے چاقو چلانا سیکھا تھا۔ کبھی زنجیر لیتے کہ مجھ پہ کیا گزری میں واقعی ویسا ہوں یا میری صورت بدل گئی ہے۔ وہ مجھے آزمائش کا ایک موقع تو دیتے۔ کورا اُن کی نہیں تھی، وہ میری امانت تھی۔ امانت لوٹاتے وقت یہ خیال نہیں رکھا جاتا کہ مالک پاگل ہوگیا ہے یا مجرم ہے یا امانت لوٹانے کا اہل ہی نہیں رہا ہے۔ مگر مولوی صاحب نے اُسے میری امانت ہی نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ میں کورا کو کس طرح گھر سے لایا ہوں۔ میں نے انھیں ساری بات بتادی تھی۔ مولوی صاحب کورا سے کچھ بھی کہتے ہوں لیکن انھیں اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ صرف میرے لیے زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ وہ اُسے کچھ بھی تاثر دیتے ہوں کہیں بھی لے جائیں، کورا کے پاس اپنا بھی ایک دل تھا اور وہ دل ضرور کہتا ہوگا کہ میں نے اُس کے پاس پہنچنے کے لیے کوئی سا جتن نہیں کیا ہے۔

جیسے زہرہ نے مجھے اُس کی حالت بتائی تھی، مولوی صاحب نے میرے مرنے کا یقین دلانے کی غلطی نہیں کی ہوگی۔ وہ اُسے آسرے پر قائم رکھ سکتے تھے۔ اُن کا خیال ہوگا کہ وقت کی رفتار کے سامنے کورا کب تک ٹھہری رہے گی۔ ایک دن تھک جائے گی اور پھر کبھی نہیں ڈھونڈے گی۔ مولوی صاحب خود تھک جائیں گے۔ کسی دن انھیں مجھے تلاش کرنا ہی ہوگا اور مجھے تلاش کرنا اُن کے لیے ایسا مشکل نہیں ہوگا۔ جیل میں کسی سے بھی انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔

مارٹی، ٹلّا اور میں جب اڈّے سے واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ دکانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ اڈّے کے باہر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اندر بھی بہت گہما گہمی تھی۔ نصیب میاں، زہرا، چھیلا، کانا، مُنّن، کپتین خاں اور دوسرے بھی مصروف نظر آتے تھے۔ سارے نے مجھے بتایا کہ استاد جگل کے آنے کی خوشی میں بکرے کاٹے گئے ہیں، میٹھے کی دیگیں بھی چڑھائی گئی ہیں۔ رات کو گلی کے آخری سرے پر میدان میں مجرا بھی ہوگا۔ وہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ اڈّے کی تمام کمپنیوں اور دوسرے اڈّوں کے آدمیوں کو دعوت دی گئی ہے۔ سے فقیروں نے ڈیرا لگا دیا تھا۔ سارے انھیں میدان میں بیٹھنے پلیٹ کر دیا تھا۔ اڈّے کے تقریباً سبھی لوگ وہاں موجود تھے لیکن جگل بھیا اور ہیرو کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے کانے کو پکڑ کے پوچھا: "جگل بھائی کہاں ہیں؟"

"کچھ تو ہی لیل لاڈلے" وہ راز دارانہ انداز میں بولا "آج کل بڑے چکر میں دکھائی دیتا ہے۔ شام تک اُوپر کے کمروں میں میٹنگ ہوتی رہی۔ اُستاد نے گاڑی بھیج کے اپنے منّے وکیل کو بھی بلوایا تھا۔"

"منّے وکیل کو بھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"منّے وکیل کے جانے کے بعد وہ تینوں بھی اُوپر سے باہر چلے گئے۔ اب دیکھو سواریاں کب لوٹتے ہیں۔"

"پھانک کے نہیں گئے؟"

کانا نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو۔ مجھے اتنے دن جگل کے ساتھ رہتے ہو گئے تھے۔ معلوم تھا وہ اُسی بات کا جواب دیتا تھا جو بتانا چاہتا ہو۔ کانے کے اندازے کے مطابق اُسے جلد آ جانا چاہیے تھا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔

جلوس میں سارے لوگ اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار مرحوم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھرے مجمع میں جگل کو چیلنج دے دیا تھا کہ اگر اُس نے میرے ساتھ آتی ہوئی لڑکی دوسرے دن شام تک مستری کو واپس نہ کی تو اُس سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ دوسرے دن وہ مرحوم ہی نہیں رہا اور وہ علاقہ جگل کے علاقوں میں شامل ہو گیا جہاں مستری رہتی تھی۔ اُس روز رات کو ناچ گانا بھی ہوا تھا کیونکہ یہی اُسی طرح کا پروگرام تھا۔ جگل نے سارے محلے کو دعوت دی تھی۔ آج لوگ اُس دن سے زیادہ تھے۔ نصیب میاں بولائے بولائے پھر رہے تھے۔ بادشاہ میدان میں تنظیم کے انتظامات کر رہے تھے۔ اڈّے کا سب سے بڑا سب سے بھاری آدمی ٹالو اُن کے ساتھ لگا تھا، کان پھٹی آواز سنائی دینی مشکل ہو گئی۔ جگل ہی نے اُس کا نام ٹالو رکھا تھا۔ لوگ اُسے ٹالا بھی کہتے تھے مگر ٹالا کی عادت کام ٹالنے کی تھی۔ ایک دو آوازیں تو ٹھیک کان سے سُن کے دوسرے کان سے اُڑا دیتا تھا۔ وہ اتنا بھاری تھا کہ اپنا جسم اُٹھاتے ہوئے اُسے زور لگانا پڑتا تھا۔ اُس کے سامنے بھنا ہوا سالم بکرا رکھا جاتا سارا کھا جاتا اور ڈکار نہیں لیتا۔ اُس کی آنکھیں بھاری رہتیں۔ سانس پھول جاتا تھا، جیسے تقلل سے اُس کے پھیلے ہوئے جسم کو لگا کے رکھا ہو۔ بیٹھے سے بڑا وزن اُٹھانے میں اُس کی سانس نہیں پھولتی تھی۔ پہلے ہی ٹانگ توڑ دیتا اور جسم پر لگتے ہی تھپیاں کشتی کے فن میں ماہر استاد رہا۔ کسی زمانے میں چاقو زنی اور شہزوری میں کمال تھا مگر اب بتدریج موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ جیل میں وہ مختلف اوقات میں میرے ساتھ کوئی ڈیڑھ سال تک رہا تھا۔ ایک بار وہاں کسی لڑائی جھگڑے کی سزا میں اُسے تھپیاں ماری گئیں۔ وہ آنکھیں بند کیے بے حرکت کھڑا رہا۔ اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو جیلر نے اُس کے لیے ایک سخت سزا تجویز کی۔ بھوکا رکھنے کی سزا۔ ٹالا بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک وقت میں ہاتھ پاؤں زمین پر پٹخنے لگا۔ ڈاکٹر نے کیل کی طرف سے اعلیٰ حکام کو درخواست بھجوائی۔ آیندہ اُسے بھوکا رکھنے کی سزا نہیں دی گئی۔ اب اُس کا زیادہ تر وقت اڈّے کے کھانے کی تیاری اور جگل کے جسم کی مالش کرنے میں گزرتا تھا۔

نعرے اُس کے جسم میں شہر کے مانند لگے۔ ٹالو کے جسم میں اگر کوئی ایک تنکا بھی چبھا دیتا تو وہ پندرہ بیس منٹ مسلسل ہنستا رہتا۔ جگل کی چیخ پکار بھی نہیں کی۔ یہ دورہ ختم ہو کر ٹالی۔ زہرن نے اُس کے گرد دوپٹا ڈال دیا۔ مولے ٹالو نے بُرا نہیں مانا۔ وہ دوپٹا اوڑھے کے ٹالو لنگڑاتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس کی حالت دیکھ کے مجھے بھی ہنسی آگئی۔ کانے نے میرے شرٹ میں دس کا نوٹ رکھ دیا۔ جو اُس کے بجائے ایک زہرہ نے اچک لیا اور میری بلائیں لینے لگا۔ مولے ٹالو کو اڈّے کے آدمیوں نے پھر گھیرے میں لے لیا اور اس سے دور دور کھڑے رہے۔ جگل کی سخت ممانعت تھی کہ کوئی اس کے جسم میں گدگدی نہ کرے۔ ٹالو ایسا تانا ہنس رہا تھا اور اُس کا سارا جسم پارہ بنا ہوا تھا۔ سارے میدان میں قہقہے گونج رہے تھے۔ اڈّے کے آدمیوں کو ڈر تھا کہ اس دوران جگل نہ آ جائے۔ کہیں پندرہ بیس منٹ بعد مولو کی ہنسی رُکی اور جیسے اُسے ہوش آیا۔

وہ جھیل نہیں آئے لیکن چاٹا ماؤں کے اڈّے سے ایک آدمی نے آکے خبر دی کہ جگل کے آنے میں اور دیر ہو جائے گی۔ کھانا شروع کر دیا جائے اور ناچ گانا بھی۔ اڈّے کے بہت سے آدمیوں نے کھانا نہیں کھایا۔ البتہ فقیروں اور گلی کے لوگوں اور دور دراز کے اڈّوں کے آدمیوں کے لیے دیگیں کھول دی گئیں۔ کانے نے مجرا جانے کی کوشش کی مگر جگل کے نہ آنے کی خبر سُن کے میدان میں ایک افراتفری پیدا ہو گئی تھی۔ زہرن نے مجھے بتایا تھا کہ گانے والیاں بلا لی گئی ہیں، وہ اڈّے کی عمارت میں ٹھیری ہوئی تھیں۔ اُن میں سب سے پہلے گانے والی نتھا بے سارنگیوں سمیت میدان میں آ پہنچی تھی۔ میں وہاں کسی کو نہیں جانتا تھا لیکن جگل کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ نتھا کی آواز بُری نہیں تھی۔ عمر بھی کم نہیں ہوگی۔ مارٹی کے اشارے پر وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ پھر مارٹی، زہرا اور چھیلے نے اُس پر روپے برسانے شروع کر دیے۔ کانے اور کپتین خاں نے انھیں روکا۔ ابھی اُس نے پہلی غزل بھی ختم نہیں کی تھی کہ جگل کے آنے کی گونج اُٹھی۔ اُس کے ساتھ ہیرو اور جابر بھی تھے۔ وہ نشے میں ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ناچ گانا رک گیا تھا۔ جگل کے قریب آنے پر نتھا نے اُسے جھک کے سلام کیا۔ "جمنا بائی! نیچے لوٹ دیں" جگل نے بھاری آواز میں کہا۔

"آپ کی نظر کا اثر ہے استاد، آج اُس کا بدن بھر گیا۔"

"زبان کو بھی برت سکھا دی ہے۔"

"سننے والے کو شاید بھانے لگی ہے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "اب آپ دکھیں بلاتے ہیں نہ آتے ہیں۔ جب پوچھو ایک ہی جواب تھا کہ استاد شہر میں نہیں ہیں۔"

"میں شہر میں نہیں تھا جمنا!"

"لیکن سُنا ہے درمیان میں آئے تھے، ہماری طرف نہیں آئے؟"

"تیسرے چوتھے ہی روز تو پھر جانا ہو گیا تھا۔"

"کوئی اور شہر پسند آگیا ہے؟"

اڈے پر رکھے گیا تھا۔ قجل نے آ کے اپنے ہاتھوں سے کھولا۔ اس میں منّے رکھے ہوئے تھے۔ قجل انھیں ایک ایک کر کے نکالتا رہا۔ ہم سب حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

"تم لوگ یہ ذرا ہاتھ صاف کرنا ہے۔" اُس نے منہ لیجے میں کہا۔ "اس سے ذرا ہاتھ بہک جائے گا اُستاد!" کالے خان نے ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں، یہ کیا کرے۔ مالم بدل گیا ہے۔"

"کسی تجربے یار نا تے نے اس کو رنا ہے۔" کپتن خان نے تمنچا ہاتھوں پر اچھالتے ہوئے کہا: "اُستاد! میں نے اسے چلایا ہے لیکن تمھاری قسم مزہ نہیں آیا۔"

"مزہ تل رضا لے گئے۔" وزیر بیچ میں بولا۔ "اسلمول ہی تنی اُستاد نے بھی ایک رکی ہوا ہے۔ آج تک ضرورت نہیں پڑی۔"

"تھا میں قص۔" ماچھی منہ بگاڑ نے لگا۔ "دو تمبیتی میں ان کو چلانے کا بس چار چانس ملا تھا۔ ہر بار ایسا ہی کرتا تو میں نے کے ایسا لگا جیسے اپنی سالا تمنچا ہو گیا ہے لنگڑا لولا ہو گیا ہے۔" "یہ اُن کے لیے ہے اُستاد جن کے ہاتھ پر ٹھیک نہیں۔"

"ہر من کی نظر ٹھیک ہے۔" قجل نے اونچی آواز میں کہا: "اس کا کھیل کسی وقت بنتا ہے جب سامنے والے کے ہاتھ میں بھی یہ دھرا ہو۔ ویسے بھی کام کی چیز ہے۔ سب کے پاس یہ ہو جائے گا تو تم کیا کرو گے، جب تک چاقو کھولو گے، کام تمام ہو جائے گا۔"

"سب مرد عورتیں کیسے ہو جائیں گے اُستاد!" کپتن خان تنک کے بولا: "ہاتھوں میں مہندی لگا کے یہ اوڑھنا اچھا لگے گا۔ یہ سب سالا چھّی چھُری والوں کا حرامی پن ہے۔ سالے شکل سے عورت لگتے ہیں۔" قجل کو ہنسی آنے لگی: "تمھیں بتا دوں اُستاد! کوئی مرد سالا اتنا گورا چٹا لال انگارا ہوتا ہے جتنے یہ بندے ہوتے ہیں۔"

"کلکتہ میں ایک گورے لونڈے پر کپتن خان کا دل آ گیا تھا اُستاد! اسی لیے جل جل کے باتیں بول رہا ہے۔ لونڈے نے اس کو گنتی کا ناچ نچا دیا تھا۔"

"چپ رہے۔" قجل نے جامو کی کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا اور میری طرف دیکھا: "لونڈے! کبھی تو نے بھی تمنچا چلایا؟"

"بمبئی میں کرشنا جی کے ہاں اُٹھا کے دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تیری نظر بڑی تیز ہے۔ چاقو کی نوک کی طرح اس میں بھی نال سے آنکھ بند ہی رہتی ہے۔ چاقو کا نشانہ چوک جائے تو فرصت مل جاتی ہے۔ اس کا نشانہ چوکے تو اپنی جینے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ ذرا دو کھا تو سے ان بڑ بولوں کو ہاتھ۔"

کمرے کے تمام دروازے بند تھے۔ کھڑکیاں بھی بند کر دی گئیں۔ دوسرا بلب بھی جلا دیا گیا۔ قجل، کپتن خان، کالے خان، چیرو، ماچھی، وزیر تمنچا چلانا

خوب جانتے تھے۔ قجل نے اس کا میکنزم سب کو سمجھایا۔ مجھے پہ ہی کرشنا جی سے اور خدا اس میں ایس پی شنکا کی زبانی تھوڑی بہت ہو گئی تھی۔ جیل میں بھی میں نے اس کے متعلق بہت سی باتیں سن کر میکنزم ہی کیا تھا۔ پھر گولیاں بھر کے چرخی گھمانی اور جیسا کہ پڑھا تھا۔ قجل نے اپنی جگہ سے ہٹ کے چائے کی خالی پیالی ایک میں رکھ دی اور مجھے تمنچا لے کے دُور جانے کا اشارہ کیا۔ کرہ خاصا تھا۔ نشانہ لینا کچھ ایسا مشکل نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے چاقو اچھا لیے انداز سے تمنچا ایک طرف رکھا اور ہر طرح جانچ کے دیکھ لیا۔ ساری توجہ پیالی پر مرکوز تھی۔ سانس سینے میں روک کے میں نے تمبھ کر لیا اور جھجکتے جھجکتے گھوڑا دبا دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں زرا لی تھیں۔ اسی آن تیز چھناکا ہوا۔ میری سانس چلنے لگی۔ پیالی ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ سب مجھ سے لپٹ گئے۔ قجل نے پھر آدھا نچ کے ذریعہ کو پلاسٹر اپنے چاقو کی نوک سے اُدھیڑ دیا اور مجھ سے بولا: "واہ لے گولا کر دے۔"

پیالی بڑی تھی، اس لیے نشانہ بنانا آسان تھا۔ دوسری بار نشانہ دور بنا پڑا۔ وہ ایک چھوٹا دائرہ تھا، انگوٹھے کے مانند۔ چاقو ہوتا تو ہاتھ چوک جانے کا امکان نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی بھی اتنی زیادہ نہیں لیکن نشان زدہ جگہ بہر حال مجھے نظر آ رہی تھی۔ میں نے تمنچا لیے طاق کے عین مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ جلدی ہو گئی۔ مجھے یقین کرنا چاہیے تھا۔ گھوڑا دباتے ہی طاق میں دھول سی اڑ گئی۔ طاق ہی میں لگی تھی مگر اصل نشانے سے نیچے تقریباً ایک پور کے فاصلے پر۔ اس سے پہلے کہ قجل مجھے کوئی ہدایت دیتا، میں نے تیسری چلانے کے لیے چرخی گھمائی۔ سب کان دبائے ہوئے تھے۔ پہلی گولی سے مجھے غلطی کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا۔ تمنچا پھر اسی جگہ رکھ کے میں نے اس بار نشانہ پہلے سے کچھ اونچا کیا۔ دھماکا ہوا تو قجل طاق کی طرف دوڑا۔ اس کے پیچھے چیرو اور جامو بھی تھے۔ چیرو نے تیزی سے لوٹ کے مجھے گلے لگا لیا۔ پھر میں نے سارا تمنچا اسی نشانے پر خالی کر دیا اور گولی کی رفتار، اُس کی سیدھ اور نال اور نگاہ کا توازن کچھ کچھ میری سمجھ میں آ گیا اور اصل بات یہ پتا چلا کہ اصل تو چاقو کی طرح ہاتھ اور نظر کا اشتراک ہے۔ ہاتھ میں لگا ہوا نظر متذبذب ہو تو نشانہ ٹھیک لگ ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے لگ جائے تو نگ جائے۔ قجل نے کبھی مجھے کہا تھا کہ ہاتھ سے دیکھنے اور سننے والا بنانا ہی نشانہ بنتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ ہاتھ کو سمجھایا جائے تو وہ نظر آنے لگتا ہے اور وہ سننے بھی لگتا ہے۔ اُس کا مطلب ہاتھ اور نگاہ کا توازن سے تھا۔ ہاتھ تبھی اٹھے جب نگاہ اجازت دے اور کان ان دونوں کی تحقیق کر سکیں۔ ہاتھ سے سننے اور دیکھنے کی قوت پیدا کرنے کے لیے ہاتھ کی جھجک بھی بری ٹوٹی پڑتی ہے۔ میں نے دو غلطیاں کیں۔ دوسری

ترتیب یا نچویں بار تجربے کی غلطی تھی۔ نشانہ خطا ہو جانے کا امکان پچاس فی صد تھا مگر چھ گولیاں خرچ کرنے کے بعد میرا ہاتھ بڑی حد تک منجھ ہو رہا۔ وہاں ہو گیا یا قجل کے بقول ہتھیار گرفت میں آ گیا۔

میں دوبارہ گولیاں بھر رہا تھا لیکن قجل نے مجھے منا دیا۔ پھر چیرو، سارے، ماچھی، زور، بلاکر، شتا، گورو، ملتو، جینتی وغیرہ نے نشانے باندھنے شروع کیے۔ اُن میں سے کئی بندوق چلا چکے تھے۔ چلانے کی بہت سی پیالیاں ٹوٹ گئیں۔ کسی کو نشانہ چوکا، کسی نے پہلے ہی لگے میں پیالی توڑ دی۔ مگر ان سب کے لیے یہ کام کچھ ایسا دشوار ثابت نہیں ہوا۔ ایک دو غلطیوں کے بعد بھی ٹھیک ٹھیک جگہ گولیاں مار رہے تھے۔ مرا ایک نے ایک ایک تمنچا خالی کیا۔ البتہ دوسرے نشانے پر اُن کا ہاتھ ذرا بہکا۔ بھیٹے نے چھ گولیوں میں چار گولیاں ٹھیک چلائے۔ سب کو متحیر کر دیا۔ ملّو بجتا تھا۔ قدوائی پہلے سے تمنچا چلا رہا تھا۔ جان بوجھ کر چپ بیٹھا تھا۔ ماڈل نے تو دیدی کر دی۔ تقسیے نے آج پہلی ہی بار اسے ہاتھ لگایا ہے۔ ابھی ٹھیک ہے کہ گدھے کو منہ اُٹھا کے سامنے کمرے میں گھورنے لگا۔

کوئی دو گھنٹے تک بند کمرے میں گولیاں گرجتی رہیں۔ قجل، چیرو، ماچھی، کالے اور وزیر اُن دونوں کو تمنچا چلانا آتا تھا۔ جنھوں نے اُسے پہلے استعمال نہیں کیا تھا۔ خود چیرو اور ماچھی نے بھی نشانے لیے۔ ان کے ہاتھ نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کسی نے رات کو کھانا نہیں کھایا۔ کالا خان نے تمام تمنچے واپس لے کے دوبارہ انھیں تھیلے میں رکھ دیا اور قجل کے آگے جانے پر کہنے کے لیے ہم سب نیچے آ کے چائے والے کمرے میں بیٹھ گئے۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا، قجل کہیں نا کہیں تھے۔ دیرو اور جامو کے ساتھ اوپر فلیٹ میں چلا گیا۔ دوسری صبح وہ پھر اڈے پر موجود نہیں تھا لیکن جلد واپس آ گیا اور ہم سب کو کلکتے سے کوئی بیس پچیس میل دور ایک بڑے باغ میں لے گیا۔ منّوں کا تھیلا اُس کے ساتھ تھا۔ باغ کے چوکی دار سے تین بندوقیں بھی ہمیں وہیں مل گئیں اور اسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ باغ کلکتے کے ایک رئیس گرودیال کی ملکیت ہے۔ وہیں ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ قجل زیادہ دیر نہیں ٹھہرا، جامو کو چھوڑ کے وہ جیرو کے ساتھ کسی وقت لوٹ گیا تھا۔ ہم سب نے جامو سے کچھ جاننے کی کوشش کی تو اُس نے صاف سر ہلا دیا۔ جامو کی یہی عادت تھی۔ وہ درمیان کی بات کبھی نہیں کرتا تھا یا تو صاف منع کر دیتا یا صاف اقرار کر لیتا تھا۔ ایک بار منع کرنے کے بعد لاکھ واسطے دیے جائیں، وہ زبان کھول کے نہیں دیتا تھا۔

سہ پہر تک کالے خان، ماچھی اور وزیر ہم سب کو نشانے کی مشق کراتے رہے۔ میں نے اُس دن پہلی مرتبہ بندوق چلا کے دیکھی اور وہ مجھے تمنچے سے زیادہ سہل لگی۔ قجل واپس نہیں ہوا البتہ شام کو ایک بڑی سی موٹر ہمیں واپس لے جانے کے لیے آ گئی تھیں۔ قجل اور چیرو ہمیں وہاں بھی دکھائی

نہیں دیے۔ اندھیرا ہونے کے بعد تھیلا ہاں اور شیلا کی اداس اڈے پر اُن کی آمد کی دھمک سنائی دی۔ سب بڑے کمرے کے فرش ستا رہے تھے لیکن وہ ہمارے درمیان اتنی دیر بیٹھے... کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ پھر اوپر فلیٹ میں جا کے بند ہو گئے۔ چلتے قجل نے کالے کو رلا کے کہہ دیا تھا کہ ہم کہیں جا کے لوٹنے کا مشورہ دریا کے کنارے چلنے کا تھا۔ کوئی رات ہم کشتی کا ... مگر ماچھی نے ناچ دیکھنے کی ضد کی۔ سب اُس کی ہاں میں ہاں ملا لگے۔ میں نے تھکن کا عذر کر کے اڈے ہی پر بیٹھے رہنے کا ارادہ کیا۔ ابھی زورا، پھیلا اور مارتی نے یہ بغیر کہیں جانے سے انکار دیا۔ کالے نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ لا لا ملا میں تک ... کوئی حرج نہیں ہے۔ چیرو اور جامو ہوتے تو وہ شاید ان کی بات مان لیتے لیکن وہ اڑ گئے۔ پھر لے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑا۔ اسے اڈے سے پر کو جاتے ہوئے زیب نے سرگوشی میں بلا کہ لاؤ لے کر آ جا... میں نے اس سے کچھ نہیں کہا کہ وہاں جانے میں کچھ ہی نہ سکتا ہے۔ وہاں میری ایک بہن رہتی ہے۔ میرا ایک بھائی ہے۔ اور ان کو پتہ نہیں کیا بیتی۔ میں اسی ڈر سے وہاں نہیں جا کر کسی کی طرح کوئی اور مل جاتے لیے یہ خوف بھی تھا اور میری ہر وقت ہر طرف اُن کے لیے بے چینی سی گرمائی تھیں۔ وہ کہیں کا بھی کہیں کسی طور اُن کی صورت نظر آ جائے یہی بہت ہے۔ اپنی ... میں اُن سے اچھی جگہوں پر بلنا رہ گیا تھا، یہی سہی۔ اس سے میرا زخم نہیں لوٹ پاتا تھا۔ مجھے تمہیں اطلاع ہیں۔ نے وہاں جانے کیوں احتراز کیا تھا۔ تن کی مثال میرے سامنے تھی۔ مجھے ... جانا چاہیے تھا جہاں بے آسرا لوگ کہیں کوئی ٹھکانا ملتا ہے۔ ہاتھ ... یتیم خانے، نوٹ، ہاتھ، بالا خانے۔ کن اپنی مرضی سے وہاں جا ... کوئی چارہ نہیں رہتا۔ جبھی لوگ جاتے ہیں اور جو لوگ وہاں پہنچے ... کون جانے کہاں کہاں سے آتے ہیں۔ انھیں زندہ رہنے کے لیے چھت تو مل جاتی ہے اور ایک زندہ بھی رہتی ہے۔ کرنا ... دن بھر جائیں۔ اُن کے ٹھکانے ہو جاتے ہیں۔ یہاں آ کے ان رنگیں کر کی نقش۔ اُن کے دل نہیں مل جاتے۔ خاتم اور چاہی ... جگہوں سے آئی تھیں۔ انھیں چھت مل گئی تھی لیکن گھر نہیں ... جس کے دروازے پر کسی کی حکومت ہو، اور کیوں کی نہیں ... جھکا کے اندر آیا کریں، سر اُٹھا کے نہیں۔ پھر بھی وہ جانے ... وہ کچھ دیر صبر کر لیں۔ میں اسے کہاں ہیں پاتا۔ وہ دیکھتی ... سینے سے لگا کے اُن کی حویلی میں لاؤ۔ لگر نے مجھے بخش ... موسم خنک تھا۔ جب ہم چلے تو آسمان صاف تھا اب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی رات ...

"میں سمجھ گیا پھر مجھے واقعی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔"
"مگر میں گا تو نہیں رہی ہوں۔"
"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔"
"آپ کا دل یہاں بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا؟"
میں نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔
"مجھے یقین تھا کہ آپ ایک دن ضرور واپس آئیں گے۔ اب آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں تو میں آپ سے دو باتیں بھی نہ کر سکوں۔"
"یہ تو تم بہتر سمجھ سکتی ہو۔"
"آپ کے خیال میں کیا یہ نامناسب بات ہے؟"
"میں کیا کہوں میں سمجھتا ہوں تمہیں اتنا اختیار تو ہونا ہی چاہیے۔"
"آپا جانی کہتی ہیں وہ پابندی لگانے کا اختیار رکھتے ہیں انھوں نے کرایہ دیا ہے۔" وہ جھکتے ہوئے لہجے میں بولی۔
"کتنا کرایہ؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔
"پتہ نہیں بہت ہی ہوگا۔"
"تمہیں نہیں معلوم؟"
"میں معلوم کر کے کیا کرتی۔"
"تو پھر وہ تمہیں یہاں کیوں لیے ہوئے ہیں؟"
"یہ تو اُن کی اور آپا جانی کی مرضی ہے۔ وہ چاہیں تو لے بھی جائیں۔ اُن کے پاس بہت دولت ہے۔ پر آپا جانی نے شاید انھیں منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ مجھے سمو چا کسی کی تحویل میں دینا پسند نہیں کرتیں۔ انھوں نے تو عذر کر دیا ہے کہ ابھی میری عمر کم ہے۔ مجھے ابھی اور دیکھنا ہے۔ ابھی اُن کا ایسا کوئی خیال نہیں۔ وہ کچھ عرصہ اور مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں۔ البتہ جہاں تک گانے کی بات ہے تو مجھے کسی ایک شخص کے لیے وقف کر سکتی ہیں۔ انھوں نے یہی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن آمادہ ہو جائیں اور سیٹھ جی مجھے یہاں سے لے جائیں یا پھر یہیں رکھیں اور میں بس انھی کے لیے محدود ہو جاؤں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیٹھ جی ابھی آپا جانی کی منہ مانگی مراد قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہوں، آپا جانی نے کچھ زیادہ ہی طلب کر لیا ہوگا۔ یہ گھر بھی سیٹھ جی نے لے کے دیا ہے۔"
"تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟"
"میرا خیال کیا۔"
"سیٹھ جی کیسے ہیں؟"
"آدمی ہیں۔" وہ سرد آہ بھر کے بولی اور دیر تک چپ بیٹھی رہی۔ کمرے میں میرے اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی جس میں خفیف سی کھنکھناہٹ ہوتی۔ جی چاہتا تھا وہ بولتی رہے۔ کسی بات پر وہ مسکراتی تو ٹھوڑی کے قریب گڑھا سا پڑ جاتا۔ آنکھیں

کرتے کرتے اس کے ہونٹ جیسے جیسے لرزتے تھے چہرے کا رنگ اور لال ہو جاتا تھا۔ اس کا لہجہ بہت صاف نرم کسی مرچ کی طرح تھا لیکن پھر مجھ سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ میرا سر گھومنے سا لگا تھا۔
"آپ نے بتایا، آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"
"کیا بتاؤں؟"
"ایک بات پوچھوں؟" وہ مختصر آواز میں بولی۔ "کبھی پیار میرا یاد آیا آپ کو؟"
"ہاں، کئی بار خیال آیا۔"
"سچ؟" اس کی پتلیاں چمکنے لگیں۔ "میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا۔"
"کیا کیا۔ تم نے کیا معلوم کیا؟" میں نے وحشت سے کہا۔
"یہی کہ آپ کے ساتھ کیا کیا گزری۔"
"تم کیا جانتی ہو؟"
"زیادہ نہیں بس اتنا کہ آپ نے بہت دُکھ اٹھائے ہیں۔"
"مجھے تفصیل سے بتاؤ۔"
"آپ اپنی ہی باتیں جاننے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہیں؟"
"شاید تم نے کچھ غلط سُنا ہو۔"
"مگر میں نے آپ کو دیکھا بھی تو ہے۔"
"کتنی بار۔"
"بعض اوقات تو ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔
"ایک بار میں تم نے کیا سمجھا ہوگا؟"
"بہت کچھ سمجھ لیا۔ میں نے آپ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جو لوگ میں نے اب تک دیکھے ہیں، آپ کی آنکھیں اُن سب سے الگ ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ آپ آئے تھے اُن میں بھی الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ میرا دل چاہا تھا کہ آپ کو روک لوں مگر ہمت نہیں پڑی۔ پھر میں آپ کا انتظار کرتی رہی کہ شاید آپ پھر آئیں۔ میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں کہ آپ آئیں گے تو کروں گی لیکن اب کچھ یاد ہی نہیں آ رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا سوچا تھا۔ میں اس چار دیواری میں بند ہوں اور میرے پیروں میں گھنگھروؤں کی زنجیر پڑی ہے۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور میرے کرنے نہ کرنے سے ہوگا بھی کیا؟ ہو سکے تو اپنے کچھ دُکھ مجھے دے دیجیے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ ایک مہمل سی بات ہے۔ کون کسی کے دُکھ سمیٹ سکتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے سامنے اور کیا کہنا چاہیے۔"
"شبانو!" میری آواز بیٹھ گئی۔ "تم نے کیا کیا سُنا ہے؟"
اس نے جو سُنا کم تھا، اندازہ زیادہ کر لیا تھا اور جتنا اندازہ کیا تھا اُسے

اندازہ نہیں تھا کہ وہ اصل کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ میں نے ایک طویل مدت جیل میں گزاری ہے اور وہاں میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ شاید اس دوران میرے گھر والے مجھ سے کھو گئے ہیں۔ میں انھی کی تلاش میں شہروں شہروں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اُسے خانم اور جہاں گیر کی بابت کچھ علم نہیں تھا لیکن وہ خانم سے واقف ضرور ہوگی۔ نسرین بانو، میاں مرتضیٰ کا واقعہ، زرینہ کا کام، فیض آباد میں اس کی حویلی، یہ سب کچھ اُسے معلوم تھا۔ بمبئی کے چند واقعات بھی اس کے علم میں تھے۔ اس نے شمیدہ کا ذکر نہیں کیا۔ کوئی بعید نہیں کہ نفیس آپا سے یہ بات کھلتے کھلتے رہ گئی ہو۔ افواہوں کے آدمیوں ہی سے اُس نے یہ ساری باتیں سنی ہوں گی۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے رہتے ہوں گے۔ شب بانو نے اُن سے خود ہی پوچھا ہوگا اور انھوں نے اس کی خاطر الٹا سیدھا زبان کھولنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا ہوگا۔ جلال فٹے کرالا اور مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔
"کیا یہ سب کچھ غلط ہے؟" اس نے وارفتگی سے پوچھا۔
"نہیں بہت کچھ درست ہے۔ تو کیا تمھیں مجھ پر ترس آتا ہے؟"
"نہیں،" وہ پریشان لہجے میں بولی۔ "یہ ترس نہیں ہے۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ جب مجھے کچھ پتہ نہیں تھا تو بھی میں نے کچھ یہی جانا تھا۔ اتفاق سے بعد میں اس کی تائید بھی ہو گئی۔ اسے ترس کہہ کے مجھے الزام مت دیجیے۔ ترس تو معذوروں، بے بسوں پر کیا جاتا ہے۔ ہاں مجھ پر آپ ضرور ترس کھا سکتے ہیں۔ میں نہ آپ کی طرح آزاد ہوں، نہ مختار۔ آپ مرد ہیں اور خدا نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ آپ کے بازو مضبوط ہیں۔ ابھی آپ کے سامنے ایک عمر پڑی ہے۔ خدا آپ کو بہت زیادہ عمر دے، بہت زیادہ اور آپ کی ساری مرادیں بر آئیں۔"
"شبانو!" میں نے خجالت سے کہا۔ "تم نے اگر میری بات محسوس کی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ میری زبان قابو میں نہیں رہتی۔ کہنا کچھ چاہتا ہوں نکل کچھ جاتا ہے۔ جنھوں نے دُکھ سہا ہے دُکھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ تم مجھے بہت دُکھی لگتی ہو۔ یقین کرو پہلے بھی جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے یہی محسوس کیا تھا لیکن میں تم سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ تم نے کہہ دیا ہے۔ میرے لیے تمھاری طرح اور لوگ بھی دعا کرتے ہیں، پر کچھ ہوتا ہی نہیں۔"
"مایوس کیوں ہوتے ہیں۔"
"تم بھی تو مایوس نظر آتی ہو۔"
"مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک اُمید بھی ہے۔ خدا کبھی تو سُنے گا۔"
"سب یہی کہتے ہیں۔"
"کوئی غلط تو نہیں کہتے۔ کیا دیکھتے دیکھتے لوگوں کی قسمتیں نہیں بدل جاتیں؟ اتنا اندھیر نہیں ہے۔"
"تم یہاں اس قید خانے میں بیٹھ کے یہ کہہ رہی ہو تو واقعی اندھیر نہیں ہے۔ تمھارے دُکھ بھی میں جانتا ہوں شبانو۔ بیشتر یہی ہوں گے جو یہاں بہت سوں کے ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ خوش رہتے ہوں گے یہاں اور تم جیسی لڑکی تو بالکل نہیں۔" میں نے پوچھا نہیں کہ وہ نعمی کی طرح معصوم ہے یا زرینہ، جولین اور نبیل کی رنگتی ہے۔
"قسمت کا تماشا ہے۔"
"تم سب یہ پسند نہیں کرتیں نا؟" اس نے گھور کر کہا۔
"مجھے یقین ہے کہ نسرین بیگم تمھاری اصل ماں نہیں ہوں گی۔"
"اب تو وہی سب کچھ ہیں۔"
"تمہیں کہاں سے لایا گیا تھا؟"
"مجھے کچھ یاد نہیں، صرف دھندلا دھندلا سا ایک نقش ہے۔" پھر پوچھنے پر اس نے بہ مشکل تمام بتایا کہ وہ بہت چھوٹی تھی کہ کسی نے اُسے حیدرآباد کے بازار میں پہنچا دیا۔ اُسے صرف اتنا یاد ہے کہ اُن دنوں گھر میں بہت سے لوگ آئے تھے اور اس کے باپ کا سر جھکا کر بیٹھے رہتے تھے۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی رونے لگی۔ اُسے حیرت تھی کہ اس کے باپ کو اچانک کیا ہو گیا ہے، وہ بولتے کیوں نہیں، آنکھیں کیوں نہیں کھولتے۔ اس کا ایک بڑا سا گھر تھا، بہن بھائی تھے۔ اُن کی شکلیں اب تک اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب اس کے ابا کو لوگ کندھوں پر اٹھا کے لے جانے لگے تو وہ بھی باہر آ گئی۔ گلی میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ اُسے سینے سے لگا کے پیار کرنے لگے اور انھی میں سے کوئی شخص اُسے گود میں لے گیا۔ پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ ایک دوسری جگہ تھی۔ حیدرآباد کے بازار حسن کی منڈی میں۔ وہ وہیں پلی بڑھی۔ بعد میں نسرین بیگم کلکتے سے حیدرآباد آئی تو شب بانو اس کے سپرد کر دی گئی کہ جس عورت کے یہاں اس نے پرورش پائی تھی وہ نسرین بیگم کی قریبی عزیز تھی۔ "سب ایک خواب کے مانند ہے۔" اس کی آواز ڈگمگانے لگی۔ "وقت کے ساتھ یہ دھند بھی چھٹ جائے گی۔"
"کبھی نہیں چھٹے گی اور گہری ہو جائے گی۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ بھول جائے گا لیکن بہت سی باتیں بھولنے کی نہیں ہوتیں۔ وقت کا اُن پر اثر نہیں ہوتا۔"
"ہو ہی جاتا ہے۔ کئی مثالیں تو میرے سامنے ہیں۔ وقت نے اُن کے زخم بھر دیے۔ انھیں اب کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔"
"پتہ نہیں یہ اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔"
"اچھا ہی ہوتا ہے۔ یوں زندہ رہنا بھی ایک طرح وقت سے سمجھوتا کرنا ہے۔ وقت کے سامنے سر خم کر دینا ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید رُت بدل جائے اور رُت کبھی بدل جاتی ہے کبھی نہیں بدلتی۔ کسی کے لیے بدل جاتی ہے کسی کے لیے نہیں اور آدمی عمر بھر اس کے انتظار کے فریب میں رہتا ہے۔"

"کاش میں تم سے کچھ کہہ سکتا لیکن فضول باتیں کرنے سے کیا حاصل ہوتی۔ زبان کہتے کہتے رک جاتی ہے۔"

"آپ کا اتنا کہنا ہی میرے لیے بہت ہے۔" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "مجھے احساس ہے کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دکھی آدمی جھوٹ نہیں بولتا ورنہ اس کے ذکر جھوٹ ہوتے ہیں۔ دل پر پتھر رکھیے گا میری باتیں سن کے آپ کا جی اور گراں ہوگیا ہوگا۔"

"یہ ذکر تو میں نے خود چھیڑا تھا شہپارے! اپنے آنسو روک لو۔ تم ہی تو مجھے صبر ضبط کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اب بتاؤ ضبط کرنا کیسا مشکل ہے؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ کے گم سم بیٹھی رہی۔

"ہم لوگ جا رہے ہیں شہپارے! دیکھو واپسی کب ہوتی ہے لیکن جب بھی ہوگی میں ادھر ضرور آؤں گا۔"

"پھر جا رہے ہیں؟" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"ہاں اور مجھے خود نہیں معلوم کہ کس طرف جانا ہے۔ ہو سکتا ہے جلدی آجائیں یا ممکن ہے بہت دیر ہو جائے یا کبھی واپس نہ آسکیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "ایسی بدفالیں منہ سے کیوں نکالتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کامیاب لوٹیں گے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"اور تم مجھے یاد آتی رہو گی۔" میں نے ڈولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ہر دم تمہارا احساس رہے گا۔ میں آگیا تو ٹھیک ہے لیکن نہ آسکا تو تم ..." میرے دماغ میں گڈمڈ ہوگیا کہ میں اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

"آپ آئیں گے انشاءاللہ جلد واپس آئیں گے۔ میرا کوئی احساس نہ کیجیے گا۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ حوصلے سے جائیے اور مایوسی دل میں مت لائیے۔" وہ مجھے تسلیاں دینے لگی۔

دیر ہوگئی تھی۔ ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ کریمن بیگم ایک بار آکے جا چکی تھی۔ شہپارہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اٹھ کے کہیں نہیں گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ باہر جا کے کانٹے وغیرہ کو خود تلاش کرنا چاہیے۔ معاً سامنے کے دروازے سے کریمن بیگم حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ "وہ آگئے ہیں۔" کمرے میں اس کی گھبرائی آواز گونجی۔

"کون آیا جانی؟" شہپارہ نے آنکھیں پٹ پٹا کے پوچھا۔

"کرم جی! وہ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ مرشد پیچھے کھڑی ہے۔"

"تو آنے دیجیے۔" شہپارہ تحمل سے بولی۔

"میں چلتا ہوں۔" میں نے درمیان میں کہا۔

"آپ بیٹھیے۔ کہاں کانٹے ہی کو ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"کیا یہ مناسب ہوگا؟" کریمن کتراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاید انھیں یہ پسند نہ ہو۔"

"میں نے نہ گنگرو باندھے ہیں نہ شکاری ہوں نہ یہاں مالدار کے موجود ہیں تو ضرورت کتنی ہو شاید وہ محسوس کرلیں گے۔ مجھے جو اندیشہ تھا وہی ہوا تھا۔ وہ آگئے۔ انسان کے مزاج سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تمہارے معاملے میں کتنے حساس ہیں ہمیں ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم پر ان کے احسانات کچھ کم نہیں ہیں۔"

"مگر آپا جانی!" شہپارہ نے احتجاج کیا۔ "کیا یہاں ہمارا کوئی مہمان نہیں آسکتا؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی مہمان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟"

"میں نے تمہیں بتا دیا ہے تم خود سمجھدار ہو۔" کریمن ناراضی سے بولی۔

"کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ان کے آنے سے پہلے ہی ہم اپنے مہمان کو اٹھا دیں؟"

"تم جاؤ... وہ آرہے ہیں۔"

دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی پھر چشم زدن میں سانولی رنگت درمیانہ قد اور ادھیڑ عمر کا ایک شخص برآمد ہوا۔ اس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ کھچڑی بالوں کی مونچھیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اس نے بند گلے کا ایک سکن کوٹ پہن رکھا تھا۔ دھوتی سفید تھی۔ چہرے مہرے سے وہ اچھا خاصا صاف ستھرا شخص تھا۔ موٹے موٹے ناک ابھری ہوئی۔ کوٹ کے باہر گلے میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں کئی رنگوں کے نگینوں کی موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں۔ پہلے اس نے شہپارہ کو دیکھا پھر مجھے پھر کریمن بیگم کو۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ شہپارہ نے کھڑے ہوکے آداب تسلیم کی۔ اس نے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی۔ میں نہیں اٹھا تھا۔ "تشریف لائیے کرم جی!" شہپارہ نے شائستگی سے کہا۔

وہ آگے نہیں بڑھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے ہی پر کھڑا رہا۔

"یہ لاڈلے میاں ہیں۔" کریمن نے جلدی سے کہا۔ "یہ استاد مجمل کے خاص آدمی ہیں۔"

سیٹھ کرم چند نے جواب نہیں دیا۔ شہپارہ اس کے پاس جا کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیوں؟ آپ بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"کریمن بیگم!" اس کی بھری ہوئی آواز ابھری۔ "ہم اس کو کیا سمجھے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تو مطلب خوب سمجھو۔ کیا ہم ادھر دوبارہ نہیں آئے؟"

"کون کم بخت کہتا ہے۔ بیٹھ کر آپ کہیے آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔"

"تمہارا خیال ہے ہم کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ادھر ہمارے پیچھے کون آتا جاتا ہے؟ کیا ادھر ہم نے اپنا کوئی آدمی نہیں چھوڑا ہوگا جو ہم کو پل پل

کی خبر دے۔"

"سیٹھ صاحب! اگر آپ کا اشارہ لاڈلے میاں کی طرف ہے تو یہ ہمارے مہمان ہیں۔" کریمن عاجزی سے بولی۔ "آپ سکون سے کچھ دیر بیٹھیے ذرا بات سن لیجیے۔ یہ بھی عزت دار آدمی ہیں۔"

"ہم کو اس سے کوئی نا نہیں ہے۔ یہ کون ہے کدھر سے آیا ہے؟ ہماری بات تم سے ہے۔ تم سے ہمارا کیا طے ہوا تھا۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی بھی نہیں آئے گا تو تمہارے کے پاس تیں۔ ہم کو پتہ چلا ہے کہ ابھی ادھر سے بہت سے لوگ اٹھ کے گئے ہیں۔ وہ ادھر کیا کرنے آئے تھے؟ شہپارے کے سوا ادھر اور کون چیز دیکھنے کی ہے؟"

"خدا گواہ ہے سیٹھ صاحب! شہپارے نے تو ان کے سامنے گنگرو باندھے ہیں۔ وہ اس علاقے کے لوگ ہیں۔ ان کا بھی کچھ لحاظ کرنا آتا ہے۔"

"ایک سے جانے کے کہو ہم کو پہلے ہی بول دیا تھا کریمن بیگم! یہ سب ہم کو ایک دار پھر بھی اچھا نہیں لگتا۔ شہپارے کو ہم باہر کے کسی آدمی کے سامنے کرنا نہیں چاہتے اور ہم اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہیں۔"

"آپ بیٹھیے تو سہی۔ پھر تو جو جی میں آئے کہہ لیجیے گا۔"

"ہم کو معلوم ہے ہم کو ادھر کسی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں ہے۔"

"لاڈلے میاں بس جانے ہی والے تھے۔"

"تو یہ ادھر کیوں ہے؟" اس کی آواز تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کریمن بیگم کی خوشامدوں کے باوجود اس کا پارہ نہیں اترا۔ شہپارہ نے بھی اسے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس نے اس کی بات پر بھی توجہ نہیں دی۔ مجھ کو تاؤ آ رہا تھا لیکن مجھے اس کی بدتمیزی بہت بری لگی۔ شہپارہ کبھی میری طرف دیکھتی کبھی اس کی طرف۔ "یہاں ہر کسی کا ہونا کرم چند کا اپمان ہے بے عزتی ہے۔ اپنے مہمان سے بولو کہ چلا جائے۔"

مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ جی چاہا بڑھ کے اس کا گریبان پکڑ لوں۔ شہپارہ کی توہین کر رہا تھا۔ کریمن بیگم نے شکایت کی۔ "آپ ایسا نہ کیجیے یہ چلے جائیں گے۔ یہ خود کہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے ہم نے ہی انھیں روک لیا تھا۔ مدت بعد آج نظر آئے ہیں۔ وہ تو ذرا سی ٹھکانے کی تھا کہ آپ کو گھر گھر ...ہیں لاڈلے میاں!" کریمن اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ میری سرخ آنکھیں دیکھ کے چپ ہوگئی۔

"پہلے سیٹھ سے کہو کریمن بیگم کہ زبان سنبھال کے بات کرے۔ اسے پتا نہیں ہے۔ ناتو زبان بند رکھے۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"لاڈلے میاں! خدا کے لیے خاموش رہیے۔ میری خاطر، شہپارہ کی خاطر۔" کریمن گڑگڑا کے بولی۔ "سیٹھ کرم چند جی نے ہمارے ساتھ بہت سلوک کیا ہے۔ جو یہ کہہ رہے ہیں سب سچ ہے۔ شہپارہ باہر کے لوگوں میں بھی کم ہی سامنے آتی ہے۔ ماشاءاللہ آپ سمجھدار ہیں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس سے پہلے کہ بات طول کھینچے میں منت کرتی ہوں کہ ابھی آپ کرم داری رکھیے۔"

"بات کرتو سیٹھ کرم چند طول دے رہا ہے۔"

"کریمن بیگم!" کرم چند گرجتی آواز میں بولا۔ "جھگڑے سے پہلے کہ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم اپنے گھر میں ایسی بات برداشت نہیں۔ چلے جاؤ چھوکرے!" وہ پہلی بار براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم ادھر نہیں رہ سکتا۔"

شہپارہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے..."

"اس سے دور رہو شہپارے جان!" کرم چند نے چیخ کے کہا۔ شہپارہ نے اس طرح میرا ہاتھ چھوڑا جیسے آگ لگ گیا ہو۔

"سیٹھ کرم چند!" میں نے نسبتاً پرسکون آواز میں کہا۔ "تم حکومت جتلاؤ۔"

"ہم نے ادھر روکڑا دیا ہے۔" وہ انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے بڑی بے بسی سے بولا۔ "ہم کاروبار کرتا ہے۔ روکڑا بولو رکھو لو۔"

"ضرورت پڑی تو وہ بھی کھول دیں گے۔"

"اس کی ضرورت ایسے ہی وقت پڑتی ہے۔ ادھر خالی نہیں چلتا۔"

"تم نے کتنا روکڑا دیا ہے؟" میں نے لرزتے لہجے میں کہا۔

"او ادھر دو لاکھ۔ کریمن بیگم کی مانگ ہے۔"

"ہم چار لاکھ دیں گے۔"

"چار لاکھ... ہم چھ لاکھ دے گا۔"

"میں اسے دگنا کر دوں گا۔"

"پہلے ادھر لے آ۔" وہ حقارت سے بولا۔ "اور اس سے پہلے ادھر سے چلا جا۔ جب پیسہ لے کے آئے پھر بات کر۔ ذرا ادھر دیکھ تو گا۔ دیکھا ہے؟ آنکھیں پھٹ جائے گا۔"

"آنکھیں تیری پھٹیں گی سیٹھ کرم چند! اک ایک پیسہ دکھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اسے یوں تیرے سامنے لے جاؤں گا۔ پوچھ لے شہپارے سے۔"

"مفت کا مال نہیں چھوکرے! بازار میں کھڑا ہے۔"

"پوچھ لے شہپارے سے کہ وہ تیرے ساتھ جانا چاہتی ہے یا میرے ساتھ۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں۔"

"ہا ہا! آپ کا تصور کو... دن میں سپنا دیکھتا ہے پوچھ لے۔ پوچھ لے اور اپنے غرور سے یہ حسرت بھی نکال دے۔"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا کے واسطے یہ گفتگو بند کیجیے۔" کریمن بے بسی کے انداز میں بولی۔ "سیٹھ جی! آپ ہی بڑے پن کا ثبوت دیجیے۔ یہ باتیں آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

- اپنی شان پر جو کالک لگانا تھی وہ تم نے لگا ہی دی ہے کرین بیگم! اب اور کیا چاہو ہو؟ اس چھوکرے سے بولو کہ چلا جائے ورنہ ہم اس کو دھکّے دے کے باہر نکال دے گا۔"

- سیٹھ! تمھاری عمر کا دھیان ہوتا ہے تم صرف زبان سے کہتے ہو، میں ابھی تمھیں سیڑھی سے نیچے پھینک دوں گا۔"

"- اوہ! اوہ!" کرین دونوں ہاتھ کان پر رکھ کے واویلا کرنے لگی۔

سیٹھ نے پھر کچھ نہیں سنا، سیدھا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ میں سمجھا وہ چلا گیا ہے۔ زینے پہ جا کے اس نے تالی بجائی۔ اسی لمحے زینے میں جلدی جلدی بھاری قدموں کی آہٹ گونجی۔ کرین بیگم دہائیاں دینے لگی۔ آنے والے دو آدمی تھے، دو مشٹنڈے۔ پہلوانوں کے مانند، لباس سے نوکر معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی کمر سے چمڑے کی ایک ایک بیلٹ بندھی تھی اور بیلٹوں کے خانوں میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ کندھوں سے پستول لٹک رہے تھے۔ چھرے بھی پیٹی میں اڑسے ہوئے تھے۔ دونوں کے جسم بڑے بھاری بھرکم اور قد نکلتے ہوئے تھے۔ مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ سر پہ چھوٹی پگڑی کسی ہوئی تھی۔ ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک کی چالیس ہوگی تو دوسرے کی پینتیس۔ رنگت خاکی تھی، جیسے بھوری مٹی۔ وہ اس طرح اندر آئے جیسے انھیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ دیدے پھاڑے ہوئے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انھوں نے چاروں طرف گھوم کے دیکھا پھر ان کی نظریں مجھ پر آ کے ٹک گئیں۔

"اس کو اٹھا کے نیچے پھینک دو۔" کرم چند نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"یہ استاد فیصل کے آدمی ہیں۔" کرین سیٹھ کے سامنے آگئی۔

"ان لوگوں نے بڑے بڑے استادوں کا نشہ ہرن کر دیا ہے کرین بیگم!"

"میں کہتی ہوں آپ انھیں روک لیجیے۔"

"ہم ان کو روک لیتے ہیں۔ چھوکرے سے بولو آخری موقع ہے۔ ادھر سے دفع ہو جا۔ پھر کبھی اس گھر کی طرف سر اٹھا کے نہ دیکھنا۔"

"- لاڈلے میاں! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے اپنا دامن میرے آگے پھیلا دیا۔ "سیٹھ جی اس وقت ہوش میں نہیں ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں رہے ہیں لیکن تم ہوش مت کھونا۔"

دونوں آدمی مجھ سے ایک فاصلے پر آ کے ٹھیر گئے تھے۔ "سیٹھ کرم چند!" میں نے تلخی سے کہا۔ "بازو بھی دوسرے کا استعمال کرتے ہو۔"

"یہ بھی اپنا بازو ہے چھوکرو! دوسرے کا بازو اور کرائے کا بازو بلائے بغیر نہیں آتا۔ بولو جلدی فیصلہ کرو۔ ہم ان کو اشارہ کرے؟"

"بس کرو! بس کرو!" کرین چلانے لگی۔

"چپ ہو جاؤ!" کرم چند نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"یہاں سے چلے جاؤ سیٹھ!" میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"ہم جائے؟" وہ حیرت سے بولا۔ "پھینک دو اسے نیچے۔" اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ وہ جو ایک قدم نہیں بچے، پہلے مجھے نظروں ہی نظروں میں تولتے رہے۔ میں نے اپنے کندھے گرا دیے تھے لیکن میری آنکھیں بھی پوری طرح کھلی تھیں۔ کرین اور شبنم پارہ میرے آگے ڈھال بن کے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے انھیں دھکیلنے کے خدشے سے دور کیا۔ کرم چند کے آدمیوں نے خنجر نہیں نکالے۔ دونوں مجھے بازوؤں سے پکڑ کے دھکیلتے اور گھسیٹتے ہوئے نیچے لے جانے کی تدبیر میں ہوں گے۔ شروع شروع میں وہ یہی کر سکتے تھے۔ سیٹھ کمرے کے درمیان ایک ستون سے سہارا لے کے کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستگی سے میرے قریب آئے جیسے مجھ سے دو بدو کچھ کہنا چاہتے ہوں کہ میری بے رخی میں انھیں ہاتھ نہ اٹھانے دوں۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ انھیں آتے دیکھ کر شبنم پارہ سسک رہی تھی۔ ان دونوں نے ہاتھ بڑھائے مگر اس سے پیشتر کہ وہ میرے بازو پکڑ کے مجھے آگے دھکیلتے، میں نے خود پھرتی سے جھپٹ کے ان کے دراز ہاتھ پیچھے سے پکڑ لیے اور زور سے جھٹکا دیا۔ دونوں ایک ساتھ فرش پر گرے اور قلابازی کھا گئے۔

ان کے لیے یہ بہت غیر متوقع ہوگا۔ میں نے ایک [illegible] گرتے ہی پھر پیچھے ہو کے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ فوراً جلدی اٹھ گئے لیکن پھر انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے میں جلدی نہیں کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور استہزائی انداز میں مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ پھر قدم بقدم انھوں نے دوبارہ آگے بڑھ کے مجھ سے فاصلہ کم کیا۔ میں دوسری بار ان کے ارادے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ کئی باتیں ممکن تھیں۔ یا تو وحشی لوگوں کی طرح طیش میں آ کے مجھ سے چمٹ جاتے یا خنجر نکال لیتے یا کچھ اور کرتے لیکن وہ دو گز کی دوری پہ آ کے ٹھیر گئے اور اچانک طوفان کی تیزی سے دونوں ادھر اُدھر سے بیلوں کی طرح اپنے سر آگے کیے میرے سینے پر حملہ آور ہوئے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔ میں دونوں کے بیک وقت زور کی تاب نہیں لا سکا۔ گو میں نے بچنے کی ایک کوشش کی تھی تاہم انھوں نے بہت عجلت کی۔ مجھے سنبھلنے کا ذرا سا وقت بھی نہیں دیا اور میرے ساتھ ہی گرے۔ وہ میرے جسم پر دباؤ ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ اس طرح کہ بے فائدہ ٹانگیں چلانے کے سوا میرے لیے باقی جسم کو حرکت دینا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی صورت مناسب تھی کہ میں مزاحمت کے بجائے اپنا جسم ڈھیلا کر لوں۔ اس طرح قدرتی طور پر ان کے ہاتھ سست پڑ جاتے کیونکہ ابھی ابتدا تھی۔ پہلا واقعہ انھوں نے اتفاق پر محمول کیا ہوگا۔ اپنے ڈیل ڈول پر انھیں پورا اعتبار ہوگا اور سیٹھ کرم چند کو یہ جتانے کی بھی خواہش ہوگی کہ انھیں زیادہ ہاتھ پیر چلانے اور زور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ صرف ایک جھٹکے ہی میں مخالف کو زیر کر لیتے ہیں۔ جیسا مجھے یقین تھا، جلد ہی ان میں سے کوئی اپنے دوسرے ساتھی کو یہ کہہ کے ہٹائے گا کہ وہ اکیلا کافی ہے لیکن یہ سب فضول باتیں تھیں۔ کیا میرے پاس ان کی رعایت ملنے کے سوا اپنے بچاؤ

کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا تھا؟ ایسا نہیں تھا۔ ایک کی نسبت دو آدمیوں سے نمٹنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں میں اپنے عمل کی یکسانی ممکن نہیں ہوتی۔ سوچ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے سے کتنی ہی منصوبہ بندی کریں مگر مخالف کے غیر متوقع جوابی داؤ پر غور کرنے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کا وقت نہیں ہوتا اور پھر ایک کو دوسرے کا بھی خیال رہتا ہے۔

میں ان کے نیچے دبا رہا۔ مجھے اپنے اور ان کے جسموں کے درمیان حرکت کے لیے ایک گنجائش درکار تھی۔ گنجائش انھیں دینی ہی تھی۔ وہ نہ دیتے تو میں نیچے سے زور کر کے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ظاہر ہے میری کشمکش سے ان کا حرکت کرنا لازم ہو جاتا اور میں سمجھے کوئی رخ مل جاتا۔ میرا کوئی ہاتھ کھلا ہوتا تو اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ میں ترچھے ہاتھ سے ان کے کولھوں اور کمر پہ ضرب لگا سکتا تھا۔ میں نے کسی کشمکش کا اظہار نہیں کیا۔ انھوں نے میری کنپٹیوں پر ضربیں لگائیں۔ وہ میری کراہیں اور چیخیں سننے کی آرزو میں ہوں گے مگر میں جیسے بے دم پڑا رہا۔ مجھے بے مزاحمت دیکھ کے انھیں کچھ تردد ہوا۔ اپنی دانست میں انھوں نے ذرا سا اوپر اٹھ کے میرا جائزہ لینا چاہا۔ میں نے پھر بھی کوئی جدوجہد نہیں کی۔ نتیجتاً ان کی گرفت میں اور ڈھیل پیدا ہوئی اور انھوں نے گویا اپنے طور پہ طے کر لیا کہ اب مجھے اٹھا کے زینے میں پھینک دیا جائے۔ جیسے ہی ان کا دباؤ کم ہوا اور وہ میرے جسم سے کسی قدر اوپر ہٹے، میں نے اُس کی سینے کے بل پوری طاقت کے ساتھ نیچے سے زور کیا۔ وہ منتشر ہو گئے۔ ایک میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ میں نے دوسرے کا خیال ترک کر کے پہلے اُس کے منہ پر گھٹنا مارا۔ پھر بے دریغ ٹانگیں چلاتے ہوئے کم از کم اُسے چند لمحوں کے لیے دور کر دیا۔ دوسرا جس کی عمر زیادہ تھی، غصے میں آ گیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے لپٹا رہتا تو اتنی دیر میں دوسرا آ جاتا مگر اس نے بیل بازی کی طرح مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میری ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ میرے کولھوں پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مارنے کے سبب میرا ایک ہاتھ بھی آزاد ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اس نے دبا رکھا تھا۔ میرے لیے اب زیادہ دشواری نہیں تھی۔ میں نے کوئی پل ضائع کیے بغیر کھلے ہاتھ سے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ بڑبڑا کے پیچھے ہٹا۔ اس طرح میرا دوسرا ہاتھ بھی کھل گیا۔ پھر میں نے ادھر اُدھر کروٹ بدلنے کے انداز میں اپنے جسم کو تین چار جھٹکے دیے۔ اس عمل سے میری مراد تھی کہ وہ اور منتشر ہو جائے حالانکہ میں اس کی گردن پر ایک ترچھی ضرب لگا سکتا تھا لیکن مجھے خیال تھا کہ انھیں اپنے پیروں سے نیچے جانا چاہیے۔ انھیں کندھوں پہ اٹھا کے موڑ تک لے جانے میں اور اُلجھن ہوتی۔ جس طرف میں کروٹ بدلنے کا ارادہ ظاہر کرتا تھا، اسی طرف وہ بھی جا کودتا تھا۔ وہ میری تیزی کا ساتھ نہیں دے سکا جو تھی [illegible] میں تھا۔

اُس کے نرغے سے نکل گیا اور فرش پر لوٹتا ہوا ایک لمحے میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب پیش قدمی مجھے کرنی پڑے گی۔ اتنی دیر میں ان کے کس بل کا بڑی حد تک تخمینہ لگا چکا تھا۔ وہ زور میں کم نہیں تھے مگر انھیں بازو مختلف طریقوں سے آزمانے کا [illegible] تھا جیسا کہ میرا خیال تھا۔ پہلا آدمی زینے کے دوران مجھے دوبارہ دبوچ لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں اٹھ گیا تو اس نے احتیاط مناسب سمجھی۔ دونوں کی پگڑیاں اُتر چکی تھیں اور ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے خون اُبل رہا تھا۔ ان کا یہ اشتعال میرے لیے سودمند تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلائے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک قسم کی جھپکیاں لے رہے تھے۔ میری پیش قدمی سے قبل انھوں نے بہرحال ایک داؤ آزمایا۔ دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ایک مجھ سے چمٹ گیا، دوسرا اُس کا ساتھ دینے کے بجائے میرے پیچھے چلا گیا۔ میں ادھر سامنے کے آدمی کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھا کہ پیچھے والے نے جست لگا کے میرے بازوؤں میں بازو ڈال کے انھیں باندھ کر رکھا اور سامنے والا اطمینان سے میرے منہ پر گھونسے اور طمانچے مارنے لگا۔

- "شبنم!" کرم چند کے چیخنے کی آواز آئی۔ [illegible]

کرین بھی کمرے کے ایک گوشے سے التجائیں کر رہی تھی۔ شبنم پارہ اشارہ کر کے مجھے نمائش سے بچنے کی تاکید کر رہی تھی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ یہ کرین بیگم کا بالاخانہ ہے۔ معاملہ زیادہ بگڑ گیا تو شبنم پارہ کی بھی رسوائی ہوگی۔ دوسرے کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے سے فیصل کی ناراضی کا بھی اندیشہ تھا۔ ہمارے سفر میں بھی رکاوٹ پڑ سکتی تھی۔ پھر اگر کانتے، ماجی ادا وغیرہ اس اثنا میں حالیہ آ جاتے تو یہ ماجرا دیکھ کے اپنے آپ کو نہیں روک پاتے لیکن ان باتوں کی خاطر میں اپنے ہاتھ پیر نہیں باندھ سکتا تھا۔ جو کچھ مجھے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ پیچھے والا آدمی میرے بازو منتقل کیے ہوئے تھا، اس کے باوجود میں سامنے والے کو [illegible] جھپٹا اور زینے کی طرف چند قدم بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے بل پھر دہرا رہا تھا۔ پیچھے والا ساتھی میرے بازو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ادھر آگے والا اپنے گھونسوں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا اور اس نے میرے ہاتھوں سے تنگ آ کر دیا تھا۔ میں پیچھے والے کو ساتھ لیے ایک بار پھر سامنے کی طرف لپکا اور چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔

میرا رخ واضح طور پر زینے کی سمت تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ میں بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ اس سے زیادہ خوش گوار بات ان کے لیے کوئی نہیں تھی چنانچہ انھوں نے مجھے بڑھنے دیا۔ سامنے والا البتہ

کھینچ رہا تھا۔ کمرے میں بہت سردی تھی۔ روزنوں سے ہوا اندر تک آ رہی تھی اور لیمپ کی بتی بھڑک اٹھتی تھی۔ رات کو کسی وقت مجھے تجمل کی آواز سنائی دی میرا سارا جسم دہل سا اٹھا۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ جواب دیتے ہوئے میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ اٹھ کر میرے ہی بستر پہ چلا آیا اور میرا رخ چھپاتے ہوئے آہستگی سے بولا "سو یا نہیں رہے؟" میرا جی چاہا کہ چیخنے لگوں میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بند کر لیے۔

"مجھ کو پتہ ہے تو مجھ سے خفا ہوگا پر میں تجھ سے کیا بات کرتا۔ مجھ سے ایک دن بھی چپ رہا نہ جاتا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے لرزتے لہجے میں کہا۔

"درمیان سے وہ کس بات پہ میں آیا، مجھ کو بولو دوں پہ اس لیے چپ کا رہا کہ ٹھیک طرح تاکید کی ہے میں نہیں چلانے دے گا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات بڑی نہیں ہے پر بڑی بھی ہو سکتی ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھاؤ۔ جلدی بتاؤ۔"

"بولتا ہوں رے۔" وہ خفگی سے بولا۔ "ادھر فیض آباد میں چلنے سے تین چار دن پہلے بمبئی سے شکلا کی چٹھی آئی تھی میں نے تجھ کو نہیں دکھائی۔ شکلا نے لکھا تھا کہ تیرے باوا کو ڈیڑھ دو مہینے پہلے شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔"

"نہیں۔" میری آواز گلے میں گھٹ گئی۔

"ہاں رے ایسا ہی بہت لمبی منتا وہ چٹھی ملتے ہی شکلا کو پتہ لگا۔ وہ ادھر بمبئی میں نہیں تھا۔ شملے چھٹی پہ گیا ہوا تھا۔ آکے اس نے چٹھی پڑھی لکھا تھا کہ تیرے باپ کی صورت کا آدمی شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔ ایک پولیس والے نے تیرے باوا کے سامنے اس کا اصل نام بولا تو وہ گھبرا گیا۔ ہوٹل میں اس نے دوسرا نام لکھوایا تھا پر اس کا حلیہ وہی تھا جو کرشنا جی نے چٹھیوں میں لکھا تھا۔ پولیس والے نے اس سے پوچھا کہ کیا تم صفدر زماں کو جانتے ہو؟ تیرے باوا نے منع کر دیا مگر اس کی گھبراہٹ دیکھ کے پولیس والا ہوشیار ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی چالان نہیں تھا۔ نہ اسے کسی جرم کا پتہ تھا۔ وہ چپ چاپ چلا آیا اور اس نے بمبئی پولیس کو لکھا۔ چٹھی پڑھتے ہی شکلا نے فوراً شیلانگ تار دیا۔ جواب آیا کہ وہ ادھر نہیں ہے۔ پولیس والا دوسرے ہی دن اسے دیکھنے گیا تھا مگر وہ ہوٹل سے جا چکا تھا۔ پھر شکلا نے مجھ کو سارا حال لکھ کے بھیج دیا۔"

میرے کان جلنے لگے۔ تجمل کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی اسے ایس پی شکلا کا خط موصول ہوا، اس کے دل میں آئی کہ وہ فوراً فیض آباد سے آسام کی طرف چل پڑے لیکن اس نے تامل کیا۔ شکلا کے خط کے مطابق ابا جان ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ساتھ گھر کا کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے ابا جان سے متعلق ایک ایک بات تجمل کو بتائی تھی اور بمبئی میں ابا جان کے دوست مولوی اکرم سے ملنے کا واقعہ بھی وہ مجھ سے سن چکا تھا۔ پھر اسے ان کے بارے میں جہانگیر سے معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ میرے گھر سے نکلنے کے بعد ایک مدت تک ابا جان کے ساتھ وہی رہا تھا۔ اس نے بھی اسے یہی بتایا ہو گا کہ وہ ان کاغذات کی چھان بین میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ نہ انھیں صبح کی خبر تھی نہ شام کی۔ کاغذات کے ساتھ جو جواہرات تھے انھیں بیچ بیچ کے وہ اپنا گزارا کرتے تھے۔ مکان اور زمینوں کی فروخت سے بھی انھیں ایک معقول رقم حاصل ہوئی ہو گی۔ کچھ نقدی ان کے پاس ہو گی۔ وہ جواہرات اتنے بیش قیمت تھے کہ شاید انھیں اپنی نقدی چھیڑنے کی ضرورت بھی نہ پڑی ہو۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ میں جس جوہری سے ملا تھا، اس کی باتوں سے ان جواہر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کاش کہ اس رات خالی ہاتھ آ جاتی۔ جواہرات اور کاغذات ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ نہ لاتی پھر شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نہ یہ کاغذات ہوتے نہ ابا جان اپنے آپ سے اتنے بے خبر ہوتے اور اتنی جلدی ... ابا جان میری تلاش میں ضرور نکلتے یا رو پیٹ کے بیٹھ جاتے مگر سب گھر ہی میں رہتے اور فہمیدہ مجھے دیکھ کے اس طرح گھٹ گھٹ کے نہ مر جاتی۔ مولوی اکرم نے جب بھی ابا جان کو ٹوکا انھوں نے ایک ہی بات دہرائی کہ مولوی اکرم! تم نہیں جانتے ان کاغذات میں کیا چھپا ہوا ہے میں ان میں صرف ہونے والے ایک ایک لمحے کی قیمت وصول کروں گا۔ اور اس دوران انھوں نے فہمیدہ کو ضائع کر دیا۔ تجمل کو معلوم تھا کہ مجھ سے پہلے کرشنا جی نے ہندوستان بھر کی پولیس کو ابا جان کے بارے میں خط لکھے تھے۔ کرشنا جی کو امید تھی کہ ایک دن وہ ان کا سراغ یقیناً لگا لیں گے۔ کرشنا جی زندہ رہتے تو انھیں ڈھونڈنے کی اور کوشش بھی ضرور کرتے۔ ان کا کام ہی سراغ لگانا تھا لیکن وہ بھی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایس پی شکلا کو دو ایک جگہ سے کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کے جواب موصول ہوئے مگر سب بعد از وقت تھے۔ ابا جان وہ شہر چھوڑ کے پہلے ہی جا چکے تھے۔ کرشنا جی کی طرح شکلا جی کو بھی امید تھی کہ شاید کہیں سے کوئی حتمی جواب آ جائے گا۔ انھوں نے میرا ... مضمون کے خط مختلف شہروں کو بھیجے تھے۔ ممکن ہے کہیں اور سے جواب آیا بھی ہو مگر شکلا جی نے مجھے اطلاع دینا اس لیے ضروری نہ سمجھا ہو کہ ابا جان اس شہر سے بھی روانہ ہو چکے ہوں۔ شکلا جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی تمام کوششیں جاری رکھیں گے اور بار بار یاد دہانی کراتے رہیں گے۔

تجمل کہہ رہا تھا کہ فیض آباد میں جب شکلا جی کا خط ملا تو ... ارشد اس کے قریب تھا۔ ارشد نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی ... نے ارشد سے ہوٹل اور شیلانگ کے محل وقوع کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ اس نے نقشے میں بھی شیلانگ دیکھا۔ ہم ابا جان کی

تلاش میں گیا شہر کے قریبی علاقوں میں دانستہ نہیں گئے تھے کیونکہ ابا جان گیا سے دور دور کے علاقوں میں جا سکتے تھے جہاں انھیں بدھ راہبوں اور جان پہچان والوں سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ چنانچہ وہ بمبئی گئے جہاں انسانوں کا جنگل ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ نیچے کی منزل والے کو اوپر کی منزل والے سے تعلق نہیں ہوتا۔ بمبئی میں طویل قیام کے بعد ابا جان شہر بدلتے رہے ہوں گے۔ آج یہاں کل وہاں۔ تین مہینے اس بستی میں تین مہینے اس بستی میں۔ وہ فہمیدہ کے واقعے کا اعادہ نہیں چاہتے ہوں گے اور سب سے زیادہ فکر تو انھیں کاغذات کی ہو گی کہ ان کی کسی کو بھنک نہ مل جائے۔ زیادہ عرصے ایک جگہ رہنے سے آس پاس کے لوگ دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ کاغذات پر تحقیق کے لیے انھیں ذرائع کی ضرورت بھی پڑتی ہو گی۔ مولوی اکرم کے سوا انھوں نے کاغذات کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہو گا۔ مولوی اکرم سے بھی تب کیا ہو گا جب انھیں ان پر پورا اعتماد ہو گیا ہو گا۔ ادھر مولوی صاحب اور کرشنا کے ساتھ بھی یہی تھا۔ کلکتے یا مراد آباد کے علاقوں اور بدھ راہبوں کے مرکزوں سے دور ہی رہنے میں ان کی عافیت تھی۔ چانگ قبیلے کے لوگ کرشنا کی جستجو میں تھے۔ ہم نے بھی سرحد کے بنگال اور آسام کے علاقوں کا رخ نہیں کیا تھا تاہم وہ کہیں اور نہ ملتے تو ہمیں اس طرف بھی آنا پڑتا۔

ابا جان کا کسی ایسی جگہ نظر آنا تجمل کے لیے چونکا دینے کا سبب تھا جہاں بدھ راہبوں کے تبتی قافلے گزرتے ہوں اور گرد و نواح میں بڑی بڑی خانقاہیں موجود ہوں۔ نو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس مدت میں کاغذات کی تحقیق کے بعد ابا جان نے اپنی دانست میں کوئی نتیجہ اخذ کیا ہو گا یا نا وقت انھوں نے صرف گنوایا تو نہیں ہو گا۔ وہ پاگل تو نہیں تھے۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد تجمل بھی اس نتیجے پہ پہنچا کہ کہیں قریب کے شیلانگ میں ہونے کا مطلب تبت کی طرف کوچ کرنا تو نہیں ہے۔ اگر انھیں فوراً مطلوب تھی تو ایک نہ ایک دن تبت جانا ہی تھا۔ تجمل نے فوراً بیرو کر بمبئی اور وزیر کو مستقل تار دیے جو برش اور کپتان عمان کو ساتھ لے کے کلکتے آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تبت میں داخلے کے لیے باقاعدہ اجازت ضروری ہے اور اسے حاصل کرنے میں دن بھی لگ سکتے ہیں۔ درخواست نامنظور بھی ہو سکتی ہے۔ کلکتے کے بہت سے مال دار لوگوں کے کارخانے بنگال اور آسام میں پھیلے ہوئے تھے اور کلکتے کے منشی کی حیثیت سے اس کا واسطہ ان لوگوں سے پڑتا رہتا تھا۔ کسی سے زیادہ کسی سے کم۔ کلکتے آنے کے بعد وہ مختلف جگہوں پہ مختلف طبقوں کے لوگوں کے پاس جاتا رہا۔ ایک طرف اس نے راہی علاقوں میں تمام ضروری کاغذوں کا بندوبست کیا، دوسری طرف رات دن سفر سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اس نے جاپانی ... کے اڈے کے ایک تبتی باشندے سے بھی رابطہ قائم کیا، جو تبتی زبان بھی جانتا تھا

اور ان راستوں سے گزر چکا تھا۔ پڑھا لکھا شخص تھا جسے وہ بیرہ گرام ہوتے وقت میں نے جاہو کے ساتھ اسٹیشن پر دیکھا تھا۔

ہم دونوں اکیلے بھی جا سکتے تھے لیکن تجمل کے کہنے کے مطابق وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ مجھ کو اسے خود بھی اندازہ تھا اور مجھ کو اسے بتایا گیا تھا کہ یہ سفر اور سفروں کے مانند اتنا آسان نہیں ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستے ہیں، اونچی اونچی برفیلی چوٹیاں ہیں۔ نہ ریل ہے نہ موٹر۔ نہ سڑکیں ہیں نہ منزلوں کے نشان۔ قدم قدم پر قبائلی قزاقوں کا خدشہ۔ کاغذات کا تعلق چانگ قبیلے سے ہو گا۔ چانگ قبیلے کے لوگ اسی کے لیے اب تک ابا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ تجمل کے ذہن میں کچھ اور الجھنیں بھی ہوں گی اسی لیے اس نے اکیلے جانے کے بجائے لوگوں کو ساتھ لے چلنے کا فیصلہ کیا۔ اسے ابا جان کے تبت کی طرف کوچ کرنے کا ابھی تک کامل یقین نہ ہو گا۔

سردی کے باوجود میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کی باتیں مجھے ایک خواب معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ شکلا جی نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ پولیس والے نے ابا جان کو تنہا دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا اور وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری نظروں میں ان سب کے چہرے گھوم رہے تھے۔ رہ رہ کے یہی خیال آ رہا تھا کہ ابا جان تنہا کیوں تھے۔ انھوں نے ان سب کو کہاں رکھا؟ کہیں وہ بھی ان سے جہانگیر اور فہمیدہ کی طرح جدا تو نہیں ہو گئے؟ ممکن ہے پولیس والے ہی کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ یوں بھی گھبرا جاتے ہیں اس لیے شاید اس نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہو کہ یہی شخص صفدر زماں ہیں لیکن تجمل کا یہ کہنا بھی قرین قیاس تھا کہ بالآخر انھیں تبت جانا ہی تھا۔ ان کا تنہا ہوٹل میں ٹھہرنا اور تبت کی سرحد سے قریب شیلانگ میں نظر آنا تجمل کے شبہے کی تائید کرتا تھا۔ ابا جان فرح، زبیدہ، نادر میاں اور اکبر کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ سکتے تھے۔ اتنی مدت میں ان کو بمبئی کے مولوی اکرم جیسا کوئی اور قابل اعتماد دوست مل گیا ہو گا یا ہو سکتا ہے کہ وہ گیا واپس چلے گئے ہوں اور سب کو کسی عزیز کے حوالے کر آئے ہوں۔ وہ گیا سے کوئی جرم کر کے تو آئے نہیں تھے جو واپس نہ جا سکتے۔ فہمیدہ کے بارے میں لوگوں نے پوچھا ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا ہو گا کہ اس کی شادی ہو گئی یا وہ مر گئی اور جہانگیر بھی مر چکا ہے۔ وہ تبت میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کو ساتھ لے کے کیسے جا سکتے تھے۔

تجمل مجھے ٹہوکا مار کے پوچھنے لگا "کیوں لیٹے تو کچھ نہیں بولتا؟"

میں کیا بولتا۔ میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہو رہی تھی کہ ابا جان ان علاقوں میں آ کے کسی بڑی مصیبت میں نہ گرفتار ہو گئے ہوں۔ ان کے ساتھ اگر کاغذات ہیں تو

کریں گے اور ہم اُن کے شک سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ چھ جھکشو دنیا بھر سے تبت آتے ہیں اُن کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ تبتی زبان سے بھی واقف ہوں۔ سُولم کہتا تھا کہ قبائلیوں کے نزدیک جھکشو شاکیہ منی گوتم بدھ کا روپ سمجھے جاتے ہیں۔ تجمل کو وہ ہرگز یہ تجویز پسند نہ آئی لیکن اُس نے عمل نہیں کیا۔

راستے میں تلی تبت کی کہانیاں سُنانے لگتے تھے۔ سُولم اُن کا ترجمہ کر دیتا یا تلی جو نے لگتے کبھی سلطان، مارثی، تجمل اور وزیر بھی اُن کی آواز سے آوازیں ملانے لگتے۔ سہ پہر کو جیسے ہی دھوپ نرم پڑتی، پہاڑوں پر رفتہ رفتہ دبیز کُہر چھانے لگتی اور آگے کا راستہ دکھائی دینا مشکل ہو جاتا۔ دن میں تو کچھ نہیں ہوتا لیکن شام ہوتے ہی بیزاری گھیرنے لگتی۔ اندھیرے میں اونچے پہاڑوں کے سائے دیکھ کے مجھے خوف سا لگتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا، شام کو بھی ہم چلتے رہتے جب ناممکن ہو جاتا تو پڑاؤ ڈال دیتے۔ اب کم بستیاں قریب قریب آ رہی تھیں۔ دانگ کے بعد غیر آباد پہاڑوں کی وجہ سے ہمارے کھانے پینے کا سامان کم ہونے لگا۔ ہر چند کہ ہم پہلے ہی غاصا وغیرہ ساتھ لے کے چلے تھے۔ حقیقتاً ہمیں اپنی بندوقیں نکالنی پڑیں۔ شکار کی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی ہم دن میں مارتے، رات کو الاؤ پر بھون لیتے۔ تبتی تلی بھی رفتہ رفتہ ہمارا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھا کے خوش خوش رہتے تھے۔

ہر تبتی تلی لمبی داڑھی اور تلوار سے ہر وقت مسلح ہوتا تھا۔ یاک یا بھیڑ کی اُون کا لباس، چمڑے کا جوتا، کانوں تک لمبی چوڑی اونی ٹوپی اُن کا عام پہناوا تھی۔ بستیوں میں امیر لوگ فر کے کوٹ، مسلک کی چادر والے مخصوص مفلروں میں ملبوس رہتے تھے۔ سالا کے بعد جن چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ہم جاتے اور بستی کے لوگوں کو مہمانوں کی رسم کے مطابق تحائف پیش کرتے تو وہ اپنے گھر کے دروازے ہمارے لیے کھول دیتے۔ دروازہ کھلنے کے لیے تحائف ہی شرط نہیں تھے۔ مسافر جس دروازے پر چلا جائے مہمان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں میزبان اور مہمان گلوبند تبدیل کر کے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے پاس گلوبندوں کی ایک وافر تعداد موجود تھی۔ مہمانوں سے میزبانی کی کوئی قیمت طلب نہیں کی جاتی۔ سارے راستے ہمیں کوئی سرائے نظر نہیں آئی۔ گو ہم سالا کے بعد دو تین ہی گھروں میں بہت مختصر وقت کے لیے مہمان ہوئے لیکن میزبانوں نے اس مختصر وقت میں بھی ہماری تواضع میں یاک کا دودھ، انڈے، تبتی شراب پیش کی۔ مکھن اور نمک ملی ہوئی چائے ہمیں پلائی۔ چائے کے بغیر وہ شاید زندہ نہیں رہ سکتے۔ سُولم کی وجہ سے اُن سے بات کرنے میں ہمیں زبان کی کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ لوگ مہینوں منہ ہاتھ نہیں دھوتے۔ پانی سے اُن کا جسم کٹنے لگتا ہے۔ اُن لوگوں کی طرح ہم نے بھی سالا میں اپنے جسموں پر روغن کی مالش کر لی تھی۔

تلی عام طور پر ایک گیت سناتے تھے جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا: "تو اپنے باہر سے نہیں اندر سے ہے۔ تیرا ظاہر ایک دھوکا ہے تیرا اصل تیرا باطن ہے۔ تیری اہمیت بس تیری اندرونی شخصیت سے ہے۔ سو اُسے پاک صاف رکھ۔"

ہر چند تبتی اسی پر عمل کرتے تھے، باہر سے بہت گندے مگر اندر سے دُھلے ہوئے۔ ہم نے کسی تبتی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سارے مختلف بستیوں میں ہوتے ہوئے تبت کے سب سے پہلے شہر زانگیل میں داخل ہوتے ہی ہم نے چند معززین کے گھروں میں جا کے سب کو تحائف پیش کیے۔ زانگیل دریائے ریگنو اور دریائے سونگو کے سنگم پر واقع ایک گندا شہر ہے۔ اس کا ایک دوسرا نام شیگا تھا جو کم ہی ہے۔ تلی نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں تبت کا ایک نمایاں افسر رہتا ہے جس کا لقب ہے زانگ پون (سول گورنر)۔ زانگیل میں اگر ہم دو دن آرام نہ کرتے تو آگے نہیں چل سکتے تھے۔ چھوٹی ہی اپنی جت سے چل رہا تھا۔ اُسے ٹھنڈ لگ گئی تھی اور کئی بار تیز بخار آ چکا تھا۔ میرے، پیرو، تجمل اور زردا کے سوا سبھی باری باری بیمار پڑتے رہے۔ پیرو بھی کھانسنے لگا تھا۔ اِن کا مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن ہر منزل پر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوتا تھا۔ رات کو جب پہاڑوں پر دھند چھا جاتی اور میرا دل ہولنے لگتا تو میں الاؤ میں اور لکڑیاں ڈال دیتا۔ روشنی سے مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔ کتنی بار جی نے اِن سے کہا کہ واپس چلیں۔ یہ سنتے ہی پیرو مجھے گھورنے لگتے اور تجمل گھورنے لگتا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غصے میں تھپڑ لگا دیا ہے۔

چند دیہاتی سرحدی چوکی وانگ اور تبتی سرحدی چوکی کے سوا نیپ میں پڑنے والی تمام بدھ خانقاہوں اور مندروں میں ہمارا جانا ایک معمول تھا۔ وانگ سے سالا تک ہم ایک طویل چکر کاٹ کے پہنچے تھے ورنہ وہاں کی خانقاہوں اور مندروں میں نہیں جا سکتے۔ زانگیل میں بستی کے لوگوں نے ہماری بہت خاطر کی۔ زانگیل سے آگے چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ ہم نے اتنی ہی دیر وہاں قیام کیا جتنی دیر میں کھانے پینے کا سامان اکٹھا کر سکتے تھے اور نئے قلیوں کو ڈھونڈ سکتے تھے۔ زانگیل کے بعد برف پوش پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ دن میں برف پر دھوپ کی چمک سے آنکھیں سُرخ ہونے لگتیں اور ہماری صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ باقی چہرہ اُونی ٹوپیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بات کرنے کے لیے ہمیں ٹوپیاں سرکانا پڑتیں۔ بستی کی اسی لانگ سے چند میل بعد دریائے برہم پترا واقع ایک بستی ژردو ماگر ملا ہے۔ اس سے کچھ آگے قصبہ سانگ ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو اتفاق سے سالانہ مقدس میلا لگا ہوا تھا۔ تبت کے کونے کونے سے لاما وہاں موجود تھے اور بھکشوؤں کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ مجھے

وہاں ہم دو دن کے لیے وہاں رُک گئے اور ہم نے اپنا بیشتر وقت میلے ہی میں گزارا۔ راستے میں تلیوں کی مدد سے ہمیں چند تبتی الفاظ آ گئے تھے۔

بارگے پاک بوکی: ان گی بڑا۔ ڈروو۔ خوب، تم تبتی زبان اچھی طرح جانتے ہو۔

- لاک: نہیں۔
- پاک یو شی گی مدہ: اچھی طرح نہیں۔
- لاکس سو تزے مچے: مہربانی۔ آپ کا شکریہ۔
- پاوا لا تنگ: اٹھ جاؤ۔
- مے تری بار: آگ روشن کرو۔
- جا بو گنگ: چائے بناؤ۔

جو جیلا جتنی بندوقیں پر بڑا تھا، اتنا ہی معزز سمجھا جاتا تھا جو جتنا پیچھا تنہا ہی بے عزت۔ اس اعتبار سے ہم بچے کی نسبت زیادہ عزت کر کے بستیوں سے گزر رہے تھے۔ سالا سے ہم چار راستوں کے سنگم سے گزر کے لٹ سا کے مقدس مقام پر آ گئے۔ یہاں بھی ایک بڑا مندر تھا۔ گر سے لٹ سا سے ساما جو تُن تک ہمیں کوئی مکان نہیں ملا۔ تمام راستہ بلند ترین پہاڑوں، گھاٹیوں اور چھوٹے بڑے دریاؤں سے ہو کے نکلتا تھا۔ قدم قدم پر خیمے تھے کہیں صرف جانوروں کے لیے اور بعض مقامات کے لیے قصص۔ مرشد تنشیب کرنے کے سبب یہاں پر ہم ہی پہلے آئے ہیں۔ گزشتہ لٹ سا اور ساما جو تُن کا سارا علاقہ جانے کیسا خوفزدہ سے بھید تھا۔

ڈیڑھ مہینے کی مسافت کے بعد ایک دن جب تلیوں نے ہمیں بتایا کہ آگے چند میل کے فاصلے پر جانگ قبیلے کی بستی ہے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اور خلاف باوجود ہماری رفتار تیز ہو گئی۔ وہ کوئی کا وطن تھا۔ جانگ قبیلے کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جانے کتنی داستانوں سے ہو کے گئی ہو گی۔ جبھی تو اس میں ایسی ہیبت تھی، جیسا وہم تھا۔

ہر بستی کے مانند جانگ قبیلے کے لوگوں نے ہماری آمد کو ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ ہم نے کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے جانگ قبیلے کے سردار کے روبرو ہو کے اُسے چند تحائف پیش کیے۔ سُولم نے ہماری ترجمانی کی۔ سردار نے ہمارے سفر کا مقصد تجارت جان کے سر ہلایا۔ گلوبند بدلا اور اس طرح ہم نے کچھ کہے اور اُس سے کچھ سُنے بغیر بڑا اتفاق اطمینان ہم چند دن وہ بستی میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

جانگ قبیلے کے لوگ عام تبتیوں کے مقابلے میں سرخ و سفید اور لمبے چوڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دانت، چمکتی ہوئی تیز آنکھیں، عورتیں بہت خوب صورت تھیں۔ اُن کے بال لمبے اور زردا اُٹھتے ہوئے تھے۔ تمام کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ قبیلے کا موجودہ سردار عارضی ہے۔ ہر سردار کو مہلت دی جاتی ہے کہ وہ گیارہ مہینے کے عرصے میں کھوئے ہوئے جنجرگ کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ناکامی کی صورت میں اُسے یا تو قبیلہ بدر کر دیا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔ بستی کئی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ قبیلے کا ہر شخص غور و فکر میں ڈوبا ہوا، پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمیں ابتدا ہی میں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ہماری نقل و حرکت کی پوری نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم نے پیرو، وزیر، پلٹو، زردا، سادھے جیسی، مشتی خان اور ملا کو بستی سے دُور ایک فاصلے پر روک دیا تھا۔

تجمل نے انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ چار روز بعد بستی کا رُخ کریں۔ ہم صرف پانچ، تجمل، میں، جانز، مارثی اور سلطان بستی میں داخل ہوئے تھے۔ ہم بھی ہر طرح محتاط تھے۔ نتیجے ہم نے اپنے کرتوں کی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔ تین دن تک ہم بستی کے لوگوں سے سُن گُن لینے کی کوشش کرتے رہے مگر ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ قبیلے کے لوگ صبح و شام عبادت کرتے تھے جس شخص کے ہاں ہم مہمان تھے، اُس نے چوتھی رات زبان کھولی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے لوگ برسوں سے ایک عذاب میں مبتلا ہیں۔ وہ اُن جنجرگ کاغذات سے ابھی نہیں ہے جو اُن کے قبیلے کے لیے باعثِ افتخار تھے۔ ہم نے کوئی تبصرہ کیے بغیر صرف دُکھ کا اظہار کرنے پر قناعت کی۔

دوسرے دن جب ہم ارد گرد کے پہاڑوں سے واپس بستی میں اپنے میزبان کے مکان پر پہنچے تو سامان پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔ انھوں نے کوئی چیز چوری نہیں کی تھی اور تمام چیزیں جوں کی توں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔

بستی سے چند میل کی دُوری پر بدھوں کی پتھروں سے بنی ہوئی ایک بڑی خانقاہ تھی۔ ابھی پیرو اور دوسرے لوگ چار دن گزر جانے کے باوجود بستی میں نہیں آئے تھے۔ یقیناً کوئی بیمار پڑ گیا ہو گا یا انھیں کوئی اور اُفتاد پیش آ گئی ہو گی۔ ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ پانچویں دن ہم نے خانقاہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو راہب گوتم بدھ کی ایک بڑی مورتی کے سامنے عبادت کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ہم سب کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ عبادت ختم ہونے کے بعد راہب منتشر ہو گئے اور مختلف جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ہم وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ ایک مندر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے میری سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ ایک بوڑھے راہب کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ اُس کا چہرہ سپاٹ اور مرجھایا ہوا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے عبادت میں مصروف تھا۔ میں نے تجمل کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ میری سسکی نکل گئی۔ تجمل نے مجھے سرزنش کی اور میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں انھیں اس سلسلے میں کچھ بھی بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ آپا جان کے سوا کوئی نہیں ہو

چاہا مگر جمیل نے اشارے سے آگے روک دیا۔ "تیرے ساتھ ایسا بڑا
نے جا سو استاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "ان لوگوں نے ہم پر
بھروسا کیا ہے سویرے گڑوں کریں کر لینا ابھی رات باقی ہے۔"
اور اُس وقت جمیل کے لہجے اور اشارے سے مجھ پر یہ خدشہ
کسی حقیقت کی طرح آشکار ہوا کہ ان میں سے کوئی ہندوستانی سے واقف
ہو سکتا ہے۔ جامو نہیں سمجھا۔ اُس نے حیرت کی تو جمیل نے اُسے ڈانٹ
دیا۔ جانے ہوئے ہیں وسا نے تم سے کچھ نہیں کہا تھا اس لیے ہم اُسی
کوٹھری نما کمرے میں لیٹ گئے۔ بہت دیر بعد جب مکان میں ہر آہٹ
معدوم ہو گئی تو جمیل میرے قریب کھسک آیا اور میرے کان میں سرگوشی
کرتے ہوئے بولا: "شہزادے! ہمارا ن کر پیچھے ہی رکھنا۔"
"نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔
اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ "کم سے ہم بندھا
رہ لاڈلے!"
"میرا جی اُڑ رہا ہے۔"
"جی کو میان میں ہی رہنے دے۔"
"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔
"ٹھیک ہی ہو رہا ہے جانی!" وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔
"میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"
"تو اتنا بوجھ کیوں اُٹھاتا ہے بس آنکھیں کھلی رکھ۔"
"کاش میری آنکھیں بند ہو جائیں!"
وہ مجھے تھپکنے لگا: "اپنا نہیں تو اوروں کے ہاتھ پیر کی مٹھیاں کھلے۔"
"ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" میں نے وحشت سے کہا۔
"یہ چھت کے نیچے ہیں۔"
"فرض کرو۔ اگر آج ہی وہ وہاں سے نکل گئے تو؟..."
"اس سے بھلا اور کیا ہوگا لے!"
"لیکن پھر۔ پھر...!"
"پھر بہت سامنا تو ہو جائے گا۔ پرا ایسا رکھتا نہیں ہے۔"
"مگر تم نے سوچا کیا ہے؟"
اُس نے آنکھیں بھینچ لیں اور چپ رہا۔
"مجھے بتانے میں کوئی حرج ہے؟"
"کوئی حرج نہیں۔"
"تو پھر زبان کیوں نہیں کھولتے؟"
"زبان سالی اینٹھ رہی ہے۔"
"مجھے معلوم تھا۔ تمھارا جواب یہی ہوگا۔"
"تو تشنی کیوں مارتا ہے۔" وہ درشتی سے بولا۔
"ایک بات کہوں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔
"بول۔"
"باقی سب لوگ آ کو واپس کر دو۔"
"تیرا گھر بال بچہ نہیں چل رہا ہے۔" اُس نے زور سے میرے
بال پکڑ لیے۔
"تمھارا تو ٹھیک چل رہا ہے۔"
"چل لے پھر!" وہ ٹھنک کے بولا۔
میں نے پھر اُس سے بات نہیں کی لیکن نہ اُسے نیند آئی نہ
مجھے۔ ہم دونوں چپ پڑے رہے تھے۔ جامو، مارتی اور شوکم تھوڑی
دیر بعد ہی سو گئے تھے اور ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ شاید دس پندرہ
منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دفعتاً جمیل اُٹھ کے بیٹھ گیا اور میرا بازو
ہلا کے کہنے لگا: "لاڈلے! ذرا گھڑی دیکھ۔"
ہم میں سے صرف مارتی کے پاس گھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے
اُس کے کمبل میں ہاتھ ڈال کے جیب ٹٹولنی چاہی۔ مارتی ہڑبڑا اُٹھا۔
"ٹائم بتانے، مارتی!" میں نے آہستگی سے کہا۔
مارتی گھبرا گیا۔ میرا ہاتھ اُس کے منہ کے قریب ہی تھا تاکہ اگر
وہ زور سے بات کرے تو اُس کا منہ بند کر دوں۔ مارتی کا ہاتھ سیدھا
میری گردن پر آیا تھا لیکن دوسرے لمحے وہ ٹھہر گیا۔ "کیا بات ہے راجا
استاد؟" وہ حیرانی سے بولا۔
"بات مت کر۔ ٹائم بتائے۔"
مارتی کی گھڑی میں تین بجے تھے۔ میں نے جمیل کو بتایا تو وہ
تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ مارتی کو اُس نے اُٹھنے نہیں دیا۔ چین وسا باہر
جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ گیا تھا اور ہم نے معمول کے مطابق اندر سے
کنڈی نہیں لگائی تھی۔ جمیل پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کی طرف
بڑھا اور چند لمحے وہیں ٹھٹکا کھڑا رہا۔ دروازے کے پار کوئی آہٹ
نہیں تھی۔ جمیل نے آہستگی سے کنڈی پکڑی پھر آہستہ آہستہ کواڑوں
کو اندر کی طرف کھینچا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر اُس
نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے پیچھے ہی رہنے دیا اور خود کواڑ کھولنے
دیا۔ اُس کی تاخیر سے مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوگا
کہ ایک ہلکی چرچراہٹ کی آواز اُبھری اور سرد ہوا کا ایک تھپیڑا میرے
گالوں سے ٹکرایا۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ جمیل بھی رُک گیا۔ دروازے کے
کھلے ہوئے حصّے سے اُس نے آنکھیں لگا کے باہر دیکھا۔ باہر گھُپ اندھیرا
تھا۔ نہ جانے جمیل کو کیا ہوا کہ اُس نے ارادہ بدل دیا اور کواڑ کھسکانے
کے بجائے انھیں ایک دم کھول دیا۔
ہم کسی ضرورت کے تحت بھی رات کو اپنے کمرے سے نکل سکتے
تھے۔ یہ قید خانہ نہیں تھا، ایک مکان تھا جہاں ہم مہمان تھے مگر جمیل گھر
کے کسی مکین کو اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی خبر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر

بھاری دروازہ آواز کے بغیر نہیں کھل سکتا تھا ورنہ دیر بہت ہو جاتی۔
چین وسا کے گھر کی ساخت سے ہم اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ وہ
کوئی پیچیدہ اور بڑا مکان نہیں تھا۔ قبیلے کے عام مکانوں کے لحاظ
سے بڑا، شہروں کے مکانوں کی نسبت سادہ۔ ایک طرف دو کمرے بنے
ہوئے تھے جن میں سے ایک میں ہم تھے، دوسرے میں سلطان۔ ان
کے آگے پختہ چھت کا ایک مختصر سائبان۔ سائبان بائیں طرف بھی
انگریزی حرف ایل کی طرح چار دیواری تک چلا جاتا تھا۔ جہاں
کوٹھریوں جیسے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ چین وسا اُس
کی بیٹی اور ملازم انھی میں رہتے تھے۔ سائبان کے بعد ایک کشادہ صحن
تھا۔ ہمارے کمروں کے پچھواڑے بھی ایک تنگ سائبان کے ساتھ
تھوڑا سا صحن تھا۔ ہر طرف درخت اور مختلف پودے لگے ہوئے تھے۔
پتھر کی ایک چھوٹی موٹی اور اونچی نیچی دیوار سارے مکان کا احاطہ
کرتی تھی۔ زمین نسبتاً ہموار تھی۔ ہمیں غسل خانے وغیرہ کے لیے سامنے
صحن کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکل کے پیچھے جانا پڑتا تھا۔
کمروں میں صرف ایک ہی دروازہ تھا اور عقبی دیوار پر روشن دان کے
مانند ایک کھڑکی تھی جو عموماً بند رہتی تھی۔ چھت کے ساتھ دیواروں
پر بھی ایسے ہی سوکھے بنے ہوئے تھے جنھیں درختوں کی چھال یا کسی اور
قسم کے کپڑوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔
جمیل نے مارتی کو ہاتھ کے اشارے سے جاگتے رہنے کی ہدایت
کی اور باہر نکل آیا۔ ہر سو قبرستان جیسی خاموشی اور قبر جیسا اندھیرا تھا۔
قریب و دور کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ باہر آ کے اندازہ ہوا کہ ہوا
اچھی خاصی تیز ہے۔ میری انگلیاں ٹھٹھرنے لگیں۔ پیروں میں ہم اونی
جرابیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے جمیل کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم اندھوں
کی طرح ہاتھ پھیلائے ٹٹول ٹٹول کے سائبان کے فرش پر قدم رکھ
رہے تھے۔ پہلے رات کو کسی وقت باہر نکلنے کا اتفاق ہوتا تو ہم مشعل
ساتھ رکھتے تھے۔ ساری رات سائبان کے ایک کونے میں بھی مشعل جلتی رہتی
تھی۔ آج وہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چین وسا کے ساتھی جاتے ہوئے اُسے
اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ جمیل کی جیب میں بیٹری بھی ہوگی لیکن
بیٹری اُسے استعمال نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے قدموں کے اندازے
سے سائبان کا فاصلہ طے کیا اور کمرہ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ پیچھے
صحن میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ہم تھم کے ساتھ پیچھے ہوتے
نیچے اُتر گئے۔ پہلے جمیل پھر میں۔ پیروں کے بار جو صحن میں قدم رکھتے ہی
ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ٹھنڈے پانی میں اُتر گئے ہوں۔ سردی سے میرے
ہونٹ چپکنے لگے تھے۔ چند لمحوں میں کتنی ہی بار میں نے سر کو جھٹکا دیا۔
گھپ اندھیرا گہری دھند کی وجہ سے تھا۔ یخ بستہ کر چلے ہیں وہ چار قدموں میں
مجھے اندازہ ہو گیا کہ باقی فاصلہ طے کرنا آسان نہیں ہے۔ میں جمیل سے
لپٹنے کے لیے کتنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اور آگے چل پڑا۔ بیٹری اُس نے
اب بھی روشن نہیں کی تھی۔ ہم تقریباً ایک ایک دو دو انچ کھسکتے ہوئے
چار دیواری کی طرف بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے پوری
طرح ڈھانپ رکھے تھے۔ صحن کے درختوں سے بچتے ہوئے ہم کسی نہ کسی
طرح دروازے تک پہنچ گئے۔ دیوار پتھروں کی تھی اور زیادہ اونچی نہیں
تھی۔ ہم کود کے بھی مکان کے باہر جا سکتے تھے۔ میں ایک موہوم اُمید
کے سہارے ہی جمیل کا ساتھ دے رہا تھا کہ شاید وہ دیوار کے پاس کس
ایسا اندھیرا ہو۔ جمیل نہ جانے کس دُھن میں تھا۔ شاید مجھے یہ باور
کرانے کے لیے کہ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور بعد میں
سے کچھ کہنے کے لیے میرا منہ نہ پڑے۔ مکان میں کوئی شخص نہیں جاگ رہا تھا
ہماری چاپیں صرف ہمیں تک محدود رہی تھیں۔ کھردرے پتھروں پر پیر رکھ
کے ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے سر اُوپر کیے۔ جمیل دیوار پر چڑھ گیا تھا
لیکن میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ ہم نے آپس میں بات کرنے سے پرہیز
کیا۔ چار دیواری کے باہر تا حدِ نظر صرف ایک چیز نظر آتی تھی۔ برف
جیسے برف سے سیاہ دھواں اُٹھ رہا ہو اور ساری فضا پر چھا گیا ہو۔ آگے
اونچی چٹانیں تھیں اور آڑی ترچھی پگ ڈنڈیاں ہمارے پیروں سے
نامانوس۔ الٹے ہم کسی طرف بھٹک جاتے تو صبح تک بھی لوٹ نہ پاتے۔ بستی
سے منڈوں کا علاقہ اتنی دور نہیں تھا پھر بھی چند میل سے کم نہیں تھا
اور ساری کی ساری چڑھائی تھی۔ بیٹری بھی ساتھ نہ دیتی۔
سائبان تک ہم رینگتے ہوئے واپس آئے لیکن سائبان میں آ
کے ہم نے اپنی رفتار معمول کے مطابق کر لی۔ جمیل نے بیٹری جلا دی جیسے
جیسے اپنی آنکھیں واپس مل گئیں۔ سائبان میں بھی دھند تھی اور بیٹری کی
روشنی بھی اُس میں دھندلا گئی تھی۔ بہرحال اب گھر کا کوئی مکین جاگ جاتا تو
ہمیں اتنی فکر نہیں تھی۔ ہمارا کمرہ سامنے تھا۔ جمیل اندر جانے کے بجائے
سلطان کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ باہر نکلے ہیں تو
ایک نظر سلطان کو بھی دیکھ لیں۔ اسی کمرے میں ہمارا سامان رکھا جاتا تھا
دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوگی۔ جمیل نے دروازے
پر ہاتھ رکھ کے اُسے جھٹکا دیا تو وہ ایک ہلکی آواز کے ساتھ کھل گیا۔
کمرے میں مدھم روشنی تھی لیکن اندر کا منظر دیکھ کے ہماری آنکھیں چندھیا
گئیں۔ کمرے میں ایک اونچی جگہ سلطان لیٹا ہوا تھا اور کوئی اُس کے
سینے پر سر رکھے تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک گھٹی ہوئی سسکی بلند ہوئی اور
وہ بجلی کی طرح سلطان کے سینے سے اُٹھ کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں
دیکھنے لگی۔ جمیل نے بیٹری کی روشنی اُس کے چہرے پر پھینکی تو اُس نے منہ
پھیر لیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ہمیں اُسے پہچاننے میں دیر
نہیں لگی۔ وہ چین وسا کی لڑکی تھی۔ گھر میں آتے جاتے بارہا ہمارا اُس کا
آمنا سامنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد جمیل نے بیٹری بجھ

وہی اور دروازہ بھیڑ کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

سلطان کو ابھی تک سدھ بدھ نہیں تھی۔ چن وسا کی نوجوان لڑکی کا تمام کا تمام اس کے سینے پر ٹکا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہوا۔ قبل کی بھی یہی حالت ہوگی۔ نہ جانے ہم نے کیا دیکھا تھا۔ روشنی میں تمام کو رنگ چمک رہا تھا۔ میں نے اسے دن میں بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک شرمیلی اور نازک سی لڑکی تھی۔ اس کے بال کوا کے بالوں کی طرح اتنے لمبے تھے کہ کولھوں تک آتے تھے۔ چہرے کا سنہرا رنگ دمکتا تھا۔ کوئی بھی ایک بار اسے دیکھ لے تو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہوگا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شربتی تھیں۔ قبل نے اسے چند سکے دیے تھے تو اس کے گالوں پر سرخی چھا گئی تھی۔ اس وقت سلطان نے اپنے ہاتھ سے اسے چوڑیاں پہنائی تھیں مگر یہ چار ہی دن پہلے کی بات تھی۔

کواڑ کھلا تو ہماری نظر سب سے پہلے ماری پر پڑی۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ قبل نے اس کے گال اور کان تھپ تھپائے اور آتش دان کی جھولی میں لکڑیاں مارنے لگا۔ ماری نے اس میں کچھ اور لکڑیاں ڈال دیں۔ قبل کچھ دیر تک ہاتھ تاپتا رہا۔ پھر آکے چپ چاپ بیٹھ گیا۔ نہ اس نے مجھ سے کچھ کہا، نہ میں نے اس سے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

مجھے توقع تھی کہ صبح ہوتے ہی قبل باہر نکلنے میں جلدی کرے گا لیکن ایک تو وہ دیر میں بستر سے اٹھا۔ پھر لیٹے ہی لیٹے خاموش بیٹھا وقت گزارتا رہا۔ آج چلنے کا دن تھا کہ خلاف معمول چن وسا ناشتے کے دوران ہمارے درمیان موجود نہیں تھا۔ اس کے خادم نے بتایا کہ وہ سویرے ہی کسی کام سے باہر چلا گیا تھا اور اسے ہدایت کر گیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھنا۔ روز کی طرح منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی تیار تھا۔ چن وسا کی خادمہ دودھ اور مکھن میں گندھے ہوئے جوار کے آٹے کی گرم روٹیاں، اچار اور جانگ قبیلے کا مخصوص [illegible] لا رہی تھی۔ ہم سب نے کئی کئی پیالیاں چائے پی۔ خلاف معمول [illegible] شام بھی ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ ناشتے کے بعد خاصا وقت گزار [illegible] قبل سلطان کے کمرے میں گیا۔ سلطان بستر میں دبکا ہوا چائے پی رہا تھا۔ [illegible] کے چہرے پر تازگی تھی اور بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ رات اسے گہری چوٹ لگی ہے۔ بیٹھک میں بھی ہوئی تھی۔ بیٹھک کے ایک کونے میں آگ دہک رہی تھی اور سلطان اپنا پیر سینک رہا تھا۔ قبل نے اس سے رات کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی زیادہ دیر وہاں ٹھیرا۔ جب ہم اسے چھوڑ کے جانے لگے تو سلطان بے چینی سے بولا۔ "اب میں چل سکتا ہوں استاد!"

قبل نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کے اسے دیکھا اور ٹھیری [illegible] آواز میں بولا۔ "ایک دن اور آرام کر لے۔ تیسرے دن چلیے بھی مجھے کم [illegible] ئی تیتے ہیں۔"

سلطان بائیں بھینچ کانپنے لگا۔ "تم کیا... کیا؟..." وہ ہکلانے لگا۔

"ٹھیک ہی تو بول رہا ہوں سلطانے شاہ!"

"تم مجھ سے کچھ خفا لگتے ہو؟" وہ لنگڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"خفا تو تم سے کچھ ہو گیا ہے سائیں!" قبل سرد لہجے میں بولا۔

"مجھ کو بتاؤ۔" سلطان چیخ کر بولا لیکن پھر اس کی آواز خود بخود ماند پڑ گئی اور وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سلطانے کو غلط مت سمجھنا استاد!"

قبل کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور بند ہو گئے۔ وہ صرف سر ہلا کے رہ گیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ جاموس اور ماری حیرت سے ان دونوں کو تک رہے تھے۔ جاموس میں رک گیا۔ دروازے سے گزرتے ہوئے قبل مڑ کے بولا۔ "جاموسا! سلطانے نے استاد کے دل میں کچھ کچھ چیزیں بڑھی ہوئی لگتی ہیں۔ ہو سکے تو ان کو چھانٹ دے۔ استاد کو شاید پھر رنگ دکھائی دینے لگے۔"

"استاد... قبل بھائی!" سلطان بد دلی انداز میں بولا۔

قبل اس کے کمرے سے چلا آیا اور مجھے باہر آکے معلوم ہوا کہ اس نے سامان کے لیے خادم کو قلی بلانے بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج پھر قبل کا بازار لگانے کا ارادہ ہے۔ بازار سے واپس آتے آتے دوپہر ہو جائے گی۔ چند گھنٹے تو وہاں گزارنا ہی پڑیں گے۔ اس نے صرف دو رنگ سامان اٹھوایا تھا۔ ہم قلیوں کے پیچھے چلنے لگے تو جاموس بھی اندر سے آگیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کے قبل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔ سارے راستے جاموس نظریں جھکائے چلتا رہا اور دلہن کی طرح بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ہم نے سامان نکالا تو دیکھتے دیکھتے بھیڑ جمع ہو گئی۔ قبل نے آج بھی کوئی رعایت نہیں کی۔ وہ بہ ظاہر چیزوں کے دام بتا رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں تیزی اور چمک نہیں تھی۔ کبھی دام اتنے الٹ پلٹ بتا دیتا کہ بعد میں تردید کرنی پڑتی۔ میں ان سے الگ تھلگ ایک گوشے میں اپنے آپ کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے نہ کسی گاہک سے بات کی، نہ سامان کو ہاتھ لگایا۔ تھوڑی سی چیزیں بکی ہوں گی کہ اس نے یکایک سامان پھر سے گٹھڑوں میں بھرنے کو کہا اور قلیوں کو اسے گھر پہنچانے کی ہدایت کی۔ میری رگوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اب ضرور قبل کا اوپر جانے کا ارادہ ہوگا۔ اوپر یا جہان موجود ہیں مگر کیسے؟ میں جتنا سوچتا اتنا ہی میرے دماغ میں اندھیرا ہونے لگتا۔ آج ہم میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ آج کا دن بھی کل کی طرح تھا لیکن قبل کے اچانک اٹھ جانے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی بات ضرور آئی ہے۔

آج چھٹا دن تھا۔ چیڑ، زدہ راستے گئے، مشی میاں، بلیٹو ملا کر جسٹی اور وزیر میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ ان سب کو ایک ساتھ ہی آنا تھا۔ قبل نے ان سے اپنے جانے کے چار روز بعد بستی کا رخ کرنے کو کہا تھا۔ وہ بستی سے زیادہ دور نہیں تھے مگر وہ جگہ جانگ قبیلے کی حدود میں نہیں آتی تھی جہاں ہم ان سے جدا ہوئے تھے۔ وہ اگر راستہ گھوم کے نہ آتے تو زیادہ سے زیادہ دو پہر لگتے۔ کوئی ایسی ہی بات ہو گئی ہوگی۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی۔ ادھر جنگل بیابان تھا۔ قریب کوئی بستی بھی نہیں تھی۔ ہم نے جان بوجھ کے ان کے پڑاؤ کے لیے ایک سنسان جگہ منتخب کی تھی۔

یہاں آنے کے بعد ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ یہاں سے کوئی جا کے ان کی خبر لے سکتا تھا اور نہ وہاں سے کوئی آکے ہمیں ان کے نہ آنے کا سبب بتا سکتا تھا۔ ایک دن کی دیر ہو سکتی تھی مگر اب دو دن گزر گئے تھے۔ انھیں خود جلد سے جلد ہم تک پہنچنے کی فکر ہوگی کہ کہیں قبیلے میں ہم کو کوئی افتاد نہ پڑ گئی ہو۔ انھیں اس حقیقت کا بخوبی احساس ہوگا کہ بستی میں ہمارا قیام بستی کے باشندوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم اپنے قیام کو طول دینے کا کوئی نہ کوئی معقول عذر انھیں ضرور پیش کریں گے لیکن اسے قبول کرنے نہ کرنے کا سارا دارومدار قبیلے کے لوگوں اور اس کے سردار پر ہے اور انھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں قبیلے میں جا کے فی الفور ہمارا اس سے سامنا پڑ سکتا ہے۔ قبل نے سامان بچا بچا کے رکھا تھا تاہم قبیلے کے لوگوں کے خیال میں یہاں ہمارا قیام تجارتی اعتبار سے سودمند ثابت نہیں ہو رہا تھا تو ہمیں جلد ہی آگے کہیں اور چلے جانا چاہیے تھا۔ ورنہ ہم بھی اب نہیں تھا کہ آگے سفر کرنا ممکن ہو۔

چیڑ کے دانے سے اب تک اس کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ تم وقفے وقفے سے یکے بعد دیگرے دو تجارتی قافلوں کی آمد کو قبیلے کے لوگ اتفاق سمجھنے میں اکراہ کرتے۔ گو ہماری پوری کوشش ہوتی کہ ہم یہ اکراہ دور کریں۔ جدا ہونے سے پہلے بستی میں دوبارہ ملنے کے متعلق ہمارے سامنے قبل نے چیڑ سے بات صاف کر لی تھی۔ اس وقت کچھ لوگوں کو دور دور کے دینا ہی مناسب تھا۔ ایک ساتھ اتنے لوگوں کا بستی میں داخل ہونا موجودہ صورت کے مقابلے میں کسی طرح بھی بہتر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ہم آگے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگوں کو پیچھے آنے کے لیے آتی رہنا اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے آگے چند لوگوں کا جستجو کرنا ہی ٹھیک تھا۔ جانگ قبیلے کی مختلف بستیوں میں چار دیواریاں کھنچی ہوئی نہیں تھیں۔ کوئی بھی شخص یہاں آجا سکتا تھا۔ چنانچہ بستی کے کہیں پہلے پہنچنے والے اجنبیوں سے فوراً ہی کوئی عداوت نہ رکھتے۔ انھیں ان کی آمد کا مقصد پہچاننے میں کچھ وقت ضرور لگتا کہ اتنی دیر میں دوسرے لوگ پہنچ جاتے۔

آخری منزلوں میں ہم نے قبل ہی ایسے منتخب کیے تھے جو آگے جانے کے بجائے پیچھے واپس ہو جائیں۔ چیڑ پیچھے سے الگ ہو کے جانگ قبیلے میں داخل ہونے سے پیشتر ہم نے ایک اور منزل پر پڑاؤ کیا تھا اور وہاں بھی قبل بول دیے تھے۔ ہمارے سفر [illegible] پہلے آئے تھے کہ ہم دو قافلے ہیں، دونوں کی منزلیں مختلف ہیں۔ جبکہ منزلیں یکساں ہیں۔ [illegible] دونوں ایک ساتھ ہیں اور پہنچ کے آجانے کے بعد ہم قبل کے قبیلے والوں سے یہ اعتراف کر سکتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ہم نے سفر کا ایک حصہ ساتھ کاٹا ہے۔ [illegible] میں انھیں کسی ذریعے سے ہمارے سفری رفاقت کے سلسلے میں [illegible] مل جاتی تو ہمیں ہی شناسائی کے اس اعتراف کے باعث انھیں کوئی [illegible] ان کے لیے انکشاف کی نہ ہوتی اور چیڑ بستی میں آکے انھیں یہ کہہ کر [illegible] کر سکتا تھا کہ اس کا بیشتر سامان دوسری بستیوں میں ہی بارات ہو چکا ہے۔ [illegible] اسی کے لیے اس نے جانگ قبیلے میں اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا ہے [illegible] نہیں کا اس نے دوسری بستیوں میں بہت شہرہ سنا تھا اور اسے معلوم تھا کہ ایک اور قافلہ بھی ادھر سامان لے کے گیا ہے۔ یہ خبر نہیں تھا کہ قبیلے میں سب سے پہلے ان کی مڈ بھیڑ کس سے ہو اور نہیں یہ بتانے کا موقع مل جائے کہ وہ کس قسم کی بات کریں۔ قبیلے والوں کے سامنے ہمارا ان کے روبرو ہونے پر چیڑ کا رد عمل قبل کے طریقے سے مشروط تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کس حد تک واقفیت کا اظہار کریں، یہ جانچنے کے لیے چیڑ کو چند ہی لمحوں کی مہلت درکار ہوتی۔

انھیں ہر صورت اب آجانا چاہیے تھا۔ چلتے چلتے ماری اور جاموس کی نظریں اپنے ارد گرد پہاڑیوں پر منڈلانے لگتی تھیں۔ ایک دن پہلے ہمارے پیچھے بستی میں اچانک شور اٹھا تھا۔ سب [illegible] گھبرا کر وہ آگے میں لیکن پتہ چلا کہ ایک برفانی ریچھ بستی میں گھس آیا ہے اور کہیں چھپ کے بیٹھ گیا ہے۔ بستی والے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اندیشہ ہے کہ وہ قبیلے کی کسی عورت یا بچے کو پکڑ کے نہ لے جائے۔ سارا وقت بیت رہا تھا۔ طرح طرح کے وہم آرہے تھے۔ مشی میاں کی حالت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وزیر بھی کئی بار بیمار پڑ چکا تھا۔ وہ راستہ بھی بھٹک سکتے تھے۔ ممکن ہے انھیں کوئی دیر لگ گئی ہو۔ ان کے ساتھ تھوڑی تعداد میں سامان تھا۔ قبائلی قزاق بھی ان کے آڑے آسکتے ہیں۔ کچھ بھی ممکن تھا۔

ابھی ہم بستی میں تھے کہ راستے میں قبل نے ایک بوڑھے آدمی کو روک کے چن وسا کے متعلق دریافت کیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ چن وسا سردار کے مکان کے قریب ایک عمارت سے برآمد ہوتے ہوئے ہمیں مل گیا۔ سرکا ملم نے قبل کی ترجمانی کی۔ قبل نے کہا تھا کہ وہ اپنے معزز مہمان کی وساطت سے قبیلے کے سردار سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ سن کے چن وسا کچھ متذبذب سا ہو گیا اور کوئی جواب دیے بغیر عمارت کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر ہی ٹھیرے رہے۔ چن وسا واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ ایک معمر شخص بھی اس کے ہمراہ تھا۔ دونوں نے جواب طلب نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن کوئی سوال نہیں کیا اور کسی قدر تیز رفتاری سے ایک سمت چل پڑے۔

جتنا ہم آگے بڑھتے گئے، جنگ زندگی کشادہ ہوتی گئی۔ اونچائی کا ایک مختصر فاصلہ عبور کرنے کے بعد ہم سردار کے مکان کے سامنے موجود تھے۔ پہلے دن جب ہم سردار سے ملے تھے اور نوواردوں کی روایت کے مطابق ہم نے اُسے تحائف پیش کیے تھے تو وہ جگہ اور تھی۔ کچھ پیچھے اسی قطار کے نزدیک۔ یہاں وہ خود رہتا تھا۔ پتھر کی اونچی اونچی دیواریں ایک بڑے رقبے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ باہر دروازے پر کوئی خاص پہرا نہیں تھا۔ اس پاس اور بھی کئی لوگ اُدھر سے گزرتے ہوئے ہمیں نظر آئے ہم قبیلہ تھا چار دیواری کے باہر انتظار کرتے رہے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر میں ایک مستعد نوجوان بلند دروازے پر ظاہر ہوا۔ اس کے حکم پر پہرے دار ایک طرف ہو گئے۔ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے میرے پیر ڈگمگانے لگے۔

سامنے کوئی سو گز کی دوری پر چھوٹی بڑی کئی عمارتوں کے بیچ ایک بلند و بالا دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ سب سے پہلے اسی پر نظر جاتی تھی کیونکہ وہی ان میں سب سے نمایاں تھی اور کسی قدیم چینی محل کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈھلواں چھت اوپر ہی منزل پر ان گنت دروازے نیچے سے پھیلی ہوئی اوپر جاتے جاتے ایک گول دائرے میں منتہی ہو گئی تھی۔ ان گنت قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ باغیچے میں بھی مختلف رنگوں کے پتھر کی لاٹیں ایستادہ تھیں۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ پیچے گھنے درخت تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اندر دروازے کے پاس ہی ایک اونچی پہاڑی پر چشمہ پھوٹ رہا تھا اور اس کے گرتے ہوئے پانی پر کسی آبشار کا گمان ہوتا تھا کبھی یہ کوزا کا گھر تھا۔ اس دروازے سے گزر کے وہ بستی میں جاتی ہوگی۔ اس جگہ کے چپے چپے نے اُسے دیکھا ہوگا اور چپے چپے پر اس کے قدموں کے نقش ثبت ہوں گے۔ یہیں کوزا کے گھر میں تھا۔ جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی اور سارا بچپن لڑکپن گزارا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں کبھی کوزا مل گئی تو میں اُسے بتاؤں گا کہ میں وہ نگ بستی کی سب سے اونچی پہاڑی پر واقع اس کے گھر گیا تھا تو اُسے یقین نہیں آئے گا۔ میں بھول ہی سے کیا تھا کہ ثبوت کے لیے یہاں کی کچھ مٹی جیب میں رکھ لوں گا۔ کہتے ہیں مٹی میں خوشبو ہوتی ہے۔ کوزا یہ خوشبو پہچان لے گی۔ وہ بہت حیرت زدہ ہوگی اور تب اُسے یقین آ جائے گا کہ میں کہاں کہاں گیا۔ کاش وہ اندر ہی موجود ہوتی۔ مجھے یہاں دیکھتی تو اُسے سکتہ سا ہو جاتا۔ سمجھتی کہ خواب دیکھ رہی ہے۔ آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیسے طلوع ہو گیا۔

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ جیسے میں چلتے چلتے سو گیا تھا۔ تجمل نے ٹہوکا مار کے مجھے چونکا دیا۔ ہم بڑی عمارت کے بیرونی ستونوں سے گزر رہے تھے۔ چین وسا اور اس کا ساتھی ہمیں عمارت کے باہر کھڑے ہمیں ملے۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ اُن سب کی معیت میں ہم عمارت میں داخل ہوئے۔ اندر سے عمارت خاصی سجی ہوئی تھی مگر کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کے وسط میں دیوار سے لگے ہوئے تخت پر قبیلے کا سرخ جسم اور درمیانے قد کا سردار اٹھی کو بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ شہابی تھا۔ مونچھوں اور سر کے بالوں کا رنگ بھورا۔ دانت چھوٹے چھوٹے۔ پیشانی چوڑی۔ سینہ اُبھرا ہوا اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ ہم پانچوں نے قبیلے کی رسم کے مطابق اُسے تعظیم دی اور جب تک اس نے بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، کھڑے رہے۔ سردار کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی جگنو کے مانند چمک رہی تھیں۔ تجمل نے آگے بڑھ کر دستے کا ایک قیمتی خنجر پیش کیا۔ سردار نے اُسے تین چار بار اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ثانیے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر وہ پہلو بدل کے ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی اس کا چہرہ اس کے اندرونی اضطراب کی صاف غمازی کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد ہماری زبان سے کچھ سننے کے لیے بے تاب تھا۔ تجمل نے کچھ کہنے سے پہلے وہاں موجود دوسرے لوگوں کی طرف متردد انداز میں نگاہ ڈالی۔ سردار فوراً سمجھ گیا اور اس نے اُن سب کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔ چین وسا بھی چلا گیا مگر تخت کے پاس کھڑا ہوا ایک شخص موجود رہا۔

"معزز سردار سے بڑھ کر ادھر قبیلے میں ہم اس کی خاطر داری سے بہت خوش ہیں۔" تجمل کی بھاری آواز گونجی۔ "اور بولو کہ اپنے پاس اس کا بدل دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

ہوما نے تجمل کی کہی ہوئی بات تبتی زبان میں سردار سے بیان کی۔ سردار نے سر ہلایا اور خاموش رہا۔

"بولو کہ ہم کو رات چین وسا کی زبانی ساری بات کا پتہ چلا ہے۔ ابھی ہم اس بارے میں قبیلے یا سردار کے لیے کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ تو ہم کو بولو اور ہم پر بھروسا کرو۔ ذرا ٹھیک ٹھیک بولو۔"

ہم سب چونک پڑے۔ سردار بھی اپنی نشست پر جما نہ رہ سکا اور متحیر نظروں سے تجمل کو گھورنے لگا۔ "مگر تم لوگ کیا کر سکتے ہو؟" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"ہم لوگ سوداگر ہیں۔ سودا کرتے پھرتے ہیں۔ چین وسا نے بولا ہے کہ ادھر قبیلے کے لوگ بہت دنوں سے پریشان ہیں۔ اگر کاغذات قبیلے کو مل گئے تو قبیلہ اپنا سب کچھ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اور اپنے سے الگ کر سکتا ہے، حوالے کر دے گا۔ ایسا ہے کہ نہیں ہے؟"

"ایسا ہی ہے۔" سردار کی آواز لپکنے لگی۔ "کیا تم..... تم اس سلسلے میں کچھ جانتے ہو؟"

"سودا اچھا ہے تو ایک بازی ہم بھی کھیلیں گے۔"

"کیا تم کچھ جانتے ہو؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں مگر جب جاننے کا جتن کریں گے تو جان بھی لیں گے۔" تجمل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

سردار کی چمکتی ہوئی آنکھیں بجھ گئیں۔ "بہت دن ہو گئے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"ہم کو پتہ ہے دن بہت ہو گئے ہیں۔" تجمل اونچی آواز میں بولا۔ "پر تم لوگوں نے دن بیت جانے سے اُمید نہیں کھو دی ہے۔"

"قبیلے کا آخری آدمی اپنی آخری سانس تک انھیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔" سردار نے جوش میں کہا۔

"تو پھر اب ہم کو بھی اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ہم کو ساری بات بول دو۔ کاغذات کدھر رکھے تھے؟ لڑکی کیسی اور کس عمر کی تھی؟ اس کا رنگ روپ....."

"وہ ہندوستان ہی ہے۔" سردار تیزی سے بولا۔ "اور ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ قبیلے کے ہزاروں آدمی نو سال سے اُسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم کہاں کہاں جاؤ گے۔ تم ہر گھر میں گھس کے اُسے نہیں دیکھ سکتے۔"

"کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پر ہم ہندوستانی لوگ ہیں تمہارے مقابلے میں ہم اُدھر زیادہ کھوج کر سکتے ہیں اور کام کے لیے بہت سے آدمی اکٹھے کر سکتے ہیں۔ منظور ہو تو بولو۔"

"منظور!" سردار تلخی سے بولا۔ "قبیلے میں کس کو یہ نامنظور ہو سکتا ہے۔"

"پھر بولو کہ ہم رات چین وسا سے ہم نے سنا تھا۔ تم سمجھیں وہ ٹھیک ہے۔ ہماری ایک شرط اور بھی ہے کہ کامیاب واپسی پر سارا قبیلہ سودا کے لیے صرف ہمارا اور ہمارے بھیجے ہوئے قافلے کو راہ داری دے گا کسی اور کو نہیں۔"

"سب ہم کو منظور ہے۔" سردار کے لہجے میں اکتاہٹ آ گئی۔

"ایسا مت بولو سردار! بولنے سے پہلے سوچ لو۔"

"پہلے کاغذات لے آؤ، پھر بات پکی کرو۔"

"پہلے بات پکی کرو۔" تجمل نے زور دے کر کہا۔

سردار اچھل کے تخت سے اُتر آیا اور سیدھا تجمل کے پاس گیا۔ تجمل بیٹھا رہا۔ سردار چند لمحوں تک خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس کے پاس سے ہٹ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور اچانک تجمل کے درشتی سے بولا۔ "تم قبیلے کے سردار کے سامنے ہو۔"

"ہم جانتے ہیں۔" تجمل نے تھمی ہوئی آواز میں کہا۔ "پر سردار ایک ضرورت مند ہے اور ہم سوداگر۔ یہ سودا عام سودا نہیں الگ قسم کا ہے۔ چیزوں کا نہیں جان کا ہے۔ ہم سے اس معاملے پر بات کرنا ہے تو ایک سردار کی طرح نہیں دکان دار اور گاہک کی طرح بات کرو۔ دیکھو ہم تمہاری جگہ میں ہیں۔ ہم کو اس کی پوری جانکاری ہے۔"

"تم آگے بات کرو۔" وہ تلملا کے بولا۔ "ابھی تمہاری سرداری کی مدت کتنی رہ جاتی ہے؟"

"سات مہینے۔" اس نے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت ہے۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔ "شاید ہم کو اتنا ٹائم نہیں لگے۔ ہم کو چار مہینے کا ٹائم بہت ہوگا۔"

"چار مہینے... کیسے چار مہینے؟"

"چار مہینے میں ہم یا تو تمہاری امانت تم کو لا دیں گے یا پھر کبھی لوٹ کے نہیں آویں گے۔"

"مگر تم..... تم اتنے اعتماد سے کیسے کہہ رہے ہو؟" سردار کی آواز میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم بس میرے پر اعتبار کرو۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو سردار!" تجمل اپنی نشست سے اُٹھ کے اس کے تخت کے قریب آ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "ہم زیادہ بات نہیں کرتے۔ تم پرانے ہو۔ نو سال سے برباد ہو گئے ہیں۔ تم نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا ہے۔ تم کیا ملا؟ جو اب ہم کو کچھ نہیں ملا تو تم کو کوئی گھاٹا نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارا اتنا بڑا گھاٹا نہیں ہے جتنا اپنا ہے۔ خوار ہم ہوں گے۔ تم ادھر ہی رہو گے۔ پر کام شروع کرنے سے پہلے ہم کو تم سے ہر بات صاف کر دینا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمیں ہماری چیز مل جائے۔ جو چین وسا نے تم سے کہا ہے، سب درست ہے۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں۔"

"ہم تمہارے وعدے پر بھروسا کرتے ہیں۔ پکا قصد ہم کو مل گئے تو ہم اپنی جگہ اُن کو تمہارے حوالے کریں گے اور تم ہماری چیز ہمارے حوالے کرنا۔"

"تم جہاں بھی کہو۔" سردار کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "ہمارا وعدہ ہے۔"

"ایک بات اور جن لوگ تم بولتے ہو، کاغذ دوسرے سکے کے بے کار ہیں۔ پر ایسا نہیں ہوگا۔ ان کی اور لوگوں کو بھی ضرورت ہو گی جن پر کی تو پہلی جا سکتی ہے۔ آگے لاماؤں کو بھی ان کی قدر معلوم ہو گی۔ ہم نے تم کو زبان دی ہے۔ چار مہینے تک تم ہم سے کچھ نہیں پوچھو گے۔ ہم اِدھر ہیں یا نہیں اور ہم اپنے کچھ آدمی بھی اِدھر چھوڑتے ہیں جو پیچھے بستی یا اور پرندوں کے علاقے میں آنے جانے والوں کی خبر رکھ سکتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم اِدھر تمہارے آدمیوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔ پر یہ سب بعد کی بات ہے۔ ہم نے یا تمہارے قبیلے کے کسی آدمی نے ہمارے درمیان دخل دینے کی کوشش کی تو تم کبھی کچھ نہیں پاؤ گے۔ ہم

کوہ تے وقت اکیلے جانا نہیں بتایا گیا۔ کوئی بُری بات ہوئی تو پچھتانا تمھارا کام ہوگا۔ اپنا نہیں ہم کو ادھر تمھاری جگہ پر آنا نہیں جانا ہے اور ہمارا تمھارا کوئی بُرا ارادہ بھی نہیں ہے اور نہ ہم سے کوئی ہوشیاری کرو نگہبانے ہیں جیسے ہیں جانے ہو سردار! اچھی طرح سوچ لو۔ ابھی ہم ادھر تمھارے مہمان ہیں۔"

"تمھاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم ضرور کچھ جانتے ہو؟"

"ہم نے بول دیا ہے، ابھی ہم نہیں جانتے۔ پر اگر جانتے بھی تو جب تک ہم نہ چاہتے تم کچھ نہیں جان سکتے تھے۔ اتنی باتیں بولنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سے کچھ اُلٹ نہ ہو جائے۔"

سردار کے جسم کا تمام خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے یوں اچھلنے لگا تھا جیسے اس کے کپڑوں میں کوئی بچھو گھس گیا ہے۔ سولم نے یکساں اور رواں زبان میں جبل کی تمام باتیں آگے نقل کی تھیں۔ جبل کے چُپ ہو جانے پر سردار گردن جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتا رہا۔ ہم سب اپنی جگہوں پر ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار اٹھی نگاہ کو سوچنے کا نام دو۔ جبل نے سولم سے کہا "اس کا مطلب ابھی عقل نہیں ہوا تھا کہ یک لخت سردار تخت سے اٹھ کر دوبارہ جبل کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورنے لگا۔ اس کا سر جبل کے کندھے تک آ رہا تھا۔ جبل کی پلکوں میں جنبش نہیں ہوئی مگر اس کی آنکھیں سردار کی آنکھوں کی طرح سُرخ نہیں تھیں۔ تھکی اور بجھی ہوئی سی تھیں۔ یکایک سردار نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ جابر نے ادھر چاقو نکال لیا تھا۔ ادھر تخت کے پہلو میں کھڑے ہوئے سردار کے آدمی نے بھی خنجر تان لیا تھا۔ جبل کا جسم بے حرکت رہا۔ پھر سردار نے اپنے ہاتھ پھیلائے تو جبل کے ہاتھ بھی پھیل گئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ زور سے پکڑ لیے۔

"تمھارے تالے تھیلے میں مجھ کو سب سے اچھے لگتے ہیں۔"

سردار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہوگا کیونکہ سولم خاموش کھڑا عجز بھری نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سردار کے پلٹتے ہی اس کا آدمی بھاگتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب ہم سردار کے مکان سے باہر آئے تو دھوپ اُتر رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سردار کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس کے حکم پر کمرے میں کئی خادم اور خادمائیں جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہمارے آگے چاول بستی میں بنی ہوئی مٹھائیوں اور سردار کے لیے خاص طور پر پکائے ہوئے کھانوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ چین سے آئی ہوئی خوشبودار چائے سب سے خوش ذائقہ تھی۔ ہم نے ایسی چائے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ مسلسل وہی پیتے رہے۔ جبل اور سولم وہیں رہ گئے تھے۔ میں، مارٹی اور جابو انھیں وہاں چھوڑ کے اُٹھنا نہیں چاہتے تھے مگر خود جبل ہی نے ہمیں باہر جانے کو کہہ دیا تھا۔ ادھر اُدھر بے کار گھومتے اور گھر جانے کے بجائے ہم وہیں ایک پہاڑی پر بیٹھ کے ان کا انتظار کرتے رہے۔ آج کا دن بھی گزر جا رہا تھا۔ اب اوپر مندروں کے علاقے میں جانے اور اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ دھوپ پہاڑوں پر چڑھ رہی تھی۔ ہم تینوں کی نگاہیں سردار کے مکان کے اونچے دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور شاید ہم ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ اگر جبل اور سولم کچھ دیر اور نہ آئے تو...... لیکن سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر ایک ساتھ کئی آدمی باہر نکلتے دکھائی دیے۔ ان میں وہ دونوں بھی تھے، جین ڈوسا اور قبیلے کے کئی لوگوں کے درمیان۔ ہم نے تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی طرف جانے والے راستے پر انھیں جا لیا اور جبل کا چہرہ دیکھ کے ہماری بھولی ہوئی سانسیں ٹھیرنے لگیں۔

بستی کے مرکزی مقام پر باقی تمام لوگ منتشر ہو گئے۔ صرف جین ڈوسا ہمارے ساتھ دو گھڑی رکے، راستے میں نہ جانے کیوں جبل بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ اُسے بھی دن نکل جانے کا احساس ہوگا۔ مجھے معلوم تھا، اب ہم اوپر کہاں جا سکتے ہیں۔ دروازہ جین ڈوسا کی لڑکی تشا نمو نے کھولا مگر ہمیں مقابل دیکھ کے اس کا سراپا کانپ سا گیا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ میں ہٹ گئی تھی کہ جبل نے جھپٹ ہاتھ بڑھا کے اُسے اپنے بازو میں گھسیٹ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کے، اُسے بوسہ دیا۔ وہ اور سکڑ گئی۔ جین ڈوسا مسکرانے لگا اور اپنی زبان میں پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔ "ہم کو پہچانتی ہے رانی؟" جبل اس کا سر تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔ سولم نے فوراً ترجمہ کر دیا۔ تشا نمو نے ایک پل کے لیے بھی اپنی تھرتھراتی پلکیں نہیں اٹھائیں۔ اس کے نتھنے بُری طرح پھڑک رہے تھے اور رخساروں کا سُرخ رنگ جبل ملانے سا لگا تھا۔ جبل سے ہاتھ چھڑا کے وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی نہ جانے کہیں اوجھل ہو گئی۔ "بالکل بولتی گڑیا ہے، بغیر چابی کی۔" جبل نے ہنس کے کہا اور مارٹی کی گردن پکڑ کے جھٹکے دینے لگا جو مبہوت سا کھڑا تھا۔ ہم سب پیدا سے سلطان کے کمرے میں آ گئے۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر آرام کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ جبل نے تین چار بار اس کا سر جھنجھوڑا اور مروڑ کے دیکھا۔ اب اُسے کوئی خاص تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اس کے چہرے پر تو بجے ہوئے تھے۔ جیسے دن بھر روتا رہا ہو۔ وہ گردن ڈالے ہوئے ہماری باتوں پر جبل کو جواب دیتا رہا۔ جبل اس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا ہوگا کہ باہر آ کر مارٹی کو اپنے واپس آنے تک گھر میں رہنے کی ہدایت کر کے پھر سائبان میں آ گیا اور جین ڈوسا کو بلا کے اس نے مندروں کے علاقے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں سمجھا کہ جبل جین ڈوسا کی ڈوریں لینے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

شام ہو رہی تھی اور اندھیرا گیا تھا۔ جین ڈوسا نے ہمیں بے وقت روانہ ہو جانے کا عذر کر کے روکنے کی کوشش کی لیکن جبل اس کی بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ سولم کو بھی اس نے ساتھ رکھا تھا۔

اوپر جانے کے خیال سے میرا دل ایک دم دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ میں نے سوچا، جبل کو منع کر دوں۔ مجھ سے آباجان کے سامنے نہیں جایا جائے گا۔ میں تو ان کے سامنے کھڑا بھی نہ رہ سکوں گا۔ میں اُن سے کیا کہوں گا۔ میری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلے گا اور انھوں نے اگر کچھ کہا تو مجھ سے سُنا نہیں جائے گا۔ مجھے اُن کی آنکھوں سے شروع ہی سے ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے میں کراچی کے گھر سے نکل گیا تھا۔ میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ وہاں رہے گی تو مجھے اور اسے ہر وقت اُن کی نگاہوں کو سہنا کرنا پڑے گا اور اگر اُن کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی؟ وہ کچھ خیال ہی نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں آتا تھا، فوراً کہہ دیتے تھے اور انھوں نے ذکر بھی کیا تھا۔ اگر میں جلدی نکل آتا اور تین چار دن گھر میں اور رک جاتا تو اُن کی خوشامد کر لیتا کہ وہ کورا کو پولیس کے حوالے نہ کریں تو ممکن تھا۔ اس دوران وہ کورا کے لانے کے کاغذات پر نظر ڈال لیتے اور شاید کورا سے اُن کا رویہ بدل جاتا۔ وہ اُسے محفوظ کر کے رکھتے مگر پھر وہ اس سے جلد سے جلد چھٹکارا بھی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے تھے کیونکہ کورا کا گھر میں ہونا ایک مسلسل خطرہ تھا۔ میں نے ٹھیک ہی کیا تھا، میرے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ میں اُسے لے کے دُور نکل جاؤں۔ میرے سینے میں شور سا ہو رہا تھا۔ ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ جبل اوپر بڑھتا رہا۔ ہم تینوں میں کہیں نیند کے تھے مگر آرام حرارت سے کیا ہوگا کہ لوٹنا بھاری ہونے لگی اور پھر ہر طرف وہی اندھیرا چھانے لگا جس سے مجھے بہت وحشت ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی پہاڑوں پر ہُو کا عالم طاری ہو جاتا جیسے دنیا میں سب مر گئے ہوں اور پہاڑ اُن کے سوگ میں خاموش کھڑے ہوں۔ کچھ دیر تک اندھیرا سرمئی سرمئی سا رہا۔ پگ ڈنڈیاں نظر آتی تھیں۔ اوپر پہنچتے پہنچتے ہر سُو دھند پھیل ہوئی تھی۔ اور کہیں دیے جیسا چاند بھی چھپا ہوا تھا۔ ہوا تیز نہیں تھی اور دھند بھی ابھی بہت کم تھی۔ ہماری آنکھوں میں اتنا اندھیرا نہیں تھا اور جبل نے ٹارچ بھی روشن کر دی تھی۔ ایک دوسرے کو پکڑتے ہوئے ہم سنبھل سنبھل کے قدم اور پھسلواں زمین پر بہت رکھ رہے تھے۔ جانے پیچھے کسی کی چاپ نہیں تھی۔ نیچے دُور ہی سے مندروں کے علاقے میں جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ دھند کا حصار بہت کم رہ گیا ہے لیکن پیر تلے گُھٹنوں کا دھنسنا ثابت ہوتا تھا۔ بارش تیز ہو جاتی تو ہمارے کپڑے بھیگ جاتے۔ یہاں کوئی سایہ بھی نہیں تھا۔ بستی اور مندروں کے درمیان ایک بڑا علاقہ تھا، اس لیے خالی رکھا گیا تھا کہ مندر تک پہنچ سکیں راہیں۔ اوپر جانے کے لیے کہیں کہیں پہاڑوں پر سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنی ٹارچ نہیں چھوڑی اور اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد مندروں کے علاقے میں پہنچ گئے اور بارش بھی تھم چکی تھی۔

تمام چھوٹے اور بڑے مندروں میں مشعلیں روشن تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے گوتم بدھ کی دیو قامت مورتی کے سامنے ایک بڑا الاؤ دہک رہا تھا اور مختلف تعداد میں راہب گوتم بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی عمارت کے اندر بھی دھیمی روشنی ہو رہی تھی اور راہداری میں راہبوں کی چہل پہل تھی۔ گزرتے ہوئے چند ہی راہبوں نے پلٹ کے ہمیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کپڑے خاصے بھیگ گئے تھے۔ ٹھنڈ سے جسم کانپ رہے تھے۔ سولم تو دانت کٹکٹا رہا تھا اس لیے ہم مورتی کے سامنے راہبوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ آگ کی تپش سے جسم کو کسی قدر حرارت محسوس ہوئی مگر میرے ہاتھ پیروں کی کپکپی دور نہیں ہوئی۔ ہم کن انکھیوں سے وہاں موجود راہبوں کے چہرے غور سے دیکھتے رہے۔ ان میں آباجان نہیں تھے۔ آباجان ہمیں اور کسی مندر میں بھی نظر نہیں آئے۔ مندروں میں کسی نے ہماری موجودگی پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ جس وقت ہم بڑے مندر کی سیڑھیاں طے کر کے وہیں ایک چوڑی جگہ پر بیٹھے تو کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت تھی۔ بڑے بڑے ہالوں اور کمروں کے اطراف چوڑے اور لمبے ستونوں پر ٹکی ہوئی راہداری تھی۔ اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ایسی ہی تنگ اور کشادہ گلیاں تھیں۔ مشعلیں ہر کونے پر نصب تھیں لیکن روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کھانا تقسیم کرتے ہوئے پجاری جب ہماری جانب آئے تو ہم سے پوچھے بغیر ایک نے ہمارے آگے مٹی کا پیالہ رکھ دیا، دوسرے نے اس میں پتلی دال اور سبزی کا ایک ایک چمچہ ڈال دیا، تیسرے نے مرغی کی رانیں چپاتی پر رکھ دیں۔ راہداری میں ہر طرف راہب قطار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں تک ہماری نظر پڑتی تھی، آباجان نہیں تھے۔ جبل اور سولم نے سبزی کے کھانا کھایا، بڑے حلق سے ایک لقمہ بھی نہیں اُترا تھا۔ کھانے کے بعد راہب منتشر ہونے لگے۔ ہم نے عمارت کے گرد پوری راہداری کا چکر لگا کے دیکھ لیا لیکن مندروں میں رہنے والے تمام راہب صرف یہیں نہیں تھے اور بھی عمارتیں فاصلے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ ہم یہاں آنے سے پہلے ہی دیکھتے آئے تھے۔ ہمارا یوں ہر عمارت میں رکنا اور کچھ دیر ٹھیر کے واپس آ جانا مناسب نہیں تھا پھر بھی ہم مختلف مندروں میں جاتے رہے۔ باہر کھلی ہوئی جگہوں پر الاؤ دہکا کر راہب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھیں سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں اُن کے خد و خال صاف نظر نہیں آتے تھے مگر اُن میں آباجان ہوتے تو ان کا وجود ہم محسوس کر

پان سکتے تھے اور وہ ایسی مشقت کے عادی نہیں ہوں گے۔ انھیں
ں آئے ہوئے وقت بھی زیادہ نہیں ہوا تھا یا شاید وہ عادی ہوں بھی
ں کہہ سکتا تھا کہ اتنے عرصے انھوں نے کہاں کہاں وقت گزارا ہے۔
چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ کئی عمارتوں میں اُن کا
ری نشان نہ ملا تو ہم دوبارہ بڑے مندر میں آ گئے۔ اب ایک ہی صورت
گئی تھی کہ راہبوں کے آشرم کا رخ کریں جہاں اَن گنت کٹیائیں بنی
وئی تھیں۔ ہم نے اب تک سرائے یا آشرم میں جانے سے اسی سبب
پہلو تہی کی تھی کہ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ راہبوں کی ایک بڑی
تعداد مندروں میں موجود تھی۔ بڑے مندر کی عمارت میں دبی دبی سرگوشیاں
گونج رہی تھیں اور اباجان کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ کہیں وہ چلے نہ گئے
ہوں۔ مجھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا حالانکہ یہ عجیب سی بات تھی۔ جس دن
ہم نے انھیں دیکھا تھا، انھیں اسی دن یا اس کے دوسرے ہی دن چلا
جانا ہو گا۔ اچھا ہے کہ وہ چلے ہی گئے ہوں۔ مجھے چاہیے وہ وطن
پھرے کہیں گم ہو جائیں مگر کسی طرح یہاں سے دُور ہو جائیں۔ میرا دل اُن
کے لیے ہی دعا کر رہا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔
خدا کرے وہ کامیاب ہی لوٹے ہوں ورنہ پھر زندہ نہیں رہیں گے۔
اتنے عرصے کوئی بھی اپنی اُمیدیں ناکام ہونے پر زندہ نہیں رہتا۔ ایک
میں ہی بے بس تھا۔

تجمل اور سولم ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ راہبوں سے مندر خالی
ہونے لگا۔ مشعلیں کم ہوتی گئیں اور ایک سوگوار سکوت عمارت کے
در و دیوار پر مسلط ہو گیا تو ہمیں روک کے تجمل خود عمارت میں گھومنے چلا
گیا۔ وہ چھپتا چھپاتا گیا تھا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ واپسی میں کسی
کی چال ہی سے مجھے اُس کی ناکامی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مندر میں چند راہب
رہ گئے تھے اور وہ سب کے سب مراقبوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کئی
پجاری ہمیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ کے جھجکتے ہوئے گزر گئے۔ اُن کا تعلق
یقیناً مندر کے انتظامات سے ہو گا۔ پھر ایک معمر پجاری نے آ کے نرم لہجے میں
ہم سے پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ ہمارے بجائے سولم نے
جواب دیا کہ ہم ایک رات گزارنا چاہتے ہیں۔ سردی سے اُس کی آواز ٹھٹھر
رہی تھی۔ پجاری نے ہم تینوں کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مشورہ دیا
کہ ہم سرائے چلے جائیں، وہاں ہم رات آرام سے گزار سکیں گے لیکن
تجمل سرائے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اباجان اپنی کٹیا سے
باہر ہوں۔ ہم کٹیا میں جا کے جھانک کے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تاہم
ہمیں مندر سے اٹھنا ہی پڑا۔ ویسے بھی ہم وہاں ساری رات گزارنے کا
کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ دھند بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اس سے ہمیں عمارتوں
کے درمیان آنے جانے میں آسانی ہو گئی کیونکہ نقل و حرکت چند گز کے فاصلے
ہی تک دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں سے وہاں اس جگہ سے اُس جگہ کا مسلسل

چلتے پھرنے میں رات کا بڑا حصہ بیت گیا تھا۔ سولم اور تجمل کی رفتار میں
پہلے جیسی تیزی نہیں رہی تھی۔ میری ٹانگیں تو پہلے ہی شل تھیں۔ ناچار
ہم سرائے میں آ گئے۔ یہاں جنگل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پتھروں کی کٹیاؤں کے
شیشے دروازے بند تھے۔ پہلے ہم دو رویہ کٹیاؤں کے درمیان ڈھکے چھپے
راستوں کے چکر لگاتے رہے۔ وہاں بھی اُن کی کوئی سُن گُن نہیں ملی تو سرائے
کے ایک وسیع و عریض ہال میں چلے آئے۔ سالانہ میلوں کے دوران اس
ہال میں گہما گہمی رہتی ہو گی اب ویران پڑا تھا۔ اندر کسی حد تک گرمی تھی
لیکن ابھی بھی یقین نہیں کہ ہم کسی طرح سے کمر ٹکا کے رات گزار دیں۔ بڑے
مندر کے پروہت نے کہا تھا کہ سرائے میں ہمیں بستر مل جائیں گے۔
یہاں کوئی شخص جاگتا ہوا نہیں تھا۔ کسی متعلق آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش
میں سولم کو ہال کے انتہائی گوشے میں ایک شخص سوتا ہوا مل گیا۔ سولم
کسی جھجک کے بغیر اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھا اور ہمیں دیکھ
کے گھبرا سا گیا۔ حواس بجا ہوتے ہی اُس نے ہال میں ایک جانب بنی
ہوئی کوٹھریوں کی طرف بد دماغی انداز میں اشارہ کیا۔ وہاں بستروں کا انبار
لگا ہوا تھا۔ اُس شخص نے ہمیں کھلی ہوئی کٹیاؤں میں چلنے کی صلاح
دی تھی مگر ہم ہال کے کنارے دروازے کے قریب بستر لگا کے لیٹ گئے۔

رات ہی جیسے سردی سے کانپ رہی تھی اور ٹھٹھرتی ہوئی بیت
رہی تھی۔ تجمل اپنا جسم سکیڑے لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہا تھا۔ سولم بھی
کروٹیں بدل رہا تھا۔ بستر سرد تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے جسم کی حرارت
سے گرم ہوتے اور ان میں سیلن کی ایک بو بھی بسی ہوئی تھی لیکن ہم کسی طور
اُنھیں اپنے جسم سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ہمارا بس
چلتا تو انھیں اپنے اندر جذب کر لیتے۔ مگر ہم ہال میں کچھ اندر بستر لگاتے
تو شاید اتنی ٹھنڈ محسوس نہ ہوتی۔ کنارے پر ہونے کی وجہ سے یخ بستہ ہوا
ہمارے گالوں پر طمانچے مارتی گزر رہی تھی۔ ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نیند
نہیں آئی۔

رات کا آخری حصہ ہو گا کہ ہم نے کسی کی آہٹ سُنی۔ سب سے پہلے
تجمل چونک کے اُٹھ بیٹھا۔ کھلے دروازے کے ستونوں میں ہمیں
کوئی سایہ سا رینگتا ہوا نظر آیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ دُور چلا جاتا اور دھند
میں اوجھل ہو جاتا، تجمل بستر سے اُچھل کے پنجوں کے بل بھاگنے لگا۔ میں
نے اور سولم نے بھی بستر چھوڑ دیے۔ قریب جا کے تجمل ٹھٹک کے رک
گیا۔ وہ کوئی راہب تھا۔ تمام جسم کمبل کے لبادے میں لپٹا ہوا، سر اور
منہ مفلر میں چھپے ہوئے۔ اُس نے بھی ہماری چاپ سُن لی تھی، رُک
کے ہماری طرف دیکھا۔ تجمل فوراً اُس کے آگے آ گیا اور اس سے پہلے
کہ راہب اُس سے کچھ پوچھتا، تجمل نے اُس کے منہ پر ہاتھ مار کے مفلر
نیچے کھینچ لیا اور بیٹری کی روشنی اُس کے چہرے پر پھینکی۔ میرے دل کی
حرکت بند ہونے لگی۔ وہ اباجان ہی تھے۔ روشنی سے اُن کی آنکھیں چندھیا

گئیں اور انھوں نے اپنا منہ پھیر کے ہذیانی انداز میں پوچھا: "کیا ہے؟"
انھوں نے تبتی زبان میں کہا تھا۔
"ذرا ہمارے ساتھ آؤ بڑے صاحب!" تجمل نے بیٹری بجھا کے
سرگوشی کی۔
اباجان نے پھر تبتی زبان میں سراسیمگی سے کچھ کہا۔
"بڑے صاحب! ہم کو پتہ ہے آپ ہندوستانی سمجھتے ہو۔ جیسا
میں بول رہا ہوں ویسا ہی کرو۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔ "ہم کو آپ سے
کچھ بات کرنا ہے۔"
"میں۔۔۔ میں ہندوستانی سمجھتا ہوں۔" اباجان نے لرزتے لہجے
میں کہا۔ "مگر آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"
"کچھ کام ہے۔ پر یہ جگہ بولنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"
"آپ کون لوگ ہیں؟"
"اپنے ہی ہیں۔ میں بولتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں بڑے صاحب!"
"مگر آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"آپ کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔"
"کیسا بھلا! میں۔۔۔ میں ایک۔"
"اِدھر نہیں بڑے صاحب!" تجمل نے تحمل سے کہا۔
"پھر کہاں؟" اباجان نے کسی قدر ناگواری سے پوچھا۔
"جہاں آپ اچھا سمجھو۔ کسی کٹیا میں چلو۔"
اباجان کی آواز دبی دبی تھی گو وہ سرگوشی میں بات کر رہے تھے
لیکن ان کے لہجے میں وہی بھاری بھرکم پن تھا، وہی گونج تھی۔ مجھے
بہت ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تجمل کی زبان سے کچھ نکل نہ جائے۔ انھیں
غصہ آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ تجمل نے جب اُن کے چہرے
سے مفلر کھینچا تھا تو وہ بہت گھبرا گئے تھے۔ اُن کا سارا وجود لرز کے رہ
گیا مگر انھوں نے بہت جلد اپنی آواز پر قابو پا لیا اور تبتی زبان میں
بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ آنے والے
لمحوں کے خیال سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔
"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" اباجان نے ملائمت سے کہا۔
"ہو سکتا ہے بڑے صاحب! پر اُسے دُور کرنے کے لیے ہی اپنے ساتھ چلو۔"
اباجان نے زیادہ تامل نہیں کیا اور خود ہی کٹیاؤں کی طرف بڑھ
گئے۔ زمین میرے پیر کھینچے لے رہی تھی۔ تجمل نے پشت سے میرا کوٹ
کھینچ لیا۔ ہم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کھلی ہوئی کٹیاؤں کے وسط کی
ایک کٹیا میں آ گئے۔ وہ زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ زمین پر خشک گھاس
بچھی ہوئی تھی اور اندر گہرا اندھیرا تھا۔ سولم کو باہر رہنے کی ہدایت کر کے تجمل نے
دروازہ بند کر لیا۔ پتھروں کی ان موٹی دیواروں سے ہماری آواز باہر نہیں جا
سکتی تھی۔ اباجان بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ تجمل نے دیاسلائی جلا کے چراغ
روشن کر دیا۔ کٹیا میں لرزتی ہوئی روشنی پھیل گئی۔ "بڑے صاحب! زیادہ
بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کی تلاش میں بہت دُور سے
آئے ہیں۔"
"میری تلاش میں!" اباجان نے تعجب سے کہا۔
"ہاں جی! آپ کی تلاش میں۔ اور ہم کو سب پتہ ہے۔ آپ ہم
سے کچھ چھپانا مت ورنہ تمام برباد ہو گا۔ پہلے میں بول دوں، ہم لوگ
آپ کے مخبر نہیں ہیں۔ اپنے دل سے ایسے تمام خیال نکال دو۔"
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" اباجان کی آواز منہ میں ہی تھی۔
"آپ کی سمجھ میں سب آ جائے گا۔ کل ہی ہم نے آپ کو دیکھا
تھا پر آپ سے اتنے لوگوں کے سامنے بات کرنا ٹھیک نہیں تھا۔"
"آپ اپنا مقصد۔۔۔ آگے بات کریں۔"
"کیا بات کریں بڑے صاحب! سوچتے ہیں کہ کدھر سے کریں۔" تجمل
کسمساتے ہوئے بولا۔ "آپ سُن بھی سکو گے یا نہیں۔"
"میں سب سُن رہا ہوں۔" اباجان نے بے چینی سے کہا۔ "مگر میں
آپ سے پھر کہتا ہوں آپ کو کوئی بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"
"آپ صفدر خان صاحب نہیں ہو!"
اپنا نام سُن کے اباجان کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "نہیں۔ میرا
نام۔۔۔ میں ایک بھکشو ہوں اور میرا نام صفدر خان نہیں ہے۔" انھوں نے
تیزی سے کہا۔
"اب تو کچھ بھی نہیں، پر پہلے کبھی تھا۔" تجمل کی آواز بھی بیٹھ سی
گئی۔ "شہر میں آپ کا پتہ بھی لے لیا کیا؟ بڑے صاحب! آپ اپنا
حلیہ بدل سکتے ہو، نام تو نہیں۔ نام ایک ہی رہتا ہے۔"
"مگر میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔"
"میں جان رہا ہوں بڑے صاحب! تیرہ سال کا فیصلہ ہو گیا۔ اِدھر
دیکھو، یہ کون بیٹھا ہے۔ یہ کون بیٹھا ہے؟ اس جوان کا نام یاد ہے؟
آپ کو ایسا کوئی نام!"
"ب۔۔۔ بابر۔۔۔" اباجان کی آواز گھٹ گئی۔
مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اباجان مجھے پہچاننے سے انکار کر دیں
گے۔ تیرہ برس اور جوان ہو کے جدا ہو جانے پر انھوں نے پیچھے مڑ کے نہیں
دیکھا تھا۔ تجمل کی زبانی میرا نام سُن کے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ
پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے تکنے لگے۔ تجمل نے میرے چہرے پر بھی
بیٹری کی روشنی دکھائی۔ "کچھ پہچان پائے بڑے صاحب؟"
اباجان کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور اُن کے چہرے کا رنگ سفید
پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔
"نہیں۔ نہیں۔" اباجان کی ڈوبتی ہوئی آواز اُبھری۔
"روشنی اور کروں بڑے صاحب؟"

ابّاجان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اُن کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ نہ جانے کب اُن کی کانپتی ہوئی سرد انگلیاں مجھے اپنے بالوں میں سرسراتی محسوس ہوئیں۔ میری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں جب ابّاجان نے میرا چہرہ اپنے اختراعی ہاتھوں سے سامنے کیا تب میں انھیں دیکھ سکا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے جھپٹ کے میرا چہرہ اپنی گود میں دبوچ لیا: "بابر!" اُن کی دھڑکتی ہوئی آواز مجھے کہیں دور سے آرہی تھی: "یہ تو ہی ہے بابر!"

میری زبان پر فالج گر گیا تھا۔

"تو کہاں چلا گیا تھا؟"

"اس سے کچھ مت پوچھو بڑے صاحب! [illegible] دیکھو اور ٹھیک سلامت ہیں۔" فیصل نے کہا۔

"شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے دماغ میں نہ جانے کیا کیا... اُن کا کھلاڑ نہ جانے لگتا، لیکن میرا دل کہتا تھا، میرا بابر کبھی مجھ سے ضرور ملے گا۔"

وہ منہ ہی منہ میں نہ معلوم کیا کیا کہتے رہے۔

"اور اس کا دل بھی ایسا ہی بولتا تھا۔"

"او میرے خدا۔ میرے خدا!" وہ میری پیشانی اور انگلیاں بے تحاشا چومنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی وہ میرا چہرہ ٹٹولتے، کبھی بازو، کبھی میری پیشانی کو بوسے دیتے، کبھی آنکھوں کو۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اُن کے سامنے ہوں اور مجھے بھی یہ سب ایک تصور سا لگ رہا تھا۔ دیر ہو گئی، وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچے آہیں بھرتے رہے، پھر بولے: "تو یہاں تک کیسے آگیا؟" انھیں ایک دم خیال آیا۔

"بس آگیا بڑے صاحب!" فیصل نے کہا: "ہم نے سوچا، آپ جس چیز کی تلاش میں ادھر آئے ہو، ہم اسے ہی جا کے آپ کو اُس سے بڑی خبر دے دیں۔"

"آپ..... آپ کو؟" ابّاجان خفقانی انداز میں بولے: "کس چیز کی تلاش!"

"بڑے صاحب! ایسے وقت میں مجھ کو آپ سے کچھ بولنا نہیں چاہیے تھا، پر رات جاگ رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے ہم کو ادھر سے دفع ہو جانا چاہیے۔ ایک تو ہم کو اس کو دکھانا تھا، پھر ایک بات اور بولنی تھی۔"

"کہیے کہیے۔" ابّاجان بے قراری سے بولے۔

"آپ بہت بڑے خطرے میں ہو۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"میری بات پہلے پوری طرح سن لو بڑے صاحب! یہ قبیلے کے لوگ نو سال میں کٹ کٹنے ہو گئے ہیں۔ ان کے سر کا کوئی بھروسا نہیں ہے، کس وقت الٹ ہو جائے۔ اپنے آپ کو بھی تنگ کرتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہو کہ آپ یہاں محفوظ ہو۔ ادھر بھی ان کے لوگ آپ جیسے بہروپی بن بن کے، ادھر آپ اکیلے ہو۔ ہم بھی اب آگئے ہیں۔ پر جنگل اٹھی کی ہے اور راستے بھی سب سے تیس ہیں۔ ان کی آنکھ میں کوئی دانہ پڑ گیا اور کسی دن زیادہ دیکھنے لگ کر ادھر اپنا کوئی ہے جو اُن کی امانت اپنے پلّے رکھتا ہے تو جنگل میں رہنے والے یہ لوگ جنگل کی بولی بولیں گے۔ ابھی ٹھیک طرح بات کرتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" ابّاجان نے بیچ میں دخل دینے کے لیے لب کھولے، فیصل نے انھیں روک دیا: "آپ سنتے رہو، غور کرتے رہو کہ آپ کیا جواب دو گے پر بڑے صاحب! سوچ سمجھ کے بولنا۔ الٹے جواب سے کام الٹا ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے فوراً لوٹ چلو۔ ابھی آپ کو یہ [illegible] مل گیا ہے۔ یہی آپ کے لیے دولت ہے۔"

"آپ کس امانت کی بات کر رہے ہیں؟" ابّاجان وحشت سے بولے۔

"وہی جو اس رات لڑکی آپ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بڑے صاحب! ہم کو سب پتا ہے۔ ہم کو قبول کے ماتم اکارت مت کرو۔ وہ اپنے کاغذوں کے لیے جنگل نکالے پھر رہے ہیں۔ میں نے اُن سے بولا ہے کہ وہ میں اُن کو دے دوں گا اور اس کے بدلے وہ ہمیں دولت دیں گے۔ آپ وہ ساری دولت لے لینا۔ پہلے لے لینا، بعد کو کاغذ اُن کے منہ پہ مارنا۔ وہ بھی کچھ کم نہیں ہو گی۔"

"میرے پاس ایسے کوئی کاغذات نہیں ہیں۔" ابّاجان نے تلخی سے کہا۔

"بڑے صاحب! ہم پر بھروسا کرو۔ ہم کو کچھ نہیں چاہیے۔ ابھی دیکھو ادھر بابر تمھارے سامنے ہے۔ اُدھر تمھارا جہاں گیر بھی ہم کو مل گیا ہے۔"

"جہاں گیر! منا، وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی بابر کے ساتھ ہے۔" فیصل نے منی کا ذکر نہیں کیا۔ میرے منہ پر اُس کا نام آتے آتے رہ گیا لیکن میں منی کے بارے میں اُن سے کہتا بھی کیا؟ کیا یہ بتاتا کہ وہ مجھے کہاں نظر آئی تھی اور کتنی دیر کے لیے؟

"ادھر آپ کے دو بیٹے ہیں۔ اس کے پاس بھی بہت پیسہ ہے۔ نقدی، حویلی، جاگیر، پیڑھیاں کھائیں پھر بھی بچ جائے اور یہ سب تبھی ہو گا، جو ہاتھ پیر کا گلا ہوا ہے بھروسا اس کو کہیں ہے، یہ سارا سونے کا ہے۔"

"منا کیسا ہے؟" ابّاجان دہشت زدہ آواز میں بولے۔

"منا ایک دم ٹھیک ہے، پڑھتا ہے۔"

"وہ کہاں سے ملا؟"

"اچھی جگہ ملا۔" فیصل نے تند لہجے میں کہا: "آپ میری بات کا جواب دو، یہ سب بعد میں، وقت ملے تو پوچھنا۔"

"آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں کاغذ کی بابت بول رہا تھا۔"

"مگر میرے پاس کوئی کاغذات نہیں ہیں۔"

"بڑے صاحب! نو سال سے آپ رات دن کیا کھوج رہے تھے؟ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ ٹھیک ہے آپ کے پاس وہ نہیں ہیں تو آپ ہمارے ساتھ واپس چلو۔ ابھی ہم ادھر سے نکل سکتے ہیں۔"

"میں..... میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"آپ کو چلے جانا چاہیے بڑے صاحب!"

"مجھے یہاں سے جانے میں کچھ عرصہ اور لگے گا۔"

"وہی میں بول رہا ہوں، آپ اس عرصے کو جہنم میں ڈالو، سب چھوڑ کے ہمارے ساتھ چلے چلو۔ ہماری بات مان لو۔ نہیں تو لاڈلے سے پوچھ لو۔ پیرا نہیں تو اس کا ہی بھروسا کر لو۔ اس کا خون سچا ہے تو یہ آپ سے ہیر نہیں کرے گا۔"

"میں نے آپ سے کیا کہا ہے، میں ابھی واپس نہیں جا سکتا۔"

"کوئی بھی اتنی مدت دوڑ دھوپ کرنے اور ادھر دور آنے کے بعد واپسی کو تیار نہیں ہو گا۔ مجھ کو پتا ہے آپ ابھی انکار کرتے رہو گے۔ بڑے صاحب! میں نہیں بولتا کہ آپ کے کاغذ میں جو کچھ ہے وہ سب اس سے قیمتی نہیں ہے جو اس سے بہت قیمتی ہو سکتا ہے۔ پر یہ سب بیکار ہے۔ آپ کو کام پکڑنے میں اتنا وقت لگا ہے۔ لگام اب بھی چھوٹ سکتی ہے۔ آگے راستہ اتنا صاف نہیں ہو گا۔ اب تک آپ دیواروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پر ادھر کوئی دیوار نہیں ہے۔ واپسی کا راستہ مشکل ہے۔ کہیں الٹ ہو گیا تو دوبارہ نکلنے کا موقع نہیں ملے گا اور اٹھانے والا بھی ادھر کوئی نہیں ہو گا۔ تھوڑے کو بہت جانو۔"

"جناب! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ازراہ کرم اس سلسلے میں کوئی دخل مت دیجیے۔ آپ کے بقول میں نے اتنی تگ و دو کی ہے تو یوں ہی نہیں کی ہو گی۔ میں یہاں تک آ کے پیچھے نہیں جا سکتا۔ ازراہ مہربانی مجھے معذور سمجھیے۔"

"لیکن بڑے صاحب! ہم تو معذور نہیں ہیں۔"

"میں نے درخواست کی ہے۔"

"وہ دوڑ دھوپ اور تھی بڑے صاحب! یہ اور ہے۔ مجھ کو بیچ میں بولنا نہیں چاہیے۔ پر ساری زندگی اپنا کام ہی رہا ہے۔"

"دیکھیے! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

"آپ ہم کو نہیں جانتے ہو۔ آپ کو ہمارے نکلنے پر شک ہے۔ بابر سے کھلا پڑا ہے۔ اس کے پاس جا تو بھی بے ٹھکانا بھی۔ دونوں کو چلانا بھی آتا ہے۔ میں اس کو دکھا کے آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا تھا۔ پیسہ اپنے کو بھی اچھا لگتا ہے، پر اپنے سے زیادہ نہیں۔ آپ کے پاس پیسہ ہو گا، اچھا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پر ہم کو یقین ہو کہ آپ کو بھی کچھ نہیں بگڑے گا تو ہم ادھر سے چپکے واپس جائیں گے۔"

"میرے ذہن میں بدگمانی نہیں ہے، بلکہ جانا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔" ابّاجان نے ترش روئی سے کہا: "آپ کا یہاں آنے سے صرف ایک ہی مقصد تھا تو مجھے افسوس ہے اور میرے پاس الفاظ نہیں کہ بابر کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہہ سکوں، پہلے ہی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں، لوٹ نہیں سکتا۔ جتنا آپ اصرار کریں گے مجھے شرمندگی ہو گی۔ میرا یہاں کچھ بگڑ جائے گا تو اس کا سزاوار میں خود ہوں گا۔ اگر اب بھی آپ کے دل میں ہے کہ میرے پاس کوئی کاغذات ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ میں اتنی احمقانہ غلطی نہیں کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے ساتھ لاتا۔"

"مجھ کو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایسا ہے تو بہت اچھا ہے بڑے صاحب۔"

"یہی سمجھیے۔"

"آپ بولتے ہو تو ہم سمجھ لیتے ہیں۔ پر آپ سے ایک بات اور پوچھنا ہے کہ آپ یہاں آ کے کتنا آگے آئے ہو؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"بڑے صاحب! ہم ادھر آ گئے اور جاتے ہوئے آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم کو کچھ نہیں، صرف آپ کی فکر ہے۔ ہم کو بولو کہ آپ کے راستے میں ابھی کیا روڑا ہے۔ آپ کو راستہ بنانا چاہیے۔"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" ابّاجان جھجکتے ہوئے بولے: "اگر آپ کی مراد میری مدد سے ہے تو مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ پوری بات نہیں سمجھے ہو بڑے صاحب! اتنی سن کے بھی اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ ہم بولتے ہیں کہ ہم حصہ لینے نہیں آئے ہیں، بچانے کا مقصد ہے۔ ہم جان گیا ہے، آپ نہیں روک سکتے ہو نہ اس کا بھید چھپا سکتے۔ ہم ادھر خود ہی آپ سے کچھ نہیں بول رہا ہے۔ معاملے کی بات ہے جو تو لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کے پاس کاغذ نہیں ہیں، پر آپ تو ادھر ہو اور آپ ہی بتاؤ یہ جانتے ہیں کہ کوئی اور بھی ادھر آ گیا ہے۔ آپ آگے ٹھیک کام کر سکتے ہو، وہ چاہے تو آپ..... آپ!"

"فیصل بھائی!" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ فیصل کی آواز میں لکنت آگئی تھی۔ مجھے اُس کی آواز کی خوب پہچان تھی۔

"لاڈلے! تو چپ رہ، مجھ کو بولنے دے۔"

"ابّاجان!" میں نے اُن کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "فیصل بھائی کے متعلق غلط مت سمجھیے۔"

ابّاجان کے چہرے اس سردی میں پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

"لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے کچھ حاصل ہو جائے گا؟" وہ بھینچے

سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں حالانکہ اُس کا بدلا ہوا لہجہ ہی ہمارے لیے کافی تھا۔ اس نے دروں سے ایک فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا تھا، کوئی اور گنجائش نہیں رکھی تھی۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ یہ سب محض دکھاوا ہے اور وہ اس طرح یہ حقیقت جاننے کا متلاشی ہے کہ ہم نے کس سبب یہاں سے کاغذات کو غائب کیا ہے۔ کوئی بیان ضرور ہوگا جس کے کہنے کے مطابق اگر ہم اپنے تین آدمی اس کی تحویل میں دے دیتے تو اُس کا شبہ یقین میں بدل جاتا۔ ہم اُس کے یقین کے لیے اپنے آدمیوں میں سے کسی کو بھی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے، نہ اُس کا یقین ہمارے لیے سود مند تھا۔ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ تجمل کی جگہ میں ہوتا تو بھی یہی جواب دیتا اور یہ ہمارا گمان تھا کہ وہ صرف حقیقت جاننے کی جستجو میں ہے۔ اسے یقین آ چکا تھا ورنہ وہ تجمل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہاتھ اٹھا کے اپنے آدمیوں کو حکم نہیں دیتا۔ اچانک ہی سردار کی آواز اکھڑی ہوئی اور بھری ہوئی سی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس میں ٹھہراؤ آ گیا۔ ہمیں اُس کے آدمیوں کے تیوروں سے اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کس حد تک آگے جا سکتے ہیں۔ جیسے ہی سردار نے ہاتھ اٹھایا، انھوں نے نیزوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ اگر مستعد تھے تو ہم بھی پوری طرح تیار تھے۔ وہاں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا۔ تجمل نے کسی کو اشارہ نہیں کیا تھا مگر ہم سب کے ہاتھ بھی اپنی جیبوں کے قریب تھے۔ اُن کے ہاتھ میں نیزے تھے لیکن انھیں تولنے اور ہم پر وار کرنے کے لیے پیچھے کی جانب اُن کے پاس جگہ نہیں تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہم پر حملہ کرنے کے انداز میں نہیں جھپٹیں گے کیونکہ ہماری طرف سے کسی مزاحمت کا امکان اُن کے ذہن میں دور دور تک نہیں ہوگا۔ ہم نے انھیں اُن کی جگہ سے آگے بڑھنے دیا۔ دیوار سے ہٹتے ہی اُن کے نیزوں کی انیاں ہمارے سینوں کی جانب ہو گئی تھیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اُن کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ قبیلے کے بزرگ آدمی جو ہمارے آنے کے وقت یہاں بیٹھے ہوئے تھے، جاتے جاتے پیچھے کا دروازہ بند کرتے گئے۔ پیچھے ہٹنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، ہوتا بھی تو ہمارے لیے بے کار تھا۔ ہمیں چپ دیکھ کے سردار کے بڑھتے ہوئے آدمیوں کے قدم اور سست پڑ گئے۔ وہ یہی کر سکتے تھے کہ تین اطراف سے آ کے ہم پر نیزے تان لیں اور سردار کے حکم کا انتظار کریں۔ تعداد میں وہ پندرہ تھے، ہم صرف چھ۔ اُن کے پاس نیزے تھے اور ہمیں چاقو نکالنے کی بھی مہلت نہیں تھی مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ نیزے ہم سے بہت قریب نہیں ہونے چاہئیں تھے، پھر جانے ہلنے حرکت کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہمیں ایک فاصلے پر انھیں روک دینا چاہیے تھا اور ہم نے انھیں یہ فاصلہ طے کرنے دیا۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جاموٗ، سلطان، مارتی، سُولم اور میں۔ سب کی آنکھیں اور کان کھلے ہوئے تھے۔

"مہلت کے۔" تجمل نے آہستہ سے صدا لگائی۔ ایسی حالت میں تجمل کی ہدایت پر عمل کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اُن کے نیزے ہم سے کوئی ڈیڑھ گز دور تھے اور دوسرے لمحے ہمارے سینوں تک پہنچنے والے تھے کہ دفعتاً ہم سب نیچے بیٹھ گئے۔ اسی لمحے بجلی کی سی تیزی سے ہم نے سر دروشہ اپنی نشست تبدیل کی اور اسی مدت میں نیچے سے اُن کے نیزے پکڑ لیے اور انھیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے بڑھتے گئے۔ ہم میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ہی نیزہ آ سکتا تھا لیکن نیزہ پکڑنے کے بعد ہماری مجبوری یہ تھی کہ اس قدر اچانک اور تیزی کے قریب کھڑے ہوئے کئی آدمی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ نیچے جھکتے ہی ہم نے چاقو نکال لیے تھے اور اوپر اٹھتے ہوئے ایک ہاتھ سے نیزہ پکڑا تھا تو دوسرے ہاتھ سے اُن کی ٹانگوں پر چاقو سے لکیریں ڈالتے گئے تھے۔ کمرے میں اُن کی بوکھلائی ہوئی چیخیں گونجنے لگیں۔ جیسے ہی وہ فرش پر دہاڑتے ہوئے گرے، میں تجمل کے سردار کی طرف جا گھسا جس کے کرنے سے تھے۔ اُس کی آنکھیں ابھی اپنے دیکھتے ہوئے ہی مبہوت تھیں کہ میں نے اُس کی گردن پر پوری طاقت سے تڑپتے ہوئے ہاتھ مارا۔ وہ اپنا جسم سنبھال نہیں سکا، وہ لڑکھڑا کے گرا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے خود اُسے سنبھال لیا اور اس سے پہلے کہ وہ خنجر نکال لیتا، میرے چاقو کی نوک اُس کی چھاتی پر چبھنے لگی۔

ادھر جاموٗ، مارتی، سلطان اور سُولم کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور انھوں نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرنے والے آدمیوں پر ان کے نیزوں سے زور ڈال رکھا تھا۔ کسی کی ٹانگوں اور کولھوں پر کٹے ہوئے زخموں سے خون چھوٹ رہا تھا۔ جنھیں چاقو نہیں لگ پائے تھے وہ زمین پر گرے ہوئے جاموٗ، مارتی، سلطان اور سُولم کے نیزوں اور چاقوؤں کے دباؤ میں تیزی سے بدل جانے والی صورت حال کا جیسے غور کر رہے تھے۔ لمحہ بھر اُن کی آنکھوں کی چمک معدوم ہوتی رہی۔ ہمارے کسی نے اپنے سردار کو بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے فوراً جلدی کی ورنہ کوئی چھوٹا سردار تک پہنچنے کا ارادہ کرتا تو تجمل آ جاتا۔ چند لمحوں بعد تجمل اسی غرض سے سردار کی طرف جھپٹا تھا لیکن مجھے دیکھ کے رک گیا اور اس نے اچانک ایک آدمی کی پیٹی سے خنجر نکال لیا۔ سردار میری گرفت میں پھڑکنے لگا تھا۔ تجمل نے خنجر زور سے سامنے کی دیوار پر کھینچ مارا جہاں ایک عورت کی مورتی بنی ہوئی تھی۔ خنجر مورتی کی سیدھی آنکھ میں جا کے گڑ گیا۔

وہ پندرہ کے پندرہ تھوڑی طرح جاموٗ، سلطان، مارتی اور سُولم کے نرغے میں تھے۔ جنھیں چاقو لگے تھے وہ بری طرح کراہ رہے تھے۔ جو کے پیر پہنچنے اور چھیننے جانے ہی سے حواس باختہ ہو گئے تھے، اگر چاقو نہ کھولتے تو نیزے کھینچنے کے بعد وہ ہماری بھیڑ کے دوش کر لیتے لیکن اپنے ساتھیوں کی چیخیں سن کے وہ منتشر ہو گئے۔

[illegible] کے سامنے ہی کچھ کیا جا سکتا تھا۔ تجمل نے ہاتھ مورت کے حوالے کیا تھا ورنہ چاقو صرف لکیریں کھینچنے پر اکتفا نہ کرتے اور ہم سب چاہتے تو کئی بھی اُن میں سے زیادہ دیر تک نہ بلبلا پاتا۔ ہاتھ کھول کے چلانے سے ہاتھ روک کے چلانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک ہم نیچے بیٹھنا، پھر فوراً اٹھنا، چاقو نکال کے ہوا دکھانا اور نیزا پکڑنا، ایک ساتھ اتنے کام ہم کرتے رہتے تھے کہ بہت وقت لگ جاتا۔ اُن کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب ہمیں بھی زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ جاموٗ کا اب بھی بس نہیں چلتا تھا کہ سب کو ختم کرے۔ وہ تجمل کے اشارے کا منتظر تھا۔ تجمل نے ابھی کوئی حکم نہیں دیا۔ مورتی کی آنکھ چھیڑنے کے بعد وہ کمرے کے بیچ میں چپ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے ٹھہری ہوئی آواز میں جاموٗ سے کہا۔ "چھوڑ دو جاموٗ!"

جاموٗ نے فرش پر تھوکتے ہوئے نیزے سے ہاتھ اٹھا لیے۔ مارتی اور سُولم نے بھی جھٹکنے کے انداز میں نیزے سردار کے آدمیوں پر پھینک دیے اور چند قدم پیچھے چلے آئے۔ سردار کے کسی آدمی نے نیزا نہیں اٹھایا۔ البتہ جاموٗ، سلطان، مارتی کے ہاتھ میں چاقو اب بھی کھلے ہوئے تھے۔ ادھر سردار اپنی زبان میں چلا چلا کے نہ جانے کیا کہتا رہا۔ اُس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش ختم کر دی تھی۔ تجمل دھیمے قدموں سے چلتا ہوا سردار کے پاس آیا اور اس نے میرا ہاتھ اُس کی چھاتی سے ہٹا کے مجھے اُس سے دور ہو جانے کی تاکید کی۔ میں نے سردار کی گردن چھوڑ دی۔

"مجھے معاف کرو سردار!" تجمل نے جھکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور ان کو ہاتھ [illegible]۔ تجمل بھول گیا تھا کہ سردار اُس کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا۔ [illegible] بھڑکتے دیکھ کے اُسے اس کا احساس ہوا اور اُس نے سُولم کو [illegible] کہا: "سردار کو بولو۔ اتنا ٹھیک ہے تو ہم سمجھ جاتے ہیں۔"

سُولم نے اُس کی بات سردار سے دہرا دی۔

سردار ہمیں اپنے خاص کمرے میں لے آیا تھا۔ تجمل، جاموٗ اور سلطان [illegible] کھانے سے پہلے بستی کے معزز مہمانوں کے لیے خاص [illegible] ہوئی تھوڑی سی شراب پی لی تھی۔ سردار کی نوجوان خادمائیں [illegible] آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پلکیں ٹھنڈے ہوئے [illegible] آتی تھیں جیسے اُن کی آنکھیں بند ہوں۔ شرمائی اور سہمی ہوئی۔ [illegible] رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے گندھی ہوئی دو چوٹیاں [illegible] ہوئی، جوڑے کی جگہ بالوں میں جالی دار ٹوپی، کان سفید [illegible] ہوئے، تنا ہوا سونے جیسا رنگ، سب کے نقش و نگار [illegible] جیسے تھے، عمریں بھی تقریباً سب کی یکساں تھیں۔ جانچ [illegible] کی طرح اُن کے گالوں پر لال مچھی پڑی تھی۔ جاموٗ انھیں

گل چھیں کہتا تھا۔ واقعی انھیں دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اُن کے گالوں میں تازہ تازہ چٹکی بھری ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے جاموٗ، تجمل سے کہہ رہا تھا۔ "استاد! یہ انار کی کلیاں اُبھر اپنی طرف چل جائیں تو ادھر کی ساری لڑکیاں کبوتر ہمیں کا دیوالا پٹ جائے۔"

جاموٗ نے کہرا کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتا تو نہ جانے اُس کا کیا حال ہوتا۔ اس کے گالوں پر بھی ایسی ہی سرخی پھوٹتی تھی۔ ان سے کہیں زیادہ۔ تجمل کی نظر بچا کے جاموٗ نے ایک پیالہ اور پی لیا تھا۔ اُس کی آنکھیں چڑھنے اور زبان بہکنے لگی تھی۔ سردار کی خادماؤں کو وہ طرح طرح کے نغمات سے لبھاتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ہمیں سہ پہر ہو گئی۔ ہم رخصت ہی ہونا چاہتے تھے کہ ایک خادمہ نے تیتے جھجکتے ہوئے اندر آ کے سردار سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ سردار کو دخل اندازی بری لگی۔ اُس نے برہمی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ خادمہ الٹے قدموں کمرے سے واپس چلی گئی اور اسی وقت ایک خادم اندر داخل ہوا۔ وہ پہلا مرد تھا جو ہمارے آنے کے بعد اس کمرے میں آیا تھا۔

پتہ نہیں اُس نے کیا کہا تھا کہ سردار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ہماری جواب طلب نگاہیں بے اختیار سُولم کے چہرے پر جمنے لگیں۔ وہ بھی بے چین ہو گیا تھا اور اس کے منہ پر جیسے کوئی بات آتے آتے رہ گئی تھی۔ سردار نے چند سوال کر کے خادم کو رخصت کر دیا اور بے تابانہ ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا ہے سردار؟" تجمل نے پوچھا۔

"معلوم ہوا ہے کہ سوداگروں کا ایک اور قافلہ بستی میں آیا ہے۔" اس نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔

سُولم کے سوا ہم سب چونک پڑے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کون لوگ ہیں؟" تجمل نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"اپنے آپ کو سوداگر کہتے ہیں، سامان بھی اُن کے ساتھ ہے۔"

"سوداگر ہیں؟" تجمل زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے یہ وہی قافلہ ہو جو سفر میں دور تک ہمارے سنگ آ رہا تھا یا کوئی اور ہو۔"

"تمھارے ساتھ؟" سردار نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں، پھر ایک جگہ ہم الگ ہو گئے تھے۔ جیسے دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے وہی لوگ ہوں۔ پتہ وہ ادھر آنے والے نہیں تھے۔ اُن میں سے کسی کو بلا کے دیکھو۔"

"وہ باہر کھڑے ہیں۔" سردار نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہیں جا کے بات کرتے ہیں۔"

ہمارے ساتھ چلنے پر سردار نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، اس لیے ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئے۔ پیچھے زیرِ دستی بیان زور دار ہلا ہلاو جیسی ڈرتیا اور ملا کو سامان انھوں کو دوبارہ دیکھنے کے لیے ہم سب جلد سے جلد اُن کے پاس پہنچ جانا چاہتے تھے لیکن کمرے سے نکلتے ہی تجمل نے سردار کو

روک لیا۔ "ایک بات سن لو سردار! ہم سے مت مت کرنا۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "ان سے کاغذ کی کوئی بات مت بولنا۔"

سردار کی بھویں سکڑ گئیں۔ جُگل کی تاکید اس کے لیے تعجب خیز تھی۔

"پتہ نہیں وہ ادھر کس بات کی کھوج میں آئے ہیں۔" جُگل نے ترشی سے کہا۔ "سمجھ گئے؟"

"کیا مطلب؟" سردار کبیدگی سے بولا۔

"مطلب صاف ہے سردار!"

"لیکن وہ۔ کیا تمھارے خیال میں وہ بھی اُن کے بارے میں کچھ جانتے ہوں گے؟" سردار کی آواز پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔

"ہم نہیں بول سکتے، پر وہ جان سکتے ہیں۔"

"مگر کیسے؟"

"کیسے کیسے ہم سے مت پوچھو۔ ہم احتیاط کو بول رہے ہیں۔ وہ بھی سوداگر ہیں۔ تمھارے آدمی نو سال سے ہندوستان میں سر مارتے ہیں۔ یہ بھی ساری دُنیا گھومتے رہتے ہیں۔ ان کو بھی پتہ چل سکتا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں کیوں آئیں گے؟" سردار الجھتے ہوئے بولا۔ "متبرک دستاویزیں ہندوستان سے گئی ہیں۔ وہ ہندوستان ہی میں ہوں گی۔ یا تو دستاویزیں وہاں نہیں ہیں یا پھر وہ انھیں لے کے آئے ہیں اور تمھاری طرح اُن کا سودا کرنا چاہتے ہیں یا انھیں ہندوستان میں کسی ایسی جگہ کا پتہ ہے جہاں دستاویزیں موجود ہیں اور وہ تعین کرنا چاہتے ہیں کہ ہم انھیں اس کے عوض کیا کچھ دے سکتے ہیں تاکہ وہ کوئی [illegible] تنگی دور کرسکیں۔"

سردار کو قبیلے کا سردار یوں ہی نہیں بنایا ہوگا۔ اس میں سوچنے سے زیادہ سوجھ بوجھ ہوگی۔ جُگل کے کہنے کے مطابق اگر نئے آنے والوں کو بھی کاغذات کا کوئی علم ہوسکتا ہے تو سردار کے ذہن میں اُٹھنے والے تمام سوال جائز تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جُگل ان کو کیا جواب دے گا۔ "ہم نہیں جانتے کہ کون سی بات ٹھیک ہے، پر ایک بات تم نہیں بول سکتے ہو۔" جُگل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ کسی اور وجہ سے بھی ادھر آسکتے ہیں۔ کاغذ کے بارے میں ان کو کچھ جان نہیں ہو کہ کوئی ان کو لے کے ہم سے پہلے ہی ادھر آگیا ہو... اور کاغذ میں کچھ اور بھی لکھا ہو۔" جُگل نے وضاحت نہیں کی کہ کاغذات میں اور کیا رمز ہوسکتی ہے۔ سردار نے اُن کا ذکر کرتے ہوئے خود بھی اس سے پہلو تہی کی تھی۔ سردار نے مجھے بتایا تھا کہ قبیلے میں چند ہی بزرگ لوگوں کو کاغذات کی متبرک حیثیت کے سوا دوسری خوبی کا علم ہے۔ اُن کا اتالیق اجین اسے جانتا تھا۔ "ہم ابھی کچھ نہیں بول سکتے۔" سردار کو متذبذب دیکھ کے جُگل نے کہا۔ "یہ ہمارا خیال ہے۔ وہ ویسے بھی ادھر آسکتے ہیں۔ ادھر کوئی دروازہ تو نہیں ہے اسی لیے ہم احتیاط کو کہتے ہیں۔ اُن کو کچھ پتہ نہیں ہے اور پتہ چلا تو ہمارے کام میں ہرجا ہوسکتا ہے۔"

"اور اگر انھوں نے خود ذکر کیا؟"

"تو اگر وہ کاغذ اپنے ساتھ لائے ہیں اُن سے لے لینا۔ ہم اپنا مال اُٹھا کے چلے جائیں گے اور اگر انھوں نے ہماری طرح کی بات بولی تو جس سے سودا پہلے ہوا ہے اس کا تم کو دھیان رکھنا ہوگا۔ تم ان سے [illegible] کرنا بلکہ ہم کو ضرور بتانا۔ شاید تمھارا کام پھر کچھ جلدی ہو جائے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ کاغذ ہم سے پہلے لے کے تمھارے پاس آگئے تو ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ تمھیں سلام کر کے اپنا منہ کالا کر لیں گے۔ ہم اُن سے نہیں بولیں گے کہ ہم سے بھی بات ہوئی ہے۔ تم نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔" [illegible] معلوم ہوتا تھا سردار کی سمجھ میں کچھ آیا ہے کچھ نہیں۔ وہ گو مگو کی حالت میں گردن ہلا رہا تھا۔ جُگل نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھنے [illegible] معتقین کی تو جیسے قدم بوسی کرتے ہوئے اس کے پیر چھونے لگے۔ ہم [illegible] آدھے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی ہماری نظر اُن پر پڑی۔ چیرو کے ساتھ صرف وزیر تھا اور ان کے گرد قبیلے کے کئی آدمی۔ ان دونوں کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی، کپڑے گندے اور چہروں پر دھول سی جمی ہوئی۔ ہم نے انھیں اور انھوں نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ "دیکھو" اُن کے قریب جاتے ہوئے جُگل نے سردار کا ہاتھ پکڑ کے [illegible] کیا اور تیز قدموں سے چیرو کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے۔ "تم... تم ادھر کیسے آگئے؟" جُگل نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

چیرو کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اُسے کیا کہنا چاہیے۔ "زیادہ آگے نہیں جا سکے استاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کے کئی آدمی راستے میں ہی مر کے تڑپنے لگے۔ ادھر سالا [illegible] ایک رات اپن سے سٹری مار دی۔ ان کو تو اپن نے کچھ جانا، پر اپنے [illegible] کو کیسے سمجھاتا، سب آگے پیچھے ایک ایک ہم الٹ گیا۔ ابھی اپن کیا بولے" چیرو کے گلے میں کوئی پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔ "اپن ادھر آگیا۔" اُس نے سر جھکا کے کہا۔

"ٹھیک کیا، ٹھیک کیا۔" جُگل اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "ادھر قبیلے کے لوگوں کے پاس گرمی بہت ہے۔ یہ تمھارے سامنے قبیلے کا سردار اشی کا ہے۔"

چیرو نے گردن خم کر کے اُسے تعظیم دی۔ "اپن لوگ ابھی ادھر [illegible] رہنا مانگتے ہیں سردار! اپن کا کوئی آدمی سیدھا نہیں ہے۔"

سردار نے چیرو کی ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔

سردار نے انکار نہیں کیا اور مزید کوئی سوچ بچار کیے بغیر قبیلے [illegible] ایک معمر آدمی کو بلا کے چیرو اور اُس کے ساتھیوں کی دیکھ بھال [illegible]

[illegible] شخص پن وسا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ ناخوش تھے اور پن وسا کو گھر [illegible] نہیں تھا۔ چیرو نے سردار کی اس مہربانی کے عوض اسے کچھ سامان کی پیش کش کرنی چاہی، سردار نے توجہ نہیں دی۔ وہ گہری نظروں سے مسلسل اُسے دیکھتا رہا۔

"باقی سب کدھر ہیں؟" جُگل نے [illegible] کے چیرو سے پوچھا۔

"ایک کم ہوگیا ہے استاد!" چیرو نے دبی زبان سے کہا۔

ایسا لگا جیسے کوئی بہت زور سے میرے کانوں میں چیخا ہو یا جیسے کسی نے بہت اوپر سے مجھے دھکا دے دیا ہو۔ جُگل کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ "ایک کم ہوگیا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "نہیں.... تم کیا بولتے ہو دادا؟"

"اپن نے بہت روکا، پر [illegible] نہیں رہا، چلا گیا۔"

"کون.... کون؟" جُگل نے وحشت سے پوچھا۔

چیرو ہونٹ چبانے لگے۔ "اپن کا متن میاں۔"

"متن میاں!" جامو ہانپتے ہوئے بولا۔ "نہیں دادا!"

"ہاں۔" چیرو کی آواز بھرا گئی۔

جامو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ جُگل، مادری، سرولم، سلطان سبھی کی آنکھیں پھیلی کی پھیلی تھیں۔ چند لمحوں تک ہمیں بالکل احساس نہیں رہا کہ ہم سردار کے سامنے کھڑے ہیں اور قبیلے کے دوسرے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ چیرو اور وزیر نگاہیں نیچی کیے کھڑے تھے اور ہم انھیں تک رہے تھے جیسے چیرو نے ہم سے مذاق کیا ہے اور ابھی ابھی اس کا اقرار کر لے گا۔ چیرو نے ایسا کوئی اقرار نہیں کیا، لیکن اُسے جلد ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہوگیا کہ سردار اور قبیلے کے لوگوں کے سامنے اُسے ہم سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ پھیکی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے سردار سے بولا کہ وہ اور اُس کے ساتھی بہت تھکے ہوئے اور بیمار ہیں۔ انھیں آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ لہٰذا کسی طبیب کا انتظام کر دیا جائے اور اُس کے مرے ہوئے آدمی کو بستی میں کسی جگہ دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔

ہم سب ساتھ ساتھ ہی باہر نکلے۔ مکان کی باڑی سے پیچھے خاصے فاصلے پر ایک جگہ وہ سائے کے سائبانے پڑے ہوئے تھے۔ جامو اور زورا سے مرا بھی آدھے نظر آرہے تھے۔ جیسے کسی بُری طرح کا نس رہا تھا۔ چیرو کو ایک وقت بھی تیز بخار تھا۔ متن میاں کی میت اُن کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ جُگل کو بھی کچھ ہوش سا آگیا تھا۔ اُس نے متن میاں کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور دیکھنے لگا۔ متن میاں کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے گہری نیند سو رہا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہو یا کسی بات پر مسکرا رہا ہو۔ اس کے بند ہونٹوں میں کوئی شرارت سی چھپی ہوئی تھی۔ [illegible] ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لگتا تھا ابھی آنکھیں کھول کے اُٹھ جائے گا اور سب کو ڈرانے لگے گا۔ جامو اُس کی لاش سے لپٹنے کے لیے بے تاب تھا۔ جُگل نے اُسے میت سے دُور رکھنے کے لیے سلطان کو اشارہ کر دیا تھا۔ قبیلے کے کئی آدمی بھی سردار کے مکان سے ہمارے ہمراہ آئے تھے۔ زورا، بھیتی، انار وغیرہ ہم سے دُور دُور ہی تھے۔ اس لیے کہ جُگل نے اسی طرح کی ہدایت کی تھی لیکن ہمیں دیکھنے کے بعد اُن کے گالوں پر خوف [illegible] لگا تھا۔

جامو متن میاں کا چہرہ بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ جُگل نے اُسے دُور دُور ہی رکھا۔ بچپن سے متن میاں جامو کے ساتھ رہا تھا۔ جامو کھسکنے لگا تو وہ اُس کے حقیقی بھائی جمرو کی نگرانی میں فیض آباد کے اڈّے کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ نہ شادی ہوئی تھی اور ایک خالہ کے سوا دُنیا میں اُس کا کوئی نہیں تھا۔ جامو اپنے بھائی جمرو کی طرح اُس کا خیال رکھتا تھا۔ شروع شروع میں جامو نے اُسے اڈّے سے دُور رکھنا چاہا تھا اور تعلیم بھی دلانے کی کوشش کی تھی مگر متن میاں چل نہیں سکا۔ جامو نے پھر اُسے باقاعدہ اڈّے ہی پر رکھ لیا۔ ابھی چند مہینے پہلے متن میاں نے فیض آباد کے اڈّے میں [illegible] لیا تھا۔ سب [illegible] تھے لیکن وہ محض مذاق تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو چھیڑنا، مذاق کرنا اور ہنستے رہنا اُس کی عادت تھی۔ یوں تو یہ اُس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جامو ہی نے اُسے سب کچھ سکھایا تھا۔ تیغے پر بھی اُس کا ہاتھ دوسروں کی نسبت زیادہ رواں ہوگیا تھا۔ جُگل اسی لیے اُسے فیض آباد سے نکلتے وقت لایا تھا کہ وہ ہاتھ کا چلبلا اور نظر کا تیز تھا۔ اُس کے جسم میں بہت لچک تھی۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا کھنچا ہوا بدن۔ وہ بدن جس میں بجلی دوڑتی تھی، اب اُسے اپنی خبر نہیں تھی۔ کون کیا کر رہا ہے، کیا ہو رہا ہے، نہیں رہا ہے، کون اُسے دیکھ رہا ہے۔ پہلے ذرا سی آہٹ پر چونک کر اُس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔

قبیلے کے بہت سے آدمی ہمارے اطراف اکٹھے ہوگئے۔ جب ہم متن میاں کی میت کندھوں پر اُٹھائے بستی کے چوک میں آئے، جہاں چیرو کے ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہیں متن میاں کو غسل دیا گیا۔ کفن کے بجائے اُسے چادروں سے لپیٹ دیا گیا۔ قبیلے کے آدمیوں کی رائے تھی کہ اُسے اسی طرح دفن کر دیا جائے مگر جُگل نے غسل کے لیے اصرار کیا۔ میں تو باہر ہی بیٹھا رہا تھا۔ جامو کو بھی کسی نے اندر نہیں آنے دیا تھا۔ بانس کی ایک چارپائی پر متن میاں کو لٹا دیا گیا تھا۔ انھوں نے بستی سے بہت دُور ایک جگہ کی نشان دہی کی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہمارے ساتھ مشعلیں بھی نہیں تھیں۔ اندھیرے ہی میں جُگل، چیرو، سلطان، مادری، سرولم، جامو اور زورا گڑھا کھودتے رہے۔ [illegible] بیماری کی وجہ سے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ زمین نرم تھی مگر پتھر ملے ہوئے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش میں انھوں نے قبر جیسا ایک گڑھا کھود لیا۔ متن میاں کو لٹانے سے پہلے جُگل نے اُس کے منہ سے چادر کھول کے ٹارچ کی روشنی پھینکی

"بیٹھ جائیے۔" اباجان کی آواز بھی جھلا رہی تھی۔ ہم سب فرش پر بیٹھ گئے اور بے یقینی نظروں سے انھیں دیکھنے لگے۔ "ہمیں سب کچھ بتایئے۔" وہ مری آواز میں بولے۔

"یہ تو اپنی کہانی کا ایک حصہ لگتا ہے۔" ہیرو نے پہلی بار زبان کھولی۔

"آپ تینوں ادھر لوگ کیسے پہنچ گئے؟" سلطان حیرت سے بولا۔

"یہ سب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" اباجان نے تنگ کے کہا۔

"یہ تو عجیب کمرہ ہے، اپنے کمرے میں بھی ایسا نہیں ہے۔" جامو ایک آواز میں بولا۔ "استاد! ادھر سب ہیرے تھپے ہوئے ہیں۔"

"بڑے صاحب!" تجمل نے جامو کی بات پر توجہ نہیں دی اور اباجان سے مخاطب ہو کے بولا۔ "میں نے آپ سے اُس رات ان سب کے لیے بول دیا تھا۔ ان کی زبان تیز ہے۔ انھیں بس ہو جائے تو رحجان مت دینا۔ یہ اپنا ہیرو ہے۔ اس کا نام جامو ہے۔ یہ سلطان ہے۔ یہ وزیر۔ ادھر ابھی آدمی اوپر پہنچے ہیں اور دو بستی میں پڑے ہیں۔ ایک راستے میں دھوکا دے گیا۔ آگے پرسوں ہم نے پیچھے جنگل میں دبا دیا ہے۔ ان سب کو ہیرے کی طرح جانو۔ ہم کو بولو ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

اباجان سر ہلانے لگے۔ ہیرے اور تجمل کے سوا سبھی نے انھیں سٹ پٹاتے ہوئے سلام کیا۔

اباجان نے گردن جھکا کے انھیں جواب دیا اور گونجتی ہوئی آواز میں بولے۔ "آپ نے سب دیکھ لیا ہے؟"

"دیکھ لیا ہے بڑے صاحب!" تجمل نے تیزی سے کہا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"سوچا کیا بڑے صاحب!"

"میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ لوگ یہاں وقت ضائع نہ کریں۔"

"ہم آپ کے لیے ادھر آئے ہیں۔"

"مجھے دیر لگے گی۔ بہتر ہے کہ تکرار نہ کریں۔"

"ادھر آپ کے اب بہت سے ہاتھ ہیں۔ اپنے کو ابھی کیلا مت سمجھو۔"

"چلتے وقت تجمل بھائی نے سب کو بول دیا تھا کہ سارا اگلا پچھلا معاف کر کے چلنا۔ اپن صاب چکا کر کے آیا ہے۔" ہیرو ایک اٹک کے بولا۔ "اپن کو بولو یہ سب کیا ہے۔ اپن ابھی کچھ مر جائیں گے۔"

"آپ لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔" اباجان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"قسم سے لاڈلا جانی آپ کے لیے بہت پریشان تھا بڑے صاحب!" ہیرو بولا۔ "ابھی اپن کی دو کروڑ ہی کی ہے۔ مانو تو ادھر سے جلدی سے جلدی لوٹ چلو۔"

"نہیں ہیرو دادا!" تجمل نے تندی سے کہا۔ "بڑے صاحب ایسے نہیں جا سکتے۔ ہم بھی ان کے ساتھ رہتے تو ادھر تک آ کے نہیں لوٹتے۔ اپنے کو وقت کا دھیان ہے۔ رات جاری ہے۔ ہم کو شاید لوٹنا بھی ہوگا میں

نے پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ اب کیا اس کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ کام بولو بڑے صاحب!"

اباجان ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے بے بسی مترشح تھی۔ تجمل نے ان سے پھر کوئی اصرار نہیں کیا۔ ہیرو نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو اس نے اسے بھی روک دیا۔ سب چپ ان کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر تمام ان کے لب کھلے اور ان کی بوجھل آواز کمرے میں ابھری۔ "یہ جگہ جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، بدھوں کے دور سے پہلے بنائی گئی تھی۔ کسی زمانے میں یہ اس خطے کے حاکموں کی عشرت گاہ تھی۔ جب بدھ یہاں آئے تو اس وقت سیاگنگ نامی حاکم نے اس عمارت کے آگے مندر تعمیر کروا دیا اور سب کچھ یہیں محفوظ کر دیا۔ بدھوں کے عروج کے وقت اس خطے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں حاکم قبائل کی ایک بڑی بستی تھی اور بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں اس کی زرخیز زمینیں اور دوسری خصوصیات اس کی ترقی کا سبب تھیں اور اب بھی ہیں۔ بعد میں یہ علاقہ صرف مندروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور قبائل کی بستی کو نشیب میں مختلف بستیوں میں بسا دیا گیا۔ روایت ہے کہ جب بدھ یہاں آئے تو یہ عمارت حاکم سیاگنگ کی حرم سرا تھی۔ یہاں اس کی وہ خاص کنیزیں رہتی تھیں جنھیں دنیا کے مختلف حصوں سے لایا جاتا تھا اور یہ گلیاں اسی لیے بنائی گئی تھیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں، کسی سے جا نہ ملیں۔ ان کا کوئی اور مقصد بھی ہو۔ یہ عشرت کے کسی کھیل کے کام بھی آتی ہوں شاید۔ تب یہ ایک بہترین پناہ گاہ بھی تھی۔ یہ حاکم قبیلے کی ثروت اور دولت کا ... تھا۔ بدھ دنیوی آلائش و ترغیبات پسند نہیں کرتے۔ ان کی تعلیمات دنیا سے کنارہ کشی اور قناعت پر مبنی ہیں۔ یاد کیا جاتا ہے کہ جہاں جہاں انھوں نے تبلیغ شروع کی حکومتوں اور لوگوں نے اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔ راہبوں کا یہاں ٹھہراؤ ہوا تو یہ گنج مال و اسباب بھی ان کے ساتھ تھا۔ حاکم سیاگنگ نے ان کی خوشنودی کے اظہار کے طور پر اپنے تمام خزانے سمیت اسے یہاں دفن کر دیا لیکن اس کی نیت خراب نہیں تھی۔ اس نے تمام عمارت پاٹ کے ایک یہ کمرہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ جب بھی چاہے نکال سکے۔ اس کا خیال ہوگا کہ جب بدھوں کے اثر و رسوخ کم ہو جائے گا تو خزانہ دوبارہ اس کی تحویل میں آ جائے گا لیکن بدھ راہب اپنی تعلیمات عام کرتے گئے اور بستیاں اور علاقے ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہاں رہبانیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جگہ جگہ سے راہب اس علاقے میں جمع ہونے لگے اور گوتم بدھ کی تعلیمات کی تفسیریں اپنی اپنی عقل و فہم سے پیش کرنے لگے اور انھوں نے یہاں نہایت ... ایک دستاویز مرتب کی۔ بدھ کے اقوال اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح ... دستاویز مشہور ہے کہ اس میں کوئی ایسا نقطہ بھی ہے جو گوتم بدھ کے ... سے گوتم کے یہاں پہنچا تھا اور اس میں مقدس نکات بھی تھے۔ ... بدھ کی اگلی ... سند حاصل تھی۔ وہ دستاویزیں محترم ہوتی گئیں اور تمام

وہ قیمتیں اس سے وابستہ ہو گئیں۔ ہیرو الرز نے اسے جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں مدفون خزانے کی تفصیلات درج تھیں بلکہ اس لیے کہ گوتم بدھ کی امانت تھی۔ ممکن ہے کہ یہ سینہ بہ سینہ حاکموں اور ملازموں کو کسی خزانے کی موجودگی کا علم منتقل ہوتا رہا ہو اور انھوں نے اس کی تحقیق و جستجو کی کوشش کی ہو لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مجھے ایک مدت لگ گئی۔ وہ کوئی عام نقشہ نہیں تھا جیسا عمارتوں کا ہوتا ہے۔ حاکم سیاگنگ نے اسے عجیب و غریب بنانے میں کوئی چال نہیں چھوڑی تھی۔ وہ نقشہ ایک بھول بھلیاں تھا۔ اس میں رمز ہی رمز تھیں، وہ رموز و اسرار دریافت کرتے کرتے مجھے اتنا وقت گزر گیا۔" اباجان کی آواز ڈوبنے لگی۔

سب ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ سب سنتے رہے۔ جیسے اباجان کے ٹوٹے ٹوٹے لفظ ان سبھی کی سمجھ میں آ رہے ہوں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ امی اور نمی کی شکلیں بار بار سامنے آ جاتی تھیں۔ جیسے ان کی روحیں اس تہہ خانے میں آ گئی ہوں اور وہ سفید کپڑوں میں ملبوس میرے اور اباجان کے درمیان سر جھکائے کھڑی ہوں۔ اباجان کا بھی امی اور نمی سے کوئی تعلق تھا۔ شاید انھیں بھی وہ نظر آ رہی ہوں۔ ان کی تھرتھراتی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی آنکھیں بھی جل رہی ہوں گی۔ کچھ دیر سناٹا طاری رہا۔ نہ وہ بولے نہ کوئی اور۔ وہ بولتے بولتے نہ جانے کیا سوچنے لگے تھے۔ کہاں کھو گئے تھے۔ پھر کسی کے ٹوکنے سے پہلے انھیں خود احساس ہو گیا کہ اور لوگ بھی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ "مجھے وقت لگ گیا۔ خاصا وقت۔" میری طرف نظریں اٹھا کے انھوں نے ... "زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ باہر کے گھر سے جانے کے بعد میں نے قدامت کی یوں ہی ورق گردانی کی تھی۔ اسی خیال سے کہ شاید اس کا کوئی سراغ مل جائے۔ دس بارہ کو کسی مدت لگتی تھی۔ ... ان دونوں کا کوئی ... چل سکو ... قدامت کے ... مراحل میری آنکھوں میں گھومنے لگے۔

مجھے ایسا لگا جیسے اباجان مجھی سے مخاطب ہوں۔ مجھے سنانے کے لیے یہ کہہ رہے ہوں۔ "حاکم سیاگنگ نے انھیں کس مشکل سے چھپایا تھا۔ بہرحال جو وقت گزرنا تھا، وہ گزر گیا۔ وہ واپس نہیں آ سکتا۔" انھیں جھرجھری سی آ گئی۔ "آپ لوگ اس کمرے کے چند در دیکھ رہے ہیں۔ ان میں صرف ... ایسے ہیں ... رکھا ہوا ہے۔ انھیں تلاش کرنا ایک کارے دارد ہے۔ آپ کو خیال ہوگا کہ محض دیواروں کے پیچھے نہاں ہوگا۔ وہ آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ... ایسا نہیں ہے۔ تمام ٹھوس ہیں۔ ان میں جو آپ ایک در کھلا ہوا دیکھ رہے ہیں، میں نے اس کا خزانہ ایک مناسب جگہ منتقل کر دیا ہے۔"

"ملا ہے آپ نے کیا کھو دیا ہے؟" تجمل نے وحشت سے کہا۔

"ہاں۔ ابھی باقی ہیں۔ پہلے خزانے سے جو کچھ برآمد ہوا ہے ... سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ باقی بھی

اتنا ہی کچھ ہوگا اور میں انھیں کھلواؤں گا۔ یہ اس میں وقت ... ہوگا۔ مہینے دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ یہیں پر وقت نہیں جا سکتا۔"

"ابھی اپن ادھر ہیں۔ اپن کو بولو۔" ہیرو جلدی سے بولا۔

"آپ ادھر ہیں اور میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ گو میرے لیے یہ انتہائی دشوار مرحلہ تھا۔ مجھے یہ سب قبل از وقت لگ رہا ہے مگر غالباً مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ آپ کی آوازیں کھوکھلی اور آپ کے ساتھ باہر ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ ... اس عمر میں آ کے ... بینائی اور سماعت پر کچھ اعتبار کرنا چاہیے۔ لیکن بھی اب کچھ چھپانا بہتر نہیں تھا کیونکہ میری شناخت ہو چکی ہے اور مجھے اس سارے کام کے تحقیقی پہلو سے زیادہ غرض تھی۔ ... یہ میری غرض بھی ... نہیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ کسی مجبوری سے نہیں۔ یہ میرے ... اور سننے کا اعتبار ہے۔ یہ اعتبار غلط ہو تو غلطی میری ہوگی۔ آپ نے اپنا اختیار خود ترک کیا ہے۔ اُسے غصب نہیں کیا ہے۔ ... کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ میری احتیاط کو میرا شک نہ سمجھیں۔ میں آپ پر کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ پر بھی اعتبار کریں۔ میں آپ کو ہی ایک مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ ان پیچ در پیچ راستوں سے ... ایک گورکھ دھندا ہے۔ یہ راستے صرف میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ نہ میں ... سے آپ کو منتقل کر سکتا ہوں نہ آپ اتنی جلدی انھیں سمجھ سکتے ہیں اور یہاں آ کے آپ کے لیے ان کا جاننا ضروری بھی ہے۔ ... سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ ... آپ نے جن غاروں میں ... دیکھی تھی، وہی جگہ جہاں زینہ ختم ہو جاتا ہے، وہ مورتی صرف میں ہی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہوں۔ آگے کوٹھے کے اسرار کے راستے سے ہٹایا جائے گا تو آگے کے راستے خود بخود مسدود ہو جائیں گے۔

سیاگنگ نے اس میں یہی خوبی رکھی تھی۔ وہ تن گرائی جائے گی یا اسے منہدم کیا جائے گا تو اس کے پاور کی چھت جھٹکے سے زمین کے ... پیچھے کے گل بند کر دے گا اور کوئی بھی باہر نہیں نکل سکے گا۔ سیاگنگ نے یہ اہتمام اس خیال سے کیا ہوگا کہ جب خزانے کی دستاویز کا حقیقی ... اس تک پہنچ سکے، کوئی دوسرا نہیں۔ یہاں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ لوگ یہاں اندر ہوں اور اس دوران کوئی حادثہ پیش آ جائے، کہیں پیر آتا پڑ جائے، کوئی بھی معطل ہو جائے، کوئی راستہ بند ہو جائے یا کسی اور قسم کی الجھن پیش آ جائے تو ہم کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔ میں نے لوگوں کی زندگی خطرے میں ڈالنے کی رائے نہیں دے سکتا۔ یہاں ... اور دینا بھی مشکل ہے۔ بار بار اس عمارت کے ... اس مخصوص عمارت میں آپ کا آنا بھی مناسب نہیں ہے۔ سیاگنگ ... سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنے متبرک کی نشانات کے ساتھ دوسری دستاویز ہونے کا بھی کچھ علم ہے۔ گمان ہے جس کا تعلق اس عمارت

کی زیرزمین دولت سمجھ بیٹھے ہیں انھیں شبہ ہے کہ کوئی اسے برآمد کرنے کی کوشش میں کبھی ادھر رخ کر سکتا ہے۔ ہرچند انھیں یقین ہوگا کہ وہ شخص اسے حاصل نہیں کر سکتا مگر اس طرح اس شخص کے ذریعے انھیں اپنے کاغذات کا سراغ مل جائے گا اور وہ صرف یہی چاہتے ہیں۔ وہ ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مدت میں میں وہ پہلا شخص ہوں جو یہاں تک پہنچ سکا ہے۔ مجھے ہر وقت یہی اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی زلزلہ نہ آ گیا ہو، عمارت اپنی بنیادیں نہ چھوڑ چکی ہو اور کھنڈر نہ بن گئی ہو لیکن یہ جو سے ایک پتھر ہی ہوں کا مرکز و محور رہی، انھوں نے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے بناتے اور مرمت کرتے رہے ہیں۔ عمارت کے نیچے جو زینے مختلف غاروں تک جاتے ہیں وہ ان ہی کی عبادت و ریاضت کے کام آتے رہے ہیں لیکن مجھے اب بھی بہت سے غاروں میں اسباب موجود ہوں۔ ہم یہاں آنے سے پہلے میں نے یہاں تعلیم کے اس مقدس مقام کی تمام عمارتوں کی تفصیل کتابوں اور مختلف حوالوں سے کر لی تھی۔ میں نے آپ سے مکمل کر سب بیان کر دیا ہے۔ آپ یہاں پھر ساتھ رہیں گے تو یہ خدشہ مجھے ہر لمحے کھٹکتا رہے گا کہ آپ کی زندگی بھی سے بندھی ہے۔ میں اپنی عمر گزار چکا ہوں۔ میرا وقت نہ جانے کب آ جائے۔ میں نہ رہا یا مجھ پر کوئی افتاد پڑ گئی تو آپ یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک حس اور مجھ جیسا راستہ سمجھنے والا شخص کیا ضمانت دے سکتا ہے کہ اُن کے اعصاب ٹھیک ہی رہیں گے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے مجھ سے ابر کا حوالہ دیا تھا۔ میں بھی آپ کو اسی کا حوالہ دے سکتا ہوں۔"

"ہم سب مجبور ہیں بڑے صاحب۔" قنبل نے مسکرا کے کہا۔

"یہاں ادھر کسی کا بھی پتا نہیں لگتا ہے۔ آپ ان کو چھوڑ دیں ہم ادھر رہ جائیں گے تو اپنے رہنے والے ادھر بہت کم ہیں۔"

"پھر بڑے صاحب اپنی محنت کیا کے آئے ہیں۔" پیرو لپک کے بولا۔ "اپن ایک بات جانتا ہے کہ جیتے رہنا سالا بائی چانس ہے۔ اپن کا غم جانے دو۔ ابھی ہم آپ کو ادھر چھوڑ کے اُدھر تال بجانے رہیں۔"

"بڑے صاحب! ہم کو معاف کرو، لاڈلا اپنا بھائی ہے۔" جامو آبا جان کے پاس جاکے بیٹھ گیا اور اُن کے پیر چھوتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو بولو بڑے صاحب!" سلطان بھی لپک کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔

"بولو تو ابھی ادھر رک جائیں۔" جامو نے غم خواری کے لہجے میں کہا۔

آبا جان ان دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے مسکرانے لگے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اپن اس کو ایک بھیجنے سے پہلے کھونٹے پر بند کر دیں گے۔ سب کسی رات کو ادھر بند ہو جائیں گے۔ سالا باہر ڈھونڈتے پھریں گے کہیں قنبل بھائی!"

"کچھ ایسا ہی کرنا ہوگا ورنہ" قنبل تعویذ لیتے ہیں لیکن سب نہیں آ تو سکے کہ اُدھر بھیجا ہوگا۔ باقی سوچنا اپنا کام ہے۔ بڑے صاحب! آپ ادھر مندر میں ہمارا انتظار کرو۔ جب تک ہم نہ آئیں اس طرف مت آؤ۔ ہم کل پرسوں جب بھی ٹھیک ہوگا آ جائیں گے۔"

آبا جان کے پاس شاید اب تمام الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ وہ اٹھے تو ہم بھی اُن کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اوپر بائیں طرف مندر کے مرکزی حصے کو جانے والی راہداری میں ہم نے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے سب سے پہلے آبا جان باہر نکلے۔ کچھ توقف کے بعد ہم سب۔ کمرے کی مشعل بجھ چکی تھی۔ گھپ اندھیرا اور خاموشی کا تسلط تھا۔ سیڑھیوں کی جانب سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہم اُس جانب گئے بھی نہیں بلکہ عقبی دروازے سے متصل چبوترے سے پھسلتے ہوئے زمین پر آ گئے۔ شعور زورا، پلٹو، ملاکو اور ملائی ہمیں سرائے میں لیٹے ہوئے ملے۔ وہ جاگ رہے تھے۔ ہم نے بھی اُن کے پہلوؤں میں بستر لگا لیے۔ آبا جان وہیں رک گئے تھے۔ ناشتے سے پہلے ہی ہم نے مندروں کے علاقے سے اترنا شروع کر دیا اور ابھی دھوپ پوری طرح پھیلی نہیں تھی کہ واپس بستی میں پہنچ گئے۔ چوک میں سامان لگنے کے بعد قنبل نے سیدھے سردار کے مکان کا رخ کیا۔ سردار کا چہرہ جیسے اُن ہی سے بنا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اُس کے رنگ میں یکسانی نہیں تھی۔ تاہم اُس نے ناماؤں کو بلا کے ہمارے لیے چائے اور دیگر چیزیں منگوانے کا حکم دے دیا تھا۔ پینے کے دوران جب قنبل نے اسے بتایا کہ اُسے اپنا شبہ کچھ درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ سردار کاغذات کے سلسلے میں دلچسپی رکھتا ہے تو سردار اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ اسی وقت ہمارے سامنے ہی پیرو کو طلب کرنے کا حکم دینے والا تھا۔ قنبل نے اسے منع کیا کہ ابھی وہ کچھ صبر کرے۔ سردار نے قنبل کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ شام بستی کے چوک میں وزیر اور طلاکو سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے جاتے ہی سردار نے پیرو کو طلب کر لیا تھا۔

شام ڈھلتے ہی ہم پھر ایک ڈنڈ لیوں پر آ گئے۔

میں قنبل، جامو، شعور، ملائی، مارٹی اور سلطان جنگ سے نکلتے ہوئے اور سامان اٹھانے کے لیے کوئی آدھے گھنٹے ہی اپنے میزبان جیبی و ساکے گھر پہنچے تھے۔ اُس وقت جیبی ورسا گھر سے نکل چکا تھا۔ شام کو ہم گھوڑی طرف [illegible] سردار کے ہاں سے آنے کے بعد کچھ وقت بستی کے چوک میں گزارا۔ پھر [illegible] چڑھنے لگے۔ میرے دل میں آیا تھا کہ قنبل سے کہہ کے سلطان کو روک لوں۔ آج دوسری رات تھی۔ سلطان پھر ہمارے ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ صبح گھر [illegible] داخل ہوتے وقت میں نے سلطان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ [illegible] منڈلا رہی تھیں۔ تاہم ہمارے سامنے نہیں آئی تھی [illegible] دروازہ بھی ناماؤں نے کھولا تھا۔ ہم کمرے میں گئے [illegible] کب جھکے سے باہر نکل گیا۔ ہم تیار ہو چکے تھے تب کمرے [illegible]

پہلو نظر آئی۔ پتہ نہیں وہ اُسے ملی یا نہیں۔ ورنہ وہ اتنی دیر میں ذرا سا عورتوں کا چہرہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ میں قنبل سے نہیں کہہ سکا اور کہتا تو کیا مزدوری تھا کہ وہ میری بات مان ہی لیتا۔

بڑے مندر میں رات کا کچھ باقی تھے ہم دوسرے مندروں کی طرف چل گئے۔ پروگرام کے مطابق پیرو اور وزیر وغیرہ جو تھے مندر میں موجود تھے ہم نے جو تھا خیر اُسے اپنی سہولت کے لیے دیا تھا۔ مندر وہاں گھنٹی سے ہی بچولے جاتے تھے۔ وہاں سے ہم سب ساتھ ہو گئے۔ سوالوں سے آگے جھک لائی جو تدبیر پر عمل کیا وہ قدیم مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کے ساتھ صورت تھا کہ ہم اندر پہنچ گئے۔ آبا جان ہماری راہ تک رہے تھے۔ رات ابھی زیادہ نہیں گزری تھی۔ ہم نے ہتھوڑیاں، چھینیاں، کھیں اور بچے کھونٹے والے دوسرے اوزار صبح ہی اپنے اوور کوٹ کی جیبوں میں چھپا لیے تھے۔ پیرو کے ساتھ بھی یہی کچھ تھا۔ کل کی طرح مارٹی اور سولم کو ہم نے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ اُن کی جگہ پیرو اور وزیر ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ہم کل جو تھے مندر میں زینوں اور سرنگوں سے گزر کے جیسے ہی ہم متعلق حجرے میں پہنچے ہم نے ایک پل برباد نہیں کیا۔ آبا جان نے اپنے کونے کونے [illegible] تین دروازوں کے ایک درز پر نشان لگوایا تھا۔ ہم نے اسی [illegible] ہتھوڑیاں چلانی شروع کر دیں۔ تمام درزیں پوشیدہ تھیں اور [illegible] جسم کو پلاستر کیا گیا تھا۔ آبا جان نے فرش سے ایک گز اونچی [illegible] کھدائی کرنے کی ہدایت کی تھی۔ پلاستر نے چند ضربیں بھی [illegible] اتنے برس گزرنے کے بعد بھی اُس کی سختی [illegible] نہیں آیا تھا۔ فولاد کی چادر جیسا تھا۔ ہمارے پاس بڑے ہتھوڑے [illegible] تھے۔ بہرحال جیسے تیسے ہم نے اپنا کام جاری رکھا اور فرش سے [illegible] مختلف جگہوں پر ہتھوڑیاں مارتے اور چھینیاں چھوتے [illegible] آبا جان کی کھدائی کا سامان کرتے ہی میں رکھا ہوا تھا [illegible] اور چھینیاں تھیں۔ وہ ہمارے اوزاروں سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھیں لیکن اچانک آبا جان نے ہمیں روک دیا اور ہم میں سے تین آدمیوں کو [illegible] بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ قنبل پیرو اور وزیر ان کے کہنے پر دیوار [illegible] گئے۔ وہ کوئی چوڑائی زینے سے زیادہ ڈیڑھ گز ہوگی۔ لمبائی آبا جان [illegible] کے محدود کر دی تھی۔ اتنی مختصر جگہ پر بیک وقت ہم چھ آدمیوں کے [illegible] سے ہاتھ اُلٹے سیدھے پڑ رہے تھے اور ہم ایک دوسرے میں [illegible] تھے۔ آبا جان کو کسی نے ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ انھوں نے [illegible] کو دیوار سے واپس بلا لیا اور ہمیں دیوار میں ترتیب سے چھینیاں [illegible] کر دیا۔ میں اس طرف جامو اُس طرف درمیان میں سلطان اور [illegible] کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنی مقررہ حد میں [illegible] نشان ڈال چکے تھے۔ کچھ نشان پہلے ہی پڑ چکے تھے۔ آبا جان [illegible] وہاں سے ہٹا دیا اور قنبل، پیرو اور وزیر سے آگے بڑھنے کو کہا۔

قریب قریب ضربیں لگانے سے پلاستر کمزور ہو گیا تھا۔ قنبل پیرو اور وزیر کی چھینیوں سے جگہ جگہ پتھر جھڑنے لگے۔

آبا جان نے ایک بار انھیں پھر ہٹا لیا اور ہمیں دوبارہ دیوار پر بھیجا۔ ہمارے ہاتھوں کو اس وقفے میں سکون مل گیا تھا۔ ہم نے وہ سارا پلاستر چھینیوں سے جدا کر دیا۔ اندر سے موٹے سیاہ پتھر ننگے ہو گئے۔ اُن کی لمبائی چوڑائی سے اُن کی جسامت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہم وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے اس سے پہلے کہ آبا جان ہمیں پیچھے ہٹاتے اور ہماری جگہ اور لوگ آتے ہم نے پتھروں پر پہلے تو ہاتھ ہتھوڑیاں مارنی شروع کر دیں۔ ہر ضرب پر پتھر کی ایک چیخ سی بلند ہوتی تھی۔ ہمیں پتھر سوکھتے محسوس ہوئے ہم پر دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔

آبا جان نے ہی قنبل سے کہا ہوگا کہ اس نے اور پیرو نے ہم پر جھپٹ کے ہمارے ہاتھوں سے اوزار چھین لیے اور ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔

وہ سامنے کی بات تھی جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آبا جان اسی کا اشارہ کر رہے تھے۔ ہمیں پتھروں کے درمیان صرف درزوں کے مسالے پر نشانے لگانے چاہییں تھے۔ درزوں میں مسالے کی تعداد ابھی خاصی تھی اور یہ ہمارے لیے ایک اچھی بات تھی۔ پتھر بڑے ہونے کی وجہ سے درزیں زیادہ بھی نہیں تھیں۔ ایک گز کی لمبائی میں اوپر سے نیچے تک چار پتھر آتے تھے اور اسی طرح چوڑائی میں بھی۔ قنبل پیرو اور وزیر نے آبا جان کی ہدایت کے مطابق اُن کے جوڑوں میں لگے ہوئے مال ہی کو گرفت پر توجہ مرکوز رکھی۔ بعد میں اُن کی جگہ ہم پہنچ گئے۔ پھر اسی طرح ہم باریاں تبدیل کرتے رہے اور اس کے بعد ہم نے آبا جان کی مدد کے بغیر کوئی چھینی نہیں ٹھوکی۔ باری باری آنے سے ہمیں اتنی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن جیسا کہ آبا جان نے کل رات کہا تھا، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے کو حیرت تھی کہ انھوں نے تن تنہا ایک درز کیسے کھود لیا تھا۔ اس کا ملبہ وہیں پڑا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک ہی رات میں چھالے پڑنے لگے تھے اور ابھی درز پوری طرح کھلا بھی نہیں تھا۔ ساری رات کو ٹھک ٹھک ٹن ٹن کی صداؤں سے گزر گیا۔ اندر اتنی ٹھنڈ نہیں تھی جتنی باہر تھی۔ کھدائی کرتے کرتے جلد سارا جسم پسینے میں بھیگ جاتا تھا۔ آبا جان بار بار تاکید کر رہے تھے کہ ہم آہستہ آہستہ ضربیں لگائیں لیکن جیسے ہی باری آتی تھی اور چھینی ہتھوڑی ہاتھ میں آتی تھی جی چاہتا تھا کہ پتھر کے دو ٹکڑے کر دیں یا اسے شق کر دیں۔ کاش اُن پر ہمارے ہاتھ چل سکتے۔ درزیں پتھر کی بڑی جسامت کی وجہ سے اتنی گہری تھیں۔ ہم نے فرش سے اوپر پتھروں کے ساتھ جڑا ہوا مسالا نہیں چھوا تھا۔ تاہم نیچے ہاتھ چلانا مشکل تھا۔ پہلے پتھر فرش ہی سے پیوست تھے لیکن پھر ایک اُن کے درمیان کی تمام درزیں ہم نے کھوکھلی کر دی تھیں۔ اس طرح اُن کی باہم پیوستگی خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ سامنے کے پتھروں کی بھرائی کو انھیں کوئی سہارا نہ رہا تھا۔ ہماری ہتھوڑیوں سے اور دوسرے اُن کے اپنے وزن کے دباؤ سے ایک دوسرے پر اُن کے گرنے میں صرف ایک ہی کسر رہ گئی

رکھ سکتے تھے۔ اس کا احساس اُنھیں ہو چکی رات مندروں کے علاقے میں
بستی کے لوگوں کی بڑھی ہوئی تعداد سے ہو گیا ہوگا۔ شام ہوتے ہی دونوں
قافلوں کے آدمی اوپر کا رُخ کیوں کرتے ہیں۔ مختلف مندروں میں کیوں
پھرتے رہتے ہیں۔ اُنھیں وہاں کس چیز کی تلاش ہے۔ کیا وہاں ان کے
کچھ اور لوگ بھکشوؤں کے بہروپ میں چھپے بیٹھے ہیں یا وہ کسی آدمی کی
جستجو میں اُدھر جاتے ہیں جو اُن کے خیال میں کاغذات لے کے اُدھر
گیا یا آیا ہی چاہتا ہے۔ سردار اور اس کے ساتھیوں کے ذہن میں ان
گنت سوال اُبھرتے ہوں گے۔ اس نے ایک بار اچانک ہمارے تین آدمیوں
کو یرغمال بنانے کا فیصلہ اسی لیے کر لیا تھا کہ وہ ان سوالوں کے جواب
جاننے کی بے چینی تھی۔ کسی وقت بھی وہ ایسا ہی کوئی اور فیصلہ بھی کر
سکتا تھا۔ ہم ازخود ہی کہ ہم پر مندروں میں جانے کی پابندی عائد کر دے یا
صرف دن کا وقت مقرر کر دے۔ یوں کہ ہم کسی صورت میں قدیم مندر کے
زیرِ زمین راستوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے ہمیں کھلا چھوڑ
رکھا تو صرف اس لیے کہ ہمارے دو آدمی بستی میں پڑے تھے، ہمارا سامان
بھی وہیں موجود تھا اور ہم بظاہر قبیلے کی زندگی میں کسی رخنے کا سبب نہیں
بنے تھے اور ہمارے بقول ہم پر کوئی ایسی ویسی بندش عائد کرنے سے وہ
کرتل مل جانے کا اندیشہ تھا جو عرصے بعد قبیلے میں ہمارے آنے سے پھوٹی
تھی۔ کاغذات ملنے کی یہ آس کسی طرح بندھی رہنی چاہیے۔ جھل نے اسے
یہی تاثر دیا تھا کہ ہم بھی اُنھی کی طرح ہیں مگر یہ تاثر کب تک قائم رہے
گا۔ سردار کا ہمارا ضبط کب تک نہیں چھلک پائے گا۔ ہم نے اُس سے دو ہفتے
اور جھل نے چار ہفتے کی مہلت مانگی تھی۔ یہ مہلت خود اُن کی مانگ کردہ تھی
اور محض اس وجہ سے تھی کہ سردار کے پاس سوچنے کا سامان ہے۔ ہماری جو اُس
کے ماجلا فیصلوں میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتی تھی اور ہمیں کچھ فراغت دے
سکتی تھی لیکن لیٹنے کی بنیاد ابھی تک موجود تھی اور سردار بستی میں اکیلا ہی
نہیں تھا اور بھی لوگ قبیلے کے بزرگ لوگ اس کی سوچ میں شریک تھے۔
جب جھل نے اُس سے کاغذات کا ذکر کیا تھا تو سب کو حیرانی ہوئی
تھی کہ اس سے کوئی لغزش تو سرزد نہیں ہوئی ہے مگر اس نے بستی میں چند
دن گزارنے کے بعد سردار سے یہ ذکر کیا تھا۔ اگر وہ نہیں کرتا تو ہم اس طرح اوپر
آجا نہیں سکتے تھے اور سردار یہی کر سکتا تھا کہ وہ اور ہم چاروں طرف بستی کے
آدمی پھیلائے مگر وہ کچھ اور بھی کر سکتا تھا۔ وہ یہاں کا سردار تھا اور ہم پناہ گزین۔
ابھی تین در باقی تھے اور یقینی نہیں تھا کہ ان تین کی نشاندہی
بھی آجان ٹھیک ہی کریں۔ ٹھیک بھی ہو تو ایک در کے کھلنے میں
ڈھائی راتوں کا وقت لگتا تھا گویا تین دروں کے لیے ایک ہفتہ۔ مزید
ایک ہفتے تک ہم روز اوپر جاتے اور واپس آتے رہیں گے اور سردار اپنے
آدمیوں سے صرف ہماری سرگرمی کی اطلاعات سنتا رہے گا۔ اگر ہم کسی غلط
ذریعے تھوڑا مال چلانے لگے اور باقی تین در سب سے آخر میں نمودار ہونے

تو ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا۔ اگر ہم اپنے تمام آدمی اوپر لے جاتے تو دو
دروں پر بیک وقت کام کر سکتے تھے۔ یہ سب رات ہی ختم ہو جاتے اور دن
رات وہیں رہتے تو چند دن لگتے۔ میں جھل سے کہنا چاہتا تھا کہ یہی
ایک تدبیر سب سے بہتر ہے۔ جیتی اور سارنگ بھی ٹھیک ہو چکے ہیں۔ ایک
رات پانی اور کھانا لے کے ہم سب بند ہو جائیں۔ وہ ہمارا سراغ بھی نہیں
لگا سکتے۔ تین دن تک ہم شب و روز محنت کر کے سارے در کھول چکے
ہو سکتے تو کہ انھیں بھی ساتھ لے آئیں گے۔ اس کے بعد جو ہوگا، دیکھا
جائے گا۔ ہم اپنا کام تو کسی طور ختم کر ہی لیں گے اور ہمیں بار بار اوپر نہیں
آنا پڑے گا۔ تین دن بعد رات کے اندھیرے اور اطمینان میں ہم برآمد ہوں
گے تو کسی طرف بھی نکل جائیں گے۔ چلتے رہیں گے، چلتے رہیں گے اور جلد
سے جلد اس علاقے سے دور ہوتے رہیں گے۔ پیچھے رکھے ہوئے سامان پر
خاک ڈال جائے، جتنا کچھ ہم پر بچ گئے ہیں اور جتنا اور بچ سکتے ہیں، اُن
سے ہمارے پاس اتنے روپے ہوں گے کہ ہم آگے کسی منزل پہ جا کے نئے
خچر اور سامان مہیا کر لیں۔

اچھا ہی ہوا کہ میں نے جھل سے اپنی اس تدبیر کا ذکر نہیں کیا۔ اسے
بتانے سے پہلے ہی مجھے اس میں خامیاں نظر آنے لگی تھیں۔ جھل سنتا تو
شاید بہت ہنستا۔ اوپر جانے کے بعد تین دن تک ہم باہر نہیں نکلیں گے تو
وہ اپنی ساری آبادیاں اوپر لے آئیں گے۔ اُن کے پاس بہترین نسل کے
ناک ہیں۔ جن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تو بھی راستے وغیرہ ڈھونڈ
لیتے ہیں۔ بارشیں، برفانی طوفان وغیرہ کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ پھول
داریوں، وافر غذا اور دوسرے سامان کے بغیر ہم کتنی دور جا سکیں گے۔
ایک در کا خزانہ آجان کے کہنے کے مطابق وہ ایک محفوظ جگہ
منتقل کر چکے تھے۔ دوسرے دو دروں کا خزانہ ہم نے بس اُس کی قدر و قیمت
کا اندازہ لگانے کے لیے چھو کے دیکھا تھا اور وہ بھی آجان کی خواہش پر
جہاں تک میرے سامنے کی بات ہے کسی نے آجان سے اُس کی منتقلی
کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اصولاً وہ بھی انھیں اسی محفوظ جگہ پہنچا دینا
چاہیے تھا۔ کاغذات سے آجان کو تمام دروں سے نکلنے والے ذخیرے
کا تھوڑا بہت علم ہوگا ہی اور انھوں نے اسی اعتبار سے اُس کے لیے
کوئی بہت ہی محفوظ اور گنجائش کی جگہ ڈھونڈی ہوگی مگر کیا وہ پہلے سارا
خزانہ اسی جگہ پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے یا سارے در کھول لینے کے بعد اُن
کا ذخیرہ اس کمرے میں کھلا رکھنے کا خیال تھا۔ کیونکہ وہ یہ تمام ہرگز اپنے ساتھ
نہیں لے جا سکتے تھے۔ ایک بھکشو زادِ راہ میں بہانا نہیں لیے پھرے، وہ
تھوڑا تھوڑا ہی ہندوستان منتقل کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک در
سے نکلنے والے ذخیرے کے بقدر۔ اور یوں وہ قدیم مندر میں اپنی تلاش
کی بڑی محفوظ جگہ پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتے تھے کہ تمام کو تمام پہلے وہاں پہنچا دیں
اور اس میں سے تھوڑا تھوڑا نکال کے ہندوستان لے جاتے رہیں اور

ہندوستان کا طویل دورہ کر کے واپس آئیں تو اس جگہ پر کسی کی نظر نہ پڑ
سکے۔ یہ بے احتیاطی آجان سے ممکن نہیں تھی۔
تمام دروں کے ایک ہی بار کھولنے سے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب
بار بار زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ دوبارہ خزانے کی دوسری قسط لینے
ہندوستان سے انھیں تو صرف آنا اور لے جانا ہی رہ جاتا اور اُس طرح
کل ذخیرے کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہمارے شامل ہونے کے بعد صورت
کچھ بدل گئی تھی۔ اب وہ تنہا نہیں تھے۔ تمام دروں کا ذخیرہ ایک ساتھ لے
جایا جا سکتا تھا مگر کہاں سے؟ مرغوں سے براہِ راست یا آجان کی محفوظ
جگہ سے؟ وہ محفوظ جگہ کہاں ہے؟ ظاہر ہے قدیم مندر سے زیادہ دور نہیں
ہوگی یا ہو بھی سکتی ہے۔ ہم قدیم مندر سے اپنے مرغوں اور کاندھوں پر لاد
کے کیسے برآمد ہوں گے۔ ہر طرف قبیلے کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوچتے
سوچتے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آجان تک پہنچنا، در کھولنا مجھے اتنی بڑی
بات نہیں معلوم ہوتی تھی جتنا دروں سے نکلا ہوا ذخیرہ اپنے صندوقوں میں
منتقل کرنا اور بستی سے بخیریت دور ہو جانا۔ ہو سکتا ہے آجان اور جھل
کے درمیان کوئی بات ہوئی ہو۔ بہرحال دونوں دروں کی دولت وہیں
پڑی رہی۔ البتہ آجان نے پہلے در کے مانند منتقل نہیں کیا۔ جواہر کا
برتن اور زیورات کا صندوق دونوں کمرے کے ایک گوشے میں رکھ دیے
گئے تھے اور تیسرے در کی کھدائی شروع کر دی گئی تھی۔
جھل نے سردار سے ایک بار کنایۃً کہا تھا کہ مندروں کے علاقے
میں کاغذات سے متعلق کوئی اشارہ مل سکتا ہے۔ بات واضح نہیں تھی
مگر سردار کا ذہن وہاں موجود بھکشوؤں کی طرف جا سکتا تھا۔ گو وہ بھکشوؤں
پر شک کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں ان کا درجہ بہت بلند تھا
لیکن ان حالات میں برائے مصلحت وہ یہ روایتی احترام بالائے طاق
رکھ کے کوئی جرأت نہیں کر سکتے؟۔ اور ان کی نگاہ بھی فوراً ہندوستانی
شکل و صورت کے بھکشوؤں پر جائے گی۔ آجان اپنے منڈے ہوئے سر، چہرے
بشرے، تبتی زبان سے واقفیت کے باوجود صاف ہندوستان سے تعلق
رکھنے والے آدمی تھے۔ دس مختلف قوموں کے بھکشوؤں کے درمیان ان کے
ہندوستانی خط و خال صاف پہچانے جا سکتے تھے۔ ہم نے اپنی طرف سے
آجان یا کسی بھکشو سے اپنے تعلق کا شائبہ تک بھی انھیں موقع
نہیں دیا تھا مگر وہ خود ہی اپنے طور پر بھکشوؤں خصوصاً ہندوستان سے
آنے والے بھکشوؤں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی شروع کر سکتے تھے۔

دوسرا در کھولنے کے بعد ہم سرائے میں کچھ وقت گزار کے دن
کے اوّل پہر بستی میں واپس آ گئے تھے اور بازار لگا کے ہم نے اپنا کچھ
سامان اور نکال دیا تھا مگر جلد ہی پیرا اپنے صندوق لے کے چوک پر
آ گیا اور اونے پونے مال اُٹھانے لگا جب تک ہم چوک میں بیٹھے رہے۔

پیرے کے سامان کے گرد منڈلاتا رہا۔ اس وقت اس کے پاس شاید ہی
کچھ باقی رہ گیا ہو۔ انھی صندوقوں کا سامان جو وہ بستی کے چوک میں اپنی
قیام گاہ سے نہیں لایا تھا۔ اس نے ضرور کچھ رنگ کے کاہو گا۔ مال خرید
کر کے ویسے بازار سے خرید لایا ہوگا۔ اناج کے تھیلے، چاول، پھینیاں
تھوڑی کتابیں اور دوسری مختلف چیزیں۔ اسی شام اپنے وقت
مطابق مندروں کے علاقے اور مختلف مندروں میں گھومتے رہے۔ پیرو ہمیں
کہیں نہیں ملا۔ ہم قدیم مندر میں بھی تھوڑی دیر کے لیے گئے۔ آجان بھی
وہاں موجود نہیں تھے۔ رات ہم سرائے میں آ کے لیٹ گئے اور صبح
سویرے بستی میں واپس آ کے سیدھے سردار کے مسکن پر پہنچے۔ ہماری آمد
بے وقت تھی۔ سردار نے ہمیں اپنے خاص کمرے میں طلب کر لیا۔ اس کی گردن
تنی ہوئی تھی۔
"ہمیں پتہ چلا ہے کہ دوسرے قافلے کے کچھ لوگ ادھر بستی سے
واپس جا رہے ہیں۔" جھل نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔
سردار نے اثبات میں ایک ہی مرتبہ گردن کو جنبش دی۔
"وہ کیا بولتے ہیں؟ جو کہے تم ہم کو بتاؤ۔"
سردار چند لمحے چپ رہا پھر بات اُلٹ میں بولا "وہ جو جانا
چاہتے ہیں۔"
"کدھر؟ تم نے پوچھا کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں؟"
"ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔"
"تم نے ضرور پوچھا ہوگا۔" جھل اُونچے لہجے میں بولا "ایسا نہیں ہوگا
کہ تم نے نہیں پوچھا ہوگا۔ تم کو انھوں نے غلط بولا ہو تو دوسری بات ہے۔"
"تمھارے خیال میں وہ کس طرف جانا چاہتے ہیں؟" سردار نے
تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"تم بھی سمجھتے ہو، ہم سے کیا پوچھتے ہو۔"
"ہم کچھ نہیں سمجھتے۔"
"سردار!" جھل نے ترش لہجے میں کہا۔ "اپنے سے کچھ چھپاؤ گے تو اچھا
نہیں کرو گے۔ پیرو ہمارے دو آدمی، اس نے تم سے جو کچھ بولا — سب ہم بہت جانتا۔
تم کو جلد ہی اُن لوگوں کا پتہ چل جائے گا۔ ابھی ہم تم سے ایک بات بولنے
آئے ہیں۔ اپنے دو آدمی بھی اُن کے ساتھ کر دو، خطا کے لیے یہ اچھا
ہی ہوگا۔"
"کس کے دو آدمی؟" سردار تیزی سے بولا۔
"ہمارے دو آدمی، سمجھو ہم کو بولتے ہیں — ہم تم نے اچھی
طرح دیکھ لیا ہے ابھی ہم چاہیں تو وہ لوگ ادھر سے سامان بھی اپنے
ہاتھ پیر ٹھیک نہیں لے جا سکتے۔ یہ بات ہم سے چھوٹی ہے — اور
تم نے وعدہ کیا ہے کہ تم اپنی مدد کرو گے۔ ہم نے تم سے کوئی دھن نہیں مانگی
ہے۔ ایک بات بولتے ہیں — سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو — وہ واپس جانے کو

بولتے ہیں یا کچھ ہری کو۔ بولو کہ یہ دو آدمی جو اُدھر جانا مانگتے ہیں ہمارے ساتھ رکھو۔ تمھاری بات وہ منع نہیں کریں گے اور منع کرے تو زور سے بولو کہ کچھ دور تک اُن کو ساتھ رکھو۔ جہاں کوئی دوسرا قافلہ ملے، اُن کو الگ کر دینا۔ اُدھر پھر اپنے آدمی خود دیکھ لیں گے اور تم کو یہ سب بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ کبھی منع نہیں کریں گے۔"

"تم خود کیوں نہیں کہتے؟"

"تمھاری بات اور ہے۔ تمھارا اُس میں کچھ نہیں جاتا۔ پھر ہم اِدھر پہاڑ بھی نکلے نہیں بیٹھے ہیں۔ اپنا بہت کچھ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنا آدمی اُدھر سے اُن سے پہلے اِدھر واپس پہنچ جائے۔ اس میں تمھارا کیا جاتا ہے؟"

"ہمارا کوئی حرج نہیں،" سردار بیزاری سے بولا۔

"پھر کیا ہے؟" قبل نے کہا۔ "جیسا ہم بولتے ہیں ویسا ہی کرو۔ وہ سالا سمجھنے لگا کہ ہم جانتے ہیں اُس نے تم راستے جانے کا صاف مطلب نہیں بولا ہوگا۔ ہم اپنے آدمی ویسے بھی اُن کے پیچھے کر سکتے ہیں۔ پر راضی خوشی بات مان جائے تو ہمارا اچھا ہے۔ دونوں کو بھلا ہے۔"

سردار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ قبل نے اُس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اُس سے اجازت لے کر اُٹھ کے چلا آیا۔ اُسی دن سفر کے لیے کئی ضروری چیزیں ہم نے بازار سے خریدیں اور انھیں گھوڑوں پر رکھ کے شام کو ہم سردار کی قیام گاہ پہنچے۔ سردار نے اُسے بلا کے کہہ دیا تھا لیکن بستی کے دوسرے لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر ہم سے بہ ظاہر بے اعتنائی سے ملا۔ قبل نے اُس سے اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے جانے کو کہا تو اُس نے بگڑے ہوئے منہ سے قبول کر لیا۔

رات بھر ہم بھی دسا کے مکان ہی میں رہے۔ کوئی سات دن ہو گئے تھے، ہم کسی رات بھی سرائے میں ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے تھے یا سہ پہر کو کبھی کبھار دن میں دو ایک گھنٹے۔ سبھی کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ دنوں میں بارہ کے درد اُٹھنے لگتا تھا اور ہم گرے سے جاتے تھے۔ بھی دسا کے ساتھ رات کا کھانا کھا کے جیسے ہی ہم لیٹے، تن من کا ہوش نہیں رہا۔ [illegible] اُس رات بھی دیر تک نہیں سو پایا ہوگا۔ اتنی راتوں میں پہلی بار اُس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ کھانے کے وقت میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اُس نے آج خوب صورت کپڑے پہن رکھے تھے اور خوشی سے اُس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ گال اُس کے جیسے کچھ اور لال ہو گئے تھے۔

صبح ہم سبھی سواری اور سفر کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے کارتوس، دو بندوقیں، ایک [illegible] بستر اور چند تھیلے اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ سامان جو ہم نے کل شام ہم نے اُن کے لیے خریدی تھیں اُونٹ سے [illegible] خود رکھ لی تھیں۔ صرف کھانے پینے کا سامان

اور کدال۔ بستی کے کنارے جیپی پہنچا اور روانگی کے لیے تیار کھڑے تھے اور ہماری آمد کے منتظر تھے۔ اُن کے پاس بھی دو بندوقیں تھیں۔ یاک کی کمر سے اُن سب کا سامان لٹکا دیا گیا جو باقی یاکوں پر بچ گیا تھا۔ تین ہی اُن کے ہمراہ تھے۔ قبل اور پیرو نے الگ الگ لے جا کے اپنے آدمیوں کو ہدایتیں دیں۔ سورج چڑھنے سے پہلے وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔

ہم نے اُس دن بھی مندروں کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سارا دن یا تو ہم بستی کا چکر لگاتے رہے یا اطراف کے پہاڑوں پر گشت کرتے رہے۔ قبل اور جاہو نے بندوق سے بہت سے پرندوں کا شکار کیا۔ اُس میں سے اچھا شکار انھوں نے سردار کے لیے بھجوا دیا۔ پیرو نے اُس روز بھی بازار لگایا تھا۔ سہ پہر کو وہ بھی ہمیں پہاڑوں میں گھومتا ہوا مل گیا تھا۔ ہم میلوں تک ڈنڈیوں پر چلتے رہے تھے لیکن اندھیرا ہوتے ہوتے اپنے گھر لوٹ آئے تھے۔ سردار بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے اُن کی کچھ باتیں سن لی تھیں اور چونکہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے چپ ہی رہا تھا۔ تیسرے دن ہم مندروں کے علاقے میں گئے، دن ہی دن میں واپس آ گئے۔ پیرو ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ آباجان اِدھر کہیں بھی دکھائی نہیں دیے تھے۔ ہم قدیم مندر کی عمارت میں بھی نہیں گئے تھے اور آباجان سے ملاقات وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اب بھی بستی کے آدمی اُدھر تعینات تھے لیکن اُن کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ سُولم کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں لوگوں سے بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اتنے عرصے میں جو تھوڑی بہت شُد بُد آ گئی تھی، ہم اُسی سے کام چلا رہے تھے۔ تشائم کے حوالے سے ہمیں یقین تھا کہ ہمارا میزبان بوڑھا جن دسا بھی ہندوستانی جانتا ہے مگر وہ اکثر مشکل سے ہماری ٹوٹی پھوٹی سندا اور اشاروں میں بھی ہم آ [illegible] رہا۔ اُس نے ایک ہندوستانی لفظ بھی منہ سے چھوٹنے نہیں دیا لیکن سردار نے ایسا نہیں کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہندی جاننے والا ہمارا آدمی اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ سو ہم تیسرے دن ولایتی شراب کی ایک اور بوتل، نفیس قسم کے کپڑے، تھیلیاں اور راستے لے کے اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے ایک بوڑھے ترجمان کو فوراً بلا لیا۔ سردار توقع کر رہا ہوگا کہ ہم اُس سے کوئی اہم بات کہنے آئے ہیں لیکن ہمارے پاس آنے والے دنوں کے لیے امیدوں اور آرزوؤں کے اظہار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سردار بہت افسردہ تھا، تھکا تھکا سا، کھویا کھویا سا۔ اُس نے ہم سے زیادہ بات بھی نہیں کی۔ قبل بھی زیادہ دیر اُس کے پاس نہیں بیٹھا۔

یہ تین دن ہم بستی کے پہاڑوں کی ایک طرح سے سیر کرتے رہے۔ دن بھر شکار کرتے اور گھر لوٹ کے سارا شکار جن دسا کے سپرد کر دیتے۔ وہ کچھ روک کے باقی سب بستی کے ممتاز لوگوں میں اپنے خادم کے ذریعے

تقسیم کرا دیتا۔ تین راتوں تک ہم اپنا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھاتے رہے۔ وہ یاک کے مکھن میں بھونا جاتا تھا۔ شروع شروع میں یاک کے دودھ اور مکھن سے ہمیں بہت کراہت محسوس ہوتی تھی، جی متلانے لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم اُس کی بُو کے عادی ہو گئے اور بہت سی چیزیں منہ کو لگ گئی تھیں۔ سُولم اور بارتی کے جانے سے ہم خالی خالی سے ہو گئے تھے۔ ہم صرف چار رہ گئے تھے۔ قبل، میں، جاہو اور سلطان۔ اُدھر بھی پیرو کو ملا کے چار ہی آدمی تھے۔ وہ خود، وزیر، سارٹے اور ملاکو۔

اور ایک رات ساری رات ہم سوتے رہے اور ناشتے کے بعد بھاری زنبیلیں اُٹھا کے پھر بستی کے اردگرد پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ گزشتہ دو روز سے شکار لانے کے لیے یہ زنبیلیں ہم اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ چلتے چلتے ہم بستی سے خاصی دُور گھنے جنگل میں چلے آئے۔ پیرو بھی کچھ دیر بعد ہمارے ساتھ آ ملا تھا۔ جب تک اندھیرا نہیں ہو گیا، ہم سب اونچے درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپے رہے۔ وہیں ہم نے خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا تیار کر لیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی بستی میں واپس جانے کے بجائے ہم درختوں کے نیچے نیچے اور اُوپر بڑھتے گئے۔ جہاں تک ہم جوتے پہن سکتے تھے، پہنے رہے۔ سخت چڑھائی پڑنے کے بعد ہم نے جوتے اُتار کے زنبیلوں میں رکھ لیے، موزوں پر ہی اکتفا کیا اور کانٹوں، جھاڑ جھنکاڑ سے بے نیاز آگے ہی بڑھتے رہے۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ ہماری منزل سامنے تھی۔ قدیم مندر۔

تین دن تک یہاں آنے کے لیے ہم پہاڑوں میں ایسا ہی کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قدیم مندر دوسرے مندروں کے مقابلے میں کسی قدر نشیب میں واقع تھا اور بستی سے اُوپر ایک وسیع سبزہ زار پہاڑی سلسلے سے متعلق تھا۔ اُس کے ایک جانب تو مندروں کا علاقہ تھا، دوسری طرف عموماً ڈھلوان متوازی نشیبی سلسلہ تھا اور گھنا جنگل اُگا ہوا تھا۔ مندروں کے علاقے سے یہاں آنے کے لیے صاف راستے کی موجودگی میں لوگ یہ دشوار گزار راستہ کیوں منتخب کرتے۔ انسانی پیروں سے نہ لپنے کی وجہ سے یہاں جھاڑ جھنکاڑ کی بہتات تھی۔ ہم سرِ شام ہی قدیم مندر سے قریب ایک نشیب میں آ کے رک گئے تھے۔ اس جگہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں پہاڑوں پہاڑوں ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ ہم جنگل کے اندر اندر ہی چلتے رہے تھے۔ اُونچے درختوں نے ہماری نقل و حرکت پر ایک پردہ سا ڈال رکھا تھا۔ اُوپر سے کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب تک دن تھا، بھولے بھٹکے کسی کی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی۔ ہم نے اسی لیے اندھیرا ہونے کا انتظار کیا۔ اس وقت تک ہمیں کوئی دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ ہم شکار کرتے کرتے اِس طرف آ نکلے ہیں۔ پھر بھی ہمیں آج کا دن ملتوی کرنا پڑا تھا۔ تین دن سے ہم کسی ایسی جگہ کی نشان دہی کی کوشش میں تھے جو چڑھائی کا باقی سفر طے کرنے کے لیے مندروں سے

دُور رہے اور جہاں اندھیرا ہونے تک ہم آسانی سے چھپ سکیں۔ اس جگہ ہمیں کھائیوں اور دوسری جڑی [illegible] سفر کو [illegible] سکتا تھا۔ یہ باقی سفر ہمیں اندھیرے ہی میں عبور کرنا تھا۔ [illegible] جگہ قدیم مندر سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہونی چاہیے تھی تاکہ رات ہی رات میں ہم وہاں پہنچ سکیں۔ آگے کا راستہ ہمارا دیکھا بھالا نہیں تھا۔ دونوں پہاڑوں میں لیٹنے کے بعد ہم پیش آنے والی دشواریوں کا نقشہ بھی اپنے ذہن میں قائم کر سکتے تھے۔ پھسلواں زمین پر پاؤں جماتے، درختوں کا سہارا لیتے، ایک دوسرے کی کمر سے رسیاں باندھ کے کہیں زمین سے چپکے اور رینگتے، کھائیوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے بچاتے گھپ اندھیرے میں جس طرح ہم نے یہ فاصلہ عبور کیا وہ خود ہمارے لیے تعجب انگیز تھا۔ کئی جگہوں پر خود رو جھاڑیوں نے ہمارا راستہ کاٹ کاٹ دیا اور ہم گھومتے ہوئے پھر اپنے راستے پر آ گئے۔ بعض جگہ تو سامنے ایک دیوار سی کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ یہیں تو ہماری رات لگ گئی مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ [illegible] اُوپر پہنچنے کے لیے ہم ایسا کوئی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ آخر کار قدیم مندر کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت ہمارے سامنے آ گئی۔ صحن کی سیڑھیوں پر اب بھی بستی کے آدمی بیٹھے ہوں لیکن ہمیں اُن سے نمٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عقبی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور آباجان شمع کی مدھم روشنی میں وہاں مراقبے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیرِ زمین کمرے میں موجود تھے۔ زنبیلوں میں کپڑوں کے نیچے دو کدالیں رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک پیرو لایا تھا۔ کھانے پینے کا سامان، خشک لکڑیوں کا گٹھا، جلانے کے لیے تیل [illegible] ساتھ تھے۔ قبل کو یقین تھا کہ آباجان باقی تین دن بھی [illegible] مشغول نہیں کریں گے۔ اُس نے چار دن مقرر کیے تھے۔ تیسرے دن رات ہی کو ہم اپنا کام ختم کر چکے تھے لیکن وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ہم نے جو تھا دن گن گن کے گزارا۔ ان تہہ خانوں سے مجموعی طور پر زیادہ بڑا ذخیرہ برآمد ہوا تھا۔ ہم آدمیوں کے کپڑوں کی جیبوں، آباجان کے کشکول، اُن کے لبادے میں چھپی ہوئی [illegible] میں بہت سے پتھر آ گئے تھے۔ بڑا حصہ ہم نے زنبیلوں میں محفوظ کر لیا تھا، جو باقی بچا اُس کی پوٹلیاں بنا لی تھیں۔ جہاں تک ہو سکا ہم نے زیادہ سے زیادہ حفاظت اور کم سے کم مدت میں وہ سب سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ آباجان کو بار اور دوسرے برتن وہیں چھوڑ جانے کا قلق تھا۔ تیسرے درجے سے نکلنے والا منقش مجسمہ البتہ ہم نے [illegible] آباجان نے پہلے درجے کا غرفہ جو ایک جگہ چھپا رکھا تھا، وہ پہلے ہی واپس کمرے میں لے آئے تھے۔

چار دن تک ہم نے آسمان نہیں دیکھا۔ کمرے میں [illegible]

تھی۔ کچھ دروں کا ملبا، زر و جواہر کا انبار، ساتھ لایا ہوا سامان اور دم توڑتی ریل۔ دیواروں میں جا بجا لگے ہوئے شیشوں اور نگینوں کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ تیسرے روز تک تو ہم پاریاں تبدیل کرتے، نیند لیتے اور لکڑیاں جلا کے چائے بناتے رہے۔ چوتھے دن لیٹنے کے سوا ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ کسی نے بے ضرورت کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکالا تھا۔ ضرورت کے لیے ابا جان نے وہیں ایک میخ ٹھونک کے رسی باندھ دی تھی جو باہر کسی ایک سرنگ میں کچھ ہی دور تک جاتی تھی۔ وہاں دن اور رات کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا تھا۔ جمیل کے پاس گھڑی تھی۔ سب تھکے رہنے سے اس سے وقت پوچھتے تھے کہ کہیں جمیل سے اس کے حساب میں کوئی چوک نہ ہو جائے۔ وقت کہیں پیچھے نہ نکل جائے۔ سب کو اتنی فکر تھی جیسے روز کاٹتے ہوئے ہو گئی تھیں، یقین کرتا تھا کہ یہ ان کی زندگی کا پہلا دن ہے اور اس سے پہلے وقت گزارنے کا انھیں کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دن کے دس بجے جمیل نے کسی کے پوچھنے پر وقت بتایا تو انھیں یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید گھڑی خراب ہو گئی ہے۔ پھر کان لگا کے وہ اس کی ٹک ٹک غور سے سنتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ گھما پھرا کرتے کرتے گھڑی پر کوئی ضرب نہ پڑ گئی ہو۔ سوئیاں آگے پیچھے نہ ہو گئی ہوں۔ سوئیاں ٹھیک ہی تھیں مگر وہ بس چکر لگا رہی تھیں اور وقت تھم گیا تھا۔ جیسے آدمی مر جائے اور اس کی کلائی میں بندھی گھڑی چلتی رہے۔ سب گرے گرے جاتے تھے۔ سب نے برسوں تنگ کر گھروں میں بتائے تھے۔ یہاں چند دن بھی گزارنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہاں سورج تو نکلتا تھا، نئی ہوا تو چلتی تھی۔ یہ سیکڑوں برسوں کی ہوا بند تھی۔ زنگ لگی ہوئی شکستہ بوڑھی ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم بھی اس عرصے میں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے۔ چاند کی دھوپ دیکھے ہوئے زمانہ گزر گیا ہے۔

جمیل نے ٹھیک گیارہ بجے کا وقت مقرر کیا تھا اور ان کی تسلی کے لیے اپنی گھڑی فرش پر رکھ دی تھی تاکہ وہ خود اسے دیکھتے رہیں۔ دس بجتے ہی وہ سب کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارا سامان کب کا تیار پڑا تھا لیکن جمیل نے وقت پورا کیا۔ چلتے وقت کسی نے پلٹ کے کمرے کو نہیں دیکھا۔ ابا جان ہم سب سے آگے تھے اور ان کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ سب سے پہلے وہی باہر نکلے پھر ان کے اشارے پر ہم سب۔ باہر آتے ہی پچھڑنے لگے تھے۔ چند لمحوں تک ہم دیواروں کی آڑ میں اپنی سانسیں درست کرتے رہے۔ ٹھنڈی تازہ ہوا سے سینے میں برف سی جمنے لگی تھی۔ عمارت میں مکمل سناٹا تھا۔ کسی جانب سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ تو بارش نہیں تھی ورنہ پھر ہمیں واپس سرنگوں میں جانا پڑتا۔

ہمیں اسی راستے سے واپس جانا تھا جس سے چار دن پہلے ہم یہاں آئے تھے اور دو سال کا سارا نشیب تھا۔ اوپر کسی طور چڑھ گئے تھے لیکن اب نیچے اترنے کے خیال سے ہی گھبرا رہا تھا۔ نیچے قدم قدم پر کئی نیلی چٹانیں اور خاردار جھاڑیاں تھیں۔ ہمارے پاس رسی تھی اور ہم نے یہ طے کیا تھا کہ اوپر کسی درخت یا چٹان سے رسی باندھ کے اس کے سہارے نیچے اترتے رہیں گے۔ جہاں رسی ختم ہو جائے گی وہاں سے پھر اپنی آنکھوں اور پیروں سے کام لیں گے۔ نشیب کی ڈھلوان زمین کا حصہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ رسی کے آسرے ایک چوتھائی راستہ آسانی سے سر ہو کے کٹ جاتا۔ باقی تین چوتھائی ہمیں خود طے کرنا پڑتا۔ اس کے بعد زمین ہموار ہو گئی تھی۔

ہم چبوترے سے اتر ہی رہے تھے کہ جمیل نے ہمیں روک دیا اور ابا جان کے ساتھ چلتے ہوئے سامنے کے دروازے کی طرف جھانکنے لگا۔ بستی سے ہماری اچانک گمشدگی کو چار دن ہو گئے تھے۔ اس سے پانچ چھ دن پہلے ہم نے دلاور کو مندروں کے علاقے میں آنے کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ معلوم، دلی، زرداد، چلو اور جیتی کے بستی سے جانے کے بعد دن میں ہم ایک ہی مرتبہ ادھر آئے تھے۔ اس وقت عمارتوں پر بیٹھے ہوئے قبیلے کے آدمیوں کی تعداد کم تھی، ممکن ہے انھوں نے انھیں بالکل ہی ہٹا لیا ہو یا تعداد دوگنی کر دی ہو۔ دو دن ڈانواں ڈول ایک مسلسل یہاں ہمارے ہونے سے ان کی جستجو میں کمی آ جانی چاہیے تھی۔ جمیل یہی دیکھنے گیا ہوگا کہ وہ اوپر موجود ہیں یا نہیں۔ مگر قدیم مندر کی منزلوں پر نہیں ہیں تو اور عمارتوں پر بھی نہیں ہوں گے۔ ان کے نہ ہونے کی صورت میں ہم نشیب کے پر خطر راستے سے جانے کے بجائے مندروں کے علاقے کی ہموار زمینوں پر چلتے رہتے۔ ہمیں بستی واپس نہیں جانا تھا۔ آگے جا کے ایسے راستے تھے جہاں اتنی ڈھلوان نہیں تھی۔ ہم انھیں عبور کرتے ہوئے بستی سے بچتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ سکتے تھے۔ جمیل کو اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ قدیم مندر کی منزلوں پر قبیلے کے آدمیوں کا نہ ہونے کا مطلب دوسری تمام عمارتوں سے ان کی دست برداری نہیں ہے۔ وہ راستے میں کسی اور جگہ بھی ہمیں مل سکتے تھے۔

جمیل لپکتا ہوا واپس آیا اور اس نے اشاروں میں ہمیں بتایا کہ حسب سابق وہ موجود ہیں مگر چار سے زیادہ نہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ اس کا مقصد تھا کہ کہیں نہ ہم عقبی راستے سے آگے بڑھیں جیسے پہلے یہاں آئے تھے۔ سب یہی چاہتے تھے مگر انھوں نے جلدی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ جمیل ابا جان کا ہاتھ پکڑ کے عمارت کے پیچھے اترنے چلنے لگا تو سب اس کے پیچھے پیچھے ہو گئے۔ سلطان کے اوسان ٹھکانے نہیں تھے۔ اس کی گھٹی ہوئی چیخ سے جیسے ساری عمارت لرز اٹھی۔ سلطان نے اتنی تیزی میں کسی جو کٹ یا پتھر سے چوٹ کھائی تھی اور سامان سمیت منہ کے بل فرش پر لڑھک گیا تھا۔ یکایک عمارت میں بھاگ دوڑ مچنے لگی۔ وہ بیدار ہو گئے تھے اور ایک لمحے کی رعایت دیے بغیر مشعل اٹھائے بھاگتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے جدھر سے آواز آئی تھی۔ سلطان وہیں چھوڑ کے اسی لمحے ہم بھی ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے راہداری

میں سمٹ گئے تھے۔ جمیل اور جامو، پیرو اور بلاکر وسطی کمرے کی دوسری راہداریوں کی طرف دوڑ پڑے۔ مشعل کی روشنی اور ان کے جوتوں کی دھمک پیچھے اسی راہداری کے قریب آئی۔ ہم چاروں کہیں اوپر سے گرنے کے انداز میں باہر نکلے۔ ہماری طرف دو ہی آدمی تھے۔ ہم اتنی تیزی سے ان پر جھپٹے تھے کہ انھیں ہمارا چہرہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ ایک کے ہاتھ سے مشعل چھوٹ کر روش پر گر پڑی۔ صرف ایک بار ان کی آواز ابھری پھر وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ ادھر سے جامو اور بلاکر باقی دو کو کندھوں پر ڈالے ہوئے آ گئے تھے۔ جامو، سلطان اور بلاکر نے انھیں نشیب میں پھینک دیا۔

قدیم مندر سے دور کہیں کسی محفوظ مقام ملنے کا امکان تھا۔ اندھیرے اور دھند کی وجہ سے چلنے میں گو دشواری پیش آ رہی تھی تو ان کی پناہ بھی ہمیں حاصل تھی۔ جس راستے سے ہمیں پھر نیچے آنا تھا، وہاں کئی میل میں لوہے کے مندر پڑتے تھے۔ ہم پگڈنڈیاں بدلتے ہوئے ان سے دور دور ہی رہے۔ سارا سامان چار آدمیوں نے اپنے کندھوں اور سروں پر اٹھا رکھا تھا۔ ابا جان اور ہم چار آدمیوں کے ہاتھ خالی ہوئے تھے۔ کسی جانب سے ان کی آہٹ ملنے پر ہم پوری طرح تیار تھے لیکن وہ سب غالباً عمارتوں کی چوکیداری تک ہی محدود تھے۔ راستے میں اور کہیں ان سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ بڑے مندر کے علاقے سے ہو کے اگر ہم آگے نکلتے تو فاصلہ اور کم ہو جاتا۔ وہ مرکزی جگہ تھی اور وہاں زیادہ آدمیوں کی موجودگی کا اندیشہ تھا۔ اس سے پہلے ہی ہم بستی کی مخالف سمت ایک نشیب میں اتر گئے اور سامان ہم نے آپس میں بانٹ لیا۔ ابا جان کے اصرار کے باوجود کسی نے انھیں بوجھ نہیں اٹھانے دیا تھا۔ گھنے درختوں کے درمیان ضرورت کے وقت ہم نے ان کی چھوٹی بیٹری روشن کرنی شروع کر دی تھی۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہمیں اطمینان ہوا کہ بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارے قدم پھر اور تیز ہو گئے۔

یہ چوتھا دن اور پانچویں رات تھی۔ معلوم، مارٹی، جیتی، چلو اور زرداد کو بستی سے گئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ اب انھیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پیرو کو چھوڑ کے ہم بستی میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ صندوق بھی تھے اور دوسرا ضروری اسباب بھی۔ مانگٹ قبیلے کے قلیوں نے انھیں اپنی مدد سے باہر والی بستی میں پہنچا دیا ہوگا۔ وہاں سے وہ قلی بدل کے کچھ اور آگے قریب کی ایک اور بستی میں چلے گئے ہوں گے۔ وہاں سے انھوں نے پھر قلی بدلے ہوں گے اور ہندوستان کی سمت بڑھنے کے بجائے واپس مانگٹ قبیلے کی بستی کی طرف لوٹ گئے ہوں گے۔ اسی جگہ پر جو مانگٹ قبیلے کی حدود کے پار بھی تھی اور اس کے قریب بھی۔ بتی میاں نے جہاں ہم کو اتارا تھا۔ جب تک ہم نہ پہنچیں کسی نہ کسی صورت انھیں اپنے ساتھ لائے ہوئے قلیوں کو روکے رکھنا تھا یا باقاعدہ ان کے کیمپ کا سہارا لینا تھا۔ دو بستیوں تک جانے اور قلی بدلنے سے مقصد صرف یہ تھا کہ مانگٹ قبیلے کے قلی ادھر بستی میں واپس جا کے ان کے پاس ہماری آمد کے بارے ہی کی اطلاع نہ دیں۔ ہمارے حساب لگا کے سات دن تو ہو چکے تھے۔ آج آٹھواں دن ختم ہو گیا تھا۔ اب انھیں پہنچ ہی جانا چاہیے تھا۔ ہمیں وہاں ٹھہرنا نہیں تھا۔ انھیں لے کے چلتے ہی رہنا تھا۔

بستی کی حدود کا آخری پھوڑا ایک تھا جو مانگٹ قبائل کے علاقے میں داخل ہونے کے لیے ایک سرحدی چیک پوسٹ یا دروازے کا درجہ رکھتا تھا۔ پھوڑا ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا اور اس کی حیثیت محض علامتی تھی۔ مانگٹ قبیلے کی فضیلت کا نشان۔ ہم اس کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ سلطان نے یک بیک ہم سب سے ٹھہرنے کو کہا۔ اس کا لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔ "کیا ہے بے؟" جمیل نے بگڑ کے پوچھا۔

"ذرا میرے سنگ آؤ۔"

"کدھر؟" جمیل نے سامان زمین پر رکھ دیا۔

"ذرا میری بات سنو۔"

"کیا بولنا چاہتا ہے؟"

"کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاؤ۔ میں ادھر کچھ دیکھ کے آتا ہوں۔" سلطان کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"ادھر کیا ہے بے؟"

"ادھر وہ ہے؟"

"وہ کون؟" جمیل نے برہمی سے پوچھا۔

"وہی..... وہی" سلطان ہکلانے لگا۔

"صاف منہ کیوں نہیں پھاڑتا؟"

"میں نے تو رات اس سے یہاں آنے کو کہا تھا۔ وہ پھوڑے کے پاس ہی کسی جگہ ہوگی۔ میں اسے لے کے آتا ہوں۔"

جمیل نے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ سلطان گرتے گرتے بچا۔ "سیدھی طرح چل۔" جمیل درشتی سے بولا۔

"وہ ادھر ہی ہوگی استاد!"

"ہونے دے۔" جمیل نے دہاڑ کے کہا۔

"وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" سلطان بڑی عاجزی سے بولا۔

"کیا کرے! تو نے اسے بولا تھا کہ ہم ادھر سے آئیں گے؟" غصے سے جمیل کی آواز کانپنے لگی تھی۔

"ہاں بولا تھا۔"

جمیل اس کا سر پکڑ کے جھٹکے دینے لگا۔ "چلتا ہے کہ نہیں؟"

"نہیں استاد! جمیل بھائی! قسمیں۔"

"چلتا ہے کہ نہیں؟" جمیل نے اس کے گال تھپتھپا دیے۔

"نہیں اُستاد! تم کچھا درست سمجھو وہ اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں بولے گی۔ ایسا ہوا تو سلطانے تمھارے پیروں پر اپنا سر کاٹ کے رکھ دے گا۔"

"اُدھر اپنے سر تیرے پیروں پر ہوں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا اُستاد!"

"اور ایسا ہو گیا تو.....؟" قجیل گرجنے لگا۔

"تو کیا ہوا۔ اتم میری خاطر اتنا بھی نہیں کرو گے؟"

"تیری خاطر..... تیری خاطر؟" قجیل ہانپتے ہوئے بولا۔ "تیری خاطر ہی بول رہا ہوں سور کے بچے۔ حرام کے تخم.....؟"

"تم جو بول چاہے کہو... پر غلط سمجھ رہے ہو۔ تم کو اپنی اتنی فکر ہے تو مجھ کو ادھر ہی چھوڑ دو۔ میں اس کے بنا نہیں جاؤں گا۔"

"کتنی دیر تک نہیں جائے گا؟"

"جتنی دیر تک بھی۔"

"تو اپنے آپے میں نہیں ہے سلطانے۔" جامو بیچ میں بولا۔

"میں بالکل آپے ہی میں ہوں اُستاد ہر حال میں نہیں ہے۔"

"اس کو لوکو اپنے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔" قجیل کی آواز سخت پڑ گئی تھی۔ جامو اس کے اور سلطان کے درمیان میں آگیا۔

"وہ اس بستی کی لڑکی ہے سلطانے اُستاد! ہم کیسے اُس کو ساتھ لے جائیں؟" بلاکو نے دبی زبان میں کہا۔

"تم اس کے بارے میں ٹھیک نہیں سوچ رہے۔"

"وہ ادھر نہیں آئی ہوگی۔" جامو نرم لہجے میں بولا۔ "اس جاڑے اور اندھیرے میں لڑکی ذات نے اکیلے کیسے سفر کیا ہوگا؟"

"نہیں آئی ہوگی تو ٹھیک ہے۔ میں بھی ادھر ہی رہوں گا۔ تم لوگ آگے چلے جاؤ۔ سلطانے کی قسمت اس کے ساتھ ہے۔"

"ہم تیرے بھلے کو کہہ رہے ہیں۔" ساوے نے آہستگی سے بولا۔

"میں اپنا بھلا تم سے اچھا جانتا ہوں۔"

"تم میرے دشمن نہیں ہو سلطانے!"

"اور دوستی بھی نہیں کر رہے۔ میں اس کو اسی رات اوپر بند کی طرف بلا سکتا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی نہ جانے جاتی۔ پر سوچا اس کا ادھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے کام ختم ہو جائے۔ سو میں نے اس کو یہاں آنے کو کہا تھا۔ وہ ادھر تک آئے اور سلطانے چلا جائے۔ تم لوگ ساتھ نہیں دیتے تو سلطانے تم سے بھیک نہیں مانگتا۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے!" بلاکو چیخنے لگا۔

"شور مت کرو۔"

"لگتا ہے بلاکو اس کا ٹائم شاید آہی گیا ہے۔" قجیل دھیمے لہجے میں بولا۔

"پیر! نہیں اُس کو بھی۔"

قجیل نے اُس کو گریبان سے کھینچ لیا۔

"سلطانے کی بات مان لو قجیل بھائی!" آباجان کی موجودگی کے باوجود میں نے اس سے عاجزی سے کہا۔

"لاڈلے!" اس نے مجھے جھڑک دیا۔

"پیرو" سلطان کو سمجھانے لگا۔ آباجان تم کو سب کچھ گن رہے تھے۔ سلطان جھٹ اُن کے پیروں پر گر گیا۔ "بڑے صاحب! آپ ہی ان لوگوں سے کچھ بولو۔ میں اس کے بنا نہیں جاؤں گا۔"

آباجان نے قجیل کی طرف سر اٹھا کے دیکھا۔ جواب میں قجیل نے سلطان کے کولہے پر ٹھوکر مار کے اُسے آباجان کے پیروں سے جدا کر دیا۔ سلطان لڑھکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

جامو نے اُسے پھر بازو سے پکڑ لیا۔ "کدھر ہے وہ؟" وہ تلخی سے بولا۔

"اوپر ہی کسی جگہ ہوگی۔ شاید اس نے اپنی آوازیں سن لی ہوں۔" سلطان نے مضطرب لہجے میں کہا۔

قجیل سے پوچھے بغیر جامو اُسے دھکے دیتا ہوا سامنے کھڑی اُس پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ انھیں گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد کسی نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ سب چپ وہیں بیٹھے رہے۔ پیرو قجیل کے پاس بیٹھا اس کا زانو دبا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد اوپر سے چاپ ابھری تو قجیل کے سوا سبھی دیکھنے لگے۔ وہ سلطان اور جامو ہی تھے اور اُن کے ساتھ وہ بھی تھی۔ بکری سمی ہوئی تمام راہ اُس کا سر کانپ رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ سلطان نے اُترتے ہی اُسے قجیل کے آگے کر دیا۔ لمحوں بعد پیرو کے ٹوکنے پر قجیل کے جسم میں جنبش ہوئی۔ وہ اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔

ہم بڑھتے رہے۔

سویرا ہوتے ہوتے ہم آخری فاصلے طے کر رہے تھے۔ دور ہی سے اونچائی پر دھند میں لپٹے ہوئے اُن کے ہیولے ہمیں نظر آنے لگے تھے اور وہ زیادہ تر سلو، مارق، جینی اور پیٹو کے سوا کوئی نہیں تھے۔ انھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور ناچتے اچھلنے لگے تھے۔ انھیں پڑاؤ کیے ہوئے ایک دن ہی ہوا تھا۔ تین تھیلوں کو انھوں نے کسی طرح رکھ کے رکھا تھا جن کے ساتھ پاک تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کے انھیں تھیلوں کے سامنے ناچنا اچھلنا اور شور نہیں مچانا چاہیے تھا۔ ہم وہاں اتنی ہی دیر ٹھہرے جتنی دیر اپنے ساتھ لایا ہوا سامان صندوقوں میں منتقل کر سکتے تھے۔ دھوپ ابھی پھیلی نہیں تھی کہ ہم نے سفر شروع کر دیا تھا۔ قجیل ہماری رہبری کر رہے تھے۔ دو دن گزر گئے۔ تھیلوں کے انکار کے باوجود ہم نے انھیں نہیں

چھوڑا تھا۔ تیسرے دن رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صبح صبح اپنے خیمے اور دوسرا اسباب سمیٹ کے ہم نے ایک منزل سر کی ہوگی کہ ایک سرسبز وادی میں آ گئے۔ وادی کے چاروں طرف پہاڑوں کی ایک فصیل تھی۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ وہاں سے آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مارق کی فرمائش پر قجیل گانا گانے لگے تھے۔ ہم ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے کہ یکایک جامو کے پہلو سے نکلتا ہوا ایک تیر زمین پر آ کے رکا۔ چشم زدن میں ہم ایک کی آڑ میں ہو گئے۔ اوپر پہاڑوں پر ہر طرف آدمی موجود تھے اور وادی اُن کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے قجیل کھڑا ہو گیا۔

یاکوں کی آوازیں ہوتے ہی ہم نے تیر نکال لیے تھے اور جن کے کاندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں انھوں نے چشم زدن میں انھیں اُتار کے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا مگر وہ کسی ایک جانب نہیں تھے۔ وادی کے اُوپر پہاڑوں کی اونچی نیچی دیواروں پر تقریباً ہر جگہ وہ موجود تھے۔ ان کی تعداد سو سوا سو کے قریب ہوگی۔ قجیل کے کھڑے ہو جانے کے باوجود کوئی تیر نہیں چلا۔ چند لمحوں تک ہم نے انتظار کیا پھر یکایک کئی غیر محفوظ اوٹ سے نکل کے اُن کے سامنے ہو گئے۔ اُن کی آوازیں ایک دم بند ہو گئی تھیں لیکن اُن کی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے کئی کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ فاصلہ زیادہ تھا اور ہم اُن کی شکلیں واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ قجیل نے فوراً ہاتھ اُٹھا کے ہمیں بندوق نہ چلانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بولا۔

"جانے پہچانے دکھتے ہیں۔"

سب کی نظریں سلطان اور تتامو پر آ کے رک گئیں۔ "یہ بولتی ہیں اُستاد! اپنے سلطانے شاہ کو بدحالی پہچنے آئے ہیں۔" جامو نے زیر لب سے کہا۔ "سمدھیانے کو نہیں پہچانتے؟"

"نہیں نہیں!" سلطان نے تتامو کو کھینچ کے اپنے بازو سے چپکا لیا۔ "اس نے انھیں نہیں بتایا۔ یہ نہیں بتا سکتی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ہاں قسم سے.....؟" قجیل کو گھورتے دیکھ کر اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"تم سچے ہو اُستاد!"

"جامو!" قجیل نے درشتی سے کہا۔ "کھینچ کے رکھ۔"

"وہ نیچے اُتر رہے ہیں۔" اچانک بلاکو چیختی ہوئی آواز میں بولا۔

قجیل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ نیزے اور کمانیں تانے ہوئے وہ چند قدم اور آگے آ گئے تھے۔ ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک کوشش کی جا سکتی تھی کہ اِدھر اُدھر چھپنے کے بعد اردگرد کی چٹانوں، جھاڑیوں یا درختوں کی آڑ لے لیں۔ اس طرح نشانہ لینے میں کچھ آسانی ہو جاتی مگر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی اپنا بچاؤ کرنا ممکن تھا۔ شاہ صاحب نے جان لیا تھا کہ اب کوئی اور کوشش بے سود ہے۔ سو ہم اسی طرح تیار تھے۔ سب سے پہلے ہمیں بندوقوں کے صحیح نشانوں کا کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ قاعدہ انھیں آگے آنا چاہیے تھا اور ہمیں اس وقت تک کوئی گولی ضائع نہیں کرنی چاہیے تھی جب تک وہ خود پہل نہ کریں۔ پہل کی صورت میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم پیچھے ہٹنے کی پروا کیے بغیر گولیاں برسانا شروع کر دیں اور جس کو ترتیب لگ جائے وہ وہیں چھپ جائے۔ اُن کی تعداد اور عقل کی ٹکر جنگ ہوگی۔ یقیناً وہ قبائلی قزاق نہیں تھے۔ پہاڑوں پر تالوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ وہ ہوتے تو اتنا انتظار نہ کرتے۔ نہ ایک تیر چلا کے دوسرا چلانے میں دیر کرتے۔ ہمیں گھیرنے کی بجائے کہ وہ لوگ ہیں اور کیوں اس طرح چاروں سمت سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔

دونگ بستی کے نزدیک جہاں سلو، مارق، جینی، پیٹو اور زعفرانے ہم سے پہلے پہنچ کے پڑاؤ کیا تھا، وہاں سے ہمیں چلے ہوئے دس دن ہو گئے تھے۔ انھی کے روکے ہوئے قجیل کے ساتھ تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں تمام راستہ اندھیرا گھیرنے کے بعد ہم نے اپنا سفر جاری رکھا تھا۔ رات کو چلنا مشکل تھا اور ہم کسی جگہ ٹھہرتے۔ سب کا مقصد یہی تھا کہ جلد سے جلد دونگ بستی سے دور ہو جائیں۔ راستے میں کسی قافلے سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی اور ہم نے اپنے تعاقب کی کوئی آہٹ محسوس کی تھی۔ قجیل ہی پہلے تیار تھے۔

دونگ بستی سے نکل کے ہم نے آگے دو منزلوں بعد انھیں تبدیل کیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق کسی جگہ انھیں ترک گاہوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سلو، مارق، جینی، پیٹو کو سفر کے لیے ضروری اسباب سمیت ہم نے دس دن پہلے رخصت کیا تھا۔ اُن کے جانے کے تین دن بعد ہی ہم سب بستی سے اچانک غائب ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ہمارے پیچھے اِدھر اُدھر اپنے آدمی دوڑائے ہوں لیکن ہم بستی سے کہیں اور نکلے ہی نہیں تھے کہ انھیں مل جاتے۔ ہم بستی میں چند میل اوپر ہی مندروں کے علاقے میں واقع قدیم مندر کے تہہ خانے میں مسلسل چار دن تک چھپے رہے تھے۔ تہہ خانے سے دوبارہ باہر ہوتے وقت ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری بھنک مل گئی تھی مگر وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ہم نے ہر طرح روزانہ انھیں اُن کے اکڑے ہوئے جسم ہی ملے ہوں گے۔

گویا بستی کے لوگوں کی نظر میں ہمیں وہاں سے چلے ہوئے سات دن ہو گئے تھے۔ یہ عرصہ ہمارے دور نکل جانے کے لیے کافی تھا۔ اب انھیں جلد ہی کھوج ترک کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ

پھر ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ نہیں تھے تو پھر اور کون لوگ تھے۔ اگر تشام نے اپنے باپ جیسی دساکر بتایا تھا کہ سلطان نے چار دن بعد اس سے بستی کی سرحدوں پر مقدس بگڑ ڑا کے علاقے میں ملنے کو کہا ہے تو انھوں نے مزید دو دن کیوں توقف کیا۔ جہاں تشام ہمیں ملی تھی، وہیں وہ ہمارے راستے کی دیوار کیوں نہ بن گئے۔ اور انھوں نے تشام کو ہمارے ہاتھوں میں کیوں جانے دیا۔ سولم مادئی وغیرہ کے دوبارہ ہمارے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد انھیں جن چیزوں کا انتظار تھا بستی کے قریب ہی انھوں نے ہمارے اطراف اس طرح اپنے آدمی کیوں نہیں کھڑے کر دیے۔ جامو کی طرح سبھی کو انھیں دیکھ کے فوراً یہی گمان ہوا تھا کہ تشام نے انھیں ہماری خبر دی ہوگی لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو گیا کہ یہ محض بدگمانی ہے، ایک بے جواز شبہ ہے۔ تشام دو دن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سب اس کی باتیں، اس کا چہرہ جیسے بھول گئے تھے۔ اس کے چہرے پر پھولوں کی سی معصومیت اور اس کی باتوں میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ جب کوئی اس کے سامنے سلطان کا نام لے کے چھیڑتا تو وہ بری طرح شرما جاتی۔ دو دن سے ہم اسے چھیڑتے رہے تھے۔ جب اس نے پہلی بار ہمارے جانے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کی تو سب کو حیرت ہوئی حالانکہ سبھی کو معلوم تھا کہ وہ سلطان سے اسی زبان میں بات کرتی ہوگی۔ کورا کو بھی ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ کورا کے مانند سوچ سوچ کے کوشش کر کر کے بولنا، پلکیں پٹ پٹانا، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آنے پر گھبرانا، بے چارگی سے مسکرانا اور شرمانا۔ آبامان کو بھی اسے دیکھ کے کورا کی یاد آئی ہوگی۔ سلطان نے اسے اشارہ کیا ہوگا کبھی وہ زیادہ تر آبامان کے ساتھ رہتی تھی، ان کے پہلو بہ پہلو وہ وہاں سے وہیں ہمارے لیے شکار کیے ہوئے گوشت کا کھانا پکا رہی تھی۔ تشام اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو کے آئی تھی جیسے کورا ایک رات ہمارے گھر آئی تھی۔ آبامان نے نہیں سمجھا کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی، وہ تو ان کی بیٹی بننے کے لیے آئی ہے۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو وہ ان کی اپنی بیٹیوں سے زیادہ ان کی خدمت کرتی۔

کمانوں اور نیزوں سے مسلح ان لوگوں کو کسی اور ذریعے سے خبر ہوئی تھی۔ سولم کے ساتھ آنے والے قلیوں کو ہماری منزل کا پتہ نہیں تھا کیونکہ تجمل کی ہدایت کے مطابق دوسری منزل پر انھیں بدلتے ہوئے سولم نے اُن سے ہندوستان کی طرف جانے کے لیے طے کیا تھا لیکن کچھ دور آ کے اس نے انھیں جانگ قبیلے کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ سفر کی اس اچانک تبدیلی سے یہی مراد تھی کہ تلی چلتے وقت اپنی بستی کے لوگوں کو سولم کی منزل کی غلط نشان دہی کر کے آئیں۔ بس ایک ہی بات ممکن تھی کہ بڑے مندر کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے کے دوسرے دن جب انھیں وہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آئے ہوں گے تو انھوں نے ان کی تلاش کی ہوگی اور بڑے مندر کے نشیب میں ان کی لاشیں پڑی ہوئی مل گئی ہوں گی۔ لاشیں بول نہیں سکتی تھیں لیکن ان کی ناگفتنی حالت غمازی کرتی ہوگی کہ ہم گزشتہ رات وہاں موجود تھے۔ ہمارے سوا ان کی موت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے ہمارا پیچھا کرنے کے بجائے سیدھے ہندوستان کے راستے کی سمت کوچ کیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان راستے ہم سے بہتر جانتے تھے اور گھوم کے ہم سے پہلے ہماری منزل پر پہنچ سکتے تھے۔

تجمل نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن ہم سب نے خود ہی اپنی اپنی جگہیں متعین کر لی تھیں۔ اگر وہ وادی کے اطراف پہاڑوں پر ایک دائرے کی صورت میں بٹتے ہوئے ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے تو ہمارے نیزوں اور بندوقوں کا رخ بھی انھی کی جانب تھا۔ ہر ایک کا رخ کسی اور سمت تھا تو زور آ کا کسی اور سمت۔ ہر ایک کی نگاہ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور سب نے غیر ارادی طور پر سمتیں اپنی اپنی نگاہوں کے حصے میں تقسیم کر لی تھیں۔ آبامان تشام اور تلی درمیان میں تھے اور ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تجمل نے بھی اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی بندوق ابھی تک نہیں اتاری تھی اور نہ اپنا تمنچا جیب سے باہر نکالا تھا۔ وادی کے نشیب کی زمین سطح نہیں تھی۔ درمیان میں ایک تیز ندی گزرتی تھی جس کے کناروں کی زمین کہیں کہیں اتنی اوپر اٹھی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹی سی بن جاتی تھی۔ ہم نے فاصلہ کم کرنے کی غرض سے ندی کے کنارے کنارے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ منظر بھی بہت دل کش تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی اور ندی کا چاندی جیسا پانی شور مچا رہا تھا۔ اسی شور کے سبب ہمیں اپنے پیچھے ان کی نقل و حرکت کا پتہ نہیں چلا۔ ہمارے وادی میں اترنے سے پہلے وہ اوپر کسی ایک سمت چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے وادی میں اترنا شروع کیا، وہ اطراف کے پہاڑوں پر پھیلتے گئے اور انھوں نے اس وقت پہلا تیر پھینکا اور صدائیں بلند کر کے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا جب ہم وادی کے عین بیچوں بیچ پہنچ گئے۔ خصوصاً اس مقام پر جہاں نشیب گہرا تھا اور ہمارے فرار کا امکان اور مقاموں کی نسبت کم ہو جاتا تھا۔ وہ ایک گھاٹی کی شکل کا راستہ تھا مگر ندی کے دونوں طرف اٹھی ہوئی زمین ڈھلواں تھی۔ اسی ڈھلوان کی وجہ سے ہم اوپر پہاڑوں کی طرف دیکھنے پر قادر تھے اور وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

وادی میں کسی جگہ ندی کے دونوں کناروں پر اٹھی ہوئی زمین ٹوٹی ہوئی تو یہاں کے بجائے وہ اسی جگہ کا انتخاب کرتے مگر ایسا کوئی مقام وادی میں شاید کہیں نہیں تھا۔ نشیب کا یہ گھاٹی نما حصہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ انھیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو ہم آگے نکل چکے ہوتے۔ سب کو چند لمحوں اور چند جنبشوں کے اسی ایک موقع کی تلاش تھی۔

سب بتوں کے مانند ٹک ٹک کھڑے تجمل کی طرف سے کسی اشارے کے منتظر تھے۔ تجمل بھی کوئی اشارہ کرتا جب اسے کسی طرح کوئی رعایت یا گنجائش نظر آتی۔ ہمارے کسی بھی غلط فیصلے کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ تجمل سر اٹھائے گھوم گھوم کے انھیں دیکھتا رہا۔

یکایک ماسٹر مادئی کی گھٹی ہوئی چیخ پر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مادئی آبامان کو روک رہا تھا جو ہم سے کچھ کہے بغیر اچانک درمیان سے نکل کے قریب کے ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ آبامان کا یہ اقدام اتنا غیر متوقع اور ناقابل فہم تھا کہ سب ایک لمحے کے لیے جیسے اپنے حواس کھو بیٹھے۔ جامو، سلطان اور میں نے انھیں روکنے کے لیے بیک وقت بھاگنے کا ارادہ کیا مگر تجمل کی آواز نے ہمارے قدم جام کر دیے۔ آبامان کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ ہم سے کچھ دور ایک ٹیلے پر پہنچ کے وہ ٹھہر گئے۔ میرا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اوپر جا کے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور پہاڑوں سے اترتے ہوئے لوگوں سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہنا چاہا اور ہمیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ ان کے اشاروں کے جواب میں وہ لوگ رک گئے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے سر جھکا کے آبامان کو تعظیم دی تو ہم سب کی سمجھ میں آیا کہ آبامان نے یوں آگے بڑھ جانے کی جرأت کس اعتبار میں کی ہے۔ وہ ٹکشوؤں کے پاس ہی تھے۔ اپنے مخصوص حلیے کے سبب دور ہی سے وہ ہم میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ کھڑے کھڑے میں ہانپنے لگا تھا۔ جامو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "لاڈلے!" وہ مشکل سے بولا۔ "نظر کو کسی ہی رکھنا۔"

"جامو بھائی!" میری آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔

"لاڈلے بھائی!" اس نے میرے بازو میں اپنی انگلیاں گڑو دیں۔ "کبھی تو نے، نہیں بوجھا کہ تیرے جامو بھائی نے کیسی کو نوچا؟"

میں نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ جامو اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر لرزتی ہوئی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ جامو نے کہوکا مار کے مجھے چونکایا اور سامنے دیکھتے رہنے کی تلقین کی۔

آبامان کے ہاتھ ابھی تک اٹھے ہوئے تھے۔ نیچے کے کھڑے پر میری انگلی بھی بیہوش تھی اور میری نگاہ نے ان کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ ادھر لوگ ٹھیرے ادھر سلطان نے نگلتے لہجے میں تجمل کو مخاطب کیا: "استاد! یہ نشانہ پر اتنی ہے ادھر ان کا مطلب سفید جھنڈا ہی ہے۔"

"ہتھیار چڑھا دو!" تجمل نے بے محل انداز میں کہا۔ "سلطان! تو آگ لگا دے۔" یہ کہہ کے وہ نیچے تکے ندی سے آبامان کے پاس اوپر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ باقی سب آگے پیچھے ہی رہے۔ سلطان نے تجمل اور تشام کی مدد سے ایک مشعل میں آگ لگا دی۔ دھوپ میں اس کے شعلے مرجھائے ہوئے تھے۔ تمام اوپر والوں نے اسے دیکھ لیا ہوگا۔ صرف مشعل جلانے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ آڑے وقت کے لیے بانس پر خشک لکڑیوں کا جو ڈھیر بندھا رہتا تھا، اسے اتار کے اس میں بھی آگ بھڑکا دی گئی۔ اس طرح اوپر سے گھیرے آنے والوں کو ہماری طرف سے یہ پیغام منتقل کر دیا گیا کہ ہم مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ سب نے تجمل کی ہدایت پر ہتھیار نیچے کر لیے تھے۔ جاتے جاتے وہ اشارہ کر گیا تھا کہ سامان نیچے چھوڑ کے ہم سب اوپر آنے کی کوشش کریں۔ بہ نہی توقع کے ہم وہ منتظر تھے۔ اس کی آہستہ بدھ چلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آبامان کی اپیل پر نظر ثانی کرتے ارادے بدل بیٹھے ہم نے ایک دوسرے کو نگاہوں سے ٹوہ کے مانے۔ آگ جلانے کے بعد ہم نے چند ثانیوں کی تاخیر کی ہوگی کہ ایک ساتھ سب ادھر ادھر منتشر ہوتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہم نے رفتار میں کسی عجلت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہاں ہم زیادہ بہتر طریقے سے انھیں دیکھ سکتے اور زیادہ محفوظ انداز میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ یہاں جگہ خاصی کشادہ تھی۔ پتھریلی چٹانوں میں آڑ لینے کے لیے کتنی گڑھے موجود تھے۔ ہم نے دوبارہ اپنے ہتھیار اوپر نہیں کیے۔ "ابھی ان کو اور نیچے آنا چاہیے بڑے صاحب!" تجمل سرگوشی کے لہجے میں آبامان سے بولا۔

"ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" آبامان نے مایوسی سے کہا۔

"یہاں کا ابھی اور نیچے آنا ٹھیک نہ تھا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں ان سے بات کر کے دیکھنی چاہیے۔"

"وہ جو بولیں گے، وہ آپ ہی جانتے ہیں بڑے صاحب!"

"لیکن ہمارے پاس ان کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب!" تجمل نے گہری سانس لے کے کہا۔ "شاید اپنے کو بھی بعد میں یہی کرنا پڑتا۔ یہ فیصلہ ان کو نزدیک سے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

"ان کے پاس کثیر تعداد میں ہتھیار ہیں اور ہماری نسبت وہ زیادہ بہتر جگہ پر ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا

چاہیے۔ بہرصورت حال سمجھ لینی چاہیے۔" اباجان نے تذبذب سے کہا۔

"آپ اِدھر آرام سے بیٹھے رہیں۔ ابھی ہم لوگ اُدھر جاکے اُن سے بات کرتے ہیں۔" قبل نے سولم، پیرو اور مجھ سے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

"نہیں!" اباجان تندی سے بولے۔ "اگر میری رائے آپ لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو میں آپ کو اُن کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں خود جاکے بات کرتا ہوں۔ آپ سے زیادہ یہ سب کچھ دیکھنے کا صدمہ مجھے ہوگا لیکن اس کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ دوسرے ایک بات کا فیصلہ ہمیں ابھی کرلینا چاہیے کہ ہم زیادہ قیمتی ہیں یا ہمارا مال و اسباب۔"

"آپ کیا بول رہے ہو بڑے صاحب!" قبل نے بے چینی سے کہا۔

"میں درست ہی کہہ رہا ہوں۔ میری رائے میں کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سامنے جانے سے اندیشے زیادہ، منفعت کم ہیں۔ سب کچھ اُن کے حوالے کرنے کے لیے ذہن آمادہ کرلیجیے۔ اس آمادگی کے سوا کوئی اور تدبیر ہو تو مجھے بتائیے۔"

"آپ جو سوچ رہے ہو صرف اتنا نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"وہ نہیں جانتے کہ اپنے پاس کیسا سامان ہے۔ اُن کو اس کا ابھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم کو لینے آئے ہیں۔"

"لیکن ہمارے پاس اللہ کیا ہے۔ یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔" اباجان نے جلدی جلدی میں کہا۔

"بہت تھوڑا ہے بڑے صاحب! اتنے سے اُن کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہم نے اُدھر جاکے اُن سے بولا تھا کہ ہم اُن کے کھوئے ہوئے کاغذ واپس لانے کا جتن کریں گے۔ اُن کو یہ بولے بغیر ہم روز اِدھر اُدھر نہیں آجا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے میں نے پہلی بار آپ کو سب بول دیا تھا۔ اِن پتھروں کی نہیں اُن کو کاغذ کی ضرورت ہے۔"

"لیکن کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا مگر آپ نے قبل آپ سے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بہتر ہے انھیں ہمارے سامان کی تلاشی لینے دیجیے۔"

"وہ ہم کو واپس لینے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے اُن سے پورا وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہ نو سال تک کسی نے اِدھر آکے اُن سے ایسا بولا تھا۔ نو سال سے وہ سالے ہندوستان میں سر مارتے رہے ہیں۔ کچھ کی کوشش کرو بڑے صاحب!"

"میں سمجھ رہا ہوں لیکن کاغذ یہاں نہیں ہیں۔"

"یہ بات آپ مجھ سے بول رہے ہو۔ اُن کو کیسے بولا جائے؟"

"آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ ہمارا وعدہ ابھی تک قائم ہے۔ ہم کاغذات انھیں واپس کردیں گے۔ اگر انھیں حاصل کرنا مقصود ہے تو ہماری بات کا یقین کرنا ہوگا۔"

"آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

"جی؟" اباجان ہچکچا کے بولے۔

"میں بولتا ہوں وعدہ پورا کرنے کے لیے آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ ایسا بولیں تو آپ کیا جواب دو گے؟"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا۔"

"بڑے صاحب!" قبل نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ نے اُن کو روک دیا ہے۔ ابھی آپ اِدھر ٹھیرو۔ ہم جاکے اُن کو دیکھتے ہیں۔ آپ سے وہ کچھ بولیں تو ہم سے آپ اپنے کو الگ بولنا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے سود مند ہے تو بہتر ہے میں اُن سے یہی اظہار کروں گا لیکن آپ خود اُدھر جاکے اُن سے کیا بات کریں گے؟"

"ابھی اُدھر جاکے دیکھتے ہیں بڑے صاحب۔"

"میں سمجھتا ہوں میری بات شاید وہ مان جائیں۔"

"پر آپ ایسی بات ہی کیوں بولو جس کے نہ ماننے سے آپ کا بھرم بھی جاتا ہے۔"

"ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔"

"اپن لوگ سب خطرے کی گھڑی میں جنم لیے تھے۔" پیرو آگے آکے تیزی سے بولا۔ "یہ اپن کے راجا کے بارے آپ ٹھیک جانتے ہو گے بابا!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ "پر اپن کو ایک دم یقین ہے راجا بھی ایسی گھڑی میں اِدھر آیا ہوگا۔ آپ بالکل ٹھکانے سے بیٹھو۔ اپن نے آپ سے بولا تھا۔ بولا تھا کہ اُودر سے سارا حساب چکتا کر کے رہے۔"

"مگر، مگر......" اباجان نے آنکھیں بند کرلیں۔

"بڑے صاحب! آپ اِدھر ہمارے ساتھ ہی رہو۔" جابر نے لجاجت سے کہا۔

"درست ہے، درست ہے۔" اباجان اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے۔

دیر ہو رہی تھی۔ وہ دُور کھڑے ہم لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہماری جانب سے وہ جلد از جلد کسی اقدام کے منتظر ہوں گے۔ قبل نے اباجان کی طرح چاروں طرف گھورتے ہوئے اپنے

ہاتھ اُٹھائے۔ سولم، پیرو اور میں نے اُس کی تقلید کی۔ کچھ توقف کے بعد ایک طرف سے جواب میں ہاتھ بلند کیے گئے۔ قبل نے پھر پہل کی۔ باقی لوگوں کو وہیں ٹھیرے رہنے کی تاکید کرکے وہ اُوبڑ کھابڑ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ جس جانب سے جواب آیا تھا وہاں سے چند آدمی بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں قبل نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم تیز تیز قدموں سے درمیان کا فاصلہ کم کرتے رہے۔ کبھی راستے کے درختوں اور چٹانوں کی وجہ سے کہیں کہیں وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے تھے۔ ہم نے ہتھیار ہاتھوں میں نہیں اٹھائے تھے۔ آدھ گھنٹے کے وقفے میں ہم اُن تک پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے آگے آنے والے آدمی پیچھے رہ جانے والوں سے اتنی دُور نہیں آئے تھے جتنے ہم اپنے لوگوں سے دُور ہوگئے تھے۔ جو لوگ سامنے آئے تھے وہ ہماری جیسے ہی کے آدمی تھے۔ گنتی میں چھ۔ عمروں میں مختلف۔ صورتیں یکساں۔ انھوں نے کسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور اُن کے چہروں پر سفر کی تھکن کے آثار نہیں تھے بلکہ تازگی کھلی ہوئی تھی۔ پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد۔ ایک جنگی سپاہی کے پاس میدانِ جنگ میں جتنے ہتھیار ہوسکتے ہیں اُن کے جسم اُن سب سے مزین تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا نسبتاً بلند اور تن درست و توانا شخص اُن میں سب سے نمایاں تھا اور ہمارا صورت آشنا تھا۔ اُس کی کمر سے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے اُسے قبیلے کے سردار کے خاص کرے میں کئی بار دیکھا تھا۔ دوسرے آدمیوں کے ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہمیں شاید نہیں ہوا تھا۔ صورت شکل میں تمام تقریباً ایک جیسے لگتے ہیں۔ ممکن ہے انھیں بھی ہم نے سردار کے مکان یا بستی میں کہیں دیکھا ہو۔ سب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہمی پر مرکوز تھیں۔ اُن کے چہرے انگارا ہو رہے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر قبل نے کسی تمہید کے بغیر تند لہجے میں پوچھا: "سردار نے بھیجا ہے؟"

سولم نے فوراً اسی کے لہجے میں ترجمانی کردی۔

"ہاں!" ادھیڑ عمر شخص نے بیٹھی آواز میں جواب دیا۔

"سردار کدھر ہے؟"

"بستی میں ہے۔"

"ہم کو ساتھ لے جانے کو آئے ہو؟"

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اتنے بہت سے آدمی بلانے بھیجے ہیں؟"

"پیچھے اور بھی ہیں۔"

"اچھا!" قبل نے سکون سے کہا۔ "پر کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔" وہ نخوت سے بولا۔

"سردار سے بولو کہ ہم اُدھر واپس آئیں گے۔ ابھی ہمارا بہت سا سامان اِدھر پڑا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے سردار کو جو بات بولی تھی وہ ہم کو یاد ہے۔ اس کو پورا کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔" قبل نے متانت سے کہا۔

"سردار نے ہمیں ایک ہی حکم دیا ہے۔ تمھیں واپس لایا جائے۔"

قبل مسکرانے لگا۔ "تم کو پتہ ہے ہم نے سردار سے کیا بولا تھا؟"

"تھوڑا بہت۔" اس نے سر جھٹک کے کہا۔

"ابھی ہم کو کچھ نہیں ملا ہے۔"

"یہ سردار کو ہی جاکے بتانا۔"

"سردار سے تو ہم نے ساری بات صاف کرلی تھی۔ ہم نے بول دیا تھا کہ چار مہینے تک کدھر بھی آئیں کدھر بھی جائیں۔ وہ بیچ میں روڑا نہیں ڈالے گا۔ چار مہینے بعد اگر کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اپنا کالا منہ لے کے اُس کے پاس نہیں آئیں گے۔ تم لوگوں نے نو برس میں جو کچھ گنوایا ہے، ابھی تین ایک مہینے کے لیے کیوں اتنا بیر باندھا کرتے ہو؟"

"ہم سے کوئی صفائی مت کرو۔ جو کچھ کہنا ہے، سردار سے جاکے اُس کی وضاحت کردو۔"

"اُدھر جانے سے نہ سردار کا بھلا ہے نہ اپنا۔ تمھارے پاس اچھا دماغ ہے، سمجھو ہمی اپنا ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو جاکے سردار کو کیا دھیلا دیں گے۔ ہمارا راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو۔"

"ہم نے سردار کا حکم تمھیں بتادیا ہے۔"

"اور ہم تم سے یہ نہیں بولیں گے کہ یہ سردار کا علاقہ نہیں ہے۔"

"تم یہ ذکر کے اچھا ہی کروگے اور ہماری بات مان کے اور اچھا، سردار سے جاکے خود بات کرلو۔ ابھی بستی زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"چار آدمی بھیج کے سردار ہی کو اِدھر بلالو۔ ہم اس کا انتظار کرلیں گے۔" یہ کہنے سے نہ جانے قبل کا کیا مقصد تھا۔

اُس نے منہ بنایا۔ "ہمارے لیے سردار کا ایک ہی فرمان ہے۔"

"کوئی دوسرا نہیں؟" قبل نے سرد لہجے میں کہا۔

"دوسرا بھی ہے۔"

"اُس کو بھی بولو۔"

"اُس کے بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"تم اِدھر کب سے ہو؟" غالباً قبل کو یہ جاننے کی جستجو تھی کہ وہ بڑے منصوبے کے علاقے میں اپنے چار آدمیوں کی موت کی اطلاعات سُن کے آئے ہیں یا پہلے سے موجود ہیں۔ اُن کے تیور کو تو لڑانے کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔

"تمھیں اس سے کوئی غرض نہیں۔"

"خوش کیوں نہیں ہے سور ماتیاں؟" معلوم نہیں شولم نے تیل کا کیا ترجمہ کیا ہوگا۔ اس شخص کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تمھاری طرف سے کیا جواب ہے؟" اُس کی آواز بگڑنے لگی۔

"کیا جواب دیں پیرو دادا!" نجل نے پیرو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ابھی کیا بولیں استاد!" پیرو کڑواہٹ سے بولا۔ "سالا ڈپ بے مزہ کر گیا۔ مانگتا ہے، اپن اتنی بات نہیں سنتا۔"

نجل چند لمحے چپ کھڑا رہا۔ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں میں کمانیں تنی تھیں۔ ہماری ایک ایک جنبش اُن کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وادی میں ندی کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ "اپنے لیے واپس جانے میں تھلا ہی گو نا ہے؟" نجل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم اپنا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو ایک زمانے سے گھاٹے ہی میں ہیں۔" سردار کے پیغام بر کی آواز تپی ہوئی سی تھی۔

"بولو پیرو دادا!"

پیرو نے نجل کو جواب دینے کے بجائے شولم سے کہا: "اس سے بولو شولم، سالا سردار کو اپن کچھ جاستی پسند آگیا ہے کیا۔ اودر اپن کے بیچ ادھی ماں بہن کو سامنے کرے گا یا خود اپنے کو!... اس سے بولو کہ ابھی اپنا کچھ تو بھی اپن کے ساتھ باندھ لے۔ پھر اپن دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان کا سیر کریں گا اور گھوڑے گھوڑے ردّی کاغذ کھوجیں گا۔"

میں نے پیرو کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ پیرو کے ہونٹ بھنچ کے رہ گئے۔

شولم نے اپنی طرف سے قطع و برید کر کے پیرو کی بات پیش کی۔

"اس کا فیصلہ بھی سردار کرے گا۔"

"یہ چڑی مار تو اپن کو ایک نمبر کا غلام لگتا ہے۔"

"بالکل ہے دادا!"

"اپن اصیل بولنے کو تھا۔" پیرو چونک کے بولا۔

"تمھارے سردار کو کاغذات چاہئیں یا ہم؟" نجل تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ جواب دیتے دیتے ہچکچانے لگا: "کاغذات۔"

"تو ابھی اپن اُودر جا کے سردار سے منع بول دے تو کیا ہو گا؟" پیرو نے نجل کے کچھ کہنے سے پہلے درمیان میں دخل دیا۔ "تم بھی قبیلے کا کام آدمی ہے۔ اپنا تمھارے ساتھ اور سب لوگ قبیلے کا سب سردار کے آگے پیچھے کی سکوت کرو اور سمجھو کہ ابھی اپن کیا بولنا مانگتا ہے۔ کاغذ اپن نہیں ہے۔ اپنا سامان تلاشی کرو۔ اپن اُس کی جگہ میں اودر جا رہا ہے بابا! اپن کو بھی مال بنانے کی جلدی ہے۔" پیرو برادری سے کہنے لگا: "اپن سے گھٹا لامت کرو۔ نو سال گیا، سالا نو ہزار سال لگ جائیں گا، سب ایک ایک کر کے سو جائیں گا۔ رہنے والا بھی نہیں ہونے گا، شولم! اس کو بولو کہ اپن بھی تھی دار لوگ کم نہیں ہے۔ پر اپن اپنا بول رہا ہے۔ اودر بھی جا کے آتا بو سے گا۔" پیرو کی زبان میں لکنت آگئی تھی۔ "شولم! اس کو بولو تھوڑی سی دیر کو اپنے آدمیوں سے سوچ بچار کر لو۔ اپن ادھر ہی ہیں۔ بولو کہ اپن کا فیصلہ نہیں بدلنا۔"

مجھے حیرت تھی کہ نجل اور پیرو ایسی اور اتنی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ بالکل فضول۔ انھیں ابتدا ہی میں اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ وہ کوئی اور بات سننا نہیں چاہتے۔ مگر شولم نے احتیاطاً پیرو کی ترجمانی کرتے ہوئے پیرو کا لہجہ منتقل نہیں کیا تھا۔ وہ رواں اور ستھرے انداز میں انھیں اس کی کہی ہوئی باتیں منتقل کر رہا تھا لیکن وہ سب اگر چہ ہندوستانی نہیں جانتے تھے تو پیرو کا لہجہ اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھا اور ان میں سے ایک معمر شخص سر اٹھا کے بولا: "ہم سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟"

"اپن سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟" پیرو بھڑک کے بولا۔

"دونوں کا انکار برا ہے دادا!" یکایک نجل نے دھیرے سے کہا۔

"پھر کیا... کیا ہے نجل بھائی؟" پیرو چونک پڑا۔

"سردار کی عزت تم سے بڑی ہے۔"

"مطلب تم... تم واپس جانے کو بولتے ہو کیا؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں دادا!" نجل نے کسمسا کے کہا۔

پیرو کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ نجل کو شکستہ نظروں سے گھورنے لگا جیسے اس نے جو سنا ہے وہ نجل نے نہیں کہا ہے مگر نجل ہی نے کہا تھا۔ پیرو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب نجل نے شولم سے کہا: "بولو کہ ملیچھ۔ یہ اب کاغذ کا دھیان چھوڑ دو۔ اب تمھارا باپ اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ بولو کہ سیوا نے کاٹھا بیچ میں ڈال کے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔ ہم بھی اب اس کے پابند نہیں ہیں۔ کاغذ کو بھول جاؤ۔ اُدھر سردار سے اس ناتے تم میں سے بہت سے بھول گئے جب اُس نے ہم کو تولنے کے لیے اپنے آدمیوں کو ٹھیک ٹھیک کرائی تھی اور ہم نے اُس کو بولا تھا کہ اپنے کو اکیلے جانا ٹھیک نہیں لگتا۔ گنتی تمھاری زیادہ رہے گی۔ ہم تو اُدھر اپنے ٹھکانے سے سر کو اُدھار مان کے چلے تھے۔"

سردار کا پیغام بر فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ انھیں بھی پیرو کی طرح جیسے نجل کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ وہ چپ کھڑے اضطراری نگاہوں سے ہمیں تکتے رہے۔ پھر سردار کے پیغام بر نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا: "تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔"

"تم بھی کیا بولتا ہے، تم سے اُس پہ غصّا نہیں لگاتا ہے۔"

"اپنے ہتھیار اُتار دو۔"

تھوڑی دیر میں بولا: "اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"سر دست ہتھیار ہی اُتار دو۔"

"ہاں ہاں!" نجل کے نتھنے پھولنے لگے۔ "ہتھیار بھی اُتار دیں گے بلا! اپنے لیے پھر کیا چوڑیاں لائے ہو۔ بولو گے تو اُن کو بھی پہن لیں گے، تمھارے پہننے کے بعد۔"

"ہم کہتے ہیں اپنے سارے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

"تم بھی ایسا کرو گے تو اپنے کو کیا اعتبار جانتا ہے۔"

"ہم... ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ادھر تمھارے ساتھ یہ سب خام کے چنے ہیں کیا! ایک بار ہم سی کرانا مجبور سا بھر کے نہیں لانے ہو گے۔ دادا! سنا! ہتھیار اُتارنے کو بولتے ہیں۔"

"اپنے کو سالے اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تمھارے ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔ سردار کے پاس جا کے یہ تمھیں واپس مل جائیں گے۔" اُن میں سے ایک نوجوان تیزی سے بولا۔

"اور تمھارے اپنے پاس؟"

"اس کا مطلب ہے تم انکار کر رہے ہو۔ تم چلنا نہیں چاہتے۔"

"ہم نے جو بول دیا ہے اتنا ہی ٹھیک ہے۔"

"چھوڑو نجل بھائی! یہ سالا گئے گزرے کی دُم ہے۔" پیرو نے تلملا کے کہا۔ "شولم! ابھی اس کو بولو کہ فیصلہ کرے۔ اپنے کو لے جانا مانگتا ہے تو ہتھیار کے سنگ۔ اپن سالا قبیلے سے سردار کی ماں بھگا کے نہیں لایا ہے۔ اپنا ایک چھوکری اُودر کی اپنی مرضی سے آئی ہے۔ مرضی بدلے تو لوٹ جائے۔ اپن تو اپنا کا آدمی ہے۔ نہ سردار کا بچہ کھاتا ہے۔ سالا ایک کے برابر ڈنن ڈزن بھرے۔ پھر بولتا ہے ہتھیار نکال دو۔ پھر بولیں گا: آنکھ الگ کر دو، کان الگ کر دو۔" پیرو دم چڑا کے بولا: "سوری بولتا ہے۔ قسم سے ابھی اُستاد بادشاہ کا خیال ہے، اپن کا خون بہت گرم ہے۔"

وہ تنانم کے ذکر پر ایک لمحے کے لیے چونکے تھے۔ شاید اُن کے لیے یہ اطلاع نئی تھی مگر انھوں نے پلٹ کے نہیں پوچھا کہ قبیلے کی کون سی لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ تاہم اُن کے چونکنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مندر کے تہ خانے سے ہمارے نکلنے اور تنانم کے ساتھ ہونے سے پہلے انھوں نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ انھیں یقین ہوگا کہ اگر ہمیں ہندوستان کی طرف جانا ہے تو ہم اس جگہ سے ضرور گزریں گے۔ پیرو نے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمارے سامان کی تلاشی لے لیں۔ انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ہمیں بستی واپس لے کے جائیں گے تو سارا سامان چھڑوانا محال تھا۔ یہ کام وہ بستی میں جا کے بھی کر سکتے تھے۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہتھیار اُتار کے چلیں۔ انھوں نے بحث نہیں کی۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ پھر بستی سے کوئی اطلاع دیے بغیر ہمیں لیں غائب ہو جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اطلاع دینے میں کیا عذر تھا۔ یہ کوئی منظم پروگرام ہی ہو گا۔ دوسرا خلا ہمارے ساتھ تھا جسے ہم نے اپنے جانے سے تین دن پہلے بستی سے روانہ کیا تھا۔ پیرو اور نجل نے سردار کے سامنے خود کو دو قافلوں کے طور پر پیش کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے آئے تھے۔ اب وہ دونوں ساتھ تھے۔ ہزار قسم کے وہمے اُن کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ کاغذ کی متبرک حیثیت کے علاوہ اُن کے بارے میں اور بھی بے شمار روایتیں مشہور تھیں۔ ہر چند کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اس سلسلے میں اُن کا علم سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی مخفی خزانے کی روایت بھی اُن میں سے ایک ہوگی۔ اشاروں کنایوں میں انھوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر وہ یقیناً بڑے مندر کے تہ خانے میں چھپے ہوئے عظیم الشان خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ کبھی انھوں نے ان کاغذات کی تحقیق کی باقاعدہ کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک تو وہ انھیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے، پھر ان کے رموز جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ممکن ہے کبھی کسی نے ان کی تحقیق کی جرأت کی ہو اور قبیلے میں فساد کے خوف سے خاموش رہا ہو۔ اگر کبھی ایسی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اس کا علم چند لوگوں تک محدود رہا ہوگا۔ جس زمانے میں قبیلے کا سردار، سردار کا باپ تھا اس زمانے میں اس کے آتا جی نمیں نے ہو سکتا ہے کوئی رمز دریافت کر لی ہو جس کا علم کروانے کے بجائے بھی ہو گیا ہو اور اسی نے محض اسی سبب سے اپنے بڑے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو اور انھیں کاغذات اور کودا کر کے اُس کی دست برد سے دور ہو گیا۔ بہرحال کاغذات سے متعلق ان گنت روایتیں قبیلے میں جاری تھیں اور ہمارے متضاد طرزِ عمل کے پیشِ نظر وہ ہمارے بارے میں ان گنت قیاس آرائیاں کرنے میں حق بجانب تھے مگر انھوں نے ادھر اُدھر اُلجھنے کے بجائے بس اپنا مقصد سامنے رکھا تھا کہ وہ کسی طور ہمیں سردار کے سامنے زندہ پیش کر دیں۔

پیرو اور نجل کی زبانی ہتھیار اُتارنے سے قطعی انکار سن کے وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ادھیڑ عمر شخص جو ان میں سب سے معمر تھا، ہمارے ہتھیار اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھا مگر اس کے دوسرے

ساتھی اُس کے ہم راہ نظر نہیں آتے تھے۔ اس دوران بیرو بڑبڑایا تو ببل نے اس کی کہنی کے آگے کسی طرح چپ کیا اور ہم سب اُن کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی اور انتخاب باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہتھیار چھن جانے سے ہماری تعداد نہ ہونے کی برابر رہ جاتی۔ ببل، بیرو، سولم اور میں چاروں اُن کی ناراضگی کی صورت میں اپنے تیغے اور چاقو نکالنے کے لیے مستعد تھے اور ہمیں اندازہ تھا کہ ہماری کسی بھی حرکت پر ایک لمحے میں چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو جائیں گے۔ تیر چلنے کی نوبت آتی تو ہم میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ایک ہاتھ میں تیغا، دوسرے میں چاقو لے کے جھپٹ اُن کے غول میں گھس جاؤں گا۔ وہ اپنے آدمیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے ہمارے جواب کا انتظار ضرور کریں گے۔ اسی مہلت میں ہم اُن پر جھپٹ سکتے تھے۔ ببل، بیرو، سولم نے بھی یہی سوچ رکھا ہوگا۔ اس موقع پر تیغے سے کارگر کوئی اور ہتھیار نہیں ہوگا۔ پیچھے ابا جان کے ساتھ کھڑے ہوئے ہمارے سارے آدمیوں کی نظر ہم پر ہوگی۔ وہ اب ایک ٹیلے پر تھے اور اُن کی بندوقیں اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا نشانہ لے سکتی تھیں۔ وہ آخر دم تک نشانے لگاتے رہیں گے اور کسی کو بھی کسی حیران کن نتیجے کی توقع نہیں ہوگی۔ ہم کتنی گولیاں چلا سکیں گے۔ ہمارے پاس کارتوس یقیناً اُن کی تعداد سے بہت زیادہ تھے مگر انھیں استعمال کرنے کا موقع ملتا تب نا۔ یوں بھی اُن کے ساتھ جانا تھا لیکن ہتھیاروں کے بغیر زندہ جانا بھی مُردوں کے مانند جانا تھا۔

ہتھیار اُن کے حوالے کرنے تھے تو جھٹ سے ہوئے ہی کیوں نہ بندوقیں اور کارتوس خالی کر کے اور خنجروں، چاقوؤں کی دھار کند کر کے ہی کیوں نہیں۔ ایک پل، دو پل کی دیر تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ابا جان کی طرف دیکھا۔ اُن کا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھر اُن کا چہرہ دیکھنے کا وقت ملے گا یا نہیں۔ آنے والی گھڑی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر مجھے ابا جان سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تو میں اُن سے ذرّین، نیساں، شیرو، پونے کے لیے کچھ کہتا اور اپنی بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک اُن کے حوالے کر دیتا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ابا جان پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے لیکن اُن کی موجودگی میں ابا جان میری لاش کو بھی اپنے بیٹے سے نہیں لگا سکیں گے۔ اُن چند لمحوں میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے کہ میرا سارا وجود لرز گیا۔ کچھ دیر پہلے بیرو نے ابا جان سے کہا تھا کہ میں خطرے کی کسی گھڑی میں پیدا ہوا ہوں گا۔ خطرے کی نہیں تو وہ نحوست کی گھڑی ضرور تھی۔ میرا وجود ہی نحس تھا۔ سب ایک آدمی کے سبب سے تھا۔ وہ نہ ہوتا تو اتنے لوگ اس دور افتادہ اجنبی جگہ پر یوں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا نہ ہوتے۔ کاش عدالت میں تین آدمیوں کے قتل پر آتے ابتدا ہی میں موت کی سزا مل جاتی، لٹکتے یا تو اُس کے جسم کے لیے کھلے تھے۔ کوئی ایک اُن میں سے لگ جاتا تو یا وقت نہ آتا۔ معلوم نہیں وہ چند آدمی دنیا سے کیوں نہیں اٹھ جاتے جو خود بھی زندہ نہیں رہتے، دوسروں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ میرے قریب ببل پُرسکون انداز میں کھڑا تھا۔ بیرو بھی بظاہر مطمئن نظر آتا تھا۔ اندر ایک طوفان بپا ہوگا۔ اُس کی بیٹی گیتا اور بیوی کی پرچھائیاں آنکھوں میں لرز رہی ہوں گی۔ کاش وہ سب مل کے پہلے مجھے مار دیتے۔

ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسے ہی ہماری طرف متوجہ ہوا، میرے ہاتھ تیزی سے اپنی جیبوں کی طرف لپکے لیکن ہتھیار باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک لمحہ جاتا تھا کہ میرے تیغے کی گولی اُس کے سینے میں پیوست تھی۔ اُس نے سر کی جنبش سے اپنے اقرار کا اظہار کر دیا تھا۔ "کسی تاخیر کے بغیر چلو!" اُس نے اونچی آواز میں ہمیں حکم دیا۔

ببل اور بیرو پھر ایک پل کے لیے بھی اُن کے سامنے نہیں ٹھہرے۔ چپ چاپ نیچے ٹیلے پر آ گئے جہاں سب ہمارے منتظر تھے اور یہ جاننے کے لیے مضطرب کہ ہم کیا طے کر کے آئے ہیں۔ شاید وہ کسی معجزے کی توقع کر رہے تھے۔ ببل نے اُن سے سامان اٹھانے اور چلنے کے لیے کہا تو اُن کی گردنیں ڈھلکنے سی لگیں مگر انھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یاکوں کا رخ فوراً موڑ دیا گیا۔ جانگ قبیلے کے سارے آدمی اوپر ہی رہے اور اطراف سے ایک جانب سمٹنے لگے۔ وادی سے نکلتے ہی وہ ہمارے اردگرد ہو گئے۔ انھوں نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے آگے تھے، کچھ پیچھے، کچھ دائیں بائیں۔ کچھ ہم سے قریب تھے اور کچھ دور۔ جو قریب تھے اُن کے ہاتھوں میں نیزے تھے، دور چلنے والوں کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں۔ ابا جان اور شامم ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ایک بزرگ شخص نے ابا جان کے پاس آ کے انھیں الگ ہو جانے کی پیشکش کی تھی۔ ابا جان نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ایسے حالات میں وہ اُن لوگوں سے جدا ہونا مناسب نہیں سمجھتے جن کی رفاقت میں انھوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے ہمراہ اُن کی واپسی کا جواز موجود تھا۔ ان دشوار گزار راستوں میں تنہا سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لوٹنے کے بعد ابا جان اکیلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں راستے میں کسی دوسرے قافلے کی ہم رکابی کے عوض ہمارے ساتھ واپس چلنا تھا۔ بھکشو یا

تاجروں کے قافلوں کی سفری رفاقت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سفر کی دشواریاں کم کرنے کے لیے کبھی تاجر بھکشوؤں کے قافلے کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی بھکشو تاجروں کے ساتھ۔ میں دیکھ رہی تھی کہ انھوں نے ہمارے ہمراہ ابا جان کی موجودگی پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ قریب آ کے انھوں نے شامم کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا تو اُسے بُرا بھلا کہا، نہ ابا جان کی طرح اُسے ہم سے جدا ہونے کی پیشکش کی۔ جب سب بستی ہی کی طرف جا رہے تھے تو شامم ادھر سے یا اُدھر، بات ایک ہی تھی۔

اتنے بہت سے مردوں کے درمیان شامم صرف ایک لڑکی تھی۔ واپسی کا سُن کے اس کے شریر و سفید چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ لو بہ لو جیسے اس کا خون سوکھ رہا ہو۔ ببل نے اُسے ایک یاک پر بٹھا دیا تھا مگر اُس کے بدن کی لرزش کم نہ ہوئی۔ سلطان اُس کے قریب ہی تھا اور سرگوشیوں میں اُسے بار بار جانے کیا تسلیاں دلا رہا تھا۔ پھر ببل بھی اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُس نے شامم کا ہاتھ تھام کے اس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے۔ "گڑیا!" مسکراتے ہوئے بولا۔ "رنگ کیوں بدلتی ہے۔ وہ لال رنگ ہی تیرے کو اچھا لگتا ہے۔"

شامم کے ہونٹ ہلنے لگے۔

"نا، نا!" ببل اُس کی انگلیاں چومتے ہوئے بولا۔ "تیرا کیا ہے، مل گیا تو ادھر ہی ہے۔ ہنستے کھیلتے جا۔"

شامم نے اُسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ دن سے وہ چپ سادھے تھی۔ ببل نے اُسے پہلی بار مخاطب کیا تھا۔ "بکرے میں چار روپے تھے اور گھر سے بچھڑا تو رستہ بھی چھوٹا نہیں تھا۔ جب ملا ہی نہیں دیا، ابا کا ہے کا دھواں ہے۔ سمجھی! اپنے رنگ پرکھ ایک نہیں لگتی۔" وہ ہنس کے بولا۔ "یہ لوٹ پھیر تو ساری زندگی آسے جیتے کو اُجلا ہی رکھ۔ چھپانے کے آئی تھی دیا۔ سمجھی جیتا!"

پتہ نہیں شامم کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر دیکھتے دیکھتے اُس کا اڑا ہوا رنگ واپس آنے لگا۔ اس کا مرجھایا ہوا بدن جیسے پھر سے لہلہانے لگا۔ سہ پہر ہو گئی تھی۔ ابھی ہم نے وادی سے چند میل طے کیے ہوں گے۔ اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے اچانک سفر ترک کر دیا۔ وہ ایک کشادہ اور ہموار جگہ تھی۔ قریب ہی پڑاؤ کے لیے کوئی جگہ ملنی مشکل ہوگی۔ اسی لیے انھوں نے ہمیں وہیں منزل کرنے کے ساتھ باربرداری کے لیے ہمیں کے تک جنگ لیے تھے۔ باقی سامان بڑے بڑے تھیلوں میں اُن کی پیٹھ سے بندھا تھا۔ وہ فاصلے فاصلے سے ہمارے اردگرد مختلف مقامات پر بیٹھ گئے تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی انھوں نے مشعلیں روشن کر دیں اور الاؤ جلا دیے۔ اُن میں سے چند لوگ ہماری پہرے داری چھوڑ کر کھانا تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جابرا اور بیرو نے صبح صبح کئی پرندوں کا شکار کیا تھا لیکن انھیں ہم نے محفوظ رہنے دیا۔ سولم نے اُن سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ہمارے لیے بھی کھانا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ وہ منع نہیں کر سکے۔ ہم ہم تین خیمے نصب کر کے اور بستر لگا کے لیٹے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر کئی چھوٹی بڑی چھولداریاں کھڑی کر لی تھیں اور ہمارے خیموں کے باہر متعدد آدمی پھیلا دیے تھے۔ جب تک انھوں نے کھانے کے لیے آواز نہیں دی، ہم باہر نہیں نکلے۔ سالا ہم زرث دلا تھا اور بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے وافر کھانا بھیجا تھا۔ کسی کو بھوک ہی نہیں تھی۔ سب نے ایک دوسرے کے خیال سے تھوڑا بہت حلق سے اتار لیا۔ ابھی رات کا ابتدائی پہر تھا۔ کھانا کھا کے ہم کچھ دیر ہی باہر ٹھہرے پھر اپنے اپنے خیموں میں آ کے پڑ گئے۔ ببل نے سب کو تاکید کی تھی کہ پوری رات آرام سے سوئیں مگر سب آنکھیں کھولے کروٹیں بدلتے رہے۔ کسی کے پاس دوسرے سے کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ببل، ابا جان، شامم اور سولم الگ خیمے میں تھے۔ میں، جابرو، مارلی، زودا اور جینی دوسرے میں۔ تیسرے میں بیرو، سلطان، جلنو، بلاکو اور دو قلی تھے۔ میرا اور ببل کا خیمہ بیچ میں تھا۔ سب قریب ہو، قریب تھے۔ کوئی زور سے بات کرتا تو دوسرے خیمے کے لوگ سُن سکتے تھے۔ رات گزرنے پر ہم سب نے باری باری خیمے کی جھریوں سے جھانک کے دیکھا، اتنی سخت سردی میں وہ باہر ہی موجود تھے۔ نہ جانے انھوں نے چھولداریاں کیوں نصب کی تھیں۔ کھانے کے دوران ایک شخص نے آ کے ہمیں متنبہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ فرار کی کوشش ہمارے لیے انتہائی عبرت ناک ہوگی۔ آگے کی منزلوں پر بھی اُن کے جانگ قبیلے کے گروہ موجود تھے۔ سب اُن کے خاکروش رہیے۔

جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرا خیال تھا کہ سردی سے گھبرا کے وہ آخرکار چھولداریوں میں جا بیٹھیں گے لیکن ببل کے ذہن میں ہو کہ اس لیے باہر نکلنے کی ہم کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور بارش ہو گئی تو لازماً انھیں اندر گھسنا پڑے گا۔ الاؤ بھی بجھ جائیں گے، مشعلیں بھی گل ہو جائیں گی۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں ستاروں اور چاند پر چھا جاتی تھیں۔ بارش کا امکان نہیں تھا مگر کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک بادل گھر کے آ جاتے اور موسلا دھار پانی برسنے لگتا لیکن جس طرح وہ بارش میں باہر

کا سالا کوشش ملا۔ کچھ وکیل کے زور مارنے سے جامنی بائی کو صرف ۵ برس کا [illegible] پڑا۔ پانچ برس میں ابھی چار برس کو تھا کہ جیل سے چھوٹ کے پھر دادر آ گیا اور طوفان دادا کے پاڑے پر آ کے ہی جم گیا۔ سالی کی فربہی کم تھا۔ چار برس بندی کے بعد بھی کچھ گوری لگتا تھا جیسے اودر سالا ابھی شیشے کے سامنے بیٹھا رہا ہو۔ جیل سے جل کر پورا تیر کمان بنائے ہوئے نکلا تھا۔" پیرو کی آواز بہکنے لگی اور وہ بولتے بولتے گم سا ہو گیا۔ سب انتظار کرتے رہے۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد پیرو خود ہی بولا۔ "کیا کلیجہ سے بولے۔ ہوا کوئی تھا سالا بھی اتنا تا کہ پاڑے کے سارے آدمی کو تھر تھری لگ جاتا۔ کسی نے اونچا بوم مارا۔ اُس کو سالے کے لیے بنجا بیٹھا دیا۔ گیروے اور نیلے رنگ کے سوا دوسرا کلر کا ساڑی نہیں پہنتا تھا۔ ایدھ دادر کے آزو بازو پاڑوں کے دادا لوگوں کو موت مانگتا تھا تو وہ اودر جامنی بائی کے پاڑے کو اُن کا منہ پھیر دیتا تھا جس نے جامنی بائی سے محل کیا اپنے آپ سے قتل کیا۔ جامنی بائی کبھی خود سے کسی پاڑے میں نہیں گیا۔ وہ اودر اپنے کو بند رکھتا تھا۔ پر دادا لوگ ایک عورت کا سن کے اپنی خواری سمجھتا تھا۔ اُس ٹیم دادر کے بازو میں جانگڑی دادا کا بہت مشہوری تھا۔ اُس کو لوگ بلڈ آگ بھی بولتے تھے۔ جامنی بائی نے کچھ نہیں بولا تھا کہ جانگڑی نے آدمی بھیج کے بولا ام اپن سے شادی بناؤ۔ تم رانی اپن راجا۔ دونوں کا پاڑا مل جائیں گا۔ جامنی بائی جانگڑی کے آدمی کی بات سنتا رہا پھر اپنے ہاتھ کی چوڑی اُتار کے بھیج دیا۔ جانگڑی سمجھ گیا کہ ابھی جامنی بائی کا کیا مطلب ہے۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں پیدا تھا۔ آنکھ کا گرم اور دل کا جوان تھا۔ بولا اپن آتا ہے تیار رہو۔ ابھی لال کلر کا ساڑی پہننا۔ جامنی نے جواب بولا۔ کبھی تو اپن ایسا ہی ہے۔ دوسرے دن جانگڑی ہار پھول لے کے گیا تھا۔ جامنی نے لال کلر کا ساڑی پہن رکھا تھا۔ ہار پھول لے کے ایک طرف رکھا۔ جانگڑی کے آگے چاقو پھینکا اور سامنے آ گیا۔ جانگڑی نے چاقو اٹھایا، گھمایا اور دس بارہ ہاتھ سے جامنی نہیں چلایا تھا کہ بازو پر نشان ڈال کے گر گیا۔ جامنی بائی کھڑا رہا۔ اودر جانگڑی کا سارا آدمی بھی یہ تماشا دیکھتا تھا۔ جانگڑی نے پھر سے چاقو اٹھا لیا۔ سب سمجھے کہ جامنی بائی پہ پھینکے گا۔ پر جانگڑی نے اُس کو اپنی چھاتی میں اتار لیا۔"

پیرو کہہ رہا تھا کہ جامنی بائی نے جانگڑی کی آخری خواہش کے طور پر لال رنگ کی ساڑی پہنی تھی۔ سب کی آنکھیں پیرو کی طرف مرکوز تھیں۔ پیرو چپ ہو جاتا تو وہ مچلنے لگتے۔ پیرو کو اس کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ ناقابلِ یقین باتیں۔ وہ اُس کے چاقو چلانے اور داؤ پیچ کے انداز بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بظاہر وہ ایک سیدھی سادی سی عورت لگتی تھی مگر جب چاقو اٹھاتی یا سامنے کوئی آتا تو بالکل بدل جاتی۔ آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگتے۔ چہرے کا جامنی رنگ سرخ ہو جاتا اور بدن پھڑکنے لگتا۔ پیرو کہتا تھا کہ زہریلے داؤ تو اس کی آنکھوں کے تھے۔ جسے نظر بھر کے دیکھ لیتی اپنی چال بھول جاتا۔ ہاتھ اٹھاتی کہیں تھی مارتی کہیں تھی۔ کوئی اس کے داؤ کا پہلے سے تعین نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے آتے ہی ہرن کی طرح چوکڑی بھرتی۔ آتے ہی پینترے بدلنے اور جھپٹ کے وار کرنے کا ہنر کمال تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی جادو کرتی ہے لیکن اُسے تقریباً تمام داؤ آتے تھے۔ نیزہ، بھالا، چاقو وغیرہ اور خالی ہاتھ کے داؤ۔ اتنی کم عمری میں اس نے نہ جانے یہ سب کچھ کہاں اور کیسے سیکھا تھا۔ عموماً وہ اپنے پاڑے تک محدود رہتی تھی۔ نہ اُسے اپنا پاڑا بڑھانے کی خواہش تھی۔ پچھلے اڈے اس کی تحویل میں آئے۔ ان سب کے اُستادوں نے خود اس سے چھٹکارا پا کے اس کی گود میں ڈال دیے تھے۔ جن میں کئی کو تو اس نے یوں ہی چھوڑ دیا۔ کئی پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔ خود اس نے اپنے پاڑے میں تمام الا بلا آدمی نکال کے منتخب آدمی رکھے تھے۔ اپنی دو نوکرانیوں کے سوا وہ سالے پاڑے میں تنہا رہتی تھی۔ پھر بھی اُس کے تعلقات ٹھیک ہی رہتے تھے۔ علاقے سے اس کے کسی آدمی کی شکایت آتی تو وہ اُسے سدھرنے کا صرف ایک موقع دیتی تھی، دوسری شکایت پر اُسے پاڑے سے نکال دیتی۔ جبر و قہر کی کہانیاں اس کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں مگر وہ ان سب سے جیسے بے خبر تھی۔ اس کے پاڑے کے آدمیوں کا کہنا تھا کہ اس نے کبھی کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ پاڑے کے کسی آدمی سے زیادہ بات نہیں کی۔ علاقے کے لوگ اُسے جامنی دیوی کہنے لگے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ کالی دیوی کا کوئی روپ ہے۔ پاڑے میں کوئی ضرورت مند جاتا تو خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہوتی تو وہ اس کے ساتھ خود باہر آ جاتی اور زیادتی کرنے والے سے بازپرس کرتی۔ دادر کے لوگ اپنے بعض فیصلے بھی اس سے کرانے لگے تھے۔ جانگڑی کی موت کے بعد ممبئی کے کسی دادا نے پھر جامنی بائی کے علاقے کا رخ نہیں کیا۔ سب نے جان لیا تھا کہ جامنی کو زیر کرنا اپنی موت کے مترادف ہے۔ جامنی بائی کو ایک ہی شوق تھا۔ گانے اور ناچ دیکھنے کا شوق۔ اُسے کسی نے گاتے ہوئے دیکھا نہیں تھا۔ البتہ رات کو کبھی پاڑے کی اوپری منزل سے جہاں وہ رہتی تھی، کبھی کبھی اس کے گانے کی آواز آنے لگتی۔ اور وہ صرف رات کو گاتی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ اس کی آواز سننے کے لیے اس کے پاڑے کے آدمی کان لگائے رہتے تھے لیکن رات کو گانا اس کا معمول نہیں تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا اور جب

[illegible] گانا ہوتا تو کسی طوائف کو بلا کے محفل بند کر لیتی اور تنہا اُس کا رقص دیکھتی رہتی۔ سننے میں آیا ایک بار وہ ضرور کسی طوائف کو بلاتی تھی۔ رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھاتی تھی۔ اُسے ایک جوڑا بیساتی اور نیفے کے بجائے سونے کا کنگن یا جھومر دیا کرتی تھی۔

"ابھی تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟" پیرو نے اچانک ہم سے پوچھا۔

"دیکھا ہے دادا!" جامو نے جواب دیا۔

"بس سمجھو جامنی بائی بھی ایک کالا گلاب تھا۔" پیرو خود ہی پھر بولا۔ "گلاب کی پتی جیسا، پر جنتی کو کانٹا بہت تھا۔"

محفل سر جھکائے پیرو کی باتیں سن رہا تھا اور بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ "آواز کیوں کٹک رہی ہے دادا؟" دوسرا [illegible] کے بیچ درمیان میں بولا۔ "ابھی آگے زبان کھول۔"

"آگے آگے کیا زبان کھولے۔" پیرو سست پڑ سا گیا۔ "ابھی یہ رات بھی جانے کو ہے۔ جامنی بائی ایک رات سے بہت زیادہ تھا۔ اپن کتنا بھی بولے۔"

"اودھر جامنی بائی نے تم کو کب دیکھا؟"

"تم کچھ جانتا ہے استاد!" پیرو چونک پڑا۔

"آگے بولو دادا!"

"قسم سے بھول جاتی! لیکن کو بولو تم جامنی بائی کو جانتا ہے؟ کبھی نام سنا تھا؟"

"صرف نام، دیکھنے کی چیز تھا۔ اودھر بمبئی میں اپن نے تم کو پہلی بار دیکھا تو جامنی بائی بہت یاد آیا۔ تم اُس ٹیم ہوتا۔"

"اب وہ کہاں ہے دادا؟" جاکر نے بے چینی سے پوچھا۔

چہرے دار بہانے قریب آتے اور کن انکھیوں سے جھانکتے گزر جاتے۔ کل کی طرح اپنے خیموں میں سونے کے بجائے ہمارا الاؤ کے گرد بیٹھے رہنا اُن کے لیے حیرانی کا باعث ہوگا۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ الاؤ کے شعلوں نے کم از کم ہمارے اطراف کی سردی دور کر دی تھی۔ تاہم ہوا کا کوئی تیز جھونکا چلا جاتا تو آگ بھی تھرتھرانے سی لگتی۔ سرلم نے دیر ہو جانے کی [illegible] پر رکھ دی تھی۔ پانی کھولتے کھولتے سوکھ گیا۔ کسی کو چائے کا خیال نہیں آیا۔ جامو، بلٹو اور مارتی پیرو کو تکے جیسے [illegible] ہوئے تھے [illegible] باقی تھی۔ پیرو کہنے لگا کہ اس وقت جب جامنی بائی دادر کے علاقے میں اڈا چلانے لگی تھی اور بے تاج کی رانی تھی۔ پیرو کا [illegible] کے علاقے میں ایک اڈا تھا۔ زیادہ بڑا تو نہیں مگر آمدنی [illegible] بڑے اڈوں سے کم نہیں تھا۔ چھوٹے جوئے خانے اور [illegible] کی کئی بھٹیاں علاقے میں چلتی تھیں۔ ادھر اودھر کے پاڑوں کے آدمی آ کے پیرو کو جامنی بائی کے قصے سناتے تھے۔ پیرو بڑا [illegible] تھا۔ تاہم [illegible] اُس نے اپنے ہاتھ ہی کے بل پر حاصل کیا تھا۔ بمبئی کے اور داداؤں کی طرح پیرو کے دل میں کبھی یہ خیال آتا تھا کہ وہ جامنی بائی کے ہاتھ سے چاقو چھین لے لیکن پیرو اُس کے بہت سے واقعات سن چکا تھا اور جب جامنی نے کبھی اُس کے علاقے کو نہیں چھیڑا تھا تو اُسے خواہ مخواہ اُس سے بیر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے دادا جامنی بائی کو دادر کے علاقے سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ پیرو کو ان روایتوں پر یقین نہیں تھا لیکن اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی تھی تو اُسے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ پیرو کسی کے اُکسانے میں نہیں آیا۔

ادھر چند دنوں سے پیرو کے آدمی اُس کے پاس شکایت لے کے آتے تھے کہ جامنی بائی کے آدمی اُس کے علاقے میں گھس کے جیب بناتے ہیں اور بھی پاڑوں کے داداؤں کو یہی شکایت تھی۔ جامنی بائی کی شہرت کی وجہ سے اُس کے آدمی بے مہار ہوتے جا رہے تھے۔ دادر کے علاقے میں جامنی بائی کے ڈر سے وہ کچھ نہیں کر پاتے تو دوسرے علاقوں میں جا کے لوگوں کو تنگ کرتے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب کوئی بھی جامنی بائی کے اڈے سے ٹکرانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ سب اُس سے دور دور الگ رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ سو کسی کو اُن کی شکایت کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔ ہوتا ابھی یہی تھا کہ جامنی بائی کی وجہ سے لوگ انھیں نظر انداز کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُن کا کٹ کھنا پن بڑھتا گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جامنی بائی خود اپنے آدمیوں کو دوسرے پاڑوں سے بھڑ جانے کے لیے بھیجتی ہے۔ پیرو کے لیے یہ بات خاصی تشویش کی تھی کہ وہ اُس کے علاقے تک پہنچ گئے ہیں مگر پیرو نے جلدی نہیں کی۔ خود علاقے میں گیا، انھیں سمجھایا کہ مان جاؤ۔ وہ پیرو کے منہ لگنے لگے۔ پیرو نے پھر تحمل کیا اور اُسی شام کو دادر کے علاقے میں پہنچا اور جامنی بائی کو کہلوایا کہ باہم کا پیرو دادا ملنا چاہتا ہے۔ جامنی نے فوراً بلوایا۔ پیرو اکیلا پاڑے میں داخل ہوا تو وہ ایک تخت پر بیٹھی تھی۔ پیرو نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ تخت پر وہ کوئی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھول گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی رہا۔ اس کا بدن ترشا ہوا تھا۔ سانچے میں ڈھلا ہوا۔ [illegible] سر اٹھا ہوا۔ قد لمبا۔ بال کھلے ہوئے۔ گیروے رنگ کی ساڑی سے اُس نے اپنا سارا بدن ڈھانپ رکھا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں کے گجرے، ناک میں لونگ اور کلائیوں میں چوڑیاں [illegible]

سوا ملن پہ کوئی زیور نہیں تھا۔ چمکتا ہوا جامنی رنگت چہرہ کے کہنے کے مطابق جیسے کوئی پکی ہوئی جامن شاخ سے توڑی جائے، زمین سے نہ اٹھائی گئی ہو۔ عمر میں وہ بالکل لڑکی نظر آتی تھی۔ اس لڑکی کے مانند جس کا شوہر شادی کے فوراً بعد بچھڑ گیا ہو۔ سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں، نیلاہٹ لیے ہوئے سیاہ آنکھیں جو گہری گہری ڈوبی ڈوبی اور بڑی بڑی تھیں۔ اُن میں چنگاریاں سی لپکتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی پیرو کو دیکھ کے چپ رہی پھر پیرو ہی کو کچھ بےبسی سی آیا۔ سنبھل کے بولا: "جامنی بائی! اپن تم سے کچھ بولنا مانگتا ہے۔"

جامنی مجسمے کے مانند ساکت بیٹھی رہی۔ پیرو نے تلخی سے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ جامنی بائی کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ پیرو کو عجیب سا لگا: "اپن پھر اپنے آدمی ادھر بھیجے گا؟ ان کو روک دو جامنی بائی! اپن بھی ان سے اوور ٹیک سکتا تھا، پر سوچا پہلے تم کو بول دے۔" پیرو نے اشتعال میں کہا۔

جامنی بائی پیرو کی آواز پر جیسے خواب سے جاگی اور اپنی لانبی لانبی پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے آہستگی سے بولی: "دادا! ابھی آرام سے بیٹھو۔" پیرو کہتا تھا کہ اس کی آواز کھنکھنا رہی تھی۔

پیرو جھجکتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جامنی بائی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ پیرو کے سامنے اسی وقت صراحی اور گلاس رکھ دیے گئے۔ پہلی مرتبہ جامنی بائی نے کسی کو اس طرح شراب پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ پیرو نے ایک گلاس پی لیا اور بولا: "ابھی تمھارا کیا جواب ہے جامنی؟"

جامنی نے اپنے پاڑے کے سارے آدمیوں کو اندر بلا لیا اور پیرو سے پوچھا: "ان میں سے کون تھا دادا!"

پیرو نے تین آدمیوں کی طرف انگلی اٹھائی: "ابھی اپن ان کو پہچانتا ہے اور لوگوں کا اپن کو پتہ نہیں۔"

پیرو نے جن آدمیوں کی نشان دہی کی تھی ان کے سوا کسی نے واویلا نہیں کیا۔ وہ پیرو کے آدمیوں کو اُلٹا الزام دینے لگے۔ "چپ رہو۔" جامنی نے ہاتھ اٹھا کے کہا: "اور وہ تم کو کھینچ لے گئے تھے کیا؟ تم ان سے کیوں نہ لڑے؟"

انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن جامنی بائی کی آنکھوں میں آگ اور ہاتھ میں خنجر دیکھ کے کپکپانے لگے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ جامنی کا خنجر اٹھا اور ان میں سے کسی ایک کے سینے میں پیوست ہو۔ خنجر اس نے اٹھا بھی لیا تھا مگر کچھ سوچ کے رک گئی۔ بولی: "ابھی تمھارا فیصلہ خود کرو۔" تینوں آدمی چند لمحے تو اس کا چہرہ تکا کیے پھر ایک دم تیزی سے آگے بڑھے اور کتوں کی طرح پیرو کے قدموں سے لپٹ گئے۔

پیرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ "ٹھیک ہے جامنی بائی!" وہ اٹھتے ہوئے بولا: "اپن اب جاتا ہے۔" پیرو نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کا جی وہاں سے جانے کو نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھو دادا! کوئی اور کام ہو تو بولو؟"

"اپن کو اتنا ہی کام تھا۔" پیرو نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ابھی اپن ان کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اپن کا فیصلہ رہ گیا ہے۔" جامنی بائی سرد آواز میں بولی۔

"ابھی اتنا ٹھیک ہے جامنی بائی!"

پیرو کہتا تھا کہ اس نے اپنے سب آدمیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ صرف وہ اور پیرو اس بڑے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ پیرو اس کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد وہ تادیر کچھ نہیں بولی۔ پیرو بھی خاموش رہا مگر اسے اس خاموشی سے جلد ہی اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ جامنی بائی سے اس کے بارے میں کچھ پوچھے۔ بے شمار سوال اس کے دماغ میں اٹھ رہے تھے لیکن پیرو زبان بند کیے رہا۔ جامنی نے پہل کی اور اس سے ماہم کے علاقے کے متعلق پوچھنے لگی۔ پیرو کو فخر ہوا کہ کہیں جامنی کی نظر اس کے علاقے پر تو نہیں ہے مگر اس نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا: "علاقہ چھوٹا پر بھلا ہے۔" پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "کبھی اُدھر اپنی طرف آؤ جامنی بائی!"

"تم بولتے ہو تو ضرور آئیں گے دادا!" وہ شگفتگی سے بولی۔

پیرو اس سے کچھ اور نہیں کہہ سکا۔ وہ یہاں چلا تو آیا تھا نہ جانے جامنی بائی کیا سمجھتی اور خود اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ ایک علاقے کا دادا ہو کے اس پر اپنا تجسس ظاہر کرے۔ جتنا بھی اس نے اختصار برتا اور رسمی طور پر جامنی بائی کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔ پیرو بتاتا ہے کہ وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اپنے پاڑے میں آنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی کی آنکھیں اس کے ساتھ آگئی ہیں اور اسے گھور رہی ہیں۔ ابھی ایک رات نہیں گزری تھی کہ صبح اسے اطلاع ملی۔ جامنی بائی کے پاڑے کے قریب کوڑے کے ڈھیر پر تین آدمیوں کی لاشیں پڑی ملی ہیں۔ پولیس نے جامنی بائی اور اس کے پاڑے کے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ پیرو کو اس خبر سے دکھ ہوا۔ یقیناً یہ وہی تین آدمی ہوں گے جن کے بارے میں کل شام جامنی بائی نے کہا تھا کہ ابھی اُن کا فیصلہ باقی ہے۔ پیرو دن بھر بے چین رہا۔ وہ تیار تھا کہ پولیس اسے بھی بلائے گی۔ پولیس کا کوئی آدمی اسے بلانے نہیں آیا اور دوسرے دن شام اسے خبر ملی کہ جامنی بائی اپنے ساتھیوں سمیت تھانے سے پاڑے واپس آگئی ہے۔ اس کے تین دن بعد سرِ شام وہ پاڑے میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آ کے اطلاع دی: "دادا! جامنی بائی پاڑے کی طرف آ رہا ہے۔"

پیرو بہت حیران ہوا۔ خود دوڑا ہوا پاڑے کے باہر گیا۔ جامنی بائی تنہا دروازے پر موجود تھی: "دادا! اپن آ گئے۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"تم جامنی بائی!" پیرو وحشت سے بولا: "آؤ، آؤ، اندر آؤ۔ ابھی اپن کوئی سپنا دیکھتا ہے کہ ایدھر کھوپڑی کا کوئی کل الٹ ہو گیا ہے۔"

جامنی بائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی کھل گئی۔ وہ پیرو کے پیچھے پیچھے اندر آنے لگی۔ پاڑے کے تمام لوگ اسے دیکھ کے حیرت زدہ تھے اور اس کی آمد کا مقصد جاننے کے لیے بے تاب۔ اس سے پہلے جامنی بائی کے بارے میں کبھی نہیں سنا گیا تھا کہ وہ کسی پاڑے میں خود آئی ہو۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ پیرو اسے ایک کشادہ اور صاف کمرے میں لے آیا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا خاطر کرے۔ جامنی بائی نے کہا کہ اسے کچھ بھی تو پتہ نہیں ہے۔ پیرو نے پہلے تمام آدمیوں کو باہر نکال دیا: "تم نے بلایا تھا، اپن ادھر آ گئے۔" وہ دھیمے دھیمے بولی۔

"تم نے ادھر آ کے اپن کو بہت بہت خوش کیا۔" پیرو کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے: "ابھی بولو اپن کیا... کیا کرے؟"

"بیٹھے رہو دادا!"

"بیٹھا تو اپن ادھر ہی ہے۔ پر اپنے کو..."

جامنی نے نظریں اٹھا کے دیکھا تو پیرو بوکھلا گیا۔ "اپن تم سے ملنے تم کو دیکھنے آیا ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"ہو، ہو۔" پیرو ہکلانے لگا: "اپن تمھارے سامنے ہے۔"

"تم ایدھر دادا کیسے ہو گئے؟"

"کیوں؟ کیوں؟" پیرو کا خون بھڑکنے لگا: "تمھارا مطلب؟"

"[illegible] سب باپ مرتے ٹیم نہیں لکھ گیا تھا جامنی بائی!"

"جانتے ہیں دادا!"

"پھر تم کیا بولنا چاہتا ہے؟"

"کچھ نہیں دادا!" وہ کسی قدر اداسی سے بولی۔

"نہیں تم کچھ بولنا چاہتا ہے؟" پیرو نے تندی سے کہا۔

اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور بیٹھی جیسے کچھ سوچتی رہی۔ [illegible] بھی بات وہیں چھوڑ دی لیکن اس کا اضطراب [illegible] اسے کچھ بولنے میں اس لیے دشواری پیش آ رہی تھی کہ ابھی تک وہ جامنی بائی کی اچانک آمد کا سبب طے نہیں کر سکا تھا۔ دادر سے چلتے وقت اس نے رسماً جامنی بائی سے آنے کو کہا اور اس کا خیال تھا کہ رسماً ہی جامنی بائی نے حامی بھری تھی مگر اب وہ سامنے بیٹھی تھی اور اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی اُڑن جیسی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پیرو کا تذبذب بےجا نہیں تھا۔ اسے اس کے آنے سے ایک خوشی تو تھی لیکن اندیشے بھی لاحق تھے۔ ممکن ہے اس کا کوئی اور ارادہ ہو اور پیرو کو اپنی فروتنی کے اظہار پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ وہ خواہ مخواہ جامنی بائی سے کوئی کد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس چیز کا کوئی جواز ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بمبئی میں بہت سے علاقے تھے جہاں جامنی بائی کی طرح دادا پاڑا چلاتے تھے اور یہ دلیل ایک دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے مگر کوئی دلیل پیدا ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ یہ تعلق بھی ایک دلیل ہے اور وہ کسی وقت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چاقو اور زندگی ایک دلیل ہے۔ پاڑوں کی یہی ایک دلیل چلتی ہے۔ پیرو کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ جامنی بائی کو ایک مہمان سے مختلف درجہ دے اور اس کی خوشنودی کے لیے اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات کرے اور جامنی بائی پر کوئی ایسا تاثر قائم ہو جیسے وہ کسی دفاعی حالت میں ہے۔ اپنے بارے میں وہ جامنی بائی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ جامنی بائی کے بجائے کوئی اور دادا ہوتا تو پیرو کو اتنی اُلجھن پیش نہ آتی مگر وہ جامنی بائی تھی۔ پیرو کو خود اپنی جانب سے خدشہ تھا۔ اپنے دشمن کی کمزوری سے اور اسے یہ کمزوری عزیز بھی بہت تھی۔ وہ جامنی بائی کا ارادہ سمجھنے کی فکر میں تھا اور جامنی بائی تھی کہ ایک گم صم سی بیٹھی گئی تھی۔

پیرو موضوع بدل کے اس سے پوچھے بنا اپنے علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اسے کچھ جاننا تھا تو اس کی یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کا علاقہ کتنا زرخیز ہے۔ یہاں کے لوگ، کوہاٹ کا رشتہ، گاڑیاں، یہاں کتنی بھٹیاں، کارخانے اور چھپے ہوئے گودام ہیں، زیور وغیرہ۔ کوئی دادا کسی دوسرے دادا کو اپنے علاقے سے متعلق ایسی باتیں نہیں بتایا کرتا جو پیرو نے اس سے کہی تھیں۔ پیرو نے اس سے کچھ نہیں چھپایا نہ مبالغہ کیا۔ وہ اپنی کشمکش سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس دوران وہ پوری طرح کسی بھی بدلی ہوئی صورت حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر قسم کی صورت حال کے لیے۔ کوئی ایسی بات نہیں جس میں سنبھل کا کوئی پہلو نکلتا۔ پیرو کو اپنے اس عزم سے طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ پیرو تھا۔ پیرو کی جگہ کوئی دوسرا دادا ہوتا تو شاید یہ

فیصلہ نہ کر پاتا۔ جامنی بائی اُس کے علاقے کا حال سنتی رہی۔ نہ اُس نے اشتیاق کا اظہار کیا، نہ سرد مہری کا۔ سو ہیرو کا تجسس کم نہیں ہوا۔ پھر اُس نے اُن تین آدمیوں کا ذکر چھیڑ دیا جو دو دن پہلے ختم کر دیے گئے تھے۔ ہیرو نے کہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔

"اُن کو جانے دو دادا!" جامنی بائی بے دلی سے بولی۔

"پہلے اپن نے اُن کو معاف کر دیا تھا۔"

"اپن نے نہیں،" جامنی نے زیر لب کہا۔ "ابھی اُن کی بات چھوڑو۔ وہ چلے گئے ہیں۔"

"چھوڑ دو،" ہیرو نے جھٹک کے بولا۔

"ابھی ادھر کی زد میں کی بات کرو۔"

"جو بولے کرے،" ہیرو نے تیزی سے کہا۔

"ابھی تم سدا کے لیے ادھر باڑے میں رہنا چاہتے ہو؟"

"ابھی اپن کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھیک ہیں۔"

اُس نے نظر بھر کے ہیرو کو دیکھا اور تکنے لگی۔ "ادھر تمہارا بہت من لگتا ہے کیا؟"

"لگتا کیا ہے، بس بیٹھا ہے۔"

"تم اس کو جھڑ جانا چاہتے ہو کیا؟"

"ابھی اپن نے ایسا سوچا نہیں ہے،" ہیرو نے [illegible] کہا۔ "پر جامنی بائی! اپن کو تو ایسا لگتا ہے [illegible]"

"سوچتے ہیں تم کو دادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

ہیرو نے ہنسی سے کہا۔ "تم کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں،" جامنی بائی سر جھکا کے بولی۔ "پر اپن دادا ہے۔"

"اور اپن بھی،" ہیرو نے [illegible] آواز میں کہا۔

جامنی بائی نے منع کیا تھا لیکن [illegible] نمکین چیزیں اور چائے وغیرہ لے کے آئے تھے۔ ہیرو کے [illegible] اُس نے چند کو منہ میں ڈال لیے اور چائے پی لی۔ "ابھی [illegible] اور بیٹے تو لائے؟" ہیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں دادا!" جامنی بائی مختصر لہجے میں بولی۔

"اپن سوچا پہلے تم سے پوچھ لے۔"

چائے پینے کے بعد وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ آنکھیں نیم وا کیے۔ ہیرو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بھی سوچتا رہا اور جامنی بائی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آج بھی وہ گیروا ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ کھلے ہوئے بال اُس نے ایک ربن سے باندھ لیے تھے۔ کانوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ناک میں سنہری لونگ چمک رہی تھی۔ جامنی رنگ پر اُس کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ہیرو کہتا تھا کہ جب وہ بات کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دیتی تو اُس کے سفید دانت موتیوں کے مانند لگتے۔ موتی جو پیازی رنگ کی مخمل میں ٹکے ہوئے ہوں۔ اندر سے اُس کے ہونٹ اُس کا منہ پیازی رنگ کا تھا۔ بار سے سارا جامنی۔ یکایک جامنی بائی کچھ بے چین سی ہو گئی اور اُٹھتے ہوئے بولی "چلتے ہیں دادا!"

"یہ کیا... کیا؟" ہیرو تعجب سے بولا۔ "اپن اس کو کیا سمجھے؟ تم نے بولا تھا تو اپن....."

"ہر آنے جانے کے لیے نہیں۔ تم کو آئے دیر کتنا ہوا ہے، ابھی چلنے کو بولتا ہے؟" ہیرو اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر کبھی آئیں گے۔"

"وہ ٹھیک ہے، سو بار آؤ، ہزار بار آؤ۔ پر ابھی کیوں جاتا ہے۔ یوں چلا جائے گا تو اپن سمجھے گا، اپنے سے مہمان کا خیال نہیں ہوا۔ اپن جنگلی ہے۔"

"نہیں ہیرو دادا!" وہ بھری ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کیا ہے؟ سمجھو ابھی اپن بیٹھنے کو بولتا ہے جیسا ایدر نے کو بولتا تھا۔" ہیرو نے کہا کہ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں، وہی شرم سے نظر الاپتا رہا ہے۔

جامنی کچھ دیر کے لیے اور بیٹھ گئی اور اس اثنا میں اُس نے ہیرو سے آس پاس کے علاقوں کے بارے میں چند باتیں پوچھیں۔ کون سا علاقہ کس دادا کے پاس ہے، کیسا ہے۔ ہیرو کو ان سوالوں پر حیرت ہوئی جیسے جامنی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ سوالے بتاتا رہا اور اس نے ان باڑوں سے اپنے تعلقات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

وہ جانے لگی تو ہیرو اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ ہیرو نے ایک آدمی سے کہہ کے اُس کے لیے رکشہ منگوا لیا۔ رکشہ میں سوار ہوتے ہوئے جامنی کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اُس نے ہیرو سے پھر کسی دن اپنے باڑے آنے کو کہا۔ ہیرو نے وعدہ کیا۔ جامنی بائی کے جاتے ہی ہیرو کے آدمیوں نے اُسے گھیر لیا اور جامنی بائی کے آنے کا سبب پوچھنے لگے۔ ہیرو کو خود کچھ پتہ ہوتا تو وہ انھیں بتاتا۔ "سب ٹھیک ہے بابا!" ظاہر ہے ہیرو کے اتنا کہہ دینے سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

چار دن بعد کی بات ہے کہ ہیرو کے باڑے میں ایک اجنبی شخص مٹھائی اور پھلوں کی دو ٹوکریاں لے کے آیا اور اُس نے جلدی میں انھیں صرف ہیرو کے حوالے کیا۔ شکل و صورت سے وہ کسی باڑے سے متعلق آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکریاں جامنی بائی نے بھیجی تھیں۔ ہیرو نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور تیسرے روز اپنی طرف سے

پھلوں، پھولوں اور مٹھائیوں پر مشتمل چار ٹوکریاں جامنی بائی کو بھیجیں۔ اُس نے بھی اپنے باڑے کے بجائے باہر کا ایک آدمی منتخب کیا۔ باڑے میں کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ جامنی بائی کی طرف سے کوئی سوغات آئی ہے اور ہیرو نے بھی جواباً اُسے ٹوکریاں بھیجی ہیں۔ جامنی بائی نے انھیں شکریے کے ساتھ قبول کیا اور کہلوایا کہ ہفتے کی شام اپنے باڑے میں وہ ہیرو کی منتظر رہے گی۔ بیچ کے وہ دو دن ہیرو کے لیے نہایت اضطراب کے تھے۔ جامنی بائی کے پاس دوبارہ جانے کے خیال سے اُس کے دل و دماغ میں عجب عجب احساس جنم لے رہے تھے۔ اس دوران وہ خاکے بناتا بگاڑتا رہا اور جب ہفتہ آیا، سورج ڈوبنے لگا تو اُس نے دادا کے علاقے کا رخ کیا۔ وہ اپنے ساتھ کسی آدمی کو نہیں لے گیا تھا۔ جس وقت وہ جامنی بائی کے باڑے میں داخل ہوا، وہ نیلی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کی چمکتی نظروں نے ہیرو کا طواف کیا اور وہ اُسے فوراً اندر لے گئی۔ باڑے میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ البتہ اوپری منزل پر جامنی بائی کی دو خادمائیں موجود تھیں۔ ہیرو ایک صاف ستھرے سجے ہوئے کمرے میں جا کے بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیواریں رنگین تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں قالین بچھا ہوا تھا۔ جامنی کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک مختصر سا ابھرا ہوا تھا اور ایک چھوٹی میز پر صراحی اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جامنی بائی نے خود اُسے جام بنا کے دیا۔ اُسی وقت گھنگروؤں کی آواز ابھری اور دھیمے قدموں ایک خوبصورت لڑکی زرق برق کپڑے پہنے گھنگرو چھنکاتی اندر آئی اور اُس کے آتے ہی جلترنگ اور ستار کی آواز گونجنے لگی۔ سازندے کمرے میں نہیں تھے، نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جلد ہی ہیرو کو پتہ چل گیا کہ وہ سامنے لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے موجود ہیں۔ لڑکی نے دونوں کو جھک کے سلام کیا اور رقص کرنے لگی۔ ہیرو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہے اور کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جامنی بائی ایک دوسرے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُسے اس طرح دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی باڑے سے متعلق ہے اور دادا گیری جانتی ہے۔ وہ بس ایک عورت تھی، ایک لڑکی۔ ہیرو چاہتا تھا کہ وہ اُس کے اور قریب ہو جائے، بہت قریب ہو جائے لیکن وہ خود اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا، نہ جامنی کی طرف ہاتھ بڑھا سکا، نہ اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کر سکا۔ جامنی کی طرف نظر اُٹھاتے ہی اُس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا تھا۔ وہ ایک دم رانی لگتی تھی۔ ایک سالار انی سے کچھ بول سکتا تھا۔"

جامو نے درمیان میں دخل دے کے پوچھا: "واہ دادا تم بھی بولو، تم اُس وقت کیسے لگ رہے تھے؟"

ہیرو نے آہ بھر کے کہا: "اپن کیا جانے، پر ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔"

ہیرو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خود کیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اب بھی اُس کا سرخ و سفید رنگ اُس کے کالے بالوں کے گھنگریلے بالوں پر ابھی ایک سیاہی غالب تھی۔ بیس پچیس سال پہلے کی بات تھی۔ اُس وقت ہیرو کیا ہوگا۔ قد کا بڑا، کاٹھی کا مضبوط، خدوخال کا تیکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑے شانے اور ابھرا ہوا سینہ۔ وہ بھی کوئی شہزادہ معلوم ہو رہا تھا جس کو راج کمار نے کیا کم۔ جامنی بائی اپنی جگہ بیٹھی ہیرو کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اُس کے حواس میں ایک دھیما دھیما سرور رینگ رہا تھا اور وہ یہ سرور توڑنے کے لیے اپنے آپ سے مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جامنی بائی کے سامنے مدہوش ہو جائے۔ لڑکی ناچتی رہی۔ جامنی بائی نے ناچ کے دوران اُسے دوسرا جام بنا کے دیا۔ ہیرو نے منع نہیں کیا۔ وہ چسکیاں لیتا رقص دیکھتا رہا مگر اُس کا دھیان رقص میں نہیں تھا۔ وہ اصل میں جامنی بائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لڑکی نے ناچ کے دو تین بھاؤ بتائے ہوں گے کہ جامنی نے انگلی کے اشارے سے اُسے روک دیا اور ہیرو سے پوچھا کہ کیا رقص جاری رکھا جائے؟ ہیرو نے یونہی سر ہلا کے انکار کر دیا۔ اس میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ پھر خادماؤں نے کھانا لگا دیا۔ کھانوں کی اقسام کم تھیں مگر وہ سب نفاست سے پکے ہوئے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ جامنی بائی اس قدر تکلف سے کھا رہی تھی کہ ہیرو کو کہنا پڑا: "اجی تم تو کچھ کھاتا ہی نہیں، ایدر بھی تم اسے اپن ہی بولے کیا؟"

"کھاتے ہیں دادا!" وہ تبسم لہجے میں بولی۔

کھانے کے بعد جامنی بائی نے پھر اُس سے پوچھا کہ اب دوبارہ ناچ کا اہتمام کیا جائے۔ ہیرو اس سے بات کرنا چاہتا تھا سو اُس نے کہا: "ابھی تمہاری مرضی ہو تو چلے گا۔"

جامنی بائی نے لڑکی کو نہیں بلایا اور اپنے لب بھینچے سی کے بیٹھ گئی۔ پھر وہی خاموشی۔ ہیرو کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے۔ کیا یوں ہی بیٹھا بھی دلوا دے۔ کبھی جامنی بائی کو گھورتا ہے۔ سکوت کے ایک طویل وقفے کے بعد جامنی کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ اُس کی پلکیں تھرتھرائیں اور اُس کے ہونٹ سکڑنے اور پھیلنے لگے جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو۔ "دادا!" وہ سرگوشیانہ

لہجے میں بولی: "اپن تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔"
"اپن کو حکم دو۔" ہیرو نے بھولے سے کہا۔
"حکم نہیں ہے۔"
"جو بھی بولو اپن سننے کے لیے بے کل ہے۔"
"ابھی اپن تم سے سب بولے دیتے ہیں۔" اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔
"ہاں، ہاں۔"
"پتہ نہیں تم کیا بولو گے، پر اپن کو اس کی چنتا نہیں ہے۔"
"اپن کے من میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔"
"اپن نے سوچا تم سے سب کہہ دیں۔ کچھ نہ چھپائیں۔ جو کچھ اپنے پاس ہے، ابھی بول دیں۔ نہ تم روز روز ادھر آ سکتے ہو، نہ اپن اُدھر جا سکتے ہیں۔"
"تم بولو گی تو اپن روز ادھر آئے گا۔"
"اپن کو بھی اُدھر آنے کے لیے کسی سے بولنے کی ضرورت نہیں ہے پر ایسا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولی۔
"پھر جو ٹھیک ہے وہ بولو۔" ہیرو نے بے تابی سے کہا۔
وہ چند لمحے چپ رہی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی: "اپن سدا کے لیے تم کو اپنا اور اپنے کو تمہارا بنانا چاہتے ہیں۔"
ہیرو کے کان سن ہو گئے۔ "جامنی بائی!"
جامنی بائی نے سر جھکا لیا: "اپن کو لاگ لپیٹ نہیں آتی، صاف بول دیے ہیں۔ پر اس کو کچھ اور مت سمجھنا۔ اپن کی ابھی مرضی ہے۔"
"جامنی بائی!" ہیرو کی سسکی نکل گئی۔
"تم کو بہت حیرت ہے کیا؟" وہ بولی۔
"نہیں، نہیں۔"
"کیا اپن کے لیے ایسا بولنا ٹھیک نہیں ہے؟"
"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" ہیرو نے بدحواسی سے کہا۔
ہیرو کا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا، اس کی بازگشت اس کے رگ و پے میں سنسنا رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے اپنا سنا ہوا ایک سراب معلوم ہو رہا تھا۔ جامنی بائی کے اظہار میں کوئی بات وضاحت طلب نہیں تھی۔ اس نے جو کہا تھا اس میں کوئی پیچیدگی، کوئی رمز، کوئی آمیزش نہیں تھی۔ اسے صاف صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ دن کی طرح اُجلا، رات کی طرح سیاہ تھا۔ ہیرو کو ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی نے اسے اُٹھا کے آگ میں پھینک دیا ہے۔ اس کے مساموں سے پسینہ رس رہا تھا۔ جامنی بائی نے ایک اضطراری نظر سے اسے دیکھا اور کہنے لگی کہ اسے احساس ہے ایسا کہنا کتنا بڑا ہے جو کہہ دیا۔ اس کا نبھانا کتنا مشکل ہے

لیکن اس نے سوچنے سمجھنے کے چند لمحوں کو عذاب جھگتا ہے یا سود و زیاں کے چند لمحوں کو گناہ بھی کیا ہے۔ اسے معلوم ہے ہیرو کو کیا ہوا ہے۔ اس کو سنا ہوا نہیں چاہیے، اس کا فیصلہ ہیرو کے اقرار انکار سے مشروط نہیں ہے۔ ہیرو کو اختیار ہے کہ وہ اسے قبول کرے یا رد کر دے۔ اس کا نہ کوئی دعوا ہے نہ حکم۔ اسے بے شک اگر یہی خوشی ہوگی تو انکار میں دکھ ضرور پہنچے گا۔ وہ اپنے لیے قسمت کا کوئی تصور کرے گی۔ اس نے ہیرو کو اپنا دیوتا تسلیم کیا ہے اور دیوتا کی مرضی اس کی داسی کے لیے ہر حال میں مقدم ہوتی ہے۔ جامنی بائی کہنے لگی کہ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے کچھ کہا ہے اور اس کی التجا ہے کہ ہیرو اسے پاڑے کی داداگن فرمائش سمجھ کے قبول نہ کرے۔ اس نے اپنا سب کچھ دیوتا کے حوالے کر دیا ہے اور یہ کوئی بھینٹ نہیں جس کے عوض دیوتا سے اس کی خوشنودی کا سودا کیا جائے۔ ہیرو چاہے گا تو وہ ابھی پاڑا چھوڑ دے گی۔ ہیرو کہے گا تو وہ یہیں رہے گی۔ ہیرو اسے جھونپڑی میں لے جائے یا کسی محل میں، بیٹھنے سے لگنے یا ... سے پائل اپنی کر دے لیکن اگر اسے اپنی آرزو کے اظہار کی اجازت دی گئی تو وہ اپنے دیوتا کے ساتھ کہیں دور جانا پسند کرے گی۔
ہیرو سکتے کی سی حالت میں سنتا رہا۔ اس کے لیے سب بہت خواب ناک، بہت عجیب تھا۔ اس دن جامنی بائی کے اپنے پاڑے میں آنے کے بعد سے اس نے بہت سے قلعے بنائے تھے، ان میں ایسا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ ہیرو کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اس مختصر زندگی میں اس پر بہت سے وقت گزرے تھے۔ وہ کسی ایسے وقت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس نے زندگی کے بہت سے سوالوں کے جواب دیے تھے۔ یہ سب سے مختلف سوال تھا۔
"جامنی بائی!" اس نے بمشکل اپنے حواس بحال کیے اور ... آواز میں بولا۔ "بس کرو، ابھی اپن تم کو کیا بولے۔"
"اپن نے کسی جواب کے لیے تم کو نہیں بولا ہے۔"
"جامنی بائی!" ہیرو نے جھپٹ کے اسے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ ہیرو کہتا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ... تھیں لیکن وہ سب کہیں رُکے ہوئے تھے جن کا علم ہیرو کو تھا۔ اس رات اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس کا سارا ... لگ گیا۔ جامنی بائی بھی سسک رہی تھی۔ وہ اسے کوئی جواب دے سکتا تھا، کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جامنی بائی نے بہت ... کر دی تھی۔ ہیرو کا دماغ ایک اور شخص کے خیال سے ... بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی۔ اس کے سینے میں بھی ...

... دل دھڑکتے تھے۔ ہیرو سے گن رہا تھا کہ وہ کب آتی ہے۔ ہیرو نے اس سے کہا تھا کہ وہ آخری سانسوں تک اس کی راہ تکتا رہے گا۔ ... لڑکی کے گھر والے عزت شان کے لوگ تھے اور وہ اپنی نازک ... کے لیے کسی ریاست سے آنے والے ایک راج کمار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ درمیان میں ہیرو نے اس راج کمار کی جگہ لینا چاہا۔ ہیرو کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی، نہ اس کا کوئی شجرہ ... تھا، نہ پس منظر، نہ پیش منظر۔ بمبئی کے تھانوں میں اس کا ... سرِ فہرست تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ اس کا بہترین ... لڑکی والوں نے اسے مسترد کر دیا لیکن لڑکی نے نہیں۔ ... گھر والوں کو آمادہ کر رہی تھی اور اس نے ہیرو سے کہا تھا کہ اگر وہ انھیں منانے میں ناکام ہو گئی تو ایک دن سب کچھ چھوڑ کے ہیرو کے پاس چلی آئے گی اور وہ ایسی ہی تھی۔ ہیرو کو یقین تھا کہ ... وہ نہیں بدلے گی ... ساری زنجیریں سلامت بند حسن آرزو کے اپنی منزل اپنے مرکز پر آپ ... ہیرو کی ذات میں جذب ہونے اور ہیرو کو اپنی ذات میں جذب ... لیے۔ ہیرو اس دن کا بے قراری سے منتظر تھا۔ اس نے جامنی بائی سے ... چھپایا۔ سب کچھ کہہ دیا۔ جامنی بائی کی آنکھوں کے سمندر میں ... کے لیے تلاطم سا برپا ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس میں ایک ... ہیرو کو اس تلاطم سے اتنی وحشت نہیں ہوئی جتنی اس ... ہے۔ جامنی بائی سر جھکائے خاموش رہی۔
رات گئے ہیرو دادر کے پاڑے سے واپس آ رہا تھا تو اس ... تھے۔ اس کا سارا جسم جل رہا تھا اور سر خالی خالی ... ایسی حالت میں کئی دن گزر گئے۔ ہیرو جامنی بائی کے پاس نہیں گیا مگر ... بھرے اس کے سامنے ہی رہی۔ پھر ایک دن شام کو بے ارادہ ... قدم دادر کے پاڑے کی طرف اُٹھ گئے۔ جامنی بائی کے کان ... کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ ہیرو کو دیکھتے ہی اس کا سراپا ... اس نے والہانہ نظروں سے اس کا استقبال کیا لیکن اس کے ... سکوت کی سرگی رہی۔ ہیرو اس کے بعد بھی کئی بار اس کے ... گیا۔ جامنی بائی کی ڈبڈباتی نظریں اس کا سینہ کاٹتی تھیں ... رہتا تھا۔ چپ چاپ گم صم ادھر چلا آتا تھا۔ جامنی بائی بھی ... بیٹھی رہتی۔ کبھی اس کے پیالے میں تھوڑی سی جام بنا کے دیتی رہتی اور ... میں آنکھ لیا رہتا۔ جب جام زیادہ ہو جاتے تو جامنی بائی ... پھر ہیرو اپنے پاڑے میں کسی کو اطلاع دے کے نہیں ... جامنی بائی کے ہاں اس کے آنے جانے کی خبر دو پرکش ... لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ ان سے بے نیاز جامنی

بائی کے ہاں جاتا رہا۔ اس کے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تب بھی وہ جاتا رہا۔ اس کے پاڑے کے ساتھی اسے متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ ہیرو اب ان سے نہ ملاقات کا حال پوچھتا تھا، نہ آمدنی کا حساب لیتا تھا۔ دن بھر یا تو وہ پاڑے کے کسی کمرے میں پڑا رہتا یا پھر کہیں نکل جاتا۔ اس نے پاڑے میں چاقو وغیرہ کی مشق کرنا اور زور کرنا چھوڑ دیا تھا اور سویرے ورزش کرنے کا معمول بھی بھول گیا تھا۔ ہیرو کے جسم میں اس کے تعمیر ... دھواں سا بھر گیا۔ آہستہ آہستہ ... کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ آخر ایک روز اس نے اس لڑکی کو جامنی بائی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جامنی نے اس سے کہا کہ اس نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اسے امید تھی کہ وہ لڑکی کیا کہے گی کیونکہ اس کا دل پھول کی طرح نرم، شبنم کی طرح شفاف تھا۔ وہ ہیرو کی مسیحا تھی، اس کا مداوا تھی۔ ہیرو جب اپنا احوال کہہ کے اس کے پاس سے اٹھا تو اپنے آپ کو بے وزن محسوس کر رہا تھا لیکن وہ تقریباً ایک ہفتے تک جامنی بائی کے پاس نہیں گیا۔ ایک ہفتے بعد جب اس نے دادر کے پاڑے جانے کا فیصلہ کیا تو اس کا تخیل تیزی سے گردش کر رہا تھا مگر وہ اس کے عزم کی گردش تھی۔ سامنا ہوا تو ... جامنی بائی نے ہیرو کو دروازے پر دیکھا تو اپنے قابو میں نہ رہ سکی۔ اس کے بازوؤں میں بجلی کے بھنور سی گئی۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ "ابھی اپن آ گیا ہے۔" ہیرو ہانپتے ہوئے بولا۔
"اتنے دن تم کدھر تھے راجا؟"
"اپن اپنے آپ کو ہار رہا تھا۔" جامنی بائی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کی سمجھ میں ہیرو کی بات نہیں آئی تھی۔ ہیرو نے اس کے کان میں چپکے سے کہا: "ابھی اپن تم کو ادھر سے لے جانا مانگتا ہے جامنی بائی۔"
"راجا!" وہ تڑپ کے بولی: "تم کیا بولتے ہو؟"
"ہاں جامنی بائی! اپن نے بات کر لیا ہے۔"
"کس سے؟"
"اپنے آپ سے اور ابھی اس سے جس کا اپن نے بولا تھا۔ اس نے اپن سے بولا۔ ہیرو! جاؤ، جامنی بائی کو لے آؤ۔ اس کو اپن نے ایک دم سب بول دیا تھا۔ سنتا رہا اور اس نے بولا کہ وہ جاؤ، جامنی سے بولو اپن دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے۔ نہ مانے تو بولو ہم اس کی نگرانی ان کے رہے گا یا اس سے الگ رہے گا۔ پھر بھی نہ مانے تو بولو اپن بالکل الگ ہو جائے گا۔ اپن نے بولا تم نہیں ہو گا تو اپن کا کیا ہو گا۔ بولا ابھی تم اپنے جاؤ، جامنی بائی ایسا نہیں کرے گی۔ اپن کو یقین ہے۔"

جاسنی بائی کی مبہوت آنکھیں اس پر مرکوز رہیں۔

"تم نے سنا جاسنی بائی' اپن کیا بولتا ہے؟"

"سن لیا دادا!" وہ نڈھال ہو کے بولی۔

"بس، ابھی تم تیار ہو جاؤ، چاقو اٹھاؤ۔"

"چاقو!" وہ اچنبھے سے بولی۔

"ہاں جاسنی بائی! چاقو۔"

"چاقو کیوں دادا؟"

"ابھی اپن جانتا ہے کہ اِدھر دیدہ پاڑے کے دادوں نے تم کو لے جانے کا کوشش کیا تھا اور تم نے بولا تھا اپن کے ہاتھ سے کوئی چاقو گرا لے تو اپن پھر ایک پل نہیں ٹھہرے گا، اسی کے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسا بولا تھا نا؟"

"ہاں، پر تم سے نہیں بولے تھے۔"

"اپنے سے نہیں بولا ٹھیک ہے پر اپن کو پتہ ہے اور اپن بھی ایک دادا ہے۔ اپن ابھی تمھاری بات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم کو چاقو کے بل پر لے جائے گا اور اپن کے چاقو میں بل نہیں تو سالا تم سے دور ہو جائے گا۔ اپنا منہ سدا کو نہیں دکھائے گا۔"

"نہیں دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں لڑ سکتا؟" پیرو تلخی سے بولا۔ اپنے کو جھیک نہیں چھپا۔ اس نے تیز و تند لہجے میں جاسنی سے کہا کہ اگر وہ چاقو نہیں اٹھائے گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے پیرو کے ساتھ رعایت کی ہے بخشش کی ہے۔ پیرو ہمیشہ اس میں اپنی سبکی محسوس کرتا رہے گا۔ زندگی بھر اسے قلق رہے گی کہ جاسنی بائی نے اسے کسی سبب سے درگزر کیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نگاہ ملا کے رہنا چاہتا ہے نگاہ چرا کے نہیں۔ اس کا ننھے کے ساتھ نہیں کہ بمبئی کے ایک پاڑے کے دادا کی حیثیت سے وہ جاسنی بائی کا اہل نہیں تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جاسنی نے پیرو کو ایک دادا کی صورت میں نہیں دیکھا تھا اور اس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پیرو اسے بھی ایک پاڑے کا دادا نہ سمجھے لیکن اپنی ذات کے سکون آئندہ دنوں میں جاسنی بائی کی نظروں میں اپنی سرخروئی کے لیے پیرو اس سے چاقو اٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جاسنی بائی ششدر کھڑی تھی۔ اس نے شدت سے انکار کر دیا اور بولی کہ یہ پیرو کا ہذیان ہے۔ کیا اس نے اس لڑکی سے بھی جس کی اجازت لے کے وہ جاسنی بائی کے پاس آیا ہے، اسی طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے۔ مگر پیرو نے اس لڑکی سے کچھ نہیں کہا اور اسے جوں کا توں قبول کیا ہے تو جاسنی بائی کے سلسلے میں اس کی یہ خواہش کیوں ہے۔

"وہ جاسنی بائی نہیں ہے پاڑے میں نہیں ہے۔" پیرو نے جھنجھلا کے کہا۔ "اس نے پہلے کسی کو ایسا نہیں بولا۔ جیسا جاسنی بائی نے بولا تھا۔"

"دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتے۔" جاسنی بائی نآزاری سے بولی۔ پیرو نہیں مانا۔ کہنے لگا کہ جاسنی بائی کے انکار کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پیرو کی شکست سے ہراساں ہے۔ اسے یقین ہے کہ پیرو اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ پیرو کے لیے یہ صورتِ حال کسی عذاب سے کم نہ تھی کہ اس کے بارے میں ایسا سمجھا جائے۔

"پھر تم سمجھو اپن جو بولے تھے' اس کو واپس لیتے ہیں۔ تم اس چھوکری کے پاس چلے جاؤ۔ اپن کا دھیان چھوڑ دو۔ اپن بھی تم کو بھول جائیں گے۔" جاسنی بائی شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

پیرو نے کہا کہ اس طرح وہ اس کے شبہے کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ پیرو کو رسوا کرنا نہیں چاہتی مگر پیرو کے لیے اس سے بڑی رسوائی کوئی نہیں کہ جاسنی اس کے خیال سے چاقو اٹھانے سے باز ہے۔ "اپن جانتا ہے تم ایسا کیوں بولتا ہے۔ پھر تم بھی اپنے کو ابھی پیرو مت جانو۔ ہاں تم کو پاڑے کا دادا جانو۔ جو پچھلے ہفتوں کی طرح تمھارے پاڑے میں چاقو چھوانے آیا ہے۔" اس نے اشتعال میں کہا۔

"اجازت بولو!" جاسنی بائی ترشی سے بولی۔

پیرو ضد کرنے لگا۔ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا، بتاؤ میں اسے لیے کیسے لے جاتا۔ پیرو کے احساسات سمجھنا ہمارے لیے مشکل نہیں تھا۔ پیرو نے اپنی زبان سے نہیں کہا لیکن اسے بہت سے احساس ہوں گے۔ دوسرے پاڑوں کے دادوں کا اور سب سے زیادہ اپنے آزار کا۔ وہ اس عورت کو کیسے گھر لے جا سکتا تھا جس پر کلی اختیار کا اسے اعتماد نہ ہو۔ اگر جاسنی بائی پیرو کے بیان کے مطابق اسی کے خیال سے چلتی کر رہی تھی تو پیرو کے لیے ہمیشہ کا تازیانہ تھا۔

جاسنی اس سے التجا کرتی رہی لیکن جتنا وہ التجا کرتی پیرو کا اصرار اتنا ہی بڑھتا جاتا اور جب جاسنی بائی نے یہ جانا کہ اس کا انکار پیرو کے لیے آتشِ مہیز کا کام دے رہا ہے تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پیرو کہتا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر گھنا سا چھایا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ دیر تک اس پر سناٹا طاری رہا۔ "ٹھیک ہے دادا!" وہ شکستہ آواز میں بولی۔ "جیسا تم بولتے ہو' ٹھیک ہے۔"

پیرو نے آگے بڑھ کے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ "جاسنی بائی!" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تم مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے۔"

جاسنی بائی کا سراپا اس کی آغوش میں بھڑکتا رہا۔ پیرو نے جلدی کی۔ اسے خدشہ تھا، جاسنی بائی اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ "پاڑے کے سارے آدمی کو بلاؤ۔" اس نے جاسنی بائی سے کہا۔

"ان کو کیوں دادا؟" جاسنی بائی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اپن چاہتا ہے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپن تم کو تمھاری ماں کی تمھارے بھگوان کی سوگند دیتا ہے اگر تم نے چاقو میں کوئی چھدری کیا' اپن کا دھیان کیا۔ پھر اپن چھاتی میں اس کو آرام لگا دیں گا۔"

صبح قریب ہی تھی۔ ہمارے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے پیرے دار ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان سے قطعے کے لوگ بھی۔ ان میں سے شاید کوئی نہیں سویا تھا۔ فاصلے فاصلے پر گیس کی لالٹین جل رہے تھے اور ان کے اطراف بیٹھے ہوئے بشیر اور اچھو نے جمیلہ اپنے ہاتھوں میں تیار رکھے تھے۔ پیرو سانس لینے کے لیے رُک گیا تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جمیل کا ذہن بھی اسی کی جانب تھا۔ ہر شخص دم بخود سا تھا۔ جاسنی بائی کی شکل و صورت پیرو نے بیان کی تھی، اسے سن کے سبھی کے دل میں اسے ایک بار دیکھنے کی خواہش جاگی ہو گی۔ ضرور جمیل کے دل میں بھی۔ دیر ہو گئی تو جمال نے پیرو کو ٹوکا۔

پیرو نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ باتیں کرتے کرتے اس کا منہ جیسے سوکھ گیا تھا۔ بھینچی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں جاسنی بائی کے حکم پر قلعے کے پاڑے کے سارے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس دوران وہ تخت پر اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی۔ پیرو اس کے پاس تخت کے دوسرے سرے پر تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ تخت سے اتر آئی۔ پیرو بھی اس کے پیچھے پیچھے بیچ میں کھلی ہوئی جگہ پہنچ گیا۔ جاسنی بائی نے ساڑی کا پلو کمر سے باندھ لیا اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹوں میں گرہیں لگا دیں۔ سر کو کئی جھٹکے دیے اور ہاتھ بائیں جانب بڑھا دیا۔ پاڑے کے ایک آدمی نے فوراً چاقو اس کی طرف اچھالا۔ جاسنی بائی نے پھرتی سے اسے اچک لیا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں آتے ہی اس کے سراپا میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بھینچ لیں۔ اس کے سینے میں جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کے اس نے ایک نظر دیکھا۔ پیرو کو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ "دادا!" اس نے لرزیدہ آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"جاسنی بائی!" پیرو نے وارفتگی سے کہا۔

مگر جاسنی اسے مخاطب کر کے رہ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور یکایک اس کے بدن میں ایک بجلی سی کوندی۔ کوئی شعلہ سا لپکا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی پیرو نے بھی اپنا چاقو تان لیا تھا۔ جس وقت وہ دونوں آمنے سامنے تھے پیرو کا غور اس کے چاقو سے زیادہ اس کی آنکھوں پر تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جاسنی بائی کی آنکھیں اس کے مقابل کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں پیرو کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ان میں بھی جھانکتا رہا تھا لیکن آنکھیں ہی نہیں جاسنی بائی کے سارے بدن سے چنگاریاں اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ پیرو کو اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ جاسنی کے ہاں اس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے گویا اس نے اس کی دی ہوئی قسم کا پاس کیا ہے۔ پیرو کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون ابلنے لگا اور اسے جاسنی بائی کے دو تین ہی پینتروں سے اس کے متعلق سنی ہوئی باتیں چھوٹی نظر آئیں۔ وہ کسی جادو کا کرشمہ تھا' نہ اس کی شہرہ بار آوری کا شعبدہ۔ وہ سب جاسنی بائی کے چاقو کا تماشا تھا کہ اسے چاقو چلانا آتا تھا۔ پیرو نے بہت سے لوگوں کو چاقو اٹھاتے چاقو چلاتے دیکھا تھا مگر جاسنی بائی کا انداز سب سے جدا تھا۔ وہ اپنے حریف کو اپنے نشانہ وار کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی تھی۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ایک پل میں اِس بازو' دوسرے پل میں اُس بازو۔ اس کا بدن ہوا کے مانند تھا۔ سمندر کی اٹھتی ہوئی لہر۔ مچھلی کی طرح۔ پیرو کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں سوچنے کا کوئی لمحہ میسر نہیں ہے۔ سو جاسنی بائی کا چاقو منتشر کرنے کی ایک ہی صورت اس کے ذہن میں آئی تھی کہ وہ خود اسی کا تیور اختیار کرے۔ اسے اپنے داؤ کی آہٹ کا احساس نہ ہونے دے جیسا کہ جاسنی بائی کا وطیرہ تھا۔ جاسنی بائی کا یہ طریقہ کوئی حربہ یا ہتھکنڈا نہیں تھا۔ چاقو پر سدھے ہاتھ اور جسم کی تابع داری کے اعتماد کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔

پیرو کی خواہش تھی کہ جو کچھ ہونا ہے' جلد سے جلد ہو جائے اور دیر تک آمنے سامنے رہنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ شروع ہی سے جاسنی بائی کی کلائی پکڑنے کی فکر میں تھا۔ جاسنی بائی نے اپنا ہاتھ اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیا اور پیرو پہلے ہی مرحلے میں ادھر ادھر سے بڑھ بڑھ کے جھپٹ جھپٹ کے اسے وہاں حالت میں لانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے' پیرو نے اپنے جسم و دماغ

اور چاقو کی تمام صلاحیتیں آزما کے دیکھی ہوں گی۔ وہ بتا رہا تھا کہ جامنی بائی ہر مرتبہ اُس کے نرغے سے پھدک کے نکل جاتی اور آ آ کا جاتا پینترا بدل کے اُس پر جھپٹتی۔ ہیرو کسی نہ کسی طرح کبھی جھک کے کبھی تیورا کے کسی طرف لپک کے اور اپنے آپ کو اچانک سمیٹ کے اُس کا وار اکارت کر دیتا اور پھر اُسی کی تدبیر پر عمل کرتا کہ پلک جھپکتے میں چاقو تانے اُس پر اُٹھتا، بڑھتا اور وار اُس پر چلانے کی کوشش کرتا۔

جامنی بائی کے لیے ہیرو جیسے کسی شخص کا تجربہ نیا ہو گا۔ ہم نے بمبئی اور کلکتے کے باڑوں میں اُسے اپنے آدمیوں سے بارہا زور آزمائی کرتے دیکھا تھا۔ اب بھی اُس میں ایسی پھرتی تھی تو جوانی کے وقت کیسی ہو گی۔ اب کی نسبت جب ایک ہی فرق ہو گا کہ ہیرو کے ہاتھ میں گرمی کے ساتھ دماغ میں گرمی زیادہ ہو گی جو جھل کے نزدیک ایک نامناسب بات تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے تاکید کی تھی کہ لاؤنے چاقو اُٹھاتے ہوئے سر الگ رکھنے کی کوشش کرنا۔ خون کی گرمی کے اثر سے سر ٹھنڈا ہی رکھنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کہ آدمی اپنے جسم کی کھولتی ہوئی گرمی گردن سے اوپر نہ بڑھنے دے۔ جھل کا مطلب ... یہ نہیں تھا کہ سر برف کے مانند منجمد ہونا چاہیے بلکہ اس کی مراد یہ تھی کہ سر میں حبس نہ ہو، کھولا ہی لیے تو جتے ہے۔ ہیرو کو بھی یہ بات معلوم ہو گی۔ اُس نے ماہم کا باڑا یوں ہی حاصل نہیں کر لیا تھا۔ بہت سے آدمیوں میں وہی آدمی اڈّے کا مالک بنتا ہے جس کے جسم اور سر میں توازن ہو اور اس لحاظ سے جامنی بائی بمبئی کے ایک باڑے کی داوا تھی اور اُس نے کئی باڑے والوں کے سپرد کر دیے تھے وہ بھی اسی توازن سے نا آشنا ہوں گی۔

انھیں دس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے۔ مشہور تھا کہ جامنی بائی کو جلد ہی لڑے لگتے ہیں۔ اُس کے آدمی چاروں طرف دم سادھے کھڑے تھے۔ بیچ میں ہیرو کو ایک بار شبہ ہوا تھا کہ جامنی بائی اُس کے ساتھ رعایت تو نہیں برت رہی ہے مگر پھر خود ہی اُسے اس وہم کی تردید کرنی پڑی۔ کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب جامنی بائی نے اُس کے وار سے بچنے یا اُس پر وار کرنے کا موقع کھو دیا ہو۔ ... بچنے میں خراب ہو گئے تھے۔ ہیرو اسے اور تھکا دینا چاہتا تھا کہ اس صورت میں شاید کوئی وار کارگر ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے پر چاقو کا کوئی نشان ڈالنے سے بچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گزند دینے کے خیال سے چاقو کی جھلکیاں دے رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا مگر لڑاکے کوئی بھی چاقو نہیں چھوڑ دیتا، چاقو ہر حالت میں ہاتھ سے چپکا رہنا چاہیے۔ ہاں کوئی چارہ نہ رہے تو دوسری بات ہے جو گر کر پڑا کے چاقو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ جھل کے کہنے کے مطابق اُسے دوبارہ چاقو نہیں تھامنا چاہیے پھر اُسے چاقو تھامنا نہیں آتا۔ چاقو کو ایک دوسرے کو تذبذب کرنے یا بوکھلا دینے سے اُن کا مقصد محض کسی بہتر داؤ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ مثلاً داؤ کے پیچھے گرا دینے، بازو سے کھینچ ڈالنے، توازن بگاڑنے اور کسی خاص جگہ سے پکڑنے وغیرہ میں کامیابی حاصل کرنا جو ابھی تک ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ جامنی بائی دبلے ہونے وزن میں بہت کم ہو گی۔ کلائی بھی اُس کی ہیرو کی طرح مضبوط نہیں ہو گی۔ پنجے کی پکڑ بھی ہیرو کے مقابلے میں کمزور ہونی چاہیے لیکن کمزوری اور مضبوطی کا تعلق داؤ نہ جاننے والوں سے ہوتا ہے۔ جیسے رگ انگل کی زد پر آ جائے تو دیو ہیکل آدمی بھی تڑپنے لگتا ہے۔ جامنی بائی کو اپنی گرفت کا کوئی بھروسا ہو گا جبھی وہ آس پاس کے باڑوں کے داداؤں سے زور آزمائی کرتے ہوئے نہیں جھجکتی تھی۔ ہر طرف دائرے کی شکل میں کھڑے آدمیوں کے بیچ میں کھلی جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ہیرو متعدد مرتبہ دائیں بائیں پھڑکتا، پھر پھراتا بڑھتا تاکہ کسی ایک گوشے میں جامنی بائی کی جگہ تنگ ہو جائے اور اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جائے مگر وہ اُس تنگ گوشے میں آنے سے پہلے ہی اُس کے پہلو سے لڑکی طرح نکل جاتی تھی۔ اُس کے بدن میں بے حد لچک تھی۔ اُسے اُبھرا ہونے اپنے آپ کو تہ کرنے میں اتنی دشواری نہیں ہوتی تھی جتنی ہیرو کو ہوتی تھی۔ دونوں کے بیچ ... دیر تک یہ ... ہوتا رہا۔ پھر سا ہیرو کے ذہن نے کروٹ سی بدلی یا جیسے اندھیرے میں اُمید کی کرن پھوٹی۔ اُس نے کسی تاخیر کے بغیر اُسی پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اُس نے طے کیا تھا کہ اب کے جب جامنی بائی چاقو تانے ہوئے اُس پر لپکے تو وہ اِدھر اُدھر بچنے کے بجائے ایک دم بیٹھ جائے۔ جامنی بائی کے قریب آنے پر ہی اُس کا بیٹھنا سود مند ہوتا، فاصلہ زیادہ ہوتا تو وہ اُس کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ جاتی۔ فاصلہ کم ہو جانے پر اُس کے لیے پلٹنا بہت وقت طلب تھا۔ ... میں ہیرو پر ٹوٹ جاتی۔ اس گڑبڑاہٹ کے دوران اُس کا چاقو ہیرو کے جسم کے کسی حصے پر لگ سکتا تھا اور اُس کا نتیجہ بھی ہیرو کے حق میں ہو سکتا تھا۔ خود جامنی بائی کے لیے اتنے کم فاصلے پر سنبھلنا اور سنبھل کے ہیرو کا پیچھا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ... ہونے کے باوجود اتنی جلد ارادہ بدلنے کا امکان ... ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ ایک دوسرے کا ... لیتے رہے تھے۔ اس بار بھی ہیرو پر جھپٹتے وقت جامنی بائی ... ہو گی کہ ہیرو کسی جانب بچ نکلے گا۔ ہیرو کا یہ اقدام جامنی بائی کے

ذہن میں دُور دُور تک نہیں ہو گا کہ وہ یوں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دے گا۔ یہ ایک طرح کی وحشت تھی جو جامنی خوب پہچان سکتی تھی۔ بہرحال ہیرو اس موقع کی تاک میں تھا۔ جلد ہی جامنی بائی اُس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی۔ ہیرو نے چند قدم پیچھے ہٹ کے پہلے تو اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ اُس کے ممکنہ وار سے بچنے کے لیے تیار ہے لیکن... جیسے ہی جامنی کا اور اُس کا فاصلہ ایک گز سے قریب رہ گیا تو دفعتاً وہ بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے تھے اور اس کا خیال تھا کہ ضرورت پڑی تو وہ اپنا چاقو بھی چھوڑ دے گا۔ جامنی بائی بیچ میں حائل ہیرو کے جسم سے تیزی سے ٹکرائی مگر ابھی ہیرو اُس کا بازو یا کلائی پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بدن کی پوری طاقت سے اُوپر اچھلی اور پیچھے ہیرو کے دوسری جانب اُلٹ گئی۔ فرش پر وہ ایک قلابازیاں کھاتی ہوئی وہ کچھ دور جا کے کھڑی ہو گئی۔

ہیرو کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی لیکن وہ جلد ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کے کچھ پیچھے آ گیا اور اس سے پہلے کہ اب جامنی بائی اُس پر لپکتی وہ ترچھا ہو کے ایک ہاتھ بڑھا، چاقو کو ناک کی سیدھ میں لیے چند قدم جست لگا کر پھر جامنی کے قریب آ گیا۔ کوئی امید بات اس کے سوا اُس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ جامنی بائی کا اور اپنا فاصلہ کم سے کم رکھے۔ اُس نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ جامنی بائی فاصلہ کم رہنے سے کترا رہی ہے اگر یہ احساس کا گمان ہی تھا تو بھی اب زیادہ دیر تک ہیرو یہ آنکھ مچول جاری رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ فاصلہ کم ہونے پر جلد سے جلد کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی توقع تھی۔ اِدھر یا اُدھر جو کچھ بھی ہو۔ ہیرو کا چاقو والا ہاتھ اپنے سامنے دراز رہنے کی وجہ سے جامنی بائی دائیں بائیں ہو کے اُس کا ہاتھ اُچکنے کی کوشش کرتی یا پہلو سے بچ نکل کے ہیرو کو پھر پلٹنے پر مجبور کر دیتی۔ ہیرو کی خواہش تھی کہ جامنی بائی اس موقع سے فائدہ اُٹھائے اور اُس کے پنجے پر جھپٹّا مارے۔ یہیں سب سے پہچانا تھا کہ وہ جامنی بائی سے پنجہ چھڑا لیتا ہے اور خود اس کو قبضے میں کر لیتا ہے یا نہیں۔

ہیرو کی نگاہیں چاقو پر بھی ہونی نہیں تھیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جامنی سامنے سے اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ کے چاقو کی نوک پر آنے سے تو رہی اسی لیے ہیرو اس طرف سے بے فکر تھا اور سامنے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر جامنی بائی کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہر قسم کی صورت حال کے لیے مستعد تھا۔ جامنی بائی اُسے بڑھتا ہوا دیکھ کے فوراً ہی ایک جانب ہوئی، پھر دائیں جانب۔ ایک آن میں اُس نے کئی پینترے بدلے۔ ہیرو نے اپنا ہاتھ سیدھا ہی رکھا اور اس طرح جامنی بائی کو کوئی داؤ قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جامنی کے لیے اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی طرف بھی ہو سکتی تھی مگر ہیرو کا اس انداز میں چاقو اُٹھائے ہاتھ پھیلا کے رکھنا اُسے شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ ہیرو کے انتہائی بائیں جانب ہو گئی۔ مجبوراً ہیرو کو بھی رُخ بدلنا پڑا لیکن اُس نے اپنا ہاتھ ویسے ہی پھیلائے رکھا۔ جامنی بائی اس اثنا میں بڑھ چکی تھی۔ ہیرو کے رُخ بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ اُدھر سے بڑھی اِدھر سے ہیرو پلٹ کے جامنی کے سامنے ہو گیا۔ جامنی بائی اتنی تیزی میں تھی کہ ہیرو کو اپنا ہاتھ کھینچنے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ عین اُس کے مقابل آ چکی تھی اور چاقو ٹھیک اُس کے سینے میں پیوست ہوا اور دوسرے ہی پل وہ ہیرو کے بازو پر جھول رہی تھی اور ہیرو کا سارا جسم چکرا رہا تھا۔

ذرا دیر اور مارنی کی سسکیاں نکل گئیں۔ سبھی حیرانی بھری نظروں سے ہیرو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ہیرو کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کا تمام ایک ڈھیر بنا ہوا تھا۔ کسی کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ جھل بھی گم سم بیٹھا تنکوں سے آگ کرید رہا تھا۔ خاصی دیر بعد جامو نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "دادا! پھر یہ سب ایسا کیسے ہو گیا؟" اُس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"ہو گیا جانی! سب ایسا ہی ہوا۔" ہیرو بھاری لہجے میں بولا۔ "جامنی بائی اپن سے مسخری کر رہا تھا۔ وہ سب مغل تھا جامو! اپن سالا سمجھا تھا، ابے جامنی بائی کو نچاتا ہے، وہ اُو در لے کو نچاتا تھا۔ اتنے آدمیوں کے بیچ اپنے ہیرو کو ذلیل کرنا نہیں مانگتا تھا۔ اُس نے اپن کے لیے لیا تھا۔"

"نہیں دادا!" جامو متشنج لہجے میں بولا۔

"اپن نے آخری ٹیم اُس کا مسکان دیکھا تھا۔ وہ لولا اپن کے بازو پر ہی ٹنگا تھا۔ ہنستا ہوا بولا۔ اپن ہار گئے دادا! اپن سے کچھ نہیں بولا گیا۔ بولا تو وہ کان بند کر چکا تھا۔ تم سمجھتے ہو دادا کا! اپن نے پلٹنے میں دیر کی کہ اُدھر سے وہ چل پڑا تھا۔ وہاں سے چل پڑا تھا جامو! وہ چاہتا تو کسی اور طرف کو جا پڑتا۔"

ہیرو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جب اُس نے جامنی بائی سے ہار ... کیا تھا تبھی جامنی بائی نے یہ طے کر لیا ہو گا۔ جامو نے اس سے کچھ اور نہیں کہا۔ ہیرو کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ اُس نے درمیان میں جس لڑکی کا ذکر کیا تھا، اُس کا نام نہیں بتایا، نہ کسی نے پوچھا مگر میں اور جھل اُسے دیکھ چکے تھے۔ وہ گیتا کی ماں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

گزاری تھی۔ پہلی رات ہمارے سو جانے کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر اُنھیں جاگنا ہی تھا۔ دوسری رات ہم اُنھیں جگائے رکھنے کے لیے والنٹیر جاگتے رہے۔ دو دن نیند کے بغیر پہاڑوں پر مسلسل سفر اُن کے جسم کو بوجھل کر دینے کے لیے بہت تھا اور ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں ہوا تھا۔ یقیناً آدمے کے خیال سے اُن پر ایک بوجھ سا طاری ہوگا اور ہماری جانب سے کسی وقت بھی کسی اقدام کا کھٹکا اُن کے لیے الگ ایک وحشت کا سبب ہوگا۔ صبح آگے بڑھتے ہوئے اُن کے قدموں میں پہلے جیسی مستعدی نہیں رہی تھی۔ جمیل پرسوں بالکل کسی قیمت بھی جینی اور پلیٹو کو اسی طرح آگے بھیج کے اور اُن کے درمیان جھگڑا کرا کے اُنھیں اپنے قریب کر سکتا تھا۔ ہم سب کا جینی اور پلیٹو کو آپس میں جھگڑے سے باز رکھنے کے لیے اُن کے پاس بھاگنا ایک فطری عمل تھا۔ ہم سب جب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے تو اُن کا بھی ہر طرف سے ہماری جانب بڑھنا لازم تھا لیکن اُن بے چاروں کو گمان بھی نہ ہوگا کہ ہم اُنھیں اپنے قریب اُن کے گھیرے کا انتظار کر رہے ہیں۔ قریب پہنچتے ہی اُن پر گولیاں چلا دیں گے اور اُنھیں ہتھیار اُٹھانے کے لیے بھی ایک لمحہ نہیں ملے گا۔ پر مسئلہ یہی تھا کہ کل ہم اُنھیں یوں اپنے نزدیک بلا سکتے تھے؟ اچھا یہی تھا کہ دو راتوں اور دو دنوں کی تھکن اُن پر غالب آ جانے اور اس دوران اُنھیں کسی قدر یہ اطمینان بھی ہو جانے کہ کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہیں ہے۔ جمیل نے اپنے اس ارادے کے بارے میں پہلے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ جینی اور پلیٹو کو آگے بھیجنے کے بعد ہی اس نے ہم سب کو بتایا تھا کہ تیار رہیں۔ سب اپنی جگہ چوکنے تھے۔ سبھی کے ذہن میں ایک خبط تھا کہ جمیل واپسی کے لیے ایسے ہی آمادہ نہیں ہو گیا ہوگا اسی لیے سب اُس کے اشارے کے منتظر تھے۔ جینی اور پلیٹو نے آپس میں اُلجھنے میں مدد ہی کی تھی۔ زبانی اُن کے کسی طور سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کی ٹھانے ہیں۔ ایک لمحے کو جمیل کے کہنے کے باوجود مجھے کچھ ایسا لگا تھا کہ وہ حقیقتاً آپس میں بھڑ گئے ہیں۔ پلیٹو نے جینی کو گرا کے پیچ کے زور سے زمین پر پٹخ دیا تھا اور چاقو تان کے اُسے مارا ہی چاہتا تھا کہ جمیل نے لپک کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وادی کی سطحِ زمین زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ آگے ایک اونچا پہاڑی سلسلہ تھا جہاں قبیلے کے آدمیوں کے لیے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اندھیرا ہونے میں خاصا وقت پڑا تھا۔ آگے ایسا کوئی موقع ملتا یا نہ ملتا۔

اپنے سامنے ہر جانب لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایک ساتھ اتنے آدمی مرے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ زمین بہت سی جگہوں پر لال ہو گئی تھی۔ جا بجا خون کے لوتھڑے اور چھیچھڑے پڑے ہوئے تھے۔ ہم اُنھیں پھلانگتے ہوئے اُس مقام تک جا پہنچے جہاں سے چلے تھے۔ میری سانس اُکھڑ رہی تھی اور دل دھڑ دھڑا رہا تھا۔ پتہ نہیں سارنے کا کیا حال تھا لیکن اُس کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ سولم اور پیرو کو تو ہم نے تڑپتے، پھڑکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ آگے بڑھنے پر جب جامو، پلیٹو، بلاکو، مارفی اور جمیل کے چہرے نظر آنے تو جا کے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔ آباجان اُن میں نہیں تھے۔ تشانم بھی ندارد۔ جمیل نے جینی اور پلیٹو کو اشارہ کرتے ہوئے اُنھیں بھی چوکنا ہونے، پیچھے ہو جانے اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی تلقین کی۔ اور وہ یہیں کہیں کسی آڑ میں چھپ بیٹھے۔ ایک طرف جامو بندوق تانے جانگ قبیلے کے پانچ آدمیوں کو روکے کھڑا تھا۔ مارفی پشت سے اُن کے ہاتھ رسیوں سے باندھ رہا تھا۔ جامو کے ماتھے پر حملہ ہوا تھا۔ تیر اُس کی آنکھ اور گال سے گزرتا ہوا گردن تک چلا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کے ہونٹ بدبدانے لگے اور وہ چیخ کے بڑبڑانے لگا: سلطان کو دیکھو۔

سلطان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جامو سے کچھ فاصلے پر جمیل، جینی، زودا، بلاکو اور پلیٹو کسی پر جھکے ہوئے تھے۔ شاید کوئی بہت زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ میں اُن کی طرف نہیں گیا اور اِدھر اُدھر بکھری لاشوں میں سلطان کو تلاش کرتا رہا۔ سارنے دوسری جانب نکل گیا تھا۔ سولم اور پیرو بھی ٹٹوؤں سے اُتر کے میرے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ جانگ قبیلے کے آدمی اپنے مخصوص لباس کی وجہ سے علیحدہ پہچانے جا سکتے تھے۔ سو اُن کے اوندھے جسم سیدھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان اپنے چوڑے چکلے جسم اور کپڑوں کے سبب دور سے نظر آ جاتا۔ میں اُسی کو ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بڑے پتھر کے نزدیک کسی کی کراہ میرے کانوں میں پڑی۔ وہ سلطان ہی تھا اور اپنے بل پر اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی پنڈلی میں تیر لگا تھا اور گوشت پھاڑتا ہوا گزر گیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سلطان بے حال تھا۔ آواز بھی حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ میری کچھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں مگر اسی اثنا میں اُسے ڈھونڈتا ہوا پیرو بھی اس طرف آ نکلا اور سلطان کا زخم ایک نظر دیکھتے ہی اُسے اپنے کندھے پر ڈال کے جمیل کی سمت بھاگنے لگا۔ اُس نے مجھے ہدایت کی کہ میں مرہم پٹی والی دواؤں کا صندوقچہ لے کے اُس کے پاس پہنچوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ سامان میں یہ صندوقچہ کدھر رکھا ہے۔ اتنا مجھے یاد تھا کہ جمیل شروع ہی سے اُسے اپنے ساتھ لے کے چلا تھا اور جانگ قبیلے سے چلتے وقت بھی سامان میں رکھنا نہیں بھولا تھا لیکن سارا سامان راستے میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ سارنے نے بھی پیرو کو سلطان کا جسم کندھے پہ لادے جمیل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اُدھر جا رہا تھا مگر میں نے اُسے روک لیا اور صندوقچے

کے بارے میں پوچھا۔ مجھے کچھ بتانے کے بجائے وہ خود سامان ٹٹولنے چلا گیا۔ جتنی دیر میں سارنے واپس آتا، میں اُس طرف لپکا جدھر جمیل، بلاکو، جینی اور پلیٹو تھے۔ وہاں وزیر بے سدھ پڑا تھا اور وہ سب اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وزیر کا ایک شانہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اُس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جس وقت میں اُن کے پاس پہنچا، جمیل وزیر کو آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔ وزیر نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے سانس بھی بند کر لی اور اُس کے ہاتھ میں دبا ہوا تسبیح چھوٹ پڑا۔ سب ایک دوسرے کو ویران آنکھوں سے دیکھا کیے۔ جمیل نے جلد ہی وزیر کے منہ پر کپڑا ڈال دیا۔ سب اُس کے پاس سے اُٹھ گئے تھے۔ سارنے کو سامان میں صندوقچہ نہیں ملا تھا سو وہ تو اِدھر پڑا تھا۔ جیسے ہی اُس نے لوٹ کے سلطان کے بارے میں جمیل کو بتایا، سب جمیل کی طرف دوڑ پڑے۔ مجھ سے چلا نہیں گیا۔ میں وزیر کا سر اپنی گود میں بھینچے وہیں بیٹھا رہا۔

وزیر کی قبر ایک اونچی جگہ کھودی گئی۔ بڑے مندر کے تہہ خانے میں پتھریلی دیواریں کھودنے کی ہمیں مہارت ہو ہی گئی تھی۔ مٹی کی قبر کھودنے میں کیا دیر لگتی۔ چاروں طرف سناٹا ہو جانے کے بعد آباجان اور تشانم بھی کسی چھپی ہوئی جگہ سے باہر نکل آئے تھے۔ آباجان اور پیرو نے مل کے وزیر کو غسل دیا اور آباجان ہی نے جنگجوؤں کے لباس میں اُس کی نماز ادا کی۔ ہم سب سر جھکائے کھڑے رہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر متقی میاں کی طرح وزیر کو بھی منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا اور ہم اُسے ویرانے میں تنہا چھوڑ کے آگے بڑھ گئے۔

سلطان کی پنڈلی کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی مگر اُس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زودا، جامو اور جمیل بھی زخمی ہوئے تھے۔ بلاکو کے سر پر کسی نے پتھر کھینچ مارا تھا۔ جمیل کا پیر بھاگتے ہوئے رپٹ گیا تھا اور اُسے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ زودا کی پسلیوں سے تیر اُچٹتا ہوا گزر گیا تھا۔ قسمت تھی جو بچ گیا۔ سلطان کے مقابلے میں سب کے زخم معمولی تھے۔ ہمارے تینوں قیدیوں میں سے ایک ہی زندہ بچا تھا۔ باقی دو نے موقع دیکھ کے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کی اور نشانے پر آ گئے۔ قبیلے کے زندہ رہ جانے والے پانچوں آدمیوں کے ہاتھ جمیل نے کھلوا دیے تھے اور اُنھیں اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ بہت سے یاک مر گئے تھے۔ ہمارے اور اُن کے یاکوں کو ملا کے کل گیارہ یاک تھے۔ اُتنوں کی ضرورت نہیں تھی لیکن زندہ یاکوں کو یوں آزاد چھوڑ دینے سے بہتر تھا کہ اُنھیں ساتھ لے کے ہی چلیں۔ خیموں، دریوں، کھانے پینے کا سامان، گولیاں اور سفر کے لیے دیگر ضروری اشیا کا ایک بڑا ذخیرہ قبیلے کے لوگوں کے اسباب میں ملا تھا۔ ظاہر ہے وہ سب کا سب اپنے ساتھ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ضرورت کے مطابق چیزیں اُس میں سے رکھ کے باقی وہیں چھوڑ دیا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی دیر تھی کہ وادی سے چل پڑے اور اندھیرا تیز ہونے کے بعد بھی چلتے رہے۔ مشعلوں کی اب ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ آگے آگے جمیل تھا۔ مارفی اور زودا بیٹریاں اور مشعلیں روشن کر کے راستہ دکھا رہے تھے۔ جب سردی بہت بڑھ گئی اور یاکوں کا چلنا بند ہونے کی وجہ سے آگے بڑھنا دشوار ہو گیا تو ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ لکڑیاں رسیوں سے باندھ کے سلطان کے لیے ایک چارپائی نما جھلنگا سا اسٹریچر بنا دیا گیا تھا جس کے آگے پیچھے نکلے ہوئے کڑوں کو قبیلے کے آدمی اُٹھائے ہوئے تھے۔ کبھی ہم بھی اُسے کندھا دے دیتے تھے۔ تشانم اُس کے سرہانے کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھی۔ سب جیسے اب تک سلطان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ تشانم کے منہ کو چپ لگ گئی تھی۔ آباجان کا بھی یہی حال تھا۔ وادی سے چلنے کے بعد وہ بھی سلطان کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

پڑاؤ کی جگہ رکتے ہی ہم نے سلطان کے لیے ایک علیحدہ خیمہ لگا دیا۔ تشانم اور آباجان کو اُس کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہنے دیا۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی اور کوئی کسی سے نہیں بول رہا تھا۔ رات کو کئی بار ہم لوگ سلطان کو دیکھنے گئے۔ تشانم رات بھر اُس کے بالیں بیٹھی رہی تھی۔ قبیلے کے آدمیوں کو بھی ہم نے ایک الگ خیمے میں بند کر دیا تھا۔ باری باری ایک ایک گھنٹے کے لیے سب پہرا دیتے رہے مگر کسی نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہم نے خیمے اُکھاڑ لیے اور سامان سمیٹ کے یاکوں پر لاد دیا۔ صبح کو سلطان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ اُس نے آنکھیں کھول لیں مگر چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھ کے وہ پھر غافل ہو گیا۔ اُسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے اُس کے لیے کئی بوٹیاں تجویز کیں۔ جامو نے اُنھیں سلطان کو کھلانے سے پہلے خود قبیلے کے آدمیوں پر اُن کا تجربہ کیا کہ کہیں وہ کوئی دھوکا نہ کر رہے ہوں۔ راستے میں پڑنے والا دشوار حصہ ہم نے سویرے ہی عبور کر لیا تھا۔ دوسرے دن رات تک ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا تھا اور ایک سرسبز شاداب وسیع و عریض وادی میں آ گئے تھے جہاں سے ہمیں گزرنا پڑا تھا۔ چلتے چلتے جمیل کا پیر سوجنے لگا تھا۔ رات کو زودا اور مارفی نے یاک کے مکھن میں نمک ملا کے مالش بھی کی مگر صبح اُس کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ تاہم وہ چلتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہم ایک جگہ آدھ پون گھنٹے کے لیے ٹھیرے تھے کہ

اندھیرا ہونے تک ہم نے اپنے راستے میں پڑنے والے پہاڑوں کی اور کئی دیواریں عبور کرلی تھیں لیکن جو تھے دن صبح رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صرف ایک میل کے قریب آگئے تھے۔ ہوں گے کہ آسمان پر یکایک کالے بادل گھر آئے اور ہم خیمے نصب کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ چلو دھا بارش ہونے لگی۔ سلطان بھی بھیگ گیا۔ ہر چند ہم نے اُس کے اسٹریچر پر فوراً پھول داری ڈال دی تھی۔ خیموں کی تنبیں ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے ہم سبھی خراب ہو گئے تھے۔ بارش میں تیزی سے آئی تھی اُسی تیزی سے گزر گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور تازہ دھوپ چمکنے لگی لیکن جھل نے پھر آگے بڑھنے سے سب کو روک دیا تھا۔ سلطان کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسٹریچر کے جھٹکوں اور بارش نے اُس کے بچے سے اوسان بھی چھین لیے تھے۔ سب اُسے مختلف قسم کی دوائیاں دیتے رہے اور اُس کے گرد ہی بیٹھے رہے۔ سلطان کسی طرح قابو میں نہیں آیا۔ جتنا اُس کا دھیان کرتے، وہ اتنا ہی اور بکھر جاتا۔ پھر اُسی دن شام کو اُس نے نہ جانے کیسے آنکھیں کھول دیں۔ پٹ پٹاتی پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تشام اُس کی نظروں کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس پر نظر پڑی تو مسکرایا۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹ۔

"کیا ہے سلطانے؟" جھل نے بے چینی سے پوچھا۔

"استاد!" چونکہ وہ ڈوبتی اور لرزتی آواز میں بولا۔ "اِس کا دھیان رکھنا۔ اب تمھی اِس کا....."

"کیا بولتا ہے رے!" جھل مضطربانہ اُس کا گال تھپتھپانے لگا۔

"پہلے اِس وقت نہیں ہے۔" سلطان کی آواز پر غشی طاری تھا۔

"نہیں رے!" جھل نے تندی سے کہا۔

معلوم نہیں جھل کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی بھی یا نہیں۔ وہ تشام کو دیکھ رہا تھا اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ تشام پر آنکھیں جمائے لیٹا رہا۔ دیر تک اُس کی آنکھیں نہیں جھپکیں۔ جھل نے پھر ہاتھ بڑھا کے انھیں خود ہی بند کر دیا۔

تشام کے سینے سے نہ کوئی آہ بلند ہوئی نہ اُس کے آنسو نکلے۔ وہ بت کی طرح خشک بیٹھی رہی۔ سلطان کو جب قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اِس دوران جھل، پیرو، جامو اور ابا جان اُسے تھامے رہنے، بازوؤں سے چپٹنے، گردن میں ہاتھ ڈالے تاکہ اُس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اُس سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ ماں، بیٹا، کو زودیا، بلتو، سرلو جیسی سارنے اور میں نے بھی اُس سے بہت کچھ کہا لیکن اُس نے جیسے کسی کی بات ہی نہیں سنی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن ہم نے اُسی کے خیال سے جلدی کی کہ وہ سلطان سے جتنی جلد اور جتنی دور ہو جائے اچھا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون مرتا ہے۔ مرنے کا مطلب ایک مستقل دوری ہے۔ سائے تو صرف زندگی کے ہیں۔ رات کو ہم نے خاصا آگے جا کے پیکرں سے سامان اتارا۔ اُس رات کسی نے کھایا پیا نہیں۔ چانگ قبیلے کے آدمیوں کو گوشت کے پیچھے تکھی اور بھنا ہوا اناج دے دیا گیا، وہی انھوں نے کھا لیا۔

ہم سب ایک ہی خیمے میں تھے۔ تشام رات بھر ایک کونے میں ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ جھل اُس کے ماتھے، ہاتھوں اور گالوں کو پیار کرتا تھا۔ اُسے جھنجوڑتا تھا مگر تشام کا بدن سُن پڑا تھا۔ رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا جیسے رفتہ رفتہ کوئی اُس کا خون چوس رہا ہو۔ ساری رات کوئی بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ نہ جھل، نہ ابا جان، نہ پیرو۔ پیرو نے اُس کی دل جوئی کی سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ مگر میں تشام اُس کی بیٹی گیتا کے برابر ہی تھی اور پیرو ہی کی کوشش سے تشام کی آنکھیں بھیگیں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے پیرو نے اُسے اُٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا اور اُس کا بدن گدگدانے لگا تھا۔ تشام کی آنکھوں سے آبشار سا ہو نکلا۔ ایسے بلک بلک کے روتی کبھی نے کسی کو ایسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ جیسے ہم سبھی کو رونا یاد آگیا تھا۔

ہم شہر زاپول سے بھی آگے بڑھ آئے۔ زاپول کی بستی میں داخل ہونے کے بجائے ہم دور ہی دور سے راستہ کاٹ کے نکل گئے۔ راستے میں اور بھی کئی بستیاں پڑیں مگر جیسے ہی دور سے اُن کے نشانات نظر آتے، ہم راستہ بدل دیتے۔ جانے کتنا ہی جگر کو نا پڑتا۔ ندی نالے، دریا، کئی سٹوان، کچے ڈنڈیل۔ کم سے کم سلطان کو دفن کرنے کے چار دن بعد تک ہم روز رات کو چند گھنٹوں کے لیے ٹھہرتے، مسلسل چلتے رہے۔ جامو کا زخم سوکھ گیا تھا لیکن جھل کے پیر کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم اصرار کر کے اُسے یاک پر بٹھا دیتے اور دن میں دو بار اُس کے پیر پر لیپ کرتے۔ اِسی وجہ سے سفر میں کچھ رکاوٹ نہیں پڑی۔ سردی کی شدت بھی کچھ کم ہو گئی تھی اور آگے راستے اتنے پیچیدہ نہیں تھے۔ ساری پیچیدگی ہمارے عام راستوں سے ہٹ جانے کے سبب سے تھی۔ پانچ دن تک تشام ہمارے ساتھ رہی۔ کھوئی کھوئی سی ساتھ چلتی رہی۔ جب کہتے اُٹھ جاتی، جب کہتے بیٹھ جاتی۔ جب نظر پڑتی اُس کی آنکھیں چھلکتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ ہر کوئی اُس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنے سے پہلو تہی کرتا تھا۔ مگر ہم جتنے خوب واقف تھا اور تشام کو چونکہ ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی اس لیے بیشتر اُس کے قریب رہتا تھا۔ سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگا ہوا۔ ابا

جان بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور میں بھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اُسے کچھ قرار آگیا ہے۔ قرار اُسے ضرور آگیا تھا لیکن پانچویں دن سہ پہر کے وقت ہم نے دو بلند پہاڑوں کے درمیان ذخیرے کاپل عبور کیا ہی تھا اور پل سے چند قدم آگے آئے تھے کہ تشام کو جانے کیا ہوا، وہ واپس دیوانہ وار پل کی طرف بھاگی۔ ملکی نے اُس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر پل تک پہنچ ہی تشام کا فاصلہ تھا۔ تشام ہزاروں فٹ نیچے گھاٹی میں بہتے ہوئے دریا میں کود گئی۔ بارش بھی گرتے گرتے بچا، جب تک ہم سب وہاں پہنچے، دریا کی تیز لہریں اُسے بہا کے لے گئیں۔ سب نیچے جھانکتے رہ گئے۔ پیرو نے اپنا سر کھسوٹ لیا اور ابا جان سینے میں سر چھپا کے بیٹھ گئے۔

کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تشام چلی گئی ہے۔ سب کی نظریں اِس طرح جھک رہی تھیں کہ شاید ابھی وہ کسی جانب سے واپس آ جائے گی۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ نیچے گھاٹی میں اُترنا مشکل تھا ورنہ ہم اُسے نیچے جا کے دیکھتے۔ نیچے جانے کا صرف ایک راستہ تھا کہ دریا میں چھلانگ لگا دی جائے۔ ہم اور آگے بڑھ گئے مگر سب کے پیروں کو جیسے زنگ سا لگ گیا تھا۔ گرتے پڑتے اندھیرا ہوتے ہم پھر ایک جگہ آکے ٹھہر گئے۔

تشام بھی اُسی مٹی کی بنی ہوئی تھی جس کی کرا تھی۔ جس کی بہت سی باتیں کرا سے ملتی جلتی تھیں۔ اُس کے لانبے بال، آنکھیں، پیشانی، اُس کے مسکرانے اور شرمانے کا انداز۔ تشام کو اگر کرا کی طرح کوئی آسرا ہوتا کہ سلطان واپس آجائے گا، تو وہ بھی ایسا کرتی۔ ساری زندگی اُس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اُس نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے کرا جیسا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ کرا کی طرح جھوٹ موٹ کا سہی۔ ہم نے تشام سے کوئی سی بات کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جتنی بھی تسلیاں ممکن تھیں، دیتے رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ انھوں نے روٹھی ہوئی تشام کو منا لیا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ تشام ایسے کیسے بہل جائے گی۔ جامو نے اُسے اپنی بہن بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ اُس کے ہوتے ہوئے اُسے کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ابا جان اور پیرو اُسے بیٹی بیٹی پکارتے تھے۔ اگر وہ سلطان کے بدلے سب سے کچھ نہ کچھ مانگتی تو سب کے پاس جو کچھ تھا وہ اُس کے حوالے کر دیتا مگر کیا اِس طرح سلطان کی قیمت ادا ہو جاتی۔ قیمتیں تو اُن چیزوں کی ہوتی ہیں جنھیں لوگ بیچنے اور خریدنے کے لیے آمادہ ہوں۔ یہاں تو صرف خریدار تھے۔ دُکھ کے بدلے سُکھ کا سودا کرنے کے خریدار سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ بے شک تشام کو سلطان کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار تھا مگر وہ اُس کی کیا قیمت لگاتی؟ جس چیز کی قیمت نہیں ہوا کرتی۔

کرا سے بھی لوگ ایسا ہی کہتے۔ سنا زہر ہونے لیے ... بتایا تھا، جیسلمیر میں رانا مہتاب کی بیٹے کی ارشد کا پیام ... نہ جانے اتنے عرصے میں کس کس نے کھانے لیے مولوی صا... کے آگے خزانے بچھانے ہوں گے اور صرف مولوی صاحب ... جانتے ہوں گے کہ کرا کو کھونے سے تعاقب کرنا کتنا مشکل ... لوگ کہتے ہیں، وقت کے ساتھ بہت کا چیزیں بدل جاتی ... ہیں۔ عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ آدمی زندہ رہنے کے لیے کوئی ... نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ کپڑا نہ ہو تو چیتھڑے سے ستر پوشی کر ... بے کھانا نہ ہو تو گھاس پھوس کھا لیتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی ... بدل مل جاتا ہے۔ آدمی کا بدل بھی مل جاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ... دنیا کب کی ختم ہو جاتی مگر سب کو نہیں ملتا۔ اُن کا نصیب ... ہو، انھیں نہیں ملتا۔ مولوی صاحب نے کرا کے لیے کیا کچھ نہیں ... کیا ہوگا۔ اُسے پڑھایا لکھایا، اُس کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیا ... دیا۔ در بدر مارے مارے پھرتے رہے۔ انھوں نے کرا کو اپنی ... میں ہزار تسلیاں دی ہوں گی مگر اُن کی تسلیاں نہیں تھیں جو کرا ... کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ اُس کی اپنی تسلی تھی جو اپنے آپ سے ... بھی تو کچھ کستی ہوگی۔ اُس کا دل بھی اُن سے کچھ کہتا ہوگا۔ اُس کا دل ... کہتا ہوگا کہ میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈوں۔ دا جیوں میری نظریں اُسے ... اپنے بدن پر چبھتی محسوس ہوتی ہیں کیونکہ اُس کی نظریں بھی مجھے ... اپنے اردگرد محسوس ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب نے اُسے جو کچھ بتایا ہو، امکان اِس بات کا زیادہ ہے کہ انھوں نے اُسے میرے مرکھپ جانے کا یقین دلانا چاہا ہوگا۔ وہ میرا آسرا چھوڑنے اُن کے خیال میں کرا کو اِسی صورت میں صبر آ سکتا ہے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ کرا نے اُن کی بات کا بالکل یقین نہیں کیا ہے۔ وہ چپ ہے تو اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے دل میں اُمید کی ساری کرنیں بجھ گئی ہیں۔ مَیں نے مولوی صاحب سے حجت نہیں کی ہوگی کہ وہ نہیں مانتی۔ بس وہ چپ ہو گئی ہوگی۔ اتنے عرصے کرا کے ساتھ رہنے کے باوجود مولوی صاحب کو پتہ نہیں چلا۔ آرا اور کتنے عرصے نہیں چلے گا۔ خود وہ تھک جائیں گے اور ایک دن انھیں احساس ہوگا کہ انھوں نے میری طرف سے بے خبری برت کے کتنا بُرا کیا ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آتی تھی ورنہ پھر کیا وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے کبھی پلٹ کے میری خبر نہیں لی۔ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ میں مر تو نہیں گیا تھا اور مر گیا تھا تو انھیں کم از کم اِس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہوں گے۔ جھل نے ایک بار

اشارتاً مجھ سے کہا تھا، لاڈلے! کیا پتہ، مولوی صاحب ابھی تک اُن بھکشوؤں سے خوف زدہ ہوں جو کرا کی تلاش میں سارے ہندوستان میں منڈلاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی اُن بھکشوؤں سے اُن کا کوئی واسطہ پڑا ہو اور انھیں یہ شبہ ہو کہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کرا اتنی محفوظ نہیں رہے گی جتنی اُن کے پاس ہے۔ بڑی جھیل کی بات سُن کے خاموش ہو گیا تھا۔ بحث کرنے سے کیا حاصل تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کہنے سے جھیل کی مُراد مجھے سمجھانا ہی تھا۔ ایسا تھا تو بھی مولوی صاحب اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے میری تلاش ضرور کرتے۔ وہ مجھے تلاش کرنا ہی نہ چاہتے تھے وہ کرا کو اپنے پاس سے جدا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں گے۔ انھیں خدشہ ہو گا کہ کرا پھر اُن سے چھن جائے گی اور یہ سب تو اُن کے اپنے اندر کی باتیں تھیں۔ کرا سے انھوں نے کیا کہا ہو گا، میرے نہ آنے کی کیا تاویل دی ہو گی۔ جو کچھ بھی دی ہو گی۔ یہ مولوی صاحب کی بھول تھی کہ انھوں نے جو کہا ہے کرا نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ کرا اپنی تاویل سے قائم تھی، اپنے دل کی تاویل سے ــ اور تاثر! وہ کس تاویل پر بھروسا کرتی۔ اُس کے سامنے کوئی پردہ نہیں پڑا تھا، وہ خود کو کیا باور کراتی!...

ابھی راستے میں ہمیں ہندوستان میں داخل ہونا تھا جس سے ہم یہاں آئے تھے۔ سرحدی چوکیوں اور بستیوں سے گزرے نہیں۔ اعصاب کے ہمیں زیادہ احتیاط کرنی تھی کہ ہمارے پاس دنیا کا بیش قیمت سامان تھا۔ زر و جواہر، لعل و یاقوت، ہزاروں سال پہلے کے برتنوں اور زیوروں سے بھرے ہوئے صندوق۔ آدھے سے زیادہ راستہ ہم نے کسی نہ کسی طرح طے کر لیا تھا۔ ہر دن ہمیں ہندوستان کی سرحد سے اور قریب کر دیتا تھا۔ کوئی بیسویں اکیسویں دن پہلی بار ایک بڑا قافلہ ہمیں ہندوستان کی سمت سے آتا نظر آیا۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے ٹھیر گئے اور قافلے کے کچھ قریب ہونے کا انتظار کرنے لگے مگر وہ سب بھکشو تھے جو اپنے مخصوص لباس کے باعث دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ دیکھنے کو کوئی بات نہیں تھی لیکن ہمارے ہمراہ جانگ قبیلے کے چار آدمی اور ایک تبتی قلی تھا۔ ایک آدمی کو عظم عادل پر جامو نے گولی مار دی تھی۔ قافلے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ شور مچا سکتے تھے۔ زورا، بلاکو اور شوکولم نے انھیں اس کے سامنے ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ تینوں فوراً انھیں دور لے گئے۔ ابا جان کی وجہ سے قافلے کے بھکشو کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ ابا جان اور اُن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ انھوں نے ہماری خیریت بھی پوچھی اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ ہو سکتا تھا کہ آگے جا کے اُن سے کوئی ہمارے بارے میں استفسار کرتا لیکن ہماری گنتی کم تھی۔ ابا جان ہمارے ہمراہ تھے اور اس دوران ہمارے حلیے یک سر بدل گئے تھے۔ چہرے پر داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کے ہم نے بندوقیں پہلے ہی چھپا دی تھیں۔

اس سے پہلے بھی راستے میں اکا دکا چھوٹے موٹے قافلے ملے تھے مگر اُن کے سامنے وہ ایک لفظ نہیں بولے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ہماری بندوقیں اور تمنچے اُن کی کسی بھی آواز پر چلنے لگیں گے اور صرف وہی نہیں مارے جائیں گے، قافلے کے لوگ بھی ختم ہو جائیں گے۔ انھیں یہ بات پہلے بتا بھی دی گئی تھی۔ بھکشوؤں کا قافلہ بہت بڑا تھا اور ویسے بھی اُن پر بندوق اٹھاتے ہوئے ہمارا جھجکنا لازم تھا اسی لیے ہمیں انھیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کرنا پڑا کہ وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانے کی غلطی نہ کریں۔

ڈیڑھ مہینے کی مسلسل مسافت کے بعد ہم ہندوستانی سرحد کے خاصے نزدیک ہو گئے۔ قبیلے کے آدمی اور قلی ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں مزید آگے لے جانا مناسب نہیں تھا گو ہمیں اُن کی اب بھی ضرورت تھی۔ وہ وقت آ پہنچا تھا جب ہمیں اُن کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا تھا۔ جامو کی رائے تھی کہ انھیں مار دیا جائے۔ بلاکو، جینی، مارتی اور سارنے بھی اُس کے ہم نوا تھے۔ شکیل نے کچھ بھی نہیں بولا۔ بیریٹ نے منع کر دیا اور انھیں اپنے ساتھ ہی رکھا مگر دوسرے دن جیسے ہی ایک گہری گھاٹی پر نظر پڑی بیریٹ نے ہمیں ٹھیر جانے کا حکم دیا۔ قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو رسیوں سے باندھ کے یکے بعد دیگرے نیچے گھاٹی میں اُتار دیا گیا۔ کدالیں، میخیں، ایک خیمہ، مشکیزے اور سفر کا ضروری سامان بھی اُن کے اُترنے کے بعد نیچے چھوڑ دیا گیا۔ ہزاروں فٹ گہری گھاٹی کی تہہ سے انھیں اوپر چڑھنے اور کسی قریبی بستی تک پہنچنے میں کئی دن لگتے اور اس دوران ہم کب کے تبت کی سرحد پار کر چکے ہوتے۔ انھیں ایسے چھوڑنے پر کوئی بھی تیار نہ ہوتا، اگر ہمیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ہمارے سامان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ صندوق میں بھری ہوئی چیزوں کے متعلق قطعاً لاعلم تھے۔ جس وقت بڑے صندوق تہہ خانے سے نکل کے، اُس رات ہم اس مقام پر پہنچے تھے جہاں شوکولم ہمارا انتظار کر رہا تھا تو ہم نے اپنی جیبوں اور تھیلوں میں بھرا سامان اُس کے ساتھ لائے گئے صندوقوں میں منتقل کرتے وقت اس بات کی خاص احتیاط کی تھی کہ تینوں قلی اُسے نہ دیکھ پائیں۔ انھیں اس دوران دور رکھا گیا تھا۔

اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا مگر سردی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ دن میں ہم اپنے اوور کوٹ اتار دیتے تھے۔ سردی کا موسم بھی بدل گیا تھا۔ راستے میں باری باری سبھی بیمار پڑے تھے۔ سب کے بدن کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ منہ کھولتے ہوئے ہونٹ دکھتے تھے، رات کو لیٹتے تو رگیں کھنچنے لگتیں۔ ابا جان بہت کم کسی سے بولتے تھے، مجھ سے بھی نہیں۔ تقریباً سبھی کے منہ سلے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ اب کوئی رہبر نہیں تھا، صرف ایک اندازہ تھا کہ ہم سرحد کے قریب ہو رہے ہیں، سرحد اب آ جانی چاہیے۔ ایک ہفتہ گزر گیا، کہیں بھی سرحدی بستیوں کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس وقت ہمیں راستہ بھٹک جانے کا شبہ ہوا۔ اب تک ہم بستیاں کاٹ کاٹ کے گزر رہے تھے مگر اب ہمیں خود اُن کی تلاش تھی۔ اونچائی سے ہم چاروں طرف نظریں دوڑاتے رہتے کہ کہیں انسانی زندگی کے نشانات دکھائی دے جائیں۔ کئی دن تک ہم اسی تگ و دو میں رہے۔ اس عرصے میں کسی بھی قافلے سے ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً ہم کسی ویران جگہ آ گئے تھے۔ یہاں سبزہ بھی برائے نام تھا اور آگے دُور تک عموماً چٹیل پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر کہیں کہیں برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر سرحد اتنی ہی دُور تھی تو ہمیں قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو گھاٹی میں نہیں اُتارنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے ہی ہمارا رُخ کسی دوسرے راستے کی طرف موڑ دیا تھا لیکن سمت کی پہچان مشکل نہیں تھی۔ ابا جان کے پاس قطب نما، ایک چھوٹی ڈبیا تھی۔ سورج سے بھی سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے اندازے کے مطابق جنوب کی سمت سفر جاری رکھا اور زمین جیسے ہمارے پیروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ بڑے چھوٹے پہاڑ، میدانوں کو دیکھتے ہوئے ہفتے گزر گئے تھے۔ سب کی رفتار تیز تھی، ہندوستان کی سرحد نزدیک آنے کے خیال سے سبھی کے قدم اُٹھ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا، پہاڑ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ساری زندگی ہم انھی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ سامنے جب کوئی اونچا پہاڑ دیوار بنا کھڑا نظر آتا تو جی چاہتا، برمے سے اس میں سوراخ کر دوں۔ ایک مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک پہاڑ کے کئی چکر کاٹنے پڑتے تھے، تب کہیں وہ سامنے سے ہٹتا تھا مگر اس کے ہٹتے ہی دوسرا سامنے آ جاتا تھا۔ تبت کی پہلی سرحدی چوکی کا نام سالما تھا اور اس کے پاس بہت سی چھوٹی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ سالما یا کسی دوسری بستی کی دُور دُور تک کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ قبیلے کے لوگوں کو جدا ہوئے دس روز سے زیادہ ہو چکے تھے، ہم چلتے رہے۔ چلتے ہی کی صورت میں کوئی بستی ملنے کا امکان تھا اور آخر گیارھویں روز بلندی سے نشیب میں واقعی ایک چھوٹی بستی ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ کسی سیاح کو دنیا کا کوئی نیا خطہ دریافت کرنے کی اتنی خوشی اور حیرت نہیں ہو گی جتنی ہمیں گنتی کے چند مکانوں پر مشتمل بستی دیکھ کر ہوئی۔ سب لوگ آگے جا کے رک گئے اور شوکولم اور بیریٹ تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے اور جب وہ آئے تو اکیلے نہیں تھے۔ اُن کے ہمراہ یاکوں کے ساتھ چار آدمی بھی تھے۔ یقیناً وہ قلی ہی ہو سکتے تھے اور وہ قلی ہی تھے۔ انھی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آسام کی طرف جانے کے بجائے جنوب مغرب میں بھوٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھوٹان کے سارے علاقے عبور کر کے ہی ہندوستان میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ وہ جگہیں اور وہاں کے لوگ ہمارے دیکھے بھالے نہیں تھے۔ بھوٹان زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا لیکن ہم نے قلیوں کو آسام کی سرحد کی جانب چلنے کو کہا۔ انھیں ایک بڑے معاوضے کی پیشکش کی گئی تھی اور کچھ رقم پیشگی بھی دے دی گئی تھی۔ ساتھ ہی اُن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ سالما کی سرحدی چوکی تک ہمارے ساتھ چلیں گے تو ہم اپنا بچا ہوا تجارتی سامان اور چند یاک بھی اُن کے حوالے کر دیں گے۔ وہ آنا کانی کر رہے تھے لیکن ابا جان کا اصرار کارگر ثابت ہوا۔ وہ مان گئے۔ آئندہ ایک ہفتے کی مسافت سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے مختلف راستے پر اپنی منزل سے کتنی دور چلے گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ سالما کی سرحدی چوکی اب ایک دن کے فاصلے پر رہ گئی ہے تو سب ایک دوسرے کو ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا چند میل کے فاصلے پر ہندوستان تھا۔ دو یا تین دن کا سفر۔ سبھی کی بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہم نے قلیوں سے کہہ دیا تھا کہ سالما آنے سے کچھ دور پہلے ہی وہ ہمیں مطلع کر دیں۔ اب تک ہم نے انھیں نہیں بتایا تھا کہ ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے ہمارے پاس راہداری کا باقاعدہ پروانہ نہیں ہے ورنہ وہ شروع ہی میں آئیں بائیں کرتے۔ ابا جان کا کچھ نہیں تھا۔ بھکشو پروانۂ راہداری کی قید سے آزاد تھے۔ جیسا کہ ہمیں توقع تھی، یہ سن کے قلی منہ بنانے لگے اور انھوں نے پروانے کے بغیر ہمیں آگے لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہاں تک آ کے ہم اُن سے کوئی ضد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بستیاں قریب تھیں اور ہمارا کوئی بھی نازیبا عمل ہمیں اُن کی نظروں میں مشکوک کر سکتا تھا۔ جاتے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پڑا نے

نشستوں پر بیٹھے کہیں گم تھے۔ جمیل کو نیلی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔
اُس کے پاؤں میں تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی۔ چہرے سے اس کا اظہار
نہیں ہو رہا تھا مگر اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں
ہے۔ میں نے اُس کے پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیے تھے۔ میرے
مقابل ابا جان کھڑکی کی طرف منہ کیے گھومتی ہوئی زمین دیکھ رہے
تھے مگر ڈبے کی دیوار سے ٹکی آنکھیں خالی خالی، پیشانی پر شکنیں،
معلوم نہیں کہاں کھوئے ہوئے تھے۔ جتنے کہیں کی ترجیح نہیں ملا تھا۔ میرا
خیال تھا گاڑی میں بیٹھ کے مجھے اپنے پاس بلا کے ضرور پوچھیں گے کہ تم اتنے
دن کہاں رہے، کیسے گزران کی۔ ان لوگوں کے بارے میں انھوں نے
کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد کوئی
بات اُن سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی مگر انھوں نے مجھ سے
کچھ نہیں پوچھا۔ سارے سفر کے دوران انھوں نے مجھ سے بہت کم
بات کی تھی۔ اس لیے مجھے دیکھتے ضرور رہے تھے۔ بارہا میرے دل میں
آیا، ان سے پوچھوں وہ فرزانہ، فرخ، خادمہ اور اکبر کو کس کے پاس
چھوڑ کے آئے ہیں لیکن ڈر لگتا تھا۔ نہ جانے کون سا جواب سُننے
کو ملے۔ اُن کے لبوں پہ بتانے کو کچھ ہو نہ ہو۔ شاید جمیل سے زیادہ
پوچھا ہو۔ وہ دونوں آپس میں کبھی کبھی چپکے چپکے باتیں کرتے رہے
تھے لیکن مجھے جمیل نے انھیں بتایا ہو کہ ان کی خواہش کے مطابق
میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ میں
بہت پڑھوں لکھوں اور بڑا افسر بن جاؤں۔ شاید جمیل نے اُن
سے نہیں کہا کہ میں نے قتل کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹی
ہے۔ مجھے بہت اچھا جانو چلا آتا ہے۔ تم بھی واقعی بہت بچنا چلاتے
بجتے تو انھوں نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔

مجھے احساس ہوتا تھا، ممکن ہے وہ اپنی جھجک کی وجہ سے
مجھ سے توقع کرتے ہوں کہ میں اُن سے ثمی، فرزانہ، فرخ، خادمہ اور
اکبر کے بارے میں پوچھوں گا۔ لیکن یہ سوچتے ہوں کیسا بھائی ہے
جسے اپنی بہنوں اور بھائی کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ بھائی اُن سے
کیا کہتا، اگر اُس نے ثمی کو جھکی نظروں کے درمیان بیٹھا نہ دیکھا
ہوتا تو کسی اور کے بارے میں پوچھتے ہوئے اُس کی ہمت یوں
جواب دے جاتی۔ غالباً ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی
سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں خود ہی جواب نظر آتے
رہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نے جمیل سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی
نہیں سمجھی کہ وہ کلکتے جا کے ٹھیر جائے گا یا سیدھا فیض آباد جانے
کا ارادہ ہے۔ جہاں جہاں گھر ہے۔ ابا جان اُسے دیکھنے کے لیے
بے چین ہوں گے۔ ایک مدت بعد وہ اُن کے سامنے آئے گا تو اُن
کا کیا حال ہوگا اور جمیل کہیں کلکتے میں رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے جمیل
نے اُن سے کہا ہو کہ دو چار دن کلکتے میں ٹھیر کے پھر فیض آباد آئیں
گے۔ بہرحال ابا جان کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور اُن کے
ذہن میں آگے کے بھی خاکے ہوں گے۔ وہ فیض آباد میں رہیں گے
یا کہیں اور۔ اب اُن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اب وہ
گیا تو نہیں جائیں گے اور نہ زریں انھیں کہیں جانے دے گی۔ حویلی میں
جا کے ابا جان سب سے زیادہ اُسی کو پسند کریں گے۔ وہ اُن کا اسی
طرح خیال رکھے گی جس طرح جمیل کا۔ شاید وہ دوسروں کا خیال رکھنے
ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ ثمی کی بہت سی خصوصیات اُس میں
موجود تھیں۔ ابا جان نے ثمی کو کھو دیا مگر زریں سے مل کے بڑی حد
تک ثمی کا ازالہ ہو جائے گا مگر یہ سب میرے اپنے ذہن کے خیال
تھے۔ میں ابا جان کے دل میں چھپا نہیں بیٹھا تھا۔ نو سال میں انھوں
نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ اب ان کی تعبیر کا وقت آیا ہے۔
اتنی بڑی دولت سے وہ کیا کیا خریدیں گے۔ محلات، جاگیریں، کوئی
ریاست۔ ان چیزوں سے وہ اپنے خوابوں کی کیسی کیسی تعبیریں تراشیں
گے۔ اُن کا شمار دُنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ہو گیا ہے۔ اب خزانہ
اُن کے ساتھ تھا اور وہ خزانے کے ساتھ۔

جمیل آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ ابا جان
تھوڑی دیر کے لیے لیٹے پھر اٹھ کے بیٹھ گئے۔ وہ کھڑکی سے کبھی
کبھی نظر اٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے۔ رات کو انھوں نے مجھ سے
کہا تھا کہ میں بھی لیٹ جاؤں مگر مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں
رات بھر بیٹھا رہا۔ صبح سویرے گاڑی نیو کوچ بہار سے ایک میل
ایک آئی ہوگی کہ اچانک رک گئی۔ ہم نے دروازہ کھول کے
دیکھا۔ گاڑی کو دونوں طرف سے پولیس نے گھیر لیا تھا۔ ابھی گاڑی
ٹھیرے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک پولیس افسر دو
سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے
انگریزی میں دخل اندازی کی معافی چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے
جیسے ہی اُس نے ہماری صورتیں دیکھیں صورتیں کیا، لباس دیکھے
تو ناک بھوں چڑھا کے بولا۔ "تم لوگوں کے پاس فرسٹ کلاس
کا ٹکٹ ہے؟" اُس نے انگریزی میں کہا۔ اُس کی نگاہیں ہمارے
چہروں اور سامان پر پھسل رہی تھیں۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے
پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوگا۔

"بابو کیا گٹ پٹ کرتا ہے رے؟" جمیل نے بولچال اردو
میں مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔
مجھے پولیس افسر کے لہجے پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں حقارت
تھی۔ "ہمارے پاس ٹکٹ ہیں۔" میں نے آہستگی سے انگریزی میں کہا۔

مجھے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کے وہ چونکا ہوا اور مجھ
سے بولا: "دکھاؤ۔" اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔
میں نے سوچا کہیں دکھاتے ہیں مگر پہلے بات کرنے
کی تمیز سیکھو۔ میں چپ رہا۔ جمیل نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال لیے
تھے۔ "دکھاؤ بابو صاحب کو۔"

میرے ہاتھ سے ٹکٹ لینے کے باوجود اُس کا شک دور
نہیں ہوا۔ الٹ پلٹ کے کبھی ٹکٹ کو دیکھتا کبھی ہمیں کبھی سامان
کو۔ "ٹھیک ہے دیکھ لو جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ٹکٹ میں لکھا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہوں۔" وہ سر ہلانے لگا اور کچھ توقف کے بعد شستہ اردو
میں بولا۔ "آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا ٹکٹ کے ساتھ یہ سب بتانا بھی ضروری ہے؟"

"نہیں۔ اتنا ہی ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے میں نرمی
تھی۔ نرمی اسی لیے آ گئی تھی جب میں نے اُسے انگریزی میں جواب
دیا تھا۔ جمیل نے مجھے اشارہ کر دیا تھا ورنہ میں اُس سے بہت کچھ
ضرور پوچھتا۔ جمیل کو خیال ہوگا کہ وہ پولیس افسر ہے۔ ہمارے
سامان پر بھی شک ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی حکم دے
سکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ساری گاڑی پولیس والوں
نے گھیر رکھی ہے۔ ڈبے میں موجود اُس کے ساتھ آنے والے دونوں
سپاہیوں کی نظریں صندوقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے
کہ وہ اپنے افسر کو کوئی اشارہ کرتے، افسر نے مجھ سے معذرت
کی اور کہنے لگا کہ گاڑی میں یہ چیکنگ مسافروں کے فائدے
کے لیے ہے۔ میں نے اپنے لفظ منہ ہی میں دبا رکھے۔ وہ واپس
چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی۔

میں نے مڑ کے دیکھا۔ ابا جان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔
مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ ابا جان بھی ڈبے میں بیٹھے ہیں اور
وہ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود بولنے کے بجائے
مجھے اُن کے پولیس افسر سے بات کرنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔
پولیس افسر کسی نہ کسی طرح واپس چلا گیا تھا اور گاڑی بھی روانہ
ہو گئی تھی لیکن جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا
کہ وہ ٹکٹ سے ضرور مطمئن ہو گیا ہے ہم سے نہیں۔ وہ اپنا اطمینان
کرنے پھر واپس آ سکتا تھا یا گاڑی کے ساتھ چلنے والی پولیس
کو حکم کر سکتا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھیں۔ مجھے اُس سے اتنی درشتی
سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مبادا وہ ناراض ہو جاتا پھر سب
خاک ہو جاتا۔ راستے بھر مجھے پچھتاوا ہوتا رہا۔ ہر چند میں نے کوئی
غلط بات نہیں کی تھی لیکن مارفی کے بقول افسر افسر ہی ہوتا
ہے۔ تمام راستے مجھے بے چینی رہی۔ جہاں گاڑی رکتی میں سب سے
پہلے باہر جھانک کے دیکھ لیتا کہ پولیس نے گاڑی کے گرد دوبارہ
تو گھیرا نہیں ڈال دیا ہے۔ مجھے خزانے کی فکر نہیں تھی۔ اُس کو
مجھے کیا کرنا تھا مگر جہاں تک ابا جان کا تعلق ہے، انھیں بہ حفاظت
وہاں تک پہنچا دینا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے کلکتے
کے نزدیک ہو رہی تھی۔ پھر کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا اگر جمیل
نے ابا جان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے تو میرے روانی سے انگریزی
بولنے پر انھیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

ابھی کلکتہ آنے میں درمیان کے دو ایک اسٹیشن باقی تھے
کہ جمیل نے پیرو، زورا، مارفی اور ابا جان کو ایک ڈبے میں کر دیا
اور خود دوسرے ڈبے میں چلا آیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔
ہم نے وہ سب صندوق بھی اُسی ڈبے میں منتقل کر لیے تھے جس
میں ابا جان تھے اور اپنے ساتھ صرف وہ سامان رکھا تھا جس
میں خزانہ نہیں تھا۔ یہ احتیاط سب کی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کسی
نے اعتراض نہیں کیا۔ جمیل چھ مہینے بعد کلکتے واپس جا رہا تھا۔ حالات
مختلف ہوتا تو بات اور تھی۔ ہمارے پیچھے کلکتے میں بہت کچھ بدلا
ہو سکتا تھا۔ پیرو، زورا اور مارفی کا تعلق بمبئی کے اڈے سے
تھا۔ انھیں کلکتے میں اڈے کے چند آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا
تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت ہمارا ایک دوسرے سے الگ
رہنا ہی بہتر تھا۔ اب کے اسٹیشن پر کوئی ہمیں لینے آنے
والا نہیں تھا لیکن وہاں مختلف اڈوں کے چند آدمی ہمیشہ موجود
رہتے تھے۔ اسٹیشن تقریباً ہر وقت مسافروں سے بھرا رہتا تھا۔ کسی
بھی اڈے کا آدمی ہمیں وہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی گونجتی ہوئی ہاوڑا کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو
میری رگوں میں خون بجنے لگا۔ ہم پہلے اترے، بعد میں پیرو اور ابا جان
وغیرہ۔ جمیل لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے گزر کے ایک دو منٹ کے
پیچھے جب ہم گیٹ سے باہر آ گئے تھے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھنا
ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا ہماری طرف
آیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بدرو تھا، جیم پوڑے کے اڈے کا
آدمی۔ آتے ہی اُس نے جمیل کے پیر چھو لیے اور لپٹتے ہوئے بولا۔
"استاد تم!"

"کیسا ہے رے بدرو؟" جمیل اُسے بدرو ہی کہتا تھا۔

"تم ... تم کدھر تھے استاد؟" وہ حواس باختگی سے بولا۔

"ذرا دور چلے گئے تھے۔"

"دور چلے گئے تھے؟" اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔ "پر اِدھر

اور اتا جان کر چلے ہی اپنے سے جدا کر دیا تھا کہ ہمیں اپنے بچے
گزرنے والے شب و روز کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس وقت ججل کی
احتیاط بے فضول لگی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ
گاڑی سے اترنے کی دیر ہے' بدو چنگاریاں لیے کھڑا ہے۔
مذاکرے کے ختم ہونے کے بعد دو ایک بار صرف گھورشی نے پوچھا کیا
تھا۔ ججل کوئی کتنی میں سے میرے ساتھ اڈے سے بے خبر کبھی جنوبی
بلوچستان کبھی وسطی ہندوستان گھومتا رہا تھا۔ جب میں نے سبھی
بیکرٹس تاہی کو ختم کرنے والے لوگوں کو پہچاننے کے لیے جھنگا
استاد سے پڑا لیا تھا تو اس دوران ججل بھی وہیں آ گیا تھا اور اس
کے ساتھ کاٹنے سماجو وغیرہ بھی تھے۔ اڈا چلتا رہا۔ ہم واپس آئے
تو کہیں سے کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ جنت کی طرف جاتے وقت
ججل شہر کے تمام اڈوں پر گھوم گیا تھا اور اسے یقین ہو گا کہ اس
کے پیچھے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرے گا۔ تبھی اس نے سفر کا
ارادہ کیا ہو گا اور تبھی اس نے کپتن خاں اور کاٹنے پر بھروسا کر
لیا تھا ورنہ وہ جامو کو نہیں چھوڑ دیتا۔ ایک سلطان بخت کرتا تھا
مگر ججل اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ سلطان کے ... جب ... تھی
کہ ججل کے خاص اڈے پر اس کی عدم موجودگی میں کوئی ...
کرے گا۔ جامو نے اس کی نہیں چلنے دی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس
کی نگاہیں ججل کے اڈے پر لگی ہوئی ہیں۔ گھورشی کو ججل کی منافقت مل
گئی تھی۔ پل بھر تو میں نے ہی اسے ججل کے پاس لا کے معافی دلوائی تھی۔ ججل
تیار نہیں تھا۔ میں نے سفارش کی تھی۔ اس لیے اسے درگزر کر دیا
تھا۔ گھورشی کے دماغ میں خناس سمایا ہوا تھا۔ باز نہیں آیا اور
بار پھر غداری کی اور جامو نے اسے ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا۔
اس کے بعد دور دور کوئی دوسرا گھورشی نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے
روانہ ہوتے وقت تمام اڈے ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔

ججل کپتن خاں اور کاٹنے کے بجائے اڈے پر اپنی مورت
رکھ جاتا تو بھی سب کچھ ویسے ہی رہنے کی امید تھی۔ ... ججل نے
اپنی مورت نہیں رکھی تھی۔ وہ کپتن خاں اور کاٹنے کو اپنی جگہ چھوڑ
گیا تھا۔ کاٹنے کا خون کچھ زیادہ گرم تھا لیکن کپتن خاں اسے سرد
رکھنے کے لیے موجود تھا۔ مشہور تھا کہ چاقو ہاتھ میں آتے ہی کپتن خاں
کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ کوئی دوسرا آدمی نظر آتا ہے۔ پھر اس کا
چاقو ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو لکھنؤ شہر کے سارے اڈے
اس کے چاقو کی نوک پر ہوتے مگر وہ اپنے ایک ہی اڈے میں
مست رہتا تھا اور وہاں بھی ٹک کے نہیں بیٹھتا تھا۔ کبھی ...
بھی نکلتے کبھی آگرے، کبھی دلی۔ جہاں جہاں سے اسے خبر ملتی کہ
کوئی اچھی گانے والی اور اچھے ناک نقشے والی آئی ہے کپتن خاں
سارے کام چھوڑ کے پہلے وہیں کا رخ کرتا۔ بیٹھتے ہی دو ایک ...

زنانوں کی خبر خبر لیتے بعض بار مزید جاتا تھا۔ کبھی وہ والی ... جاتا۔
ڈیروں کراچی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ شکل و صورت سے وہ کوئی ...
لگتا تھا۔ عمل کا کرتا' دوپلی ٹوپی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اسے
ہتھیار اٹھانا آتا ہے۔ اصل عمری رنگت سرخی مائل زرد و مل
ہیں کسرتی جسم کا مرجس وہ میانی تھی۔ جس کام کا ارادہ کر لیتا اس میں
جٹ جاتا۔ لکھنؤ میں لاڈو میاں کی بڑی دھوم تھی کہ اس کے پاس
بازار کا علاقہ تھا۔ ایک مدت تک یہ دستور رہا کہ لکھنؤ کے کسی
دوسرے اڈے کا کوئی آدمی بازار کا رخ کرتا تو پہلے لاڈو میاں کے اڈے
پر اپنی آمد کی خبر کرا دیتا یا وہاں متعین لاڈو میاں کے کسی آدمی کی نظروں
میں آنے داخل ہوتا۔ یہ ایک رسم بن گئی تھی جس کا لاڈو میاں کی وجہ
سے بھی پاس کرتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا ... لاڈو میاں نے کسی
بڑے سے بڑے مخالف کو بازار میں داخل ہونے سے منع کیا ہو۔ اطلاع
دینا شرط تھی اور اطلاع ہو جانے کے بعد کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی
جاتی تھی۔ اس میں نہ کوئی الجھاؤ تھا' نہ جواب کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔
اس لیے لوگ اطلاع دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں
ایک زمانے سے لاڈو میاں بازار کے اڈے پر جما ہوا تھا۔ یہ سب
سے زیادہ آمدنی کا علاقہ تھا اور شہر اطراف کے منتخب آدمی وہاں
موجود تھے۔ دن بھر یہ لوگ شہ زوری کرتے پھرتے۔ رات کو رنگین شوقین
بازار میں نکلتے۔ لکھنؤ کے اڈوں کی صورت دوسرے شہروں کے
اڈوں سے کچھ مختلف تھی۔ وہاں بڑے نواب اور راجا لوگ ہر ماہ
ایک مخصوص رقم بھجواتے تھے۔ باقاعدہ طور پر اڈے صرف کہیں
کہیں قائم تھے لیکن اپنے اپنے علاقے کے جو لوگ تھے جو ایک طرح سے
اڈوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

وہ کپتن خاں ہی تھا جس نے پہلی مرتبہ بازار میں اپنی آمد کی
رسمی اطلاع لاڈو میاں کے اڈے پر نہیں بھجوائی۔ پہلے تک بھی
کوئی بات نہیں تھی کہ کپتن خاں رات کو علاقے میں داخل ہوتے
وقت ناکوں پر بیٹھے ہوئے لاڈو میاں کے آدمیوں سے بھی یہ
کہتا تھا کہ وہ گانا سننے اندر جا رہا ہے۔ لاڈو میاں نے شہر کے
دوسرے اڈوں کے چند خاص آدمیوں کو اس رسم سے مستثنیٰ قرار
دے رکھا تھا مگر کپتن خاں کا شمار اس زمرے میں بھی نہیں تھا۔
کپتن خاں کے ساتھ اپنے اڈے کا صرف ایک آدمی تھا۔ جب وہ
وہاں پہنچا اور اس نے لاڈو میاں کے کسی آدمی سے رابطہ قائم نہیں
کیا تو انھیں فکر ہوئی اور ابھی کپتن خاں ایک بالاخانے پر چڑھنے
کے لیے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے اس کا راستہ روک لیا۔
کپتن خاں نے دو تین وار میں اسے اپنے سامنے سے ہٹا
دیا اور اوپر چلا گیا۔ اس نے دیر تک گانا سنا۔ ناچ دیکھا اور وہیں
کے کسی آدمی کے ذریعے اسے خبر ملی کہ پہلے لاڈو میاں اپنے

ساتھیوں سمیت موجود ہے۔ یہ سن کے گانے والی نے گانے سے
انکار کر دیا تھا۔ کپتن خاں نے اس کے اور اپنے درمیان چاقو رکھ
دیا۔ ... رہی اور وہ ناچتی گاتی رہی۔ آدھی رات کے
وقت جب کپتن خاں اٹھا تو نیچے سب سے پہلے لاڈو میاں
سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ لاڈو میاں نے اسے یاد دلایا کہ یہاں کا
کیا دستور ہے۔ کپتن خاں نے ہنس کے جواب دیا' معلوم ہے'
ہمارا بھی کوئی دستور ہے۔ لاڈو میاں نے فیصلہ کرنے میں تاخیر
نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا مگر کپتن
خاں نے کسی مستعدی سے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے
ہوں گے کہ اس نے لاڈو میاں کے آدمی کا ہاتھ زخمی کر دیا تھا۔
لاڈو میاں کے لیے یہ خلاف توقع تھا۔ پہلے تو وہ خیرہ کن نظروں
سے کپتن خاں کو دیکھتا رہا پھر کسی اور آدمی کو آزمانے کے بجائے
اس نے خود چاقو سنبھال لیا اور کپتن خاں کے مقابل آ گیا۔
کپتن خاں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ
لاڈو میاں کو زندگی میں بہت کم ہتھیار اٹھانے کی ضرورت پڑی
تھی۔ یا تو وہ ہتھیار اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اٹھا لیتا تھا تو چاقو پوری
طرح اس کے قابو میں ہوتا تھا۔ اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے ہی لاڈو
میاں ہتھیار بند کرتا تھا۔ کپتن خاں پر وار کرنے سے پہلے اس
نے اسے موقع دیا کہ وہ چلا جائے اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرے۔
کپتن خاں نے جواب میں اس پہ چاقو تول لیا۔ گلی میں اس وقت
سناٹا چھا گیا تھا۔ قریب قریب کے تمام بالاخانوں پر ناچ گانا بند
ہو گیا تھا اور راہ گیر ان کے گرد دائرہ کھینچے ہو گئے تھے۔ کپتن خاں کو دو
ایک ہی مرتبہ لاڈو میاں کے داؤ سے بچنا پڑا ہو گا کہ دیکھتے دیکھتے
وہ چلبلے اچھل کے تیزی سے چیتے کی طرح لاڈو میاں کے جسم پر گرا اور
اس کے چاقو والے بازو میں اپنے بازو سے پیچ ڈال دیا۔ کپتن
خاں نے ایک لمحہ نہ جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دو بار
اچھل کے اس زور کا جھٹکا دیا کہ چاقو تو لاڈو میاں کے ہاتھ سے
گر ہی گیا تھا' اس کے کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ بہت سے
لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ کپتن خاں نے منٹ سے زیادہ وقت
نہیں لیا تھا۔ لوگوں نے بس دو باتیں دیکھیں۔ کپتن خاں کا اچانک
لاڈو میاں سے بھڑنا اور اگلے چند لمحوں میں لاڈو میاں کا ہاتھ جھٹکنا۔
لاڈو میاں کے کسی اور آدمی نے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ چلتے
چلتے کپتن خاں اس سے کہتا گیا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے
وہ بازار کے اڈے پہ نظر نہ آئے۔

اور یہی ہوا۔ سویرے کپتن خاں ابھی سو کے نہیں اٹھا تھا کہ
لاڈو میاں کے آدمی اس کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ وہ اسے اپنے
اڈے پر لے جانے آئے تھے۔ کہتے تھے کہ لاڈو میاں رات کو
اڈے واپس نہیں آیا۔ وہیں سے کہیں اور چلا گیا۔ اب کپتن خاں
آ کے اڈا سنبھالے۔ کپتن خاں نے انکار کر دیا اور کہا وہ اپنے
آدمیوں میں سے کسی کو چن لیں اور ہمیں آئندہ لاڈو میاں کی ڈال پر
رقم کا ارادہ نہ کریں۔ کپتن خاں نے جان بوجھ کے منع کر دیا تھا۔
ایک تو وہ اپنا اڈا ہی نہیں دیکھ پاتا تھا۔ دوسرے اس طرح وہ لاڈو
کے ساتھیوں کو آپس میں جھگڑا کرا کے ان کی طاقت کمزور کر دینا
چاہتا تھا۔ اڈے کی گدی کے لیے ساتھیوں کا آپس میں لڑنا لازمی
تھا۔ لاڈو میاں کے جانے کے بعد کئی آدمی مارے گئے۔ ایک کے
بعد ایک کپتن خاں بیٹھا سنتا رہا۔ پھر بازار میں لاڈو میاں کا ایک
پرانا آدمی کسی طور جم گیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اپنا نام بدل کے
گلباز رکھ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک کان میں بالا پہنتا تھا۔ گلاب کا
پھول اس میں شنگار رہتا اور گردن میں رومال کا پھندا پڑا رہتا تھا۔
جب بھی کپتن خاں بازار جاتا' گلباز بالے سے پھول نکال کے فوراً
جیب میں رکھ لیتا اور گردن سے رومال اتار کے کپتن خاں کی کلائی
میں باندھ دیتا۔ لاڈو میاں کے بازار سے جانے کے بعد جتنے بھی
آدمی اس کی جگہ آئے' سب کپتن خاں کا اتنا ہی لحاظ کرتے تھے۔
کپتن نے کبھی کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا' کوئی حکم نہیں چلایا تھا'
معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ اڈے پر لاڈو میاں کے پرانے
ساتھی ہی قابض تھے مگر ہر طرف یہی سمجھا جاتا تھا کہ بازار کے اڈے
پر اصل راج کپتن خاں ہی کا ہے۔ بازار میں جب بھی کوئی نئی طوائف
آتی تھی' اسے لاڈو میاں کے ساتھیوں کے سامنے ناچ گانے کا
ایک مظاہرہ ضرور کرنا پڑتا تھا مگر اب اس تقریب کا اہتمام صرف
کپتن خاں کے لیے ہوتا تھا۔ کپتن خاں کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس
کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ جامو نے ایک بار مجھے کپتن خاں کا واقعہ سنایا۔ اس
وقت یہ واقعہ گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کپتن خاں کے بارے میں
اور بھی عجیب اور انوکھی باتیں مشہور تھیں۔ عجیب پاگل سا تھا۔ ایک
دفعہ ایک نواب نے اس کی کسی بات سے خوش ہو کے اسے دس
ہزار روپے دیے۔ کپتن خاں رقم لے کے اپنے اڈے واپس جا
رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ بھیڑ دیکھی۔ ہندوؤں کا مجمع تھا اور
پنڈت زیر تعمیر مندر کے چبوترے پر کھڑا مندر کی عمارت مکمل
ہونے کے لیے دان مانگ رہا تھا۔ کپتن خاں نے چپکے سے اپنے
آدمی کے ہاتھ نوٹوں کی گڈیاں آگے بھجوا دیں اور اس سے قبل کہ
پنڈت اس کا شکریہ ادا کرتا' کپتن خاں فوراً وہاں سے کھسک گیا۔
سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔ اس کی صرف ایک بہن اور ماں ہی زندہ
تھیں۔ بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ماں سیتاپور میں رہتی تھی۔ معلوم نہیں
انھیں خبر بھی ہوئی یا نہیں۔

ہی کچھ تھا جو جمّل نے کپتن خان کو کلکتے کا اپنا خاص اڈا سونپ دیا تھا۔ کپتن خان نے فرض شناسی، وفاداری اور خدمت نہیں برتی ہوگی، کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔ شعلہ لالہ تھا۔ اڈے پر جتنے لوگ تھے سبھی کی گرفت چاقو پر مضبوط تھی، کاٹتے پلک جھپکتے میں دوسرے کو بے بس کر دیتا تھا۔ اس سے چاقو گروا لینا یا چھین لینا آسان نہیں تھا۔ شہر میں سبھی جانتے تھے کہ جمّل کے آدمیوں سے چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ لمحوں میں نکل آتا ہے اور کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ نہ جانے ان سب کو کیا ہو گیا تھا۔

ابا جان کے ساتھ سامان اٹھائے ہوئے قلی بے چین ہو رہے تھے اور ابا جان بھی۔ مارتی بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ وہاں ان کے پاس صرف زورا رہ گیا تھا یا قلی۔ زریں کا پتہ بتا کے سامان کے ساتھ صرف ابا جان کو فیض آباد بھیج دینا بھی کسی حال میں درست نہیں تھا۔ پھر فیض آباد ہی کیوں۔ ابا جان اپنے ٹھکانے پر ہی کیوں نہ جائیں جہاں فرخ، فریال، فاطمہ اور اکبر کو چھوڑ کے آئے ہیں۔ ہم نے ان سے ان کا ٹھکانا نہیں پوچھا تھا مگر کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں انھیں واپس جانا ہوگا۔ ساری محنت تو اس سامان کے سبب سے تھی جس میں کچھ بھرے ہوئے تھے۔ ممکن ہے ابا جان خود بھی تنہا سفر کرنا پسند نہ کریں۔ نہ انھیں ایسا مشورہ دینا مناسب تھا لیکن سر دست کوئی جمّل سے الگ ہونے اور ان کے ساتھ جانے پر تیار نہیں تھا۔ تو پھر یہاں انھیں کہاں ٹھہرایا جائے یا اپنے ساتھ ہی رکھا جائے؛ دوسرے اڈوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بدو کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ آخر ہم کیوں پولیس کو مطلوب ہیں لیکن اب کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پولیس کی نظر ہمارے بعد فوراً انھی صندوقوں پر پڑے گی۔ اتنے بڑے شہر میں انھیں چھپانے اور ابا جان کو کسی محفوظ جگہ ٹھہرانے کا کوئی گوشہ، کوئی تہہ خانہ کم از کم میرے علم میں نہیں تھا۔ ہر جگہ مشکوک تھی۔ ایک کانسٹیبل کے نگاہ بھٹکنے اور صندوق کھلنے کی دیر ہوتی کہ سارے شہر کی پولیس حرکت میں آ جاتی۔ ان میں بہت سے پتھر ایسے تھے جن کی چمک سے آنکھیں پھٹ جائیں۔ صندوق کھلتے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ سکتی تھی۔ پھر نہ ہم کچھ پتہ چلنے دیتے نہ وہ کچھ کھوج پاتے۔ دونوں صورتوں میں سلامتی مقصود تھی، ابا جان کے لیے بھی، ہمارے لیے بھی۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں جمّل سے کہہ دیتا ہوں میں ہی چلا جاتا ہوں لیکن ارادے کے باوجود میری زبان نہیں کھلی۔ ابا جان کو حویلی میں پہنچا کے میں فوراً لوٹ سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ دن کا فرق پڑتا۔ دوسرے دن میں پھر کلکتے میں ہوتا مگر یہ رات کو مجھے پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا جاؤں کیونکہ ابا جان اور ان کے ساتھ دنیا کا قیمتی ترین سامان ہے؟ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے جمّل بھائی! ابھی ان کی بات ختم ہی تھی کہ پیرو نے ایک کے نرم لہجے میں جمّل کو مخاطب کیا۔ پیرو بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ہم میں سے کوئی فیض آباد نہیں جائے گا۔ سب یہیں رہیں گے۔ ابا جان بھی۔ اور جس طرح ہم دو اسٹیشن پہلے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے، فوراً پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ پیرو، زورا، مارتی اور ابا جان شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جمّل اور دوسرے لوگ ادھر ادھر کی سن گن لینے کے لیے روانہ ہو جائیں یا سیدھے اڈے کی طرف نکل جائیں۔ جمّل نے نہ ہاں کی نہ ناں۔ وقت نہیں تھا۔ پیرو نے کسی توقف کے بغیر محمد علی اسٹریٹ پر واقع اوسط درجے کے ایک ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ جمّل کی خاموشی ہی تائید تھی۔ پیرو نے اس سے باقاعدہ طور پر پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مارتی کو لے کے آگے بڑھ گیا اور مسافروں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ میں ان کے ساتھ نہیں گیا۔ جمّل نے مجھے پہلے ہی ان سے الگ کر دیا تھا۔ پیرو مجھے لے جانا بھی چاہتا تو میں نہ جاتا۔ ادھر میں سامنے کو بلانے کے لیے بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا، چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اسٹیشن سے باہر تھے۔

اچھا یہی تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے ابا جان جلد سے جلد شہر سے اور ہم سے دور ہو جائیں۔ ہوٹل بھی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی، کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا مگر ایسی صورت میں پیرو ہی کی تجویز بہتر تھی۔ کلکتے میں رہ کے وہ ہم سے قریب بھی رہے گا اور کسی وقت اس کی ضرورت پڑی تو وہ برابر موجود ہوگا۔ وہ ہم سے اور ہم اس سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ پیرو پہلی بار کلکتے آیا تھا۔ اڈوں کے کم ہی لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ دو سال میں کچھ مہینے کی مدت کا فاصلہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس کے نقوش ان کی آنکھوں میں محفوظ رہے ہوں۔ ابھی صرف بدو نے پیرو کو ہمارے ساتھ دیکھا تھا۔ کسی اور کی نظر نہیں پڑی تھی۔ شاید بدو نے توجہ نہ دی ہو۔ جس وقت اس نے ہمیں اسٹیشن پر دیکھا تھا، پیرو ہمارے ہمراہ نہیں تھا۔ پیرو کے ہمارے پاس آتے آتے سیٹھ اسے دور لے جا چکا تھا اور بدو کو اس وقت کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی لیکن اگر بدو نے پیرو کو دیکھ لیا ہے تو وہ ہم سے جدا ہو کے یہ خبر عام کر سکتا تھا۔ ہم اسے منع کرتے تو وہ خواہ مخواہ وہم میں پڑ جاتا۔ بدو کیا، اڈے کے اور آدمی بھی پیرو کو پہچان سکتے تھے۔ پیرو، مارتی اور زورا کے چہروں پر نقاب

نہیں پڑی تھی۔

ادھر جمّل کی کلکتے میں آمد کی خبر پھیلتی ادھر اتفاق سے کوئی پیرو کو پہچان لیتا یا بدو کے پیٹ کو سہارا نہ ہوتی تو رتنا نے پتے ملانے والے اپنی عادت سے باز نہ آتے۔ دونوں کی ایک ساتھ کلکتے میں آمد دونوں کو الگ الگ ہو جاتا۔ پیرو کا ہوٹل میں ٹھہرنا تاک جھانک کرنے والوں کو چونکانے کے لیے بہت تھا۔ پتہ نہیں کن کن اڈوں کے آدمی جمّل کے لیے اپنے سینے میں زہر چھپائے ہوئے ہوں گے۔ بوبجار کے اڈے کے لوگ ان میں پیش پیش تھے۔ رتنا نے انھیں اکسایا ہوگا تو انھوں نے ضرور اس کا ساتھ دیا ہوگا اور سب کو فکر ہوگی کہ جمّل کسی دن کلکتے واپس نہ آ جائے۔ سب سے زیادہ فکر رتنا کو ہوگی۔ انھوں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا ہوگا کہ جیسے ہی جمّل کلکتے آئے اسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی جائے۔ پہلے ہی ہلّے میں اسے اس کے ساتھیوں سمیت کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ دوسرے اڈوں کی مدد کے بغیر رتنا تنہا یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا یا ہو سکتا ہے اس نے سوچا ہو کہ ایک بار جمّل کے خاص اڈے پر قبضہ کر لیا جائے۔ بعد میں ادھر ادھر کے اڈے خود بخود ساتھ ہو جائیں گے۔ رتنا نے انھیں یقین کی حد تک فریب دیا ہوگا کہ جمّل کا واپس آنا ممکن نہیں ہے اور اگر وہ آ بھی جائے گا تو اڈا چھن جانے کے بعد وہ پہلے جیسا جمّل نہیں ہوگا۔ رتنا نے انھیں پھسلانے کے لیے بہت سے حربے اختیار کیے ہوں گے، طرح طرح کی باتیں بنائی ہوں گی۔

مگر خود رتنا نے اپنے آپ کو کس طرح مطمئن کیا ہوگا؟ اسے ہر لمحے جمّل کی واپسی کا دھڑکا ہوگا۔ کیا اس کے ذہن میں ایسا کوئی امکان نہیں تھا یا وہ اس کی واپسی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ جمّل کو بھول گیا تھا یا اسے جمّل کی عمر گزر جانے، بوڑھا ہو جانے کا گمان ہو چلا تھا۔ رتنا اتنے سال کلکتے سے باہر رہ کے اپنے اعتماد کا زور کرتا۔ اسے پروان چڑھاتا رہا ہوگا۔ اکیلا کلکتے نہیں آیا ہوگا۔ رتنا کو یقیناً جمّل کے اڈے کے کسی آدمی سے بھنک مل گئی تھی کہ جمّل کسی لمبے سفر پہ روانہ ہو گیا ہے اور کھٹکا یا ہے کہ اس کی واپسی مشکوک ہے۔ اسے کسی نے بتایا ہوگا جانے سے پہلے جمّل نے اپنے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا تھا کہ اسے بارہ ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو اپنے آگے پیچھے کی فکر نہ رکھتے ہوں اور جو اپنا سب کچھ چھوڑ کے اس کے ساتھ چل سکیں۔ اس نے ان میں سے بارہ آدمی چنے تھے۔ جو رہ گئے وہ سب جمّل کے چہیتے آدمی تھے مگر کسی نازک لمحے ان کے منہ سے بات نکل گئی ہو یا کپتن خان اور کاشتے ہی سے کوئی ناراض ہو گیا ہو۔ آدمی کا کیا بھروسا، کوئی پتھر مار دے تو بچ رہے اور ایک تنکا چبھ جائے تو چیخ پڑے۔ کچھ بھی ہو، رتنا نے خوب سوچ سمجھ کے ہی جمّل کے اڈے کی طرف قدم بڑھائے ہوں گے۔ ہتھیار سنبھالنے کا سلیقہ اسے کچھ زیادہ ہی آ گیا ہوگا مگر رتنا کے لیے یہ خبر کہ جمّل کلکتے آ پہنچا ہے کسی حادثے کا درجہ رکھتی ہو۔ پیرو کا الگ ٹھہرنا تشویش کا سبب بن سکتا تھا۔ پیرو اور اس کے ساتھی وہاں کیوں موجود ہیں، ان کے ساتھ وہ بزرگ شخص کون ہے اور ان صندوقوں میں کیسا سامان بھرا ہے۔ یہ لوگ اتنے دنوں تک کہاں تھے، کہاں سے آ رہے ہیں؟ جمّل اور پیرو کا ایک وقت کلکتے میں لوٹنا محض اتفاق نہیں ہوگا اور ضروری نہیں کہ انھیں یہیں آ کے اپنے اڈے کے متعلق خبر ملی ہو، وہ کوئی منصوبہ بنا کے لوٹے ہوں۔ ہر صورت رتنا کے آدمی جلد ہی پیچھے سائے کی طرح لگے ہی ہوں گے۔ قدم قدم پر پیرو کی نگرانی بھی کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے پیرو کا ہوٹل میں ٹھہرنا کچھ زیادہ سود مند نہیں آتا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پیرو سائے کا آدمی نہیں ہے لیکن جب رتنا کے آدمی بے سبب اس سے الجھے ہیں پیرو پر ہاتھ ڈالنا ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ شاید انھیں معلوم ہو کہ پیرو کون ہے۔ رہا پولیس کا تو پولیس کا بھی کوئی الزام کے بغیر پیرو کے گرد حصار ڈالنے کا امکان نہیں تھا۔ کلکتے کی پولیس میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے، نہ بمبئی سے کلکتے آنے جانے پر کوئی پابندی عائد ہے، نہ ہوٹل میں ٹھہرنا جرم ہے۔ ان تمام باتوں کے سوا پیرو خود بھی تو ہر ممکن احتیاط کرے گا۔ اپنے لیے نہیں تو ابا جان کے لیے۔ اسے اندازہ ہوگا کہ ایک ذرا سی چوک کتنے بڑے حادثوں سے دوچار کر سکتی ہے۔

دھوپ چڑھ رہی تھی اور اسٹیشن کے باہر حسب معمول انسانوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ وہی عمارتیں، وہی سواریاں، وہی لوگ وہی چیخ پکار۔ ہر طرف اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہم کسی سواری میں نہیں بیٹھے۔ جمّل سر جھکائے چل رہا تھا۔ اس وقت سب کے ذہن میں یہی تھا کہ ہم سیدھے اڈے کی طرف جائیں گے۔ باہر آ کے احساس ہوا کہ مزید کچھ جانے بوجھے بغیر اڈے کا رخ کرنا قرین عقل نہیں ہے۔ ابھی ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ بدو نے صرف چند باتیں بتائی تھیں جنھیں سن کے حواس ہی برقرار نہیں رہے۔ وہی باتیں اتنی اچانک تھیں کہ کچھ اور جاننے کی سکت نہیں تھی۔ سارے بدو کو الگ لے گئے تھے مگر باہر آ کے اس نے اپنے ہونٹ بند کر لیے۔ کسی نے اس

سے کچھ پوچھا۔ پہلے ہمیں سکون کی کسی جگہ بیٹھ کے اپنے اوسان درست کرنے چاہئیں تھے۔ بدھو ہمارے ساتھ ہی تھا۔ پلیٹو نے اُسے ایک چادر دے دی تھی جس سے اُس نے اپنا گریبان چھپا رکھا تھا۔ اسٹیشن سے ہم نے سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اپنے ہی اڈّے کا ایک آدمی نظر آگیا۔ ہلاکو نے جینی کو، جینی نے جامو کو لو کو اور جامو نے اُسے آواز دی، وہ ہریلا تھا۔ دُبلا پتلا لمبا، ادھیڑ عمر۔ ہریلے نے مڑ کے دیکھا اور اُچھل پڑا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا جو بدھو کا ہوا تھا۔ جیسے ہم بھوت ہوں اور مرنے کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے ہوں۔ ہریلا پہلے تو پنپنایا، مارا، پھر جھل کے پیروں پر جھک گیا۔ جھل نے اُس کی گدی پکڑ کے کھڑا کیا تو ہریلے کا جسم اُس کی انگلیوں میں جھول گیا جیسے اُس کی جان نکل گئی ہو۔ "سیدھی طرح کھڑا رہ۔" جھل نے جھنجھلاتی آواز میں کہا۔

ہریلے سے بولا نہیں جا سکا۔

سامنے ایک ہوٹل تھا۔ جامو نے ہریلے کو اُسی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور اندر بیٹھنے کے بجائے ہم باہر پڑی ہوئی تپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک ایک پل کا ٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ سب کا دل یہی چاہتا ہوگا کہ اڑ کے اڈّے پہنچ جائیں اور رتنا سے پہلے کسی او کو زندہ دیکھیں۔ ہریلے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "مجبور تھے استاد، بہت مجبور تھے۔"

"آگے بول سُور کی اولاد!" جامو نے گرج کے کہا۔

"ماں قسم اپنے کا کوئی دوش نہیں ہے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "ہم آوارہ ہو گئے۔ ایک دم تنکے بن گئے جامو استاد!"

"تُو ابھی زندہ کیسے ہے حرام زادے؟" ہلاکو نے غصّے سے کہا۔

"سب جگاڑ میں لگے ہوئے تھے پر پر....."

فضول کی باتیں کرنے سے کیا حاصل تھا۔ جھل نے ہاتھ اٹھا کے ہلاکو کو روک دیا اور پھر جو کچھ ہریلے نے بتایا، اُسے سن کے سب کے چہروں سے خون نچوڑنے لگا۔ ہریلے کے کہنے کے مطابق یہ کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ وہ چھ بجے شام کو اڈّے پہنچا گیا تھا۔ کتبن خاں اڈّے کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ صحن میں رکھی ہوئی چوکی پر بیٹھا تھا۔ ذرا اُس کی انکھیاں چڑھا رہا تھا اور کتبن خاں بہت خوش نظر آتا تھا۔ ہریلا اُسے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کتبن خاں نے اُس کی خیریت پوچھی۔ ہریلا بتا رہا تھا۔ اُس نے پوچھا "استاد کب آ رہے ہیں؟" کتبن خاں نے مسکرا کے جواب دیا "جلد ہی آ جائیں گے، بس آتے ہوں گے۔ جلدی آ جائیں گے۔" جھل کے بارے میں پوچھنے والوں کو وہ یہی

جواب دیا کرتا تھا۔ کالے خاں وہاں موجود نہیں تھا۔ کتبن خاں نے بتایا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کلکتے سے باہر ہے۔ ہر بات معمول کی تھی۔ کتبن خاں سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے کم از کم ایک بار رات کو مغل محفل جمتی تھی۔ روز صبح اٹھ کے وہ علاقے کا چکر لگاتا۔ دوسرے تیسرے روز دوسرے اڈّوں کے علاقوں کا کا ٹنے کا بھی یہی معمول تھا۔ دو مہینے میں بیالہ کے اڈّے کے لوگوں نے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑا سا شور شرابا ہوا۔ کالے اور کتبن خاں نے جا کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اپنے اڈّے کے لوگوں کو کتبن خاں سے ایک ہی شکایت تھی کہ وہ حد سے زیادہ درگزر سے کام لیتا ہے۔ دوسرے اڈّوں کے آدمی کا جتنا سمجھتے ہیں اُتنا ہی دل کرنے لگے تھے اور ادھر اُدھر کے علاقے کے لوگ بھی دھندے کی چوری کرنے لگے تھے۔ کتبن خاں بہت دیر میں سختی کرتا تھا۔ کالے ہی گھوڑا وصول کر کے لاتا تھا۔

ہریلا تھوڑی دیر بیٹھ کے چلا آیا۔ رات کو وہ اڈّے پر نہیں تھا۔ اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ سارے کے سارے لوگ اڈّے پر نہیں رہتے تھے۔ ہریلا اڈّے سے مستقل وابستہ نہیں تھا۔ صبح علاقے میں شور مچا تو وہ بھاگا ہوا اڈّے پہنچا۔ عمارت پر پولیس چھائی ہوئی تھی اور بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ارد گرد کی گلیوں کی ساری دکانیں بند تھیں۔ اُسے قریب نہیں جانے دیا گیا۔ اُس وقت اُس کا وہاں سے فرار ہو جانا ہی ٹھیک تھا لیکن اُسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کتبن خاں، شرولی لالہ، فدا، جیسوا، نصیر وغیرہ اڈّے کے بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔ ۱۴ آدمی۔ وہ بعد کو اُن کی لاشیں علاقے کے لوگوں کے حوالے کر دی گئیں۔ سب خون میں لت پت تھے۔ ادھر پولیس نے اڈّے کے آدمیوں کو چن چن کے گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا لہٰذا مرنے والوں کی تجہیز و تکفین یا کریا کرم کا کام مشکل ہو گیا تھا۔ علاقے کے باسی انھیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے۔ شام تک لاشیں پڑی رہیں۔ بہرحال رات کو کچھ لوگوں نے مل کے انھیں قبروں میں چھپا دیا یا جلا دیا۔ ہریلا آئندہ چھ سات روز تک کہیں چھپا رہا کیونکہ پولیس کا خیال تھا کہ یہ سب اپنے اڈّے کے آدمیوں ہی کا کیا دھرا ہے اور آپس کے جھگڑے کا نتیجہ ہے۔ وہ کالے کی تلاش میں تھے جو کلکتے میں موجود نہیں تھا جیسے ہی وہ واپس آیا، اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے ہی روز واپس آ گیا تھا۔ نصیب میاں اڈّے پر کہیں چھپے ہوئے تھے، انھیں بھی پولیس پکڑ کے لے گئی۔ پندرہ بیس روز تک اڈّا سنسان پڑا رہا۔ پولیس

نے اُسے چند دن بعد ہی اُٹھا لیا تھا اور علاقوں سے بھی متعدد آدمی پکڑے گئے۔ رفتہ رفتہ وہ چھوٹتے گئے لیکن کالے اور کئی لوگوں کو انھوں نے اب تک نہیں چھوڑا ہے۔

بشیر الزام کالے پر آ رہا ہے اور یوں طرح طرح کی باتیں گرم ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کتبن خاں اور کالے نے مل کے جھل اور اُس کے ساتھیوں کو سفر میں کسی جگہ ختم کروا دیا جھل اڈّے کی خبر سن کے فوراً واپس آتا یا کسی کو بھیجتا، پھر کالے نے کتبن خاں کو راستے سے ہٹا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کلکتے سے اپنی عدم موجودگی کا عذر پیش کر کے بے گناہی ثابت کر سکے گا اور شاید کر بھی سکے۔ کچھ لوگ جھل ہی کو اصل سبب سمجھتے ہیں کہتے ہیں یہ سب اُسی کی کوئی ترکیب ہے۔ اُس کے اشارے پر ہوا ہے۔ وہ باہر چلا گیا تا کہ اُس پر کوئی حرف نہ آئے اور اس طرح اپنے چند پرانے لوگوں کو اُس نے راستے سے ہٹا دیا۔ یہ لوگ سر چڑھ گئے تھے اور آگے جا کے مشکلیں پیدا کر سکتے تھے۔ کچھ کہتے ہیں کہ جھل کتبن خاں سے خوف زدہ تھا یا اُن کے درمیان ایک عورت کا جھگڑا تھا۔ جھل کتبن خاں کی بہن کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ کچھ کہتے تھے کہ اڈّے کے دوسرے آدمی جھل کے فیصلے سے ناخوش تھے کہ اُس نے کلکتے کے ایک اجنبی آدمی کو اڈّے پر استاد بنا کے بٹھا دیا ہے جب کہ یہ حق پرانے آدمیوں کا تھا۔ اُس نے جھل پر اعتبار نہیں کیا اور کالے نے نہیں اُنھی ناخوش لوگوں نے کتبن خاں کو ہٹا کے گویا جھل سے بدلہ لیا ہے۔ ہریلا کہہ رہا تھا کہ ہم نے یہ بیچ میں دخل نہیں دیا۔ پھر وہ کہتا ہے یہ باتیں ہیں، لیکن تُو جانتا ہے وقت ضائع کر رہا تھا۔ ہریلا پھر خود ہی کہنے لگا۔ یوں لوگ عجب عجب باتیں کرتے ہیں مگر کسی کو اُن پر یقین ہے اور وہ یقین کرنا بھی نہیں چاہتے۔ سب جانتے ہیں کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر وہ جھلے عام اُس کا نام نہیں لے سکتے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ رتنا واقعے کے پندرہ روز بعد تک کہیں دکھائی دیا تھا۔ آنے کے بعد وہ مختلف اڈّوں کے چکر لگاتا رہا۔ پھر کوئی بیس اکیس دن پہلے وہ اپنے اڈّے پر آیا۔ اُس نے سیٹھ مول جی سے اڈّے کی عمارت کرائے پر لینے کا مطالبہ کیا۔ معلوم ہوا کہ سیٹھ نے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے کہا کہ اُسے استاد جھل کے آنے کا انتظار ہے، جب تک جھل نہیں آ جائے گا وہ عمارت کسی کو نہیں دے گا لیکن رتنا کے پاس ایک نہیں سنی اور عمارت لیے بغیر نہیں ٹلا۔ ہریلے کو معلوم تھا کہ عمارت جھل کی ملکیت ہے۔ جھل نے احتیاط کے طور پر اُسے مول جی کے نام کر دیا تھا اور خود کو اُس کا کرائے دار ظاہر کرتا تھا۔ مول جی جھل سے کوئی اُلجھن نہیں کر سکتا تھا۔

اڈّے پر بیٹھ کے رتنا تین چار دن تو چپ چاپ رہا۔ پھر اُس نے لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ دوسرے اڈّوں کے آدمیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی خصوصاً موجھا لے کے اڈّے کے آدمیوں کی۔ پھر رتنا علاقے میں خریدو فروخت کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کے ان گنت آدمی تھے جن میں سے جھل کے پرانے ساتھیوں کو پیش کش کی کہ وہ حسب سابق دھندا کرتے رہیں اور اڈّے سے اپنی وابستگی جاری رکھیں۔ جس نے انکار کیا، اُس کا اپنے ہی علاقے میں دھندا کرنا مشکل کر دیا گیا۔ کچھ لوگ انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی پلٹ کے آ جائے۔ استاد جھل یا جامو، سارے ہلاکو، جینی، پلیٹو وغیرہ میں سے کوئی بھی جھٹکن سے لا ملا ہی آ جائے۔ پر اُن کی کہیں سے کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ رتنا سے وابستگی کے بغیر دھندا کرنا ممکن نہیں تھا۔ جھل کے پرانے آدمیوں کے پیچھے ایک ایک پہ چار چار جاسوسی کی طرح لگے رہتے تھے اور اپنے آدمی باہر کے رہ گئے تھے۔ وہ یا تو جیل میں تھے یا مارے گئے تھے یا کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ جو بچے ہوئے رہ گئے تھے اُن کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ پھر بھی یہ لوگ ہریلے کے بقول استاد فیضو اور استاد تیلی کے پاس گئے اور کہا کہ وہ جھل کے دوست ہیں اور خاموش بیٹھے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی قسم کا جواب دیا کہ ابھی خاموش رہنا چاہیے، پولیس کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لوگ اور بھی کئی جگہ گئے تقریباً ہر جگہ سے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لوگوں کو کالے اور اپنے اڈّے کے دوسرے آدمیوں کے چھوٹنے کا انتظار تھا۔ یقین تھا کہ کالے ہی آ کے کچھ کرے گا۔ اُسے پولیس نے نہیں چھوڑا۔ ہریلا کہہ رہا تھا کہ پولیس نے پہلے متعدد آدمیوں کو بلا لیا تھا اور تھانے پر اُن کی صبح و شام حاضری لازمی قرار دی تھی۔ پولیس کے اس رویے سے تنگ آ کے کچھ لوگ واقعے سے سیدھے ہاتھ ڈال کے جیل میں چلے گئے۔

ہریلا رتنا کے اڈّے سے اپنے تعلق کی بزاری ظاہر کر رہا تھا اور بار بار غصّے کے مارے چہرے بگڑتا تھا۔ وہ ترک جا تو جینی، پلیٹو اور ہلاکو جو اُس کے پاس ہی بیٹھے تھے، اُسے زور سے کہنیاں مارنے لگے: "بھونکتا رہ۔" وہ چیخ کے کہتے اور ہریلا بوکھلا کے پھر بولنے لگتا۔ وہ بتا رہا تھا، رتنا نے اڈّا سنبھالتے ہی شہر کے تمام اڈّوں پر کہلا بھیجا تھا کہ اب انھیں بھتا بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھتا وہ اپنے پاس رکھیں۔ پھر اُس نے کچھ دن پہلے رنڈی نچوائی۔ اُس میں شہر کے کئی استاد شریک ہوئے بجز استاد فیضو اور استاد تیلی نہیں آئے تھے لیکن اُن کے اڈّے سے کچھ لوگ ضرور شامل ہوئے تھے۔ رات بھر رنڈی ناچتی رہی اور شراب

"آپ کی خوشی اس میں ہے تو تسلیم تعمیل۔"

"تم ایک پولیس اسٹیشن پر بیٹھے ہو استاد قبول! اور ایک ذمے دار آدمی سے مخاطب ہو۔" ماتھر نے بیزاری سے کہا۔

"منھ کو یہاں مت بگاڑو اور ڈالی دو ہم سب کے ہاتھوں میں۔"

"میرا خیال ہے تم سے مزید گفتگو کرنا بے کار ہے۔"

"پر ایک بات رہ گئی ہے آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔" قبول نے سر جھکا کے کہا اور اپنی ٹانگ اٹھا کے ایک جھٹکا دیا۔ مسلسل کھڑے رہنے سے اس کی تکلیف اور بڑھ گئی ہوگی۔

"تم...... تم بیٹھ جاؤ استاد۔" بلاکو نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ قبول نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹ اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ بلاکو پہلا ہی دھچکا سہے ہوئے تھا۔ اس کی جھونک میں ہی وہ کرسی پر گرتے گرتے بچا۔

"معاملہ میں ہیں قبول۔" سورتی نے ناراضی سے کہا۔

ماتھر نے انسپکٹر سورتی کی مداخلت پر منہ بنایا اور میز پر جھک کے اُسے چپ رہنے کی تلقین کی۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟" دوسرے ہی لمحے اس نے قبول سے پوچھا۔

"بولتا تھا، ایک بات رہ گئی ہے آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔"

"ہاں ہاں کہو۔" ماتھر نے تجسس سے کہا۔

"اپنے آدمی، اپنے کو واپس کر دو۔"

ماتھر اپنی کرسی پر سیدھا نہیں رہ سکا۔ "کیا...... کیا؟"

"ہم آپ سے اپنے آدمی واپس مانگتے ہیں۔" قبول نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تمھارے آدمی تمھیں واپس کر دیں۔" ماتھر نے اضطراب سے دُہرایا۔ "یہی کہہ رہے ہو تم؟"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔"

"تم...... تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"کیوں صاب! ہم اُن کو آپ سے نہیں مانگ سکتے؟"

"تم کیا، کیا بک رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بک رہے ہیں ماتھر جی! اِدھر اُدھر کی بات چھوڑو۔ ساری دنیا کی چوکی داری کرتے پھرتے ہو، اپنے آدمیوں کی رکھوالی نہیں کی گئی۔ ہم کس کے پاس جائیں اور اُن کو آپ سے پھر کون واپس مانگنے آئے گا۔ مدعی بننے کا حق صرف تمھی کو ہے؟ ہم کو نہیں ہے؟"

ماتھر کچھ دیر تک ساکت نظروں سے قبول کی صورت دیکھتا رہا۔ اس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا پھر جیسے اچانک اُسے کچھ خیال آ گیا ہو اُس کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ کھیل اٹھی۔

"خوب خوب استاد قبول! اچھا منتر الاپا ہے تم نے۔"

"کیوں سرکار! ہم نے زبان کھولی تو منتر ہو گیا؟"

ماتھر کے چہرے پر درشتی کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "تمھارے دماغ میں اگر خناس ہے کہ کہیں دھیان بٹا کے اور معاملے کو اُلجھا کے تم کچھ حاصل کر سکو گے تو اسے نکال دو۔ اس طرح تمھیں شاید کچھ وقت مزید مل جائے مگر دور جا کے نتیجہ وہی نکلے گا جو ان حالات میں نکلنا چاہیے۔ اچھی طرح کانوں میں ڈال لو پولیس اس طرح تمھیں کوئی بخشش دینے کو تیار نہیں ہے۔"

"میری بات کا جواب دو ماتھر جی! اپنے آدمی کدھر ہیں؟"

"میری جیب میں تو نہیں۔" ماتھر چڑ کے بولا۔

"ہم بولتے ہیں اُن کو ہمیں واپس کر دو۔"

"ورنہ، ورنہ تم کیا کرو گے؟" ماتھر کی جھلّاتی آواز گونجی۔

"جو بن پڑے گا کریں گے۔"

"قبول! قبول فضول کی باتیں نہ کرو۔" ماتھر جھنجلا کے بولا۔

"ماتھر جی! باتیں فضول لگتی ہیں صاب! ہمارے آدمی چلے گئے ایک نہیں کئی۔ ہم سے بولتے ہو گھس بیٹھ مت بجاؤ شرارت کرو۔ ہم اپنے آدمی اِدھر چھوڑ گئے تھے۔ ایک سے ایک ہیرا تھا اُن میں۔ آپ اُن کو نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں وہ کون تھے، اُن کا ہاتھ کتنا جمیل تھا۔ اُن کے پنجوں میں لوہا بھرا ہوا تھا۔ رگوں میں بجلی دوڑتی تھی۔ اُن کے دل کی چادر بہت بڑی تھی۔ سب کو اُس میں سما جاتا تھا۔ اُن کا دل بھلا تھا۔ یہ تینوں میں صرف آپ کے رد اقسے کے آدمی تھے۔ پر اپنے وہ بھائی تھے بیٹے تھے۔ ہمارے ہاتھ پیر تھے۔ ہم سے فضول کرتے ہو کہ تم نے اپنی ہی ٹولیاں بنا لیں اپنی ہی بوٹیاں نوچ لیں۔ آپ بولتے ہو کہ جانے کب سے پچھلے کاغذ الماریوں میں بند ہیں۔ اُن میں کہیں لکھا ہے کہ جس نے پیچھے سے کبھی چھرا گھونپا ہے، اُلٹی طرف سے ناک پکڑی ہے۔ اُن کو آگے سے ہٹانا ہوتا تو اُن کا سر بھی آپ کو نہیں ملتا۔ جو پانی پینے چلے گھٹنے سے جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کپتی خاں اپنے ہی آدمیوں کے بیچ بیٹھا تھا ماتھر جی! کپتی خاں نے اپنا کون سا خزانہ چھپا لیا تھا یا اپنی جاگیر کو قبضہ کر لیا تھا؟ اُس نے اپنی ماں کے ساتھ جرم کیا تھا تو دوسروں نے کیا کیا تھا؟ ہم اُسے اُدھر بٹھا کے گئے تھے۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی بٹھایا ہوگا۔ اُدھر آپ کے سر کی جگہ اُدھر پیر آ گئے ہیں تو ہم ہی آپ کو سامنے نظر آتے ہیں۔"

قبول کی آواز تھرائی ہوئی تھی۔ بند، سپاٹ، کمرے میں ایک اُسی کی آواز گونج رہی تھی اور جیسے ہر چیز بے آواز ہو گئی

تھی۔ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی ٹکٹکی باندھے اُسی کو تک رہے تھے۔ بتوں کے مانند بے حرکت۔ انسپکٹر سورتی اور ماتھر کے چہروں پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ قبول نے ایک لمحے ٹھہر کر اپنا سوجا ہوا پیر اٹھا کے دوبارہ زمین پر ٹکایا اور کہنے لگا۔ "کوئی نہیں ملا۔ بولتے ہو شہر ساگر کا کونا کونا چھان مارا۔ کوئی نہیں ملا! یا کسی کو دیکھنا نہیں چاہا! اُن سوروں کی اولادوں نے آنکھوں پر چربی چڑھا لی۔ سامنے موٹا ہی موٹا دکھائی دیا۔ اُنھی لوگوں پر کانٹا پھینک دیا جو سالے پہلے ہی تڑپ رہے تھے۔ کدھر دیکھا! کدھر کو دیکھا؟ اپنا ریکارڈ ہے تو اپنے پاس بھی وردی والوں کا ریکارڈ ہے۔"

قبول چپ ہو گیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بولوں، ڈی ایس پی ماتھر سے ایک سوال کروں لیکن قبول کی طرف دیکھ کے میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔ ماتھر کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ قبول کے چپ ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے ان تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہوگا۔ ہم نے کوئی......" وہ جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا اور اُس کی بات منہ ہی میں رہ گئی کہ کمرے کے باہر سے سیٹیاں بجنے اور گاڑیاں رُکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ انسپکٹر سورتی یک لخت کھڑا ہو گیا۔ پھر ماتھر بھی دونوں چپراسیوں کو اشارہ کرتے ہوئے فوراً ہی باہر چلے گئے تھے۔ سائبان میں گونجتی ہوئی سیلوٹ کرنے اور بوٹوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں ہم سے قریب ہو رہی تھیں پھر وہ دور ہوتی گئیں۔ ماتھر اور سورتی دیر تک نہیں آئے۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کو بس دیکھا کیے۔ کسی نے ایک لفظ دوسرے سے نہیں کہا، نہ قبول نے۔ سب وہیں کھڑے ماتھر کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ ماتھر نہیں آیا۔ آٹھ دس منٹ بعد انسپکٹر سورتی تیز رفتاری سے اندر داخل ہوا اور تند و تیز لہجے میں بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

قبول کی آنکھوں سے سُرخی اُبلنے لگی لیکن وہ کچھ کہے بغیر سورتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سائبان میں دبا دبا سرا سرا شور اُٹھا ہوا تھا اور سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب کے سب فاصلے فاصلے پر منتظر کھڑے تھے۔ بیچ کے دو تین کمرے چھوڑ کے سورتی ایک کشادہ گیلری نما راستے میں مڑ گیا اور کچھ آگے جا کے ایک بڑے کمرے میں آ گیا جو ایک ہال سے مشابہ تھا۔ کمرے کی چھت اونچی اور گنبد کی شکل کی تھی۔ وہاں کئی پولیس افسران بیٹھے تھے جن کی وردیوں اور بیجوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اعلا افسران ہیں۔ ڈی ایس پی ماتھر بھی اُن میں موجود تھا۔ وسط میں ایک چوڑی میز کے تین طرف کی کرسیوں پر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرف کی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہم اندر

پہنچے، ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ "استاد قبول! بیٹھ جاؤ۔" سورتی نے بلند آواز سے کہا۔ قبول نے اس بار کوئی تعرض نہ کیا۔ بدھو، بلا اور چنگا بھی ہمارے ساتھ آ گئے تھے۔ انسپکٹر سورتی نے اُن تینوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا لیکن قبول نے انھیں روک لیا۔ ماتھر، سورتی کو ایک جانب بیٹھنے کو کہہ کے ہم سے مخاطب ہوا اور بتانے لگا کہ ہمارے سامنے کون کون افسران موجود ہیں۔ اُس کے کہنے کے مطابق اُن میں دو ایس پی، دو ڈی ایس پی، تین انسپکٹر اور ایک سب انسپکٹر تھے۔ انسپکٹر داؤدیال کا تعلق خاص ہمارے علاقے سے تھا اور وہی کپتی خاں کے معاملے میں تفتیش پر مامور کیا گیا تھا۔ سب کی مضطرب نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ ایس پی رائے کے سوا اُن میں سے میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ رائے اُس زمانے میں سب انسپکٹر تھا جب تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں مجھے جیل بار تھانے لایا گیا تھا۔ اب اُس کا ڈیل ڈول خاصا بڑھ گیا تھا، چہرہ بھی بھاری ہو گیا تھا۔ رائے نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔

"میں نے ضروری سمجھا کہ یہ لوگ بھی موجود ہوں۔" ماتھر [illegible] سے بولا۔ "جو کچھ تم کہنا چاہو ان کے سامنے کھل کے کہہ سکتے ہو۔"

"اپنے کو ایک بات بار بار بولنا نہیں آتا۔" قبول نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "جو ہم نے بولا ہے ایک دم کھل کے بولا ہے۔ آپ ہی ان کو بتا دو۔"

"میں نے انھیں بتایا ہے۔" سورتی کی جھجکتی ہوئی آواز ابھری۔ "لیکن اچھا ہے تم براہِ راست انھی لوگوں سے بات کرو جن کا تعلق اس معاملے سے ہے۔"

"آپ آگے بولو۔ اپنے کو کچھ اور نہیں بولنا۔"

سب کے بیچ بیٹھے ہوئے افسر ایس پی جوشی نے ایس پی رائے سے کچھ کہا۔ رائے نے اپنے قریب موجود ماتھر کو متوجہ کیا۔ چند منٹ تک وہ آپس میں کانا پھوسیوں کے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ جوشی کی بات پر ماتھر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "استاد قبول! کیا دوبارہ تمھیں یہ جتانے کی ضرورت ہے کہ تمھارے سامنے اس وقت پولیس کے اعلا عہدے دار موجود ہیں۔ سات دن ڈیڑھ مہینے سے یہ اسی کیس کی تفتیش میں مصروف ہیں۔"

"مولا بھلا کرے سرکار۔"

"تم جانتے ہو گے کہ یہ پولیس کے منتخب لوگ ہیں۔"

"یہ بھی اپنے کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"تمیز سے بات کرو قبول!" انسپکٹر داؤدیال نے جتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ اڈا نہیں ہے۔"

"پھر اڈے کے لوگ اِدھر [illegible] داؤجی!" قبول نے

نمی سے کہا: "تم کیا اپنے رشتے داروں سے بات کرتے ہو؟"
"یہ انتہا ہے مسٹر داؤدیال!" اشتعال سے بولا: "ہی از سیلنگ ٹو ... لے یا باس......" اس نے اپنی آواز بھینچ لی۔
"اپنے کو زیادہ یاد ہیں داؤ جی؟" تجمل نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ انسپکٹر داؤدیال انگریزی میں گالی بک دینا یا کہنا چاہتا ہے۔ اچھا ہی ہوا جو داؤدیال نے اپنی آواز کی لگام تھام لی ورنہ اس کا جواب میں اسے ضرور دیتا۔
"... نو، نو" ایس پی جوشی نے ہاتھ کے اشارے سے داؤدیال کو تنبیہ کی اور انگریزی میں بولا: "تم تم کن لوگوں سے مخاطب ہو! ایک ذرا تحمل کرو۔" پھر اس نے ماتھر سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ ماتھر نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسی کو بولتے رہنے دیا جائے۔
"استاد تجمل!" ماتھر کے لہجے میں ملائمت تھی۔ "میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ یقیناً یہ بات ہمارے لیے بھی تعجب کی تھی اور ہے کہ تجمل نے اس شخص کو کیوں ختم کر دیا جو چار مہینے سے اس کے اڈے پر بیٹھا ہوا تھا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا، وہ تمھاری مرضی سے بیٹھا تھا۔ بے شک مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تمھارے ریکارڈ میں پشت سے چھرا گھونپنے والی کوئی روداد تھی جو سب تم سے واقف تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تجمل اپنے ہی گھر کو کیوں آگ لگانے لگا، اپنا ہی گلا کیوں گھونٹنے لگا؟" مجھے ماتھر کی باتوں پر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: "تمھیں کیپٹن خاں سے قبول تھا ایسی ہی کوئی کد جو تھی تو تم نے یہ طریقہ ہی آخر کیوں اختیار کیا؟ تم سامنے آ کے بھی بات کر سکتے تھے۔ کیپٹن خاں کے متعلق بھی ہم نے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ وہ کلکتے کا ایک بڑا استاد تھا اور بظاہر اس کا تم سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ وہ تمھاری عزت کرتا تھا اور پوچھے پر لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ استاد ہیں آ ہی رہے ہوں گے۔ پھر کون سی ایسی نازک بات تھی جو تمھارے اور کیپٹن خاں کے بیچ تنازع کی بنیاد بن گئی۔ ہمیں بالکل یقین نہیں آتا تھا اور ہمیں......"
ماتھر جوشی کی طرف دیکھ کے تذبذب سے بولا: "ہمیں اب بھی یقین نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پکڑ لیں۔ اسی دن ڈیڑھ سو کے لگ بھگ آدمی تھانوں میں لائے گئے۔ دوسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ابھی تک کسی نہ کسی حد تک ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ پولیس نے بے تکی پکڑ دھکڑ سے کام لیا ہے تو یہ تمھاری نری بدگمانی ہے۔ ہم نے تقریباً سارے ہی اڈوں سے آدمی پکڑے تھے۔ اس واقعے کے متعلق وہ خود بھی حیرت کا اظہار کرتے تھے اور ان کی رایوں میں بہت فرق تھا۔ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اڈوں کے استادوں کو بھی تھانے میں بلایا گیا۔"
"تمھیں یہ سن کے شاید دکھ ہوگا، استاد جی کہ انھوں نے تمھارے نام پر کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی، ان کا رویہ سرد تھا۔ ہاں گنتی کے چند استادوں نے ضرور تمھارے لیے باتیں کیں مگر ان میں اکثریت ایسے استادوں کی تھی جو تم سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تمھاری طرف اشارہ کرتے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ ان کا یہ رویہ بے وجہ نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے بہت سے غصے ہوں گے، برسوں پرانے غصے، برسوں پرانی جلن۔ تجمل! وہ شہر کے تمام اڈوں پر تمھارا راج کیوں کر دیکھتے ہوں گے۔ ہر وقت داؤ کی تاک میں لگے رہتے ہوں گے کہ کب موقع ملتا ہے۔ اس سے اچھا موقع ان کے پاس اور کب آتا کہ تم کلکتے میں موجود نہیں تھے۔ سو ہم نے تمھارے خلاف ان کے بیانات پر زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن انھیں ٹٹولنے اور کریدنے کے کام سے بھی غفلت نہیں برتی۔ نتیجہ صفر رہا۔ وہ کسی کا نام نہیں لیتے تھے۔ کسی کا بھی، تمھارا بھی کھل کے نہیں۔ ساتھ ساتھ ہم نے دونوں اڈوں کے ان گنت لوگوں کے بیانات قلم بند کیے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ان میں تقریباً سبھی نے تمھارے لیے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے کیپٹن خاں کو بھی برا نہیں کہا۔"
ماتھر کا انداز خطابت کا سا تھا مگر نرم، دھیما اور صاف صاف۔ اس میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ اس کی زبان رواں اور عام پولیس افسروں سے الگ تھی۔ میری طرح سبھی نے سکون کی سانس لی ہوگی۔ ماتھر وہی سب کچھ کہہ رہا تھا جو ہم کہتے۔ اس نے بتایا کہ کسی نے اقرار نہیں کیا اور پولیس کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کی مدد سے وہ واضح طور پر کسی حریف کا رخ کر سکتی۔ کوئی نشان نہیں تھا۔ جن لوگوں کو پکڑا گیا، انھوں نے اس رات اپنے اڈوں، گھروں یا کسی اور جگہ اپنے موجود رہنے کی شہادتیں دلوا دی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اڈے کے لوگوں نے بہت سے نام لیے جن میں موجھار کا اڈا سرفہرست تھا۔ پولیس کا سب سے زیادہ زور موجھار کے اڈے کے آدمیوں ہی پر رہا لیکن وہاں سے بھی انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جس رات لوگ اڈے پر داخل ہوئے تھے، انھیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ آس پاس گشت کرنے والی پولیس نے بھی نہیں۔ باہر پہرا دینے والا [illegible] نامی شخص صبح بدمست پڑا تھا۔ دونوں پہلے اڈے پر آنے جانے والے لوگوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی گئی اور کچھ ایسے آدمیوں

کے نام سامنے آئے جن کا تعلق کلکتے سے نہیں تھا اور جو اس رات کے بعد کبھی نہیں دیکھے گئے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہی لوگ ہوں گے مگر وہ کہاں چلے گئے۔ کلکتے کے گرد و نواح میں بھی ان کی تلاش کی گئی لیکن ان جیسے حلیوں کے کسی ایک شخص کی بھی نشان دہی کسی نے نہیں کی۔ پھر وہ کون تھے؟" ماتھر بلند آواز میں خود سے پوچھ رہا تھا۔ "کون تھے وہ تجمل؟ اگر ہماری جگہ تم ہوتے تو کس نتیجے پر پہنچتے؟"
تجمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماتھر کہنے لگا: "اور پولیس کو صرف ان تین چار آدمیوں کی کھوج ہی نہیں تھی جو چند روز پہلے کیپٹن خاں کی اجازت سے اڈے پر آ کے ٹھہر گئے تھے۔ ان کے سوا بھی چند اور آدمی ہوں گے جنھوں نے انھیں وہاں بھیجا تھا۔ تین چار آدمیوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر ایک ہی ہلّے میں اڈے کے گیارہ جانباز آدمیوں کو ختم کر دیں اور انھیں ایک پل کی مہلت نہ دیں۔ اس رات باہر سے بھی لوگ ان کی مدد کو ادھر آئے ہوں گے اور جس طرح وہ اندھیری رات اور سنسان گلی میں روپوش ہو کے آئے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔ کچھ بعد وہ یا تو صبح سویرے وہاں سے نکلے یا انھیں اڈے کے قریب مقررہ وقت پر کوئی گاڑی آ کے لے گئی۔ بہرحال وہ کس وقت آئے، کس طرح آئے، اس کی تفصیل میں جانے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کون تھے۔ کہاں چھپ گئے؟ بتاؤ تجمل! وہ کون ہو سکتے ہیں؟"
"آپ جیسا ہو جواب دے دیں۔" تجمل نے تیکھے لہجے میں کہا: "پھر تو وہ ہم بھی ہو سکتے ہیں۔"
"ہاں! وہ تم بھی ہو سکتے ہو، تم یا تمھارے آدمی۔ کرائے کے آدمی، کلکتے سے دور کے آدمی۔ شہر میں اور کسے یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ استاد تجمل کے اڈے پر اس طرح چلنے کی جرأت کر سکے۔"
"تالی بجاؤ بچو!" تجمل نے ہماری طرف منہ کر کے تیزی سے کہا۔ کسی نے تالی نہیں بجائی اور ماتھر نے بھی تجمل کی بات سنی ان سنی کر دی۔ انسپکٹر داؤدیال کو کرسی جیسے کاٹ رہی تھی۔ وہ بار بار ایس پی جوشی اور ایس پی رائے کو دیکھتا تھا مگر ان دونوں کی نظریں ایک ہی جانب مرکوز تھیں، ہماری جانب۔
"تمھارے سامنے ہمیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن بہتر ہے تم جو سچ ہے سچ کہو۔ حقیقت جھٹلانے کے بجائے اسے تسلیم کرنے کے لیے تمھیں یہ سب بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم ان افواہوں سے بے خبر نہیں رہے ہیں جو اس بیچ تمھارے اور کیپٹن خاں کے جھگڑے کے بارے میں شہر میں اڑتی رہی ہیں۔ شاید تم بھی جانتے ہو گے کہ لوگ کیا کچھ کہتے ہیں۔ ان افواہوں کو مسالا بنانے کے بجائے ہم نے ٹھوس شہادتوں ہی پر اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہی ہے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم ان کی جانب سے اپنے کان بالکل بند رکھیں۔ کہیں حقیقت انھی میں نہ چھپی بیٹھی ہو۔ یہ افواہیں کوئی ایسا خاکہ کھینچنے پر ہمیں اکساتی رہتی تھیں جو کسی حقیقت کے لگ بھگ ہو۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم نے کتنے خاکے بنائے اور مٹائے ہوں گے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے سے ٹکریں ادھر ادھر مارتے رہنا ہی ٹھیک تھا۔"
اسی لمحے سب انسپکٹر سہائے اٹھ کے دبے پاؤں ماتھر کے پاس آیا اور میز پر اس کے سامنے ایک کاغذ رکھ کے واپس اپنی کرسی پر چلا گیا۔ داؤدیال نے اسے بھیجا تھا۔ ماتھر نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور سر ہلانے لگا اور مزید کوئی توقف کیے بغیر تجمل کی طرف نظر اٹھا کے بولا: "کیپٹن خاں تمھارا دوست تھا، اچھا دوست۔ تم اسے اپنے ساتھ کلکتے لائے تھے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ لکھنؤ سے الگ تھا۔ اس کے لیے نیا اور چونکا دینے والا تھا۔ وہ تمھاری مرضی سے آیا تھا مگر ایک دن اس نے تم پر چاقو کھول لیا اور مطالبہ کیا کہ اڈے سے نکل جاؤ۔ تم نے بھی چاقو کھول لیا لیکن تمھارے چاقو نے زندگی میں شاید پہلی بار تم سے دھوکا کیا۔ اڈے کی روایت کے مطابق تمھیں اڈا فوراً چھوڑ دینا اور کیپٹن خاں کا حق مان لینا چاہیے تھا۔ تمھیں یہ بھی قبول نہ ہوگا کہ تم اڈے کے دوسرے آدمیوں کی طرح اُسے استاد مان کے وہیں رہو، نہ کیپٹن خاں اس پر تیار ہوتا۔ اس نے تمھارے ساتھ رعایت کی کہ تم جلد از جلد کلکتہ چھوڑ دو۔ جن لوگوں کے سامنے چاقو نکلے تھے، ان سب کے ساتھ۔ اڈے کے باقی آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کیپٹن خاں کو ایسا جتانا لازم تھا کہ تم نے اپنی مرضی سے اڈا چھوڑا ہے کیونکہ تمھارے بعد یہاں اُسے اپنے پیر جمانے کے لیے ان کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ جان بخشی کے بدلے اور عزت سے کلکتے سے نکل جانے کے لیے تمھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ تم نے اپنے خاص آدمی کالے سے بھی یہی کہا، دوسرے آدمیوں سے بھی۔ سنا ہے تم نے ان سے کہا تھا کہ تم ایک لمبے سفر پر روانہ ہو رہے ہو جہاں سے تمھاری واپسی ناممکن ہو سکتی ہے۔ تم نے ایک لمبے سفر کا ڈھونگ رچایا تھا مگر تم نے یہ فیصلہ دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ تمھارے ساتھ جانے والے بھی تمھیں ٹوکتے، کھٹکاتے رہے ہوں گے۔ تم نے کیپٹن خاں کو وقت دیا تھا اور تم اس سے دوبارہ چاقو کھلوانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ جب تمھی اپنا چاقو کھلوا بیٹھے تھے تو اڈے سے تمھارے ساتھ نکلے

نگاہوں نے انھیں تاک لیا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ ہمیں کچھ ہوش
ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے قریب موجود صرف جامو کو دیکھا تھا۔
وہ چیختا ہوا ایک آدمی پر اُچھلا اور اُس کی مچھ تک میں اُس نے
دو اور آدمیوں کو گرا دیا۔ میں نے بھی کچھ یہی کیا تھا۔ جب مجھے اپنی
سُدھ بُدھ ہوئی تو وہ پانچوں زمین پر پڑے تھے اور اُن کے
چاقو اِدھر اُدھر گرے ہوئے تھے۔ انھیں دوبارہ چاقو اُٹھانے کی
فرصت نہیں ملی۔

سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے بند تھے مگر دفعتہً
ایک دروازہ کھلا اور ایک ساتھ کئی آدمی تیزی سے باہر نکلے۔ ججل
کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان میں رتنا نہیں ہے لیکن یہ
کون سا طریقہ تھا کہ خود آنے کے بجائے اُس نے پھر اپنے چند
آدمی بھیج دیے تھے۔ کیا اُس کے دماغ میں یہ تھا کہ ججل اُن کے
تک آنے کے بعد ان آدمیوں کو دیکھ کے واپس ہو جائے گا یا وہ
ججل کا ارادہ آزمانا چاہتا تھا یا اُس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح
ہم آدھے ہو کے اُس کے مقابل پہنچیں گے۔ اڈّوں پر کہیں ایسا
نہیں ہوتا مگر اڈّے ایسے حاصل بھی نہیں کیے جاتے جیسے رتنا
نے کیا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" ان میں سے ایک دراز قد اور چھلے
ہوئے جسم کے ایک شخص نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ رتنا
اُستاد کا اڈّا ہے۔"

"اسی کے دوار پر آئے ہیں لے۔" ججل مدھم لہجے میں بولا۔
"تم کیا باہر بلا نہیں کر ابھی رتنا اُستاد کے آرام کا سمے ہے۔"
"اس گیدڑ سے کہیو کہ بولی آکھا آرام کر لینا۔" جامو کی آواز
لرز رہی تھی۔ "ابھی ادھر اس کی ماں کے یار آ کر آئے ہیں۔"
"تیزی سے مت بھیج کہو۔" وہ دراز قد بولا۔ "اندر ہی
جا کے بول۔"

جامو کا سارا جسم ایک لمحے کے لیے بل کھا گیا۔ وہ بلا کی پھرتی
سے ... اور سارے بیک وقت اُن پر جھپٹنے والے تھے کہ ججل کی آواز
سُن کے رُک گئے۔

"ہاں ہاں کر پرے ہی رکھو ججل۔" رتنا کے آدمیوں میں سے
ایک نے زمین پر تھوک کے کہا۔ "ابھی اِدھر جا اس کی بہن کے
... سوار کھڑے ہیں وہ اس کو نہیں پہنچتے؟"

ججل جواب دینے کے بجائے لنگڑاتا ہوا خود اُن کے پاس
جانے لگا لیکن درمیان ہی میں جامو اُس کے آڑے آ گیا۔ "تم پیچھے
رہو اُستاد!" وہ چیخ کے بولا۔ ججل رُک گیا۔ جامو نے بولانے
کے انداز میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک خبر بھری لے کے
... جسم کی گرد جھاڑ کے ... اُن کی جانب آہستہ آہستہ قدم

بڑھانے لگا۔ وہ اُسے ٹھیر جانے کا حکم دیتے رہے مگر جامو اپنی
اُبلی ہوئی آنکھیں اُن پر مرکوز کیے بڑھتا رہا اور اُن کے مقابل ہی
جا کے ٹھیرا۔ ہمیں اعتراف ہے وہ اُن کے نرغے میں تھا۔

بری سانس چینے میں لگنے لگی تھی۔ سب کے پاس نیفے
تھے، میری جیب میں بھی لیکن کسی نے نیفا باہر نہیں نکالا۔ جامو
اُن کے بیچ میں پہنچ کے بُت کی طرح جم گیا تھا۔ اُس کی حالت
کسی پاگل سانڈ جیسی تھی جو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا رہ کے گزرنے
پر پلٹ کے وار کرنے کے لیے تیار ہو اور اپنے سینگ تول
رہا ہو۔ کبن خاں اور جامو کا بچپن سے سنگ ساتھ تھا۔ دونوں
ایک دوسرے کو بالکل بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جامو کی نظروں
میں اُسی کا چہرہ سمایا ہو گا جو اسی جگہ وہ اُسے چھوڑ کے گیا تھا۔

انھوں نے چاقو نہیں چلائے کیونکہ جامو اُن کی دست
بُرد سے کچھ دُور نہیں تھا اور انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ اُس
کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ "لوٹ جاؤ، ہم بولتے ہیں
لوٹ جاؤ۔ تمھارا ٹیم گیا۔ یہ اڈّا اب رتنا اُستاد کا ہے۔" اُن
میں سے ایک آدمی نے ہکلا کے کہا۔ وہ سب جامو کے گرد چاقو
گھما رہے تھے۔ "اپنا وقت تو رام کے ساتھ ہے۔ جا کے اُس
رنڈوے کو بول، دیر ہی نہ کر، بھنبھنانے کے تو آ جا۔" جامو نے اس
کے بازو کو جھٹکی دی تو سب بھڑک پڑے۔

"ابھی پیچھے رستہ کھلا ہے۔ زیادہ اکل مت کر۔" بھیلے
بڑے جسم کا آدمی دھتکارتے ہوئے لہجے میں جامو سے بولا۔
"جھنجھنیا بھیر لے۔"

جامو نے جو زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جس شخص کے بازو پر
جھٹکی دینے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا تھا، ... اُس
کی گردن پر ہاتھ ڈال کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور دوسرے
اُسی کو نہیں، اُس نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے مقابل کھڑے ہوئے
آدمی کی گردن بھی دبوچ لی تھی۔ ایک ساتھ کئی چاقو چلے لیکن جامو
کا داؤ بالکل نہیں سمجھ پائے تھے۔ جامو نے پل بھر کی مہلت
میں اُن کے ساتھیوں کے ٹینٹوے پر ایسی جگہ انگلی بھری تھی کہ
وہ بری طرح تڑپنے لگے تھے۔ اُن کی آواز بھی نہیں نکل رہی
تھی اور اُن میں جامو کی پکڑ سے خود کو چھڑانے کے سوا کوئی
سکت نہیں تھی۔ جامو نے اپنے دونوں ہاتھوں کی وہ دو انگلیاں
اُن کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست کر دی تھیں کسی کانٹے کی طرح۔
اُن کے جبڑے کُھلے اور بلکھے جسموں کا سارا زور بھی جامو کے اُن
کانٹوں سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دونوں
مکمل طور پر جامو کے شکنجے میں تھے اور اُن کے اطراف اُن کے

ساتھی جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ جامو نے ایک ثانیے
میں متعدد پینترے بدلے تھے اور انھیں اپنی انگلیوں کی سچوں
میں پیوست کیے اِدھر اُدھر گھما کے گھماتا رہا تھا۔ ہر طرف جامو
کے پاس اُن کی ڈھال موجود تھی۔ جامو کے بجائے چاقو اُنھی کے
جسموں پر لگتے۔ نتیجۃً باقی آدمیوں کو پیچھے ہونا پڑا۔ اگر وہ آگے
آتے تو اُن کے چاقوؤں سے اُنھی کے ساتھیوں کے جسم چھلنی
ہوتے۔ جامو اپنی جگہ جما ہوا نہیں کھڑا تھا۔ لمحے بھر بعد اُس
کے بدلے ہوئے پینترے کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ اپنے ہاتھ
آگے پیچھے کرتا تو اُس کی چپکلی میں جکڑے ہوئے دونوں آدمی
لازماً اُسی کے ساتھ جدھر وہ جاتا، گھوم جاتے۔

ہم سب قریب ہی کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جامو
سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو چاقو اُس کے جسم سے دُور نہیں تھے۔
دونوں آدمی ڈھال سے بنے تھے۔ جیسا کہ ججل اکثر مجھ سے
کہتا تھا کہ داؤ میں بس لمحوں کا اُلٹ پھیر ہوتا ہے۔ جامو نے
اس سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ ججل بھی اُن کے سامنے جا کے
یہی کچھ کرتا جو جامو نے کیا تھا اور کوئی بھی شخص جس کی انگلیاں
لوہے کی طرح سخت اور چاقو جیسی دھار رکھتی ہوں، ترازو کی
اُس ڈنڈی کے مانند ہو جو بہت بڑا بوجھ سہار لیتی ہے۔ زیادہ
آدمیوں کے درمیان اسی قسم کا کوئی غیر متوقع داؤ سود مند ہوتا
ہے لیکن جامو کو دیر تک اس پر قائم نہیں رہنا تھا۔ فوراً کوئی نیا
رُخ دینا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت ایک ہی داؤ پر اڑے رہنے
سے مقابل کے لوگوں کو اپنے بچاؤ کے علاوہ جوابی حربے اختیار
کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے اور جامو کو انھیں یہ موقع نہیں
دینا تھا۔ میرا خیال تھا جامو جلد ہی ان دو نیم جاں آدمیوں کو ان
کے ساتھیوں پر دھکیل دے گا اور اسی اثنا میں دوسرے آدمیوں کو
پچھاڑے گا یا خود چاقو سے اُن پر وار کرے گا۔ اپنے دو ساتھیوں کی
جان لبی دیکھ کے اُن کے ہاتھ پیر ویسے ہی ٹھیک طرح کام
نہیں کریں گے۔ وہ جامو کے پنجے سے انھیں چھڑانے کے لیے
اپنے چاقو زمین پر بھی پھینک سکتے تھے۔ اسی بات کا امکان
زیادہ تھا۔ اس طرف ہم بھی اُن کے قریب موجود تھے اور جامو
اتنی دیر تک کشش رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم ہر صورت
میں یوں ہی کھڑے رہیں گے۔ اُن کے پیچھے ہو جانے کے
باوجود جامو گھوم گھوم کے انھیں اُکسا رہا تھا تاکہ وہ اُس پر وار
کرنے کا پھر ارادہ کریں اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے ساتھیوں کو
چاقو گھونپ دیں۔

جامو کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو سکتا تھا لیکن اُسے
کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اندر سے ایک بارگی چھت
آدمیوں کے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ جامو نے پھر بھی انھیں
نہیں چھوڑا۔ آنے والے چھ آدمیوں میں سب سے نمایاں جو
آدمی تھا وہی رتنا ہو گا۔ مجھے اُس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا
محسوس ہوتا تھا۔ شاید کبھی جیل میں دیکھا ہو مگر اب اُس کے جسم
اور شکل و صورت میں بہت فرق ہو گیا تھا۔ اُس کا جسم پہلے
کی نسبت بندھا ہوا تھا۔ وہ دراز قد، سانولا رنگ، گول چہرہ اور
مستوں نشانوں کی بھرمار، تنگ پیشانی، لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ،
آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، بال سلیقے سے کڑھے ہوئے، درمیان میں
مانگ نکلتا۔ پاجامہ اُوپر سے واسکٹ، گھونڈی، ملیں اوٹے
رنگ کے بڑے سے نگینے کی انگوٹھی، کلائی میں نیا فولاد۔ اُس کی
عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ تیزی سے باہر
آیا تھا۔ آتے ہی اُس کی نظر جامو پر پڑی جو اُس کے دو آدمیوں
کو اپنی انگلیوں سے تھامے کھڑا تھا۔ رتنا دروازے کے
پاس ہی رُک گیا۔ اُس کے ساتھ آنے والے آدمی جامو پر لپکنے
کے لیے جست لگانا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے ہاتھ کے
اشارے سے انھیں جھڑک دیا اور رکھا کے چاروں طرف دیکھنے
لگا۔ اُس کے دونوں بیچ پیل رہے تھے۔ ہر چیز جیسے یہ دم بے آواز
ہو گئی تھی۔ جامو نے دونوں آدمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل دیا تھا
لیکن خود وہیں کھڑا رہا۔ رتنا نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔
اُس کی گھومتی ہوئی نظریں ججل پر آ کے ٹھیر گئی تھیں۔ ججل بھی
اسی کو گھور رہا تھا۔ رتنا کے سکڑے ہوئے ہونٹ ہلتے رہے۔
"نجان پڑتا ہے کہیں دیکھت ہیں۔" بالآخر وہ سنسناتے لہجے
میں بولا۔

ججل کے لبوں میں جنبش نہ ہوئی۔

"او ہو، ہو۔" وہ ایک لمحے کے بعد بولا۔ "ججل اُستاد آئے ہیں۔"

"ذرا جلدی پہچان لیا۔" ججل سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہاں کو اس کو کیا بولے ہیں۔" اُس نے زمین پر اوندھے
پڑے اپنے آدمیوں کی طرف نگاہ کرتے ہوئے چیکے ہی سے پوچھا۔

"بولنا ابھی آ گیا ہے مجھ کو۔"

"اور بھی بہت کچھ آوے ہے تمائے سر کی قسم۔"

"تو بھوری کا ہے کو کرتا ہے؟"

"اندر چل کے کچھ جل پانی کر لو ..."

"اب تو تیرا خون ہی پئیں گے۔"

"بہت کڑوا ہے اُستاد، لگتے ہے۔ تجربہ یا بھی بدن کے
سنگ کچھ ڈھلک گیو ہے۔ آتے کسی نے بولا نہیں کہ رستہ

کدھر کو جا رہے ہے؟"

اُس کا وجود میری طرح کسی کو بھی ایک پل کے لیے برداشت نہیں ہو رہا ہوگا اور وہ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اُس کے منہ ہی لگنا فضول تھا۔ ہم سب بجھل کے اشارے کے منتظر تھے جو رتنا کے قریب ہی کھڑا تھا اور ہم میں سے بھی کسی کو اس کے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔ ایسے آدمی کے لیے سوچنا ہی کیا تھا۔

"زیادہ چرچ مت کر۔" بجھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "جو بچار کرنا ہے کر لے تیرے پاس ابھی تھوڑا ٹائم ہے۔"

"اب بھی کوئی بچار رہ رہے ہے؟" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا۔ "ہتھیار کو تھو پر اٹھنے لگا آئے گی۔ اچھا ہے اس کو بیچ میں مت لا۔ اپنا فیصلہ خود ہی کر لے۔ ہم تو ٹرت آئے ہیں۔"

"اور تو ہم کو بھی دیکھے ہے تم لوٹ آئے ہو پر ذرا دیری میں آئے ہو۔ ادھر سارا کچھ بدل گیو ہے۔ سنتے ہے ادھر ہی آئے ہو بڑے"

بجھل نے جواب میں چاقو نکال لیا۔

"اپنے پلے بھی ہوئے ہے استاد! اس کو بھیتر ہی رکھ لیو تو ٹھیک ہے۔ ہم لوگ دیں کو بڑا کھانا ہے گا۔ ابھی تمہاری کھپڑیا میں چلنے کا کوئی دھیان ہے تو اس کو نکال دیو۔ اڈے پر اب ہم بیٹھے ہیں اور کسی سے مار کے نہیں بیٹھے ہیں۔ دھرتی دے کے لیو ہے اور جب لیو ہے تو جانے بھی ہیں کہ اس کو کیسے جانے ہے۔ ہم ادھر آ ہی آئے تو بدلے کوئی آجا تا ہے۔ بہت سے جاسوسوں کے ترت میں بچے ہوئے تھے۔ شکر کرو کہ ہم آ ہی گئے۔ تمہارا سارا آدمی سالا تاک کٹانے کے بیٹھ گیو تھے۔ کچھ ادھر بھاگ گئے باقی اُدھر مجرے میں چلے گیو۔ برلت ہیں کہ ایون کورٹس لیو۔ تمہارا کاشا ابھی تک ان ہی پیچھے ہے۔ پر تمہارا سے بھر گیو ہے۔ تم سے کیا بولیں۔ مجھے کرنا ہیں؟ آئے ہو تو ادھر دھیرج سے بیٹھو پر اڈے کا بچار من سے نکال دیو۔"

"ضرور تجھے کسی چھنال نے جنا تھا۔"

"کس دھوکے میں مت رہیو استاد! بعد کو بڑی نندا ہوئے گی۔ تمہارے نکلنے کے بعد ہم اوپر رات دن بڑے سالا کھمی تاہی مار رہے تھے۔ بجاتی ہیں تمہاری بات اٹکانے کے گیو تھے۔"

پتہ نہیں بجھل کو کس بات کا انتظار تھا، وہ اور کیا سننا چاہتا تھا۔ رتنا کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بجھل کا چاقو اُس کے ہاتھوں میں سرد پڑا تھا۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے بجھل کی طرف دیکھا مگر وہ جیسے اپنے آپ میں گم تھا۔ رتنا کے خاموش ہو جانے کے بعد چند لمحے وہ اُس کو گھورتا رہا۔ "کا سر پن لاگے استاد!" رتنا نے ہی مسخرانہ لہجے میں اُسے ٹوکا۔

بجھل نے اپنا چاقو اُس کی جانب اُچھال دیا۔ رتنا کو اس کی توقع نہیں تھی۔ غیر اختیاری طور پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن چاقو زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ اس نے پھرتی سے اُسے ہاتھ میں اُچک لیا۔ "ناہی مانو گے لاگے ہے آج دن آ ہو گیا۔" وہ چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا ہمت ہے استاد؟" اُس کی آواز ایک دم بدل گئی۔ "اُلٹے پیروں ادھر سے لوٹ لیو۔" اُس نے چاقو واپس بجھل کی طرف پھینک دیا۔ بجھل نے ہاتھ بڑھا کے اُسے تھام لیا۔ رتنا نے اس دوران اپنا چاقو بھی نکال لیا تھا۔

"جلدی کرو جان کے بچے! اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ دن میں ہی مجھ کو ٹھیک دکھائی نہیں دیتا۔ اندھیرے میں کیا خاک سمجھے گا؟"

"لاگے ہے آج دن آ ہو گیا۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "تجھ میں ایک کمارت سینو تھے۔ گیدڑ کی موت آئے ہے تو شہر کی طرف بھاگے ہے۔ ہے کالی میا! من میں تیرے داس کی ایک ہی اچھا تھی کہ تیرے چرنوں استاد بجھل کے خون کا چڑھوا دیں۔" رتنا اپنا چاقو چومتے اور آسمان کی طرف نگاہ کرتے ہوئے جذباتی انداز میں بولا۔ اُس نے چاقو بجھل پر تول لیا تھا مگر یکایک رک گیا اور بجھل سے کہنے لگا۔ "پر ادھر نہیں اندر چلو! اندر جگہ اُدھر جگہ بڑی ہے۔ تم کو بھی شکایت نہیں ہوئے گی اور اُدھر کالی میا کی مورتی بھی درشن دیوے ہے۔" اس کے آگے ہی بل ہوتے یہ کہتے ہی وہ مڑ گیا۔

بجھل بھی غالباً یہی چاہتا تھا۔ اُس نے اعتراض نہیں کیا۔ اس طرف جگہ بہت تنگ تھی۔ پیچھے گلی کے کھلے دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے مگر اُن میں سے کوئی اندر نہیں آیا تھا۔ اُن کا گھٹا گھٹا شور ہمارے کانوں میں گونج رہا تھا۔

بیچ کا کمرہ پھلانگ کے ہم صحن میں آ گئے۔ صحن کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فرش دھلا ہوا، دیواروں پر نئی سفیدی ہوئی وی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگی بڑی چوکی پر گیروے رنگ کی چادر بچھی تھی۔ سامنے مونڈھے پڑے تھے۔ صحن کی یہ صفائی ستھرائی کپتن علی کی زندگی میں ہوئی ہوگی۔ وہ کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتا تھا اور ہر وقت بنا سنورا رہتا تھا۔ صحن خاصا کشادہ تھا۔ اندر پہلے سے کچھ اور آدمی موجود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رتنا نے اپنے خاص آدمیوں کو آج خاص طور پر اکٹھا کیا ہوا تھا یا وہ اڈے کے گرد

ہی گھومتے رہتے تھے اور گلی میں ہمارے اطراف بھیڑ دیکھ کے ہی یہاں آ گئے تھے۔ اُن میں سے چند کے چہرے مجھے دیکھے ہوئے لگتے تھے۔ شاید وہ موجودہ اڈے کے لوگ تھے یا کسی اور اڈے کے ہوں گے۔ بجھل بلا کر جا مو سارے وغیرہ انھیں خوب جانتے ہوں گے۔ صحن میں آتے ہی رتنا اُس طاق کی طرف مڑ گیا تھا جہاں زبان نکالے ہوئے کالی دیوی کی سیاہ مورتی رکھی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے طاق کے روبرو سر نگوں رہا تھا اور اُس کا چاقو مورتی کے قدموں میں پڑا تھا۔ باقی لوگ صحن میں ہر طرف دربانوں اور پہرے داروں کے مانند کھڑے تھے۔ انھیں آپس میں اشارے کرنے کے سوا اور وقت نہیں ملا ہوگا۔ اُن کے پیچھے ہم فوراً اندر آ گئے تھے۔

صحن میں روشنی کی کمی نہیں تھی۔ تمام بتیاں جل رہی تھیں۔ کالی دیوی کے پاس سے ہٹ کے رتنا چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ہم سب چوکی کے نزدیک ایک طرف موجود تھے۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی بنے ہوئے۔ بجھل جسم و فنا ہو گزر رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے ہم یہاں نہیں آئے تھے۔ سب اپنے ہاتھ پیروں کو بمشکل روکے ہوئے تھے۔ کسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے رتنا کی انتڑیاں نکال دے۔ اُس کی کھال اُدھیڑ دے۔ آنکھیں پھوڑ دے۔ اگر بجھل یہ سمجھتا تھا کہ وہ رتنا ہی ہے جس نے کپتن خان اور اپنے دوسرے آدمیوں کو آنکھیں کھولنے کی مہلت نہیں دی تھی تو سامنے آنے کے بعد رتنا بھی اتنی دیر کا مستحق نہیں تھا مگر بجھل کا جی شاید تھپڑ کا ہو گیا تھا۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں موجود تھا اور وہ رتنا کے چوکی سے اُٹھنے کا منتظر تھا۔ جب بجھل نے اڈے کی عمارت کے پچھواڑے گلی کے نکڑ پر ٹیکسیاں رکوائی تھیں اور گلی کے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا تھا، اُس وقت مجھے خدشہ ہوا تھا کہ کہیں رتنا اِس عرصے میں اڈے سے نکل نہ جائے۔ اڈے کا ایک دوسرا راستہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا لیکن رتنا نہ تو پچھلے دروازے سے باہر گیا، نہ اُس نے چاقو اُٹھانے سے اجتناب کیا بلکہ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے ہمارا انتظار ہی ہو۔ جس شخص نے کپتن خان کو اس طرح راستے سے ہٹایا ہو، ہماری آمد کی اطلاع سن کے وہ یوں اڈے پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر شاید وہ رتنا نہیں تھا۔ بجھل بھی کچھ یہی سمجھ رہا تھا مگر یہ رتنا کی کٹ حجتی بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح وہ ہم لوگوں پر کچھ اور ثابت کرنا چاہتا ہوگا جو اُس نے پولیس پر ثابت کیا تھا اور رتنا بھی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اُسے اپنے بازوؤں کا کچھ زیادہ ہی اعتماد حاصل ہو

نال خولی نہیں۔ اڈے پر قبضہ جمانے کے لیے پہلے کپتن خان کو ایسے ہی ختم کیا جانا چاہیے تھا۔ سامنے آ کے وہ کپتن خان کا مقابلہ شُول وقتے کا نتے۔ کس کس کا سامنا کرتا۔ ایک کپتن خان ختم ہو جاتا تو اڈا اُس کے ہاتھ میں نہ آتا اور ایک وقت کو ابھی جا تو دوسرے چین نہ لینے دیتے۔ اڈے پر ایک سے ایک آدمی موجود تھا۔ اس طرح اڈے پر کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اڈا حاصل کرنے کے بعد وہ اُس کے بازوؤں ہی کا زور تھا جو کلکتے کے دوسرے اُستادوں کو اُس سے دور رکھے ہوئے تھا اور اب وہ اسی کس بل پر بجھل کے سامنے موجود تھا۔ اُس بجھل کے سامنے جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا مگر خوف اور گھبراہٹ کے آثار نظر نہیں آتے تھے یا وہ انھیں چھپانے پر قادر تھا۔

مورتی کے پاس سے ہٹ کے چند ثانیوں تک وہ سر جھکا کے بیٹھا رہا پھر اچانک کالی دیوی کا نعرہ لگا کے چوکی سے اُٹھ گیا۔ ہم نے روکنا چاہا مگر بجھل چند قدم چل کے اس کے مقابل آ گیا۔ رتنا نے اُس کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ بائیں ہاتھ میں چاقو جھک رہا تھا مگر یکایک وہ پیچھے ہٹ گیا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "نا ہیں!" وہ ترش لہجے میں بولا۔ "دیری میں چوٹ لگے ہے۔ تم سے ٹھیک تنی چلا بھی نہ جاوے ہے۔"

"آگے بڑھ۔" بجھل نے بھری بھری آواز میں کہا۔

"بڑھنے کو بڑھ جاویں گے پر کالی میا کا بولے گی چوٹ کھانے کی جینٹ سرکار نا کرے گی۔"

"آگے بڑھ۔" بجھل کی آواز صحن میں گونجے گی۔

"ناہیں استاد! ہم کو مجبور مت کرو۔ ابھی پاؤں ٹھیک کر لیو پھر جاوے تو ہم کدھر جاوے ہیں۔"

"یہ گھونٹ جلا چنگا ہے رستم کے ٹھوکے۔"

"اور تو تم کو پتہ چل جائے گا رستم کے ٹھوکے ہیں پر رستم ٹھوکتے ہیں۔ اپنے پاؤں کی یہ حالت ہوتی تو تم کیا آگے بڑھ جاتے؟ نا نا استاد! اپنے دھرم میں چوٹ کھانے پر ہتھیا اُٹھانا پاپ ہے۔"

بجھل نے اُس سے نہیں کہا کہ ہتھیار اندھوں پر اُٹھانا پاپ نہیں ہے۔ آگے چوری سکھانا پاپ نہیں ہے۔ بجھل کے بولنے سے پہلے جانو سنسناتی آواز میں بولا۔ "جان سے استاد کو تو نے معاف کر دیا ہے تو ادھر سے کوئی دیوی کے لیے چن لے۔"

"تمہارے من کی حسرت یہ بھی نکال لیو دیں گے۔ پہلے جوڑ کر تو

کاٹ دیں اور تم کو ایسے ہی کھیل ہوتے ہے تو ادھر کھڑے
آدمی تالی بجانے کو تیار ہیں۔ کل کو اپنی بھسانے کے آؤ اور
بولیو کہ رتنا استاد ابھی چلے اس پر ہتھیار اٹھاؤ تو کام تمہاری
بات مان لیں گے۔ پہلے استاد کو دیکھ لیں اور استاد تم کو۔
برسوں ان ہاتھوں کی کمائی پھر کس کا دن کیے تھے تم لوگ
تو تمہارا نمبر بھی آجاوے گا۔ اڈے پر بیٹھے ہیں اپنی ماں۔۔۔"
وہ گالی دے کے بولا۔ تجمل کی آنکھیں بھاری ہو گئی تھیں۔ میرا
اندازہ ٹھیک نکلا۔ اب اُسے کچھ اور نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ
دو قدم آگے بڑھ گیا۔ رتنا کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ فضول باتیں
کر رہا ہے۔ تجمل کو آگے آتے دیکھ کے ایک آن میں اُس نے
اپنا جسم سیدھا کیا اور اُس کے ہاتھ پیر جیسے پھڑپھڑانے لگے۔ "میا کی
سوگند" وہ چیختے ہوئے بولا۔ "کچھ اور مت سمجھیو اپنی کہ ہم کوئی
رتنی ترواسے ہیں۔ ہم کو معلوم نہ تھا کہ ایک دن ایسو آوے گا۔
سوچا کو تمہارا ہی بھن دیے تھے۔" وہ دیوانوں کی طرح اپنا سر ہوا
میں جھٹکنے لگا۔ "نہیں مانت ہو تو ٹھیک ہے۔ میا جانے۔ اور خود
دیکھ رہی ہے۔" اُس نے طاق میں رکھی مورتی پر ایک نظر ڈالی
اور ہاتھ جوڑ کے نعرہ لگایا۔ "جے بھوانی کی!" اُس کے دونوں ہاتھ
تجمل کو اپنے شکنجے میں کسنے کے لیے پھیل گئے۔

اُس نے اچانک تجمل سے اپنا فاصلہ اور کم کر لیا۔ تجمل
کا چاقو بھی بائیں ہاتھ میں تھا۔ وہ رتنا کی طرح اچھلا اور کودا
نہیں کچھ آگے جاکے رک گیا۔ رتنا کو بھی ٹھہرنا پڑا مگر اُس کے
ہاتھ پہلے ہی جیسے تجمل کو شکنجے میں لینے کے لیے بے قرار تھے۔
دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رتنا کے
ہونٹ بھینچے ہوئے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں
سر سے پاؤں تک تجمل کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ جھٹک
جھٹک کے تجمل کو جنبش کرنے پر اکسا رہا تھا جو اپنی جگہ جم سا
گیا تھا۔ رتنا کو اُس پر حملہ کرنے کے لیے بظاہر کوئی رکاوٹ
نہیں تھی مگر تجمل کی اس بے حرکتی نے اُسے اور زیادہ محتاط کر دیا
تھا اور وہ کچھ تلملانے لگا تھا۔

صحن میں سکوت مسلط تھا۔ ہر طرف حصار بنائے رتنا
کے آدمی جیسے مجسمے بن گئے تھے۔ اُن کی گردنیں آگے نکلی ہوئی
تھیں، آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ہم بھی ایک کونے میں دم روکے
کھڑے تھے۔ بلا کو اور سانسے میرے بازوؤں سے چپکے ہوئے
تھے۔ مجاہد اپنا گال کھرچ رہا تھا۔ سب کی نظریں ایک ہی طرف
لگی ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد تجمل کسی کے سامنے یوں چاقو
کھولے کھڑا تھا۔ ہمیں کسی اور بات کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی
رتنا کی طرف سے تھی۔ اُس سے کوئی بھی حرکت بعید نہیں تھی
اور ادھر تجمل کا پیر سوجا ہوا تھا۔

رتنا کے جسم پر ایک ہیجان طاری تھا۔ تجمل کو ایک جگہ
جمے دیکھ کے اُس کی حالت کچھ اور اضطراری ہو گئی تھی۔ وہ پیچھے
نہیں ہٹا البتہ ایک طرف ہو گیا جو پیچھے ہٹنے ہی کے مترادف
تھا۔ تجمل وہیں کھڑے کھڑے مڑ گیا۔ رتنا نے اُسے ایک جھپکی
دی، کارگر نہیں ہوئی تو وہ دائیں طرف ہو گیا۔ تجمل کو پھر دائیں
طرف اپنا رُخ بدلنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ تین چار بار وہ
یہی عمل دہراتا رہا۔ اُس کا خیال ہو گا کہ تجمل کے لیے اس حالت
میں چلنا مشکل ہے چنانچہ وہ اُسے جتنا تھکا سکتا ہو تھکائے
لیکن تجمل جدھر وہ جاتا، ایک پل میں اُسی طرف منہ کر لیتا۔
اُس نے ایک قدم بھی نہیں بڑھایا۔ وہ رتنا سے جو کچھ کہنا چاہتا
تھا رتنا بھی اُسے سمجھ گیا تھا اسی لیے وہ اُس کے قریب آنے
اور ایک جگہ جمے رہنے کے موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے
پہلے اُسے تھکا دینے کی تگ و دو میں تھا۔ رتنا کے لیے یہ صورت
حال عجیب اور وحشت انگیز تھی کہ کوئی اس طرح چاقو تانے
کھڑا ہے۔ ایک انچ بھی ہل کے نہ دے اور وہ اُس کے قریب
نہ جا سکے۔ اگر تجمل نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ یوں ہی اپنے محور پر
گھومتا رہے گا تو رتنا نے بھی اسی تکرار کی ٹھان لی تھی۔ رتنا کی
جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کچھ دور جاکے اور فاصلہ بڑھا کے تجمل
کی طرح ایک جگہ جم جاتا اور جب تک وہ حرکت نہ کرتا، اُس
وقت تک تحمل کرتا۔ شاید اس طرح تجمل کو بڑھنا ہی پڑتا مگر
رتنا کو ہر دم یہ احساس ہو گا کہ اُس کے سامنے کون ہے اس لیے
وہ اُس کے قریب آنے اور اُس پر جھپٹنے سے پہلو بچا رہا تھا،
مبادا تجمل کچھ اور ہی سوچے ہوئے ہو۔ کسی کو بھی یہ احساس ہر دم
غالب رہتا۔ مشہور تھا کہ تجمل کو صرف اڑانے کی دیر لگتی ہے۔
اُس کے اٹھے ہوئے ہاتھ ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کے مانند
ہوتے ہیں، جن کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرف مڑ جائیں
گے، کون سی شاخ پر جا بیٹھیں گے۔

تجمل کے ہاتھ گرے ہوئے نہیں تھے۔ رتنا کی طرح وہ بھی
انہیں پھیلائے ہوئے تھا۔ اُس کا سر، آنکھیں، کاندھے متحرک تھے
مگر وہ ایک جگہ کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد رتنا کے ذہن میں یہی
تدبیر آئی جس پر اُسے پہلے سے عمل کرنا چاہیے تھا یعنی اُس
نے اپنا فاصلہ زیادہ کر لیا۔ تجمل پھر بھی نہیں ہٹا۔ رتنا کے لیے یہ
ناقابل برداشت تھا۔ کچھ دیر تو وہ انتظار کرتا رہا، پھر "جے بھوانی"
کا نعرہ لگا کے دوڑتا ہوا آگے آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سیدھے

تجمل کے پیٹ میں چاقو گھونپ دے گا لیکن وہ صرف آزمائشاً
آیا تھا۔ تین چار فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو وہ اچانک پلٹ کے دائیں
طرف ہو گیا۔ پھر وہیں سے اُلٹے قدموں واپس آگیا۔ اس تیزی سے
آکے اُس کا ایک دم پلٹ جانا آسان کام نہیں تھا۔ اُس سے
اُس کے جسم کی پھرتی اور زور کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُسے
اپنے جسم پر پورا قابو حاصل تھا۔ اُس کی بات اس حد تک درست
ہی لگتی تھی کہ وہ برسوں خالی نہیں بیٹھا رہا ہے۔ جسم کو تراشتا
تراشتا رہا ہے۔ یہ سب اُس کے کینے ہی نے کرایا ہو گا جو
ٹھکنے سے نکالے جانے پر وہ تجمل کے لیے اپنے دل میں بھر کے
گیا تھا۔ کوئی بات ضرور ہو گی جو اتنے عرصے بعد اُس نے ٹھکنے
واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک فاصلے پر رُک کے وہ چند لمحے اپنی سانسیں درست
کرتا رہا۔ پھر تند کے انداز میں اُس نے دوبارہ تجمل کی جانب
دوڑ لگائی مگر اس بار وہ کچھ اور ہی ارادہ کر کے گیا تھا۔ تجمل کے
قریب جاکے پہلے تو اُس نے حسب سابق اپنی پھرتی سنبھال اور
دائیں طرف مڑا۔ وہ واپس ہونے کے بجائے بائیں طرف آنا چاہتا
تھا کہ تجمل نے دفعتاً اپنا چاقو پھینک دیا اور عین اُسی لمحے ایک
قدم آگے بڑھ کے دائیں ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ میری کھلی آنکھوں
کی بینائی شاید ایک لمحے کو جاتی رہی تھی۔ دوسرے لمحے تجمل کا
پنجہ رتنا کے چاقو والے ہاتھ کا پنجا پکڑے ہوئے تھا۔ ابھی ہمیں
اپنے دیکھے ہوئے پر یقین نہیں آیا تھا کہ رتنا نے بڑھ کے تجمل کے زخمی پیر پر
ٹھوکر ماری اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب
لگانی چاہی۔ تجمل کو اندازہ ہو گا کہ رتنا یہی کچھ کرے گا اسی لیے اُس
نے اُس کا دوسرا ہاتھ کھلا رہنے دیا تھا۔ رتنا دیکھ نہیں سکا کہ تجمل نے
اس اثنا میں اپنا خالی ہاتھ سر کے اوپر موڑ کے رکھا ہوا ہے۔ اگر اُس
نے دیکھ لیا تھا تو سمجھ نہیں سکا یا اُس وقت دیکھا جب وہ ضرب
کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ تجمل نے کچھ آگے کھسک کے
اُس کی ضرب اور یقینی تباہی کا وار برداشت کر لیا مگر ادھر
رتنا کا ہاتھ اُس کی ٹھوڑی تک پہنچا کہ اُدھر اوپر کسی کلہاڑی کے
مانند اُس نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ تجمل نے
اس بات کا خیال رکھا تھا کہ جس وقت وہ اوپر سے اپنی ٹھوڑی
تک رتنا کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ضرب لگائے تو رتنا کا ہاتھ
ٹھوڑی سے نیچے گر کے اپنے اور اُس کے درمیان معلق فاصلے
کے درمیان جھولتا نہ رہ جائے ورنہ ضرب کا نتیجہ نہ نکلتا۔ کوئی نتیجہ
اسی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا کہ رتنا کا ہاتھ کہیں اٹک
جائے۔ آگے کھسکنے کی یہی وجہ تھی۔ رتنا کا ہاتھ تجمل کی ٹھوڑی

سے ہٹ کے اُس کے سینے پر آکے ٹکا تھا۔ صحن رتنا کی چیخ سے
گونج اٹھی۔ تجمل نے ساتھ ہی اُس کے چاقو والے ہاتھ پر پنجے
سے زور دیا تھا۔ چاقو اب رتنا سے سنبھلا نہیں رہ سکتا تھا وہ
گر رہا تھا۔ رتنا بھی لڑکھڑا رہا تھا کہ تجمل نے اپنے زخمی پیر سے
اُس کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور جیسے ہی وہ نیچے گرا
تجمل نے بڑھ کے اُس کی ٹھوڑی پر اپنا پیر جما دیا۔ رتنا میں اُٹھنے
کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ ٹوٹ چکا تھا
دوسرے ہاتھ سے اُس نے تجمل کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی
مگر نیچے اُس کی ٹھوڑی دبی ہوئی تھی جتنا وہ زور لگاتا ٹھوڑی پر
تجمل کے پیر کا دباؤ اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ تجمل نے جھک کے اُس
کا چاقو اٹھایا اور صحن میں چاروں طرف نگاہ کر کے دیکھا۔ رتنا کے
آدمی اُسے گھور رہے تھے۔ رتنا کے دوبارہ زندہ لگنے اور زمین
پر چت گرنے کے درمیان کا عرصہ اتنا مختصر تھا کہ سب کو اپنی
آنکھوں کا دھوکا معلوم ہوتا ہو گا مگر رتنا ان کے سامنے زمین پر
پڑا کراہ رہا تھا۔

ہم سب نے اپنے اپنے چاقو نکال لیے تھے مگر ضرورت نہیں
پڑی۔ رتنا کے آدمی آگے نہیں بڑھے اور ہر طرف سے اُٹھنے والے
چاقوؤں کی جھنکار گردش پر آگئی۔ اُنھوں نے اپنے ہتھیار تجمل کے
پیروں پر ڈال دیے تھے۔

ہم سب فوراً صحن میں بکھر گئے۔ سولہ نے تمنچہ نکال لیا
تھا لیکن رتنا کے آدمیوں کو ایک طرف ہٹتے اور ننگے ہاتھ دیکھ
کے اُس نے تمنچا واپس جیب میں رکھ لیا۔ شاید اُسے آدمیوں کو
یہ جتانا مقصود تھا کہ ہمارے پاس تمنچے بھی ہیں۔ سولہ کی بات
اب بے معنی تھی۔ صحن کا ایک چکر لگا کے وہ تجمل کے
پاس پہنچا۔ "تم ابھی ہٹ جاؤ۔" وہ بھرائی آواز میں ضد کرنے لگا کہ
رتنا کو اُس کے حوالے کر دیا جائے۔

تجمل نے پہلے انکار کر دیا مگر پھر مان گیا۔ "اُٹھا کے اُدھر
بیٹھک میں پھینک دو۔" اُس نے ترشی سے کہا۔

"مردی کو ابھی پھر اُدھر لے جاؤں استاد؟ دیوی کے
سامنے ہی اس کی بلی ہو۔" جابر چیل کے بولا۔

"اتنی جلدی چھٹکارا دلا دے گا۔ اُدھر لے جا کے ذرا اس
کی خاطر تواضع کرو۔ اڈے کا استاد ہے یہ۔"

رتنا بھی یہ سب سُن رہا تھا۔ اُس نے کراہتے ہوئے اُٹھنے
کی کوشش کی تھی کہ تجمل نے اُس کے منہ پر جما کے ایک
ٹھوکر ماری۔ رتنا کی آنکھیں جھپکنے اور بجھنے لگیں۔ اُسے اُٹھاتے ہوئے
جابر نے اُس کا وہی ہاتھ پکڑا جو ٹوٹ چکا تھا۔ رتنا کی چیخیں گونجیں

گئیں مگر جامو اُسے ٹھوکریں مارتا ہوا صحن سے لے گیا۔ اُدھر سے بیبی اُس کے پیچھے بھاگا۔ قبل ہی نے اُسے جامو کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا ہوگا۔

میں جامو کے ساتھ اندر نہیں گیا تھا۔ رتنا کے گرتے ہی صحن میں کچھ دیر کے لیے کھلبلی سی ہوئی تھی پھر جیسے ہر چیز ٹھہر گئی تھی۔ ہر بالا، بدرا اور چھنگا ایک کمرے میں دبکے ہوئے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد میں لوٹا تو قبل صحن کے وسط میں اُسی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ تھام کے چوکی تک کھینچتا ہوا لے آیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُس نے بجھی بجھی نظروں سے مجھے دیکھا اور میری بات مان لی۔ پھر میں نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کے اُس کا پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ "سب ٹھیک ہے۔ چھوڑو۔" وہ جھکتے ہوئے لہجے میں بولا لیکن میں نے اُس سے پوچھے بغیر پٹی کھول دی۔ کپڑے کا رنگ مٹی کی گرد اور خون سے میلا چکٹ ہو گیا تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ پیر پھولا ہوا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اندر سے پک چکا ہے اور اوپر تک پہنچ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اُسے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں خود ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ پٹی کھول کے میں نے غلطی کی تھی۔ قبل کو بھی اُسے دیکھنے کا موقع مل گیا اور صحن میں کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی۔ گلی میں اڈے کے قریب مدن پہلوان نامی ایک جراح رہتا تھا مگر باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ مدن بھی انھی میں شامل ہوگا۔ ایسے میں اُسے ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یاد تھا کہ بیٹھک کے برابر والے کمرے میں مرہم اور دواؤں کا ایک صندوقچہ رکھا رہتا ہے۔ ممکن ہے اب بھی وہ اُسی جگہ ہو لیکن اب مرہم پٹی اور دواؤں کا وقت نکل چکا تھا۔ مدن کو فوراً تلاش کرنا چاہیے تھا۔ میں کسی کو بلانے کے لیے اور اُسے قبل کے پاس چھوڑ کے باہر مدن کے پاس جانے کو سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں شور اُٹھا اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ چند سپاہی انسپکٹر داؤ دیال اور پولیس کا ایک اور افسر تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ داؤ دیال اور دوسرے افسر دونوں کے ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ گلی میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ پولیس کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کے حیرانی ہوئی کہ بلاکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ داؤ دیال گھبرایا ہوا آیا تھا اور تمنچا تانے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ داؤ جی آؤ۔" شیری دیکھ کر

دی۔" قبل نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی اِدھر اپنے پاس رسان سے بیٹھو۔"

"رتنا کدھر ہے؟" داؤ دیال کی نظریں ہر طرف متلاشی تھیں۔

"اُدھر بیٹھک میں ملن کے لیے تیار ہے۔"

"اپنے ماتھر صاب بہادر کدھر ہیں؟" قبل نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"وہ بھی آتے ہوں گے لیکن لیکن قبل یہ سب کیا ہے؟"

"اِس کری دکھانے کے لیے آپ کو بلوایا تھا۔ اچھا ہوا رستے میں مل گئے۔ سب ٹھیک ہے صاب! مینجھے کو اندر بیٹھی میں ڈال لو۔ بھاری بہت لگتا ہے۔"

داؤ دیال خود ہی دیکھ رہا تھا کہ تمنچے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے اُسے ہولسٹر میں اُڑس لیا۔ اُس کے ساتھی افسر نے بھی۔

"مگر یہ اندر کون چیخ رہا ہے؟" داؤ دیال دہشت سے بولا۔ بیٹھک سے بار بار رتنا کی چیخیں اُٹھ رہی تھیں۔ جامو کے ہاتھ نہیں رُکے ہوں گے۔

"آواز بھی نہیں پہچانتے؟ اور کون ہوگا داؤ جی۔"

"تمھیں تمھیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"اپنے کیا رہ! ہاتھوں کو مشق کرنے کی اجازت پھر آپ ہی نے دی ہوگی۔ ابھی دھیرج رکھو ماتھر صاب کو آ جانے دو۔"

"بیٹھک کا دروازہ کھلواؤ۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"دروازے پر تالا نہیں پڑا ہے۔ پر اندر جانے کی کیا ضرورت ہے اُدھر۔ سالے سب حاضر ہیں۔" قبل رتنا کے آدمیوں کی طرف منہ اُٹھا کے بولا۔ "پہلے انھی کو دیکھ لو۔ دو چار کام کے مل جائیں گے۔ ایسے بھی اپنے کو انھاں گیرے دکھائی دے رہے ہیں۔"

انسپکٹر داؤ دیال نے قبل کی بات آدھی سنی آدھی نہیں سنی، بیٹھک کی طرف دوڑا۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سپاہی بھی اندر دوڑ پڑے اور اُنھوں نے جامو اور بیبی کو پکڑ کے باہر دھکیل دیا لیکن رتنا کی چیخیں بند نہیں ہوئیں۔ قبل بھی پھر چوکی پہ بیٹھا نہیں رہا۔ کسی تاثیر کے بغیر میرے زانو سے اُس نے اپنا پاؤں کھینچا اور تیز قدموں سے لنگڑاتا ہوا بیٹھک کی طرف جانے لگا۔ ابھی وہ اندر نہیں گیا تھا کہ ڈی ایس پی ماتھر، ایس پی جوشی اور ایک دوسرا افسر کئی سپاہیوں کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ قبل رُک گیا۔ "آپ ہی کا انتظار تھا ماتھر صاب!" قبل نے اُس

کے قریب جا کے زیر لبی سے کہا۔

"شاید مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگئی ہے استاد قبل!" ماتھر تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کا چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔

"آپ ہی کے بولوں کا خیال تھا سرکار، ورنہ اِس بے چنگے کی اِدھر اُکھ بھی نہیں ملتی۔ ہاں اپنے ہاتھوں میں زندگی بھر اُٹھیں ہوتی رہے گی۔"

"ماتھر پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ "مجھے یقین تھا مجھے یقین تھا کہ تم نہیں بھولے ہو گے۔" وہ جوش میں بولا۔

"آپ نہیں ہوتے تو شاید بھول بھی جاتے۔"

"مگر تم یہاں یہ سب ......؟" ڈی ایس پی ماتھر شش و پنج کے لہجے میں بولا اور کچھ کہے بغیر قبل کا منہ تکنے لگا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے قبل بیٹھک کی طرف مڑ گیا۔ ماتھر اور جوشی بھی اُس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ انسپکٹر داؤ دیال وہاں پہلے سے موجود تھا۔ قبل کے سوا ہم میں سے کوئی بھی اندر نہیں گیا۔ جامو اور بیبی کو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بے کار کوشش کر رہے تھے۔ اندر سے رتنا کے بلکنے کی آوازیں اچانک اور تیز ہوگئیں۔ دیر تک وہ باہر نہیں نکلے۔ قبل کے چہرے پر تاب پتی نہیں تھی۔

جس وقت سپاہی رتنا کو تھانے باہر لائے اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جامو نے اُسے ادھ موا کر دیا تھا۔ منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو نے شاید اُس کی کہنیاں زمین سے رگڑی تھیں، وہ بھی زخمی تھیں۔ اُس کی گردن ڈھلک ڈھلک جاتی تھی۔ پپوٹوں کی آنکھیں کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گریبان چاک تھا اور چھٹی ہوئی واسکٹ کندھے پر جھول رہی تھی۔

"تم سب بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" ایس پی جوشی نے باہر آ کے حکم دیا۔

قبل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے جوشی کو دیکھا۔ پھر ماتھر کو۔ میں درمیان میں بولنا چاہتا تھا کہ ہم سب کو لے چلو، قبل کو یہیں رہنے دو لیکن جب قبل ہی کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے تو میں بھی خاموش رہا۔

سپاہیوں کی تعداد کم تھی اور رتنا کے آدمیوں سمیت ہماری زیادہ۔ اُنھوں نے پہلے رتنا کے آدمیوں کو ہنکاتے ہوئے باہر نکالا۔ جب سے پولیس اڈے پر آئی تھی اُن کی نظریں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ممکن ہے اُن میں سے کسی نے بھاگنے کا بھی ارادہ کیا ہو لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"چلو" سارے سُولم کے ساتھ ہر بالا، بدرا اور چھنگا مسلسل اُن پر نظر رکھے ہوئے تھے اور پھر پولیس بھی موجود تھی۔

گلی میں اب بھی لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ باہر رہ جانے والے سپاہی سیٹیاں بجا بجا کے اور ڈنڈوں کے زور پر انھیں عمارت سے دُور رکھے ہوئے تھے۔ آگے پیچھے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ احتیاطاً وہ پورا انتظام کر کے آئے تھے۔ رتنا باہر نکلا تو پولیس کو ایک دوسرے پر ٹوٹتے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ ہر سو چیخ پکار پڑنے لگی جیسے بھیڑ میں کسی کو سانپ نظر آ جائے۔ اُس کے پیچھے ہم تھے۔ رتنا اور قبل کو علیحدہ ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ایک بڑی بند گاڑی میں وہ ہمیں ٹھونسنے لگے۔ میں اور جا کر گاڑی میں پہنچے تھے کہ اچانک ایک کنکری میرے سینے پر آ کے لگی۔ میری نظر ٹھیک اُسی سمت گئی جدھر سے کنکری آئی تھی۔ وہاں مجھے لوگوں کے بیچ میں بند دکان کے ایک چبوترے پر چڑھا اکھڑا نظر آیا۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پیرو نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا چہرہ لوگوں کے پیچھے چھپا لیا۔ اُسی وقت سپاہیوں نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ مار کے ہمیں گاڑی پر چڑھنے کو کہا اور لوگ بھر گئے۔ پیچھے کوئی باقی نہ رہا تو وہ کرنے میں مدد اُٹھانے کھڑے ہوگئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کے اُوپری حصے میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اُن سے جھانک کے [illegible] کی لیکن اُس کا چہرہ مجھے پھر نظر نہیں آیا۔

علاقے کا تھانہ دُور نہیں تھا۔ گاڑیوں کی [illegible] لوگوں کی بھیڑ ہونے کی وجہ سے تھوڑی [illegible] کی ساری دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ چند منٹ [illegible] دروازہ کھلا تو ہم تھانے کے احاطے میں تھے۔ سپاہی [illegible] اور سنگینیں لیے ہر جانب پھیلے ہوئے تھے۔

سب کو ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ وہ حوالات [illegible] لیکن آنے کے بعد وہاں سے باہر نکلنے [illegible] پر سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کو کسی دوسرے [illegible] میں رکھا گیا ہوگا۔ کمرے میں بیلن کی سیاہ چھپلی ہوئی تھی [illegible] چھوٹی میز، دو کرسیوں اور دیواروں کے ساتھ لوہے کی [illegible] کے سوا کچھ نہیں تھا۔ درمیان میں چھت سے [illegible] ایک بلب لٹک رہا تھا۔ فرش سنگی تھا۔ میرے [illegible] ہو رہا تھا۔ سب دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے فرش پر بچھ [illegible] گئے۔ پہلے ہی سب کے کپڑے گندے تھے اور [illegible]

سے کیا فرق پڑتا تھا۔ جینی سب سے زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ٹانگیں سکیڑ کے لیٹ گیا۔ جاکر اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہمیں وہاں آئے ہوئے گھنٹے بھر سے زیادہ ہوگیا۔ کوئی ہمیں پوچھنے نہیں آیا۔ نہ قبھل لوٹا۔ مچھروں نے جینا دشوار کر دیا تھا۔ پلٹو ابتدا میں گولیاں بک رہا تھا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو گھٹنوں میں سر دیے چپ بیٹھ گیا۔

اڈے پر اس کمرے میں لانے سے پہلے انھوں نے ہماری تلاشی بھی نہیں لی تھی۔ تلاشی لیتے تو نے دیکھ کے ان کی آنکھیں ضرور خیرہ ہوتیں۔ رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن جھینگروں کے شور اور ہراتے ہوئے بگلوں کی گونج بڑھ جانے سے وقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے ہوں گے۔ قبھل واپس نہیں آیا۔ سپاہیوں نے ہم سے کھانے کو بھی نہیں پوچھا تھا۔ سولم نے اُن سے پانی منگوا لیا تھا۔ صبح سے اب تک ہم نے صرف پانی پیا تھا۔ قبھل کے نہ آنے کی وجہ سے بھی بے چین تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے اسے ہم سے علیحدہ کیوں کر دیا تھا۔ اب کون سی بات پوچھنے کو رہ گئی تھی۔ اس کے روکنے کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ رتنا تھانے آ کے مکر گیا ہوگا یا ہو سکتا ہے ہم سے چوک ہو رہی ہو۔ رتنا کے سوا کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی اعتراف کر لیتا مگر جیسے ہی رتنا کے حواس درست ہوئے ہوں گے اُسے اپنے کیے ہوئے کی سنگینی کا اندازہ ہوا ہوگا۔ مگر ایک رتنا ہی اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھی بھی اُس کے شریک تھے اور جیسا کہ قبھل نے انسپکٹر داؤدیال کو اشارہ کیا تھا کہ سلطانی گواہوں کی موجودگی میں ایک رتنا کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے بہت سے آدمیوں میں دو ایک آدمیوں کو زندگی یقیناً زیادہ عزیز ہوگی۔ ہم میں سے کوئی ہاتھ اور جوشی کے ساتھ بیٹھک میں نہیں گیا تھا مگر جب وہ واپس رتنا کو لے کے آئے تھے تو اُن کے چہروں پر چھائے ہوئے اضطراب سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی سمجھ کے کچھ جان کے آئے ہیں۔ کوئی ایسی بات جو اُن کی توقع کے خلاف تھی۔ پھر تھانے لے چلنے کے لیے جوشی کا مکر ہی سے قبھل کے متوحش ہونے کا بھی یہی سبب ہوگا کہ یہ قبھل کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ وہ لے تھانے لے کے آ گئے اور اب نے روکے ہوئے تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کب تک یہاں رہنا پڑے۔ ساری رات، سارا دن اور نہ جانے کتنے دن۔ سب کے جسم فرش پہ اینٹھے ہوئے لوتھڑے سے پڑے تھے۔ ایک دوسرے پر ڈھے ہوئے جیسے اب ان

میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ سب ہار گئے ہوں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھی کو اپنے دل میں برا بھلا کہتے ہوں گے۔ کہتے ہوں گے کہ اس کا سایہ ہی نحوس ہے۔ ہر روز ہزاروں کی گنتی کم ہو جاتی ہے ایسے موت کیوں نہیں آ جاتی۔ کپتن خاں کا خیال کر کے جامو کے سینے میں دھواں بھر جاتا ہوگا۔ شولی لالا سارے ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ ہر بات زبان ہی سے نہیں کہی جاتی، آنکھیں کہتی ہیں چہرہ کہتا ہے۔ اُن کی چبھتی نظریں مجھے اپنے چہرے اپنے سارے جسم پر محسوس ہوتی تھیں اور مجھے خود اُن کے سامنے نگاہیں اٹھاتے ڈر سا لگتا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا۔ بلاکو نے مجھے جھنجوڑا: "لالے سن رہا ہے؟"

میں نے ہڑبڑا کے اٹھ کے دیکھا۔ تھانے میں اچانک کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ کوئی بری طرح آہ و بکا کر رہا تھا۔ آوازیں قریب کی نہیں تھیں۔ سب چونک اٹھے۔ ایک خیال میرے دل میں سردی کی لہر کی طرح اٹھا اور میں نے ذرا اُسے جھٹک دیا۔ کوئی جانی پہچانی آواز نہیں تھی۔ پھر وہ صدائیں بڑھتی گئیں۔ جینی بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سولم نے دروازے کے پاس جاکے سپاہیوں سے پوچھا: "کس کی [illegible]"

"تیرے بھائی بند ہی ہوں گے [illegible]" وہ قہقہات [illegible]

سولم کا پوچھنا بے کار تھا۔ سپاہیوں کو کیا معلوم ہوگا [illegible] ترکیب سے ہمیں کھڑے ہراتے رہتے تھے۔ حوالات سڑاک اور چیخیں۔ ایک کے بعد ایک ولتی ہوئی آواز۔ یہ آوازیں بہت دیر تک تھانے کے در و بام میں سنسناتی رہیں۔ کبھی تیز کبھی تیز، پھر ایک دم گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہمیں اپنے کمرے کے باہر چاپیں سنائی دیں۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ سب کھڑے ہو گئے۔ اُن میں قبھل کی چاپ الگ سے پہچانی جا سکتی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ جیسے ہی [illegible] انسپکٹر داؤدیال کے ساتھ قبھل کمرے میں داخل ہوا، میری نظر سب سے پہلے اس کے پیروں پہ گئی اور میری گردن خود بخود جامو کے شانے پر ڈھلک گئی۔ جامو نے مجھے زور سے چمٹا لیا۔ قبھل کے [illegible] میں سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

داؤدیال دروازے ہی سے لوٹ گیا۔ قبھل فرش پہ بیٹھ گیا۔ سب اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے [illegible] انگارہ [illegible] "یہ بھی کوئی بری نہیں ہے۔ کچھ [illegible] نہیں ہوگا؟"

"بھوک ہی سال نہیں ہے استاد؟" سارنے منہ بناکے [illegible] "سو جا بگے میں زیادہ قائم نہیں ہے۔ تھوڑی دیر پڑ تو ڈال لو۔" قبھل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"نیند بھی نہیں پٹ رہی ہے استاد!" بلاکو لیٹے لیٹے ہی بولا اور قبھل کے کہنے لگا: "تمہارا کیسی رہی؟"

"سورا لوٹنے دے رے۔" قبھل ٹانگیں پھیلا کے فرش پر لیٹ گیا۔ سارنے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ سبھی کروٹیں بدلتے رہے۔ قبھل کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار بھی بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ قبھل نے کچھ نہیں بتایا تھا اور جاننے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ بیچارا زردا، مارتی اور ابا جان بھی ادھر ہوٹل میں جاگ رہے ہوں گے۔ ابا جان نے بیرے سے ضرور پوچھنا چاہا ہوگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ نہ جانے بیرے نے انھیں کیا جواب دیا ہوگا۔ کہا ہوگا "بڑے صاحب آپ کیوں فکر کرتے ہیں ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج آتے آتے کہیں رک گیا ہے یا رستہ ہی بھول گیا ہے۔ رات کھنچتی ہی جا رہی تھی۔ امی جان کہتی تھیں ہم سب سے کہا کرتی تھیں "خدا نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کی ہے۔ خدا کے سوا کسی کو بھی دوام نہیں ہے۔" شاید اندھیرے کی حد بھی تمام ہو گئی تھی۔ رات کی چادر کھنچتے کھنچتے آخر پھٹ گئی۔ امی جان کی باتیں اس وقت بھی ہماری سمجھ میں آتی تھیں کبھی نہیں۔ میں اُن سے طرح طرح کے سوال کرتا رہتا۔ مجھے یاد ہے جب اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تو وہ ڈانٹ کر کہتیں "بس ایسا ہی ہے۔ تو بہت نیتی ہے، بال کی کھال نکالتا ہے۔"

وہ ہوتیں تو میں اُن سے پوچھتا "امی! بہت سی صدیاں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بہت سے اندھیرے تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ رات ہوتی ہے، دن نکلتا ہے مگر اندھیرا نہیں جاتا۔ بہت سے اندھیرے سورج کی روشنی بھی دور نہیں کر سکتی۔ نہ اندھیرا جاتا ہے، نہ موت آتی ہے۔"

صبح ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ کسی سپاہی نے دروازے سے آواز لگائی: "استاد قبھل! تیار ہو جاؤ۔"

قبھل نے سارنے کے زانو سے سر اٹھایا اور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کسی کی آنکھ ہی نہیں لگی تھی جو اٹھنے میں وقت لگتا۔ قبھل کے کہنے پر سب یک لخت کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی ایک طرف ہٹ گئے اور ایک سپاہی ہمیں

تھانے کے عقبی حصے میں لے آیا۔ وہاں کھلے ہوئے نلوں سے تر تر پانی بہہ رہا تھا۔ قبھل، جامو، سارنے اور میرے سوا سبھی نے اپنے سر نلوں کے نیچے کر دیے۔ منہ ہاتھ دھو کے ہم واپس اسی کمرے میں آئے تو میز پہ ناشتہ لگا ہوا تھا۔ کچوریاں، سلائس، مکھن اور چائے۔ ایک سپاہی گلاسوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ منہ کو سب کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہر ایک نے دو دو گلاس چائے پی اور کچھ نہ کچھ ضرور کھایا پھر بھی پلیٹوں میں بچا رہ گیا۔ ناشتہ کرتے کرتے میں خاصا اُجالا ہو چکا تھا مگر ہم اُس وقت تک وہیں رہے جب تک دوسری بار سپاہی نے آ کے ہمیں باہر آنے کو نہیں کہا اور وہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ہی آ گیا تھا۔

دالان میں ہمارے پہنچتے ہی ایک جانب سے انسپکٹر داؤدیال آ گیا اور اس کے ساتھ ایک دوسرا افسر سب انسپکٹر شیو قی۔ دونوں کے چہرے نکھرے دُھلے ہوئے تھے۔ لباس بے شکن تھا اور داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں مگر ہماری چہرے اور ماتھے کی شکنیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کے دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ دالان کے سامنے وہی گاڑی کھڑی تھی جو گزشتہ رات ہمیں اڈے سے لائی تھی۔ داؤدیال ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر سورتی اور دوسرے سپاہی گاڑی کے پچھلے بند حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھے۔ آدھ پون گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی جس عمارت میں جا کے ٹھیری وہ میری اچھی طرح دیکھی بھالی ہوئی تھی۔ جس وقت میرا مقدمہ جاری تھا، مجھے روز ہی جیل سے یہاں لایا جاتا تھا۔ قبھل آہستگی سے نیچے اُترا۔ پھر اس نے جامو کو بلایا اور سارنے کو بھی۔ مجھے یا اور کسی کو نہیں۔ باقی سب کو وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کر کے وہ چلا گیا۔ سپاہیوں میں بھی صرف دو سپاہی ہماری نگرانی کو رہ گئے تھے۔ دھوپ خوب چڑھ آئی تھی اور کچہری میں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ گاڑی کھلی ہوئی تھی اور ہم آتے جاتے لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہی لوگ اُسی طرح کے لوگ۔ ہتھکڑیاں لگے منہ چھپائے سر جھکائے لوگ۔ عمارت میں آج بھی بھیڑ تھی جتنی نو سال پہلے ہوتی تھی۔ جیسے کل کی بات ہو جیسے کل رات ہی گزرا تھا جیسے جدا ہوئی ہو۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ قبھل کوئی دو گھنٹے بعد لوٹا۔

گاڑی کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا اور کچھ دیر بعد جب اُسے دوبارہ کھولا گیا تو ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ گاڑی اڈے کے باہر کھڑی تھی۔ سب کے حواس گنگ تھے۔ چند لمحوں تک تو سب پر سکتہ سا طاری رہا۔ پھر سب ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

ہی کھانے کو چاہتا ہی نہیں تھا لیکن سب نے اصرار کر کے فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان پر ہمیں بٹھا دیا۔

رات گئے علاقے کے بھی لوگ واپس چلے گئے مگر اڈے کے وہ سارے آدمی جن کے گھر موجود تھے اپنے گھروں کو نہیں گئے۔ سارے ججھل کو اوپر والے کمرے میں لے گیا، سب ادھر اُدھر مختلف کمروں میں پڑ گئے یا صحن ہی میں دریاں بچھا کے لیٹ رہے۔ کانتے، جامو، لیلا اور جینی کے ساتھ میں بھی اوپری منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ زرینہ کو جب میں نسترن کے چنگل سے چھڑا کے اڈے پر لایا تھا تو وہ یہیں ٹھہری تھی۔ سب گم صم سے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ نصیب میاں بھی کچھ دیر بعد اوپر آ گئے اور ہمیں چپ دیکھ کے تسلیاں دینے لگے اور وہ خود ہی سب کچھ بتانے لگے۔ پھر لیلا بھی چپ نہ رہ سکا اور کانتے کی زبان بھی آگ اُگلنے لگی۔ ساری رات یوں ہی گزر گئی۔ اُوپر آسمان پر کبھی تارے نکل آتے، کبھی بدلیاں چھا جاتیں۔ صبح کے قریب ہلکی ہلکی بوندیں گرنے لگیں مگر سب چارپائیوں پر پڑے رہے۔ اُن کے چہرے پہلے ہی بھیگے ہوئے تھے، رات بھر بھیگتے رہے تھے۔ کسی کو ایک پل کے لیے نیند نہیں آئی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا جیسے ہی پیرو کو تھانے سے ہماری اڈے واپسی کی اطلاع ملے گی وہ سیدھا اڈے کا رُخ کرے گا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اُسے خبر نہ ہوئی ہو۔ کل تھانے جانے کے لیے ہم گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو وہ موجود تھا گویا وہ سارے دن علاقے ہی میں منڈلاتا رہا تھا چونکہ اُسے یقین ہو گا کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے ہمارے قدم سیدھے اڈے کی طرف بڑھیں گے لیکن ہم آگے گئے ہی نہیں، وہیں اسٹیشن سے قریب پڑنے والے بڑے تھانے کی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ممکن ہے وہ علاقے کے تھانے کے اطراف بھٹکتا رہا ہو۔ ہم وہاں جاتے تو اُسے دکھائی دیتے مگر رات کو اُس نے اپنی آنکھوں سے ہمیں پولیس کی گاڑیوں میں بیٹھے دیکھا تھا اور اُسے خوب اندازہ ہو گا کہ ہم اپنے علاقے ہی کے تھانے میں جا سکتے ہیں چنانچہ اس نے کسی بھی ذریعے سے سُن گن لینے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ تھانے کے قریب کسی ہوٹل میں بیٹھ کے کسی سپاہی سے رابطہ قائم کر کے۔ ہم صرف ایک رات وہاں رہے تھے، صبح ہوتے ہی کچہری چلے گئے تھے۔ رات کو تھانے کے گرد اُس کا چکر لگانا مشکوک ہوتا اور اُسے کچھ پتہ بھی نہ چلا لیکن ہم دوپہر کو تو اڈے واپس آ گئے تھے۔ ہمیں تھانے جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد کیا وہ مایوس ہو کے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گیا۔ اس کے خیال میں تھانے سے ہمارا ایک آدھ گھنٹہ مشکل تھا اور اُس کا اِدھر اُدھر کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُسے سب معلوم ہو گیا ہوگا۔ جاننے کے باوجود وہ نہیں آیا۔ اُسے کچھ اطمینان ہو گیا ہوگا یا وہ ججھل کی جانب سے بلاوے کا منتظر تھا۔ اڈے پر ہماری واپسی اور رتنا کے اندر جانے کے بعد وہ زیادہ محفوظ ہو گئے تھے۔

مجھے بار بار خیال آتا تھا اگر ہم سیدھے اڈے پر چلے آتے تو شاید سب کچھ بدلا ہوا ہوتا۔ ہم ایک دن بعد اس طرح اڈے پر موجود نہ ہوتے۔ کہاں ہوتے؟ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے شک پھر سینے پر اتنا بوجھ نہ ہوتا۔ رتنا اور اُس کے آدمیوں کو لاشوں میں تبدیل کرنے کے بعد ہی ہم اڈے سے نکلتے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا دیکھ لیتے لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ جتنے لوگ یہاں موجود تھے، ان میں سے پھر کوئی بھی باہر نہ آتا۔ کانتے، نصیب میاں، لیلا اور دوسرے سب لوگوں کے چہرے پھر کہیں اور ہی دیکھنے نصیب ہوتے۔ رتنا کو ختم کرنے اور اڈے پر بیٹھ جانے کے بعد پولیس کو ہمارے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگتی چاہے ہم رتنا اور اُس کے آدمیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے اور ان کی قبروں کی راکھ پر بھی کسی کی نظر نہ پڑنے دیتے لیکن پولیس والے ہی پاس اُن کا پتہ لے پہنچنے آتی۔ ہم تصور ہی کر سکتے تھے کہ پھر کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ بدرو کی باتیں سننے کے بعد سب کی آنکھوں میں خون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ججھل جب اچانک تھانے کی چار دیواری میں جانے لگا تھا تو سب کو اچنبھا ہوا تھا اور پولیس افسروں کے سامنے اتنی دیر تک اُس کی فضول باتیں سُن کے سبھی کے جسم کھولا رہے تھے۔ اس وقت کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب کے دل میں ایک ہی بے کلی تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد اڈے پر پہنچ جائیں۔

مجھے ان میں جانے پر کہیں بھی پڑ سکتے تھے۔ بدرو اور ہریالے نے جو کچھ کہا تھا اس کی تصدیق پولیس کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی بدرو کے قول پولیس کو ہماری تلاش تھی تو ہمیں اس سے چھپنا بھی نہیں چاہیے تھا ورنہ بدرو نے مشورہ دیا تھا کہ ہم اسٹیشن ہی سے لوٹ جائیں۔ پولیس ہی سے ہمیں اپنی تلاش کی اصل وجہ معلوم ہو سکتی تھی۔ ہم اڈے کی طرف جا رہے تھے لیکن ہو سکتا تھا کہ ہم کبھی وہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ راستے

چلتو ٹرک کے رُکنے لگا اور اس نے سبھی کی آنکھیں جکڑ دیں۔ انسپکٹر واڈ دیال بھی گاڑی سے اتر آیا تھا اور ایک طرف کھڑا تھا۔ بازو تھامے کچھ کہہ رہا تھا، اُس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ گلی میں دیکھتے دیکھتے لوگ پھر جمع ہونے لگے تھے۔ اڈے کے رسمی مالک مُول چند نے آ کے تالا کھولا۔ ساری عمارت ویران پڑی تھی۔ بڑے دروازے سے کمرے تک کے کھلے حصے میں سامنے فرش پر رتنا کے آدمیوں کا کل کا خون جما ہوا تھا۔ سارے کمروں کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ گلی کے لوگ عمارت میں گھس آئے اور پھر تو اُن کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ جو بھی آتا کچھ نہ کچھ لے کے خود آتا۔ پھولوں اور مٹھائی کے دونوں کا انبار لگ گیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہے تھے۔ ججھل صحن کے وسط میں پڑی ہوئی چوکی پر آکے بیٹھ گیا تھا اور جتنے کہنے اُس کے منہ میں دبی ہوئی تھی۔ تنخیاً متھیار اس کے لیے تازہ حقہ بھر کے لایا تھا۔ سب ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ آنے والوں کو بھی اس خبر پر یقین نہیں آیا ہو گا کہ ججھل اڈے پر واپس آ گیا ہے اس لیے وہ خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے آ رہے تھے۔ کوئی اُس کے ہاتھ پکڑتا، کوئی پیر چھوتا، کوئی سلام کرتا، خیریت پوچھتا، رتنا کی شکایت کرتا، کوئی رونے لگتا اور کتن خان کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اسی دوران ہریالا اور بدرو اُس ہوٹل سے ہمارا سامان لے آئے تھے جہاں کل صبح اسٹیشن سے نکلنے کے بعد ہم نے اُسے چھوڑ دیا تھا مگر کسی نے کپڑے نہیں بدلے۔ سہ پہر ججھل کو ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی اور سہ پہر کو ہی گلی میں ایک بار پھر شور اُٹھا۔ ہم سب باہر کی طرف بھاگے۔ وہ سب آ رہے تھے۔ وہ سب۔ سب سے آگے کانتے تھا، برابر میں نصیب میاں، نکھوا، گھگو، لیلا، ہرچیان اور اُن کے پیچھے وہ سب۔ گلی ہی میں دُور دُور تک انہی کے سر نظر آتے تھے۔ سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں ویران اور چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔ کانتے نے جیسے ہی دیکھا، دیوانگی سے میری طرف جھپٹا ہوا لپکا۔ اِدھر سے میں بڑھا۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھتا اور مجھے چھو لیتا۔ میرے گالوں کو پیار کرتا۔ کبھی میری ٹھوڑی چومتا، کبھی پیشانی۔ پھر میرے سینے پر اُس کا سر ڈھلک گیا، وہ سسکنے لگا۔

میں اُسے سنبھالنا چاہتا تھا مگر میرا جسم خود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اُسے دلاسا دیتے ہوئے میری زبان کانپنے لگی اور آنکھوں سے آنسو چھوٹ پڑے۔

اچھا ہی ہوا کہ جامو نے جھٹ بیچ میں آ کے اُسے میرے بازوؤں سے کھینچ لیا اور نصیب میاں میرے سینے سے لپٹ گئے۔ پھر گھگو، لیلا، ہرچیان، اکبر، نکھوا۔ یقین کسی کو کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ ہوش اس وقت آیا جب ججھل کی بھاری آواز گونجی: "اندر چلو رے۔"

ججھل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے سب ہمیں چھوڑ کے دیوانہ وار اُسی کی جانب دوڑ پڑے اور انھوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ "اندر چلو۔" ججھل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

اندر آ کے وہ بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ بار بار گلے ملتے۔ کوئی دوڑ کے اُس کے پاس جاتا، کوئی اِس کے پاس۔ کسی ایک جگہ کوئی ٹکتا ہی نہ تھا اور کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ کوئی زبان کھولنے کی کوشش کرتا تو آواز ساتھ نہ دیتی۔ بس وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے، پھر جھپٹ کے اپنی آغوش میں بھر لیتے۔ ہماری واپسی کی انھیں کوئی اُمید بھی نہ رہی ہوگی یا انھوں نے بہت شدت سے انتظار کیا تھا۔ سب ٹوٹے پھوٹے، بکھرے ہوئے سے تھے۔ لگتا تھا، وزنی بوجھ سینے سے وہ اپنی آنکھوں اپنے سینے پر جبر کرتے رہے ہیں۔ انھیں اڈے پر موجود علاقے کے لوگوں کا بھی خیال نہیں آیا۔ ججھل سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ اُس کی گود میں اُس کے ہاتھوں اُس کے پیروں پر سر رکھے بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔ کانتے دیر تک ججھل کے زانوؤں پر سر رکھے سسکیاں بھرتا رہا۔ ججھل نے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر کانتے کی آنکھوں کی جھڑی نہیں تھمی۔ اُدھر جامو بیٹھک کے قریب نصیب میاں سے چمٹا ہوا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ نصیب میاں نہ جانے اُس سے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

اب تک کسی نے دھیان نہیں دیا تھا مگر لیلا کو خیال آ ہی گیا۔ میرے پاس آ کے وہ بے قراری سے پوچھنے لگا: "وزیر کدھر ہے؟" میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میری خاموشی پر اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ صرف وزیر ہی نہیں سلطان اور مٹھن میاں بھی ..... لیکن لیلا نے پھر کسی کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔ اُس کا منہ بگڑنے لگا تھا، میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

اڈے پر پہلے ہی خاصے لوگ موجود تھے۔ اُن کے آنے سے صحن بھر گیا۔ باہر سے لوگوں کی آمد رات تک جاری رہی۔ سیٹھ مول جی اور گلی کے دوسرے لوگوں نے سب کے لیے رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کتن خان اور اس کے ساتھ جانے والوں کی موت کے کھانے کا اُدھار اُن پر واجب تھا۔ کسی کا

ں میں ہمارے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں اور پھر پولیس کا
و یہ نہ ہوتا اُن کے طور کا اندازہ ہمیں ابتدا ہی میں ہو گیا تھا۔
ں وقت جب تھانے میں ہمارے آنے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔
ں کا رویہ اس سے قطعاً مختلف ہوتا اگر وہ ہمیں خود کھینچ کے
تے اور ہماری تلاشی لے کے تمنچے اور ہتھیار برآمد کرتے۔ وہ ہم
ر پوچھتے کہ ہم اتنے دنوں کہاں رہے ہیں۔ ہم وہی جوابات دیتے
م نے دیے تھے۔ ہم اُنھیں کبھی نہ بتاتے کہ ہندوستان میں تھے
نہیں لیکن شاید وہ اس طرح نہ سمجھ پاتے جس طرح اُنھوں نے
ے سمجھا بوجھا تھا۔

رتنا کیوں اندر نہیں گیا؟ رتنا نہیں تو پھر اور کون تھا؟
ن خاں نے اتنے مختصر عرصے میں اتنے بڑے دشمن کیسے پیدا
لیے۔ ہمیں ذرا سا بھی پتہ نہیں تھا کہ ہمارے وارنٹ نکلے ہوئے
یا نہیں۔ اُنھوں نے وارنٹ نکالا اس لیے جاری نہیں کیے
کہ ہم کس طرح کلکتے واپس آ جائیں۔ تھانے سے نکل کے جیسے
علاقے میں داخل ہوتے تھے دیکھے کبھی نہ جا پاتے۔ اڈّے پر
کے سامنے ہم لیں اپنے ہاتھ رکھ کے رکھ سکتے پہ تیار ہوتے،
ں آنکھیں بھٹکی رہتیں اور ہمارے پاؤں اوندھے سیدھے
نے پولیس بھی اڈّے پر آنے میں آتی دیر نہ لگاتی اور وہ قجل
ا اتنا وقت دیتا۔ وہ اڈّے کی عمارت کے بجائے گلی کے نکڑ
تر تا۔ ہم اپنے ہی گھر چوروں کی طرح داخل ہوتے۔ اُنھوں نے
ی عدم موجودگی میں ہمارے بارے میں جو ذہن میں بٹھا لیا
وہ ہماری اپنی ہی وجہ سے تھا کہ ہم موجود نہیں تھے۔ اُنھوں
دوسرے شہروں کی پولیس سے بھی ہمارے متعلق تفصیل
رابطہ رکھا ہوگا اور ہر جگہ سے اُنھیں نفی میں جواب ملا ہوگا۔ وہ
ن حوالات میں رکھ کے ہمیں جیل بھیجنے کی اجازت حاصل
اُن کے لیے مشکل نہیں تھا اور پتہ نہیں وہاں سے ہماری
سب ہوتی۔ اڈّے سے نکلنے کے بعد یا اڈّے پہ ہماری موجودگی
دران وہ ہم تک پہنچتے تو پھر واپسی اُنھی کی مرضی پر منحصر ہوتی
ں بات پر کہ ہم نے رتنا کے ساتھ کتنی رعایت کی ہے یا
ایت نہیں کی یا دو ہر شہر کے اڈّوں کے اُستاد پولیس کے
یں روز نیا شوشہ چھوڑ کے ہمارے دن بڑھاتے رہتے۔

اڈّے پر اُس رات ایک نصیب میاں ہی تھے جو بچ گئے
ن کا کہنا تھا کہ سب کچھ اچانک ہوا۔ معمول کے مطابق رات
رت کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ اندر پندرہ آدمی
ت دو جنھیں چار دن سے کپتن خاں نے اُس وقت تک
ی اجازت دے دی تھی جب تک وہ اپنا کوئی انتظام نہ

کر لیں۔ تینوں کلکتے میں نووارد تھے۔ اُنھوں نے بتایا تھا کہ وہ ڈل سے آئے ہیں اور پولیس اُن کا پیچھا کر رہی ہے۔ اُس رات تینوں اچانک غائب ہو گئے۔ نصیب میاں یا کسی اور کے ذہن میں دُور دُور تک گمان نہ تھا کہ وہ رتنا کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے وقت وہ کسی کی طرف اشارہ نہیں کر سکے مگر پندرہ دن بعد اُنھیں جب رتنا کے اڈّے پر بیٹھنے کی خبر ملی تو اُن کے ساتھ بھی نے شور مچایا۔ اُن کے پچھلے بیانات مختلف تھے پھر بھی پولیس نے رتنا کے سلسلے میں ہر طرح کی تفتیش کی ہوگی لیکن رتنا نے ہر گوشہ بند کر رکھا تھا، کوئی روزن کھلا ہوا نہیں تھا۔

کاٹنے کہتا تھا کہ جیسے ہی وہ کلکتے واپس آیا، اُسے اڈّے تک نہیں پہنچنے دیا گیا، راستے ہی میں روک لیا گیا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ وہ فیض آباد اور بمبئی گیا ہوا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس ہولین کے گھر یا زرّیں کی حویلی پہنچے۔ وہ یہ بات کسی وقت بھی بتا سکتا تھا جب کوئی چارہ نہ ہوتا۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد اُس کے لیے بھی سب کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ وہ سیدھا اڈّے کی طرف جا رہا تھا لیکن اُسے جیل پہنچا دیا گیا۔ وہاں اڈّے کے دوسرے ساتھی بھی موجود تھے۔ کاٹنے نے اُن کی باتوں اور پولیس کے رویّے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ابھی جیل سے باہر نکلنا اُس کے اور دوسروں کے لیے مفید نہیں رہے گا۔ شاید اِس دوران قجل واپس آ جائے یا پولیس خود اصل لوگوں تک پہنچ جائے۔ اُسے کلکتے میں چلنے والی ہوائیں عجیب و غریب محسوس ہوتی تھیں۔ پولیس نے اُس پہ بید برسائے۔ پوچھ گچھ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں رہ گیا تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔ کاٹنے انکار کرتا رہا اور دانستہ چپ رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس کا دماغ ہی ٹھیک کام نہیں کرتا تھا۔ اڈّے کے اتنے لوگوں کے بیچ میں بھی وہ خود کو تنہا تنہا محسوس کرتا تھا۔ جو مناسب سے مناسب بات اُس کے سر میں آ سکتی تھی وہ یہی تھی اور وہ اس پہ کاربند رہا۔ اِس عرصے میں فیض آباد سے مجرو، بمبئی سے پیچھی، بھیجا یا آسنسول سے اُستاد موتی اُس کی خبر لینے آئے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی۔ کاٹنے نے یہ کہہ کر اُنھیں لوٹا دیا کہ اُستاد لیں اب آ ہی رہے ہوں گے اور وہ اُنھیں کسی وقت بھی بلا سکتا ہے۔ جیل میں اُس کے ساتھی ہر لمحے اُس پہ زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے جیل سے فرار ہونے کا خاکہ بھی بنایا۔ کاٹنے نے اُنھیں منع کر دیا اور ایک بار رتنا کی طرف سے ایک آدمی نے آ کے اُسے پیش کش کی کہ وہ جیل سے چھوٹ کے اپنے پرانے اڈّے ہی پر واپس آ نے۔ رتنا اُسے اپنا منتظر ملے گا۔ رتنا نے کہلوایا تھا کہ استاد قجل کا اُتا پتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کاٹنے نے جواب میں رتنا

کی طرف سے بھیجے جانے والے آدمی کو ہاتھ پھیلانے کو کہا۔ جب اُس نے ہاتھ پھیلایا تو کاٹنے نے اُس کی ہتھیلی پر تھوک دیا اور کہا جا کے اسے رتنا کے منہ پر مل دینا۔

کاٹنے بتا رہا تھا کہ اُس نے ڈیڑھ مہینے کا عرصہ جیل میں نہیں، جیسے کسی بھٹی میں گزارا ہے۔ بار بار اُس کے جی میں آتا تھا کہ وہ واقعے کے دوران اپنی عدم موجودگی کا ثبوت فراہم کر کے یہاں سے نکل جائے۔ کاٹنے کو بھی احساس ہوگا کہ رتنا نے کسی برتے پہ یہ جرأت کی ہوگی۔ اپنے اور دوسروں کے حق میں مبادا اُس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اس لیے کاٹنے خود کو تھامے رہا۔ وہ بمبئی سے پیرو والے کے آدمیوں، فیض آباد سے مجرو کے ساتھیوں، کلکتے کے کپتن خاں کے دوستوں اور آسنسول سے اُستاد موتی کے شاگردوں کو کلکتے بلا کے اڈّے کا رُخ کر سکتا تھا مگر اُسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اوروں کے کندھوں پہ بندوقیں رکھ کے چلائی جائیں۔ وہ خود ہی وہاں جانا چاہتا تھا اور کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔ اُسے قجل کا بھی انتظار تھا۔

قجل جیسا کہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہتھیار اُٹھانے سے پہلے تیشہ دیکھ لو، ہتھیار سر پہ رکھ کے چلاؤ۔ ظاہر ہے قجل کی مراد زر باقاعدہ تیشہ دیکھنے سے تھی نہ ہتھیار سر پہ رکھنے سے۔ ہمارے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ پیرو یہیں ابّا جان کو لے کے فیض آباد چلے جاتے تو وقت کی تنگی کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ جتنی دیر ہمیں تھانے میں لگی تھی، اتنی دیر میں رتنا کو پیرو، زردا اور طارق کے بارے میں یہ خبر نہیں مل پائی ہوگی کہ وہ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر پیرو کو ہم سے باتیں کرتے اسٹیشن پہ دیکھ لیا تھا تو پیرو ہمارے ساتھ ہی تھا۔ تاہم یہی کہ ہم رتنا کے پاس پہنچ گئے تھے شام کو ہم اُس کے پاس نہ پہنچ پاتے۔ تھانے میں ہمیں کچھ اور وقت لگ جاتا، ایک رات اور ایک دن یا کئی دن تو شاید رتنا کلکتے میں پیرو کی موجودگی سے بے خبر رہتا اور یہ جاننے کے بعد اُسے جا تو اُٹھا کے پیرو کے سامنے پہنچ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس کو اشارہ کر دینا کافی تھا۔ پیرو کے پاس رتنا کی بے خبری جتنا ہی وقت تھا۔ پیرو تک پولیس کے پہنچ جانے کا مطلب ابّا جان تک پہنچنا تھا جن کے پاس جادو کے پتھر صندوقوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی ایک جھلک سے نہ صرف ابّا جان اور پیرو کے سامنے کے دروازے بند ہو جاتے، ہماری اپنی زندگیوں کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔ جتنے کم سے کم وقت میں ہم تھانے سے نکل جاتے، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ آنے والا ہر لمحہ لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھا جو کسی وقت بھی ہماری گردن پر گر جاتا۔

گو پیرو کسی دو دھاری تلوار سے کم نہیں تھا۔ وہ کسی کے خود تک پہنچنے سے پہلے ہی اُس کی آہٹ سونگھ لیتا لیکن ہمیں اپنے طور پر اُسے اُلجھن میں ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہمارے لیے بس یہی ایک بہتر صورت تھی کہ ہم دوبارہ تھانے واپس آئیں تو رتنا اور اُس کے ساتھی بھی ہمارے ہمراہ ہوں۔

سب سویرے ہی اُٹھ گئے اور نہا دھو کے کپڑے بدل کے ناشتہ کیے بغیر اڈّے سے نکل گئے۔ علاقے کے بہت سے لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ پہلے ہم شمشان گھاٹ گئے۔ اتنے دنوں میں لاشیں جلوا کے سپرد کرنے کی راکھ بھی ہوا کہاں سے کہاں لے گئی ہوگی۔ جتنی دیر مندر کے پنڈت جی کچھ پڑھتے رہے ہم چپ چاپ کھڑے رہے۔ وہاں سے ہم قبرستان گئے۔ جن لوگوں نے کپتن خاں، شرل، فیضو، ولی، نصیب، بندے اور ساوو کو دفن کیا تھا، اُنھی نے اُن کی قبروں کی نشان دہی کی۔ گلی میں رہنے والے قاضی صاحب نے تلاوت کی۔ جامو کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ وہ کپتن خاں کی قبر سے چمٹ کے پھوٹ پھوٹ کے روتا رہا۔ قجل نے بہ مشکل تمام اُسے وہاں سے اُٹھایا۔ واپسی میں راستے بھر جامو گُم سُم بیٹھا رہا۔

اڈّے پہ آ کے قجل نے کئی آدمیوں کو شہر کے مختلف اڈّوں کی طرف جانے کی ہدایت کی اور کہا، "اُستادوں سے جا کے بولو کہ آج رات تک اُن کا ہر اچھا اڈّے پہ پہنچ جائے۔" قجل نے اور کوئی دوسری بات نہیں کی تھی۔ مجھے یہ سب قبل از وقت معلوم ہوتا تھا۔ اڈّے کے آدمی اُس کا پیغام پہنچا کے سہ پہر تک لوٹ آئے تھے۔ شام ہی سے اُستادوں کی آمد شروع ہو گئی اور رات گئے تک جن جن کو قجل نے کہلوایا تھا شاید ہی اُن میں سے کوئی باقی رہ گیا ہو۔ کوئی اُستاد نہ آ سکا تھا تو اُس نے رقم بھیج دی تھی اور جس نے رقم نہیں بھیجی تھی اُس نے خود آ کے قجل سے مہلت مانگ لی تھی۔ قجل نے اُن سے اپنے پیچھے ہونے والے واقعات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خود ہی طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ قجل چپ چاپ سنتا رہا۔

مرگھٹ اور قبرستان سے لوٹ کے قجل دن بھر بیٹھا ہی رہا تھا مگر صبح چلنے سے اُس کا زخم اور بگڑ گیا۔ دن میں دو بار مدن پہلوان نے مرہم پٹی کی تھی اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک جگہ بیٹھا رہے یا بستر پہ آرام کرے۔ دوپہر کو اُسے تیز بخار آ گیا تھا لیکن وہ بیٹھک میں آنے والے اُستادوں اور دوسرے لوگوں سے ملتا رہا اور حقہ پھونکتا رہا۔ دوسرا دن بھی گزر رہا تھا۔ پیرو، زردا اور طارق میں سے کوئی بھی اڈّے پر نہیں آیا۔ قجل جیسے کلکتے میں اُن

ی بھول گیا تھا یا وہ بھی کہیں راستہ بھٹک گئے ہے
یاد میں ہی جھبل کر اشارہ کرتی ہیں اور کہوں۔ سب میں آباجان
کے فیض آباد چلا جاتا ہوں لیکن جھبل کا جسم جھٹک رہا
ی حالت میں اسے چھوڑ کے ایک لمحے کو بھی میں کہیں جانے
کرتا تھا۔ اگر وہ خود ہی فیض آباد جانے کا ارادہ کرتا تو
ابھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہیں اسے آرام مل سکتا تھا
و کچھ بحال سے وہ چند دن میں ٹھیک ہو جاتا۔ زرین کے
ہ درتی اور زرین کی بات وہ ٹال بھی نہیں سکتا تھا مگر
وقت اس کے کلکتے سے ہٹنے کا نہیں تھا۔ نہ اس کی
فیض آباد تک کے سفر کی متحمل تھی۔ وہ انہیں بھولا تو
اس کے ذہن میں کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اس
اڈے پر نہیں بلایا یا کوئی آدمی ادھر نہیں بھیجا۔ مجھ
نہیں جا کے دیکھنے کو نہیں کہا اور جب اس نے خود
ت نہیں دی تھی تو میرے کہنے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔
ت کا اوپری منزل پر سونے کے لیے ہم پہنچے تو کاننتے
ی پر ہی آ گیا اور مجھ سے لپٹ کے ٹھنڈی ٹھنڈی سانس
اس سے ایک بات پوچھنے کے لیے کئی مرتبہ میرے
آئی تھی لیکن کوئی مناسب موقع ہی نہیں ملا جو
شب پارہ کے متعلق پوچھتا۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے
فرار کر کے وہ اسے کرمین بیگم کے ہاں سے لے آیا
ا تو وہ میرے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ میں نے جھجکتے
میں اس سے شب پارہ کا ذکر کیا تو وہ بے چین ہو گیا۔
آتی تھی کہ تو نے اب تک اس کے بارے کوئی
نہیں کی۔" وہ اداسی سے بولا۔ "کیا تو جانتا تھا کہ اس
نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"
جھوٹ؟" میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔
میری بات کا یقین آ گیا تھی؟"
ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔
نے اس رات مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے پیچھے چھوڑ
میں تھا کہ جب میں اوپر پہنچا تو سوائے باجے بیلے
کوئی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے بولا کہ کرمین سو رہے
شبانے کو لے کے بھاگ گئی ہے۔"
نہیں۔" میں نے ڈولتی آواز میں کہا۔
شہزادہ کے ساتھ جاتا تھا اس واسطے میں نہیں
آدمی لئے اسی دن سے کے شہر سے نکل گئی تھی۔"

نے اس سے زیادہ دینے کو کہا تھا۔ پھر وہ اسے کیوں لے گئی۔

"- لے گئی دل میں خرابی آ گئی تھی اور ہو سکتا ہے کہ وہ سیٹھ نے اپنے آنے کے بعد کچھ بڑی بولی دے کے کسی کو بھیجا ہو۔ بیلدل بیٹھے لگو شبانے کی قسمت ہی خراب تھی۔

"- میں اسے کدھر ڈھونڈتا۔" کاننتے بولا۔ "پر میں نے سوچ لیا تھا، اپنے کو پتہ چل گیا تو اس سالی حرام کی ذنی کی آنکھیں بھی نکل لوں گا۔ میں نے بیرو کو فیض آباد، کپتن خاں کے نوکروں کو لکھنؤ، ماہم کو بمبئی بھیجی ڈال دی تھی کہ اس پاس جدھر بھی اس حرکتے کی عورت دکھائی دے اپنے کو ترت لکھو۔"

"- تو کیا تجھے وہ مل گئی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"- وہ نہیں ملی، پر تیسرے دن کی بات ہے، میں پیچھے ... میں اسے بیٹھا تھا کہ ہرا بھاگا ہوا آیا، بولا، کاننتے استاد... ابھی ادھر ایک مائی برقع اوڑھے کھڑی تھی، نام لیتی ہے اپنا۔ سر گھوم گیا، جا کے دیکھا تو وہ ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی، منہ ڈھکا ہوا تھا، مت پوچھ لاڈلے، اپنا کیا حال ہوا، دو دیر تک سر سے پیر تک اس کو دیکھتا رہا۔"

"کیا وہ شبانے تھی؟" میں نے اچھل کے پوچھا۔

"- ہی تو میں بولتا ہوں، اپنا مغز بالکل پھر گیا تھا۔" کاننتے نے مجھے زور سے دبوچ لیا۔ "وہ شبانے ہی تھی۔" وہ تیزی سے بولا اور کہنے لگا کہ وہ اکیلی تھی، اس کے ہاتھ لرزتے تھے، گلابی پاؤں ... حمل میں آئے ہوئے تھے مگر چہرے پر تکلیف پڑی ہوئی۔ کاننتے اسے بس تا جبر کے بغیر اوپر کے فلیٹ میں لے آیا۔ اس نے نقاب الٹی تو کاننتے کو اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ شب پارہ کے رخساروں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں ویران اور سہمی ہوئی تھیں۔ "کاننتے بھائی! میں آ گئی ہوں۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کاننتے سے کہا اور بتایا کہ کرمین بیگم اسے زبردستی بیلی سے لے گئی۔ اس نے لاکھ منع کیا کہ کرمین نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ اس کے ساتھ چلی تو گئی لیکن راستے بھر روتی ہوئی اور اس نے راستے ہی میں دل پکا کر لیا۔ بنارس کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو کرمین بیگم سو رہی تھی۔ شب پارہ نیچے اتر آئی اور دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی الہ آباد جا رہی تھی۔ الہ آباد سے وہ کلکتے جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ زنانے ڈبے میں بیٹھ کے ڈبے سے تبھی اتری جب کلکتہ آ گیا۔ کلکتے میں بیٹھ کے وہ سیدھی اڈے پر چلی آئی۔ کاننتے نے ... سے لگا لیا۔

وہ بہت بدحال تھی۔ کاننتے نے اس کے لیے دو دیر تک

نیا جوڑا سلوایا۔ اڈے پر شمول، لالا اور کپتن خاں کے سوا کسی اور کو اس نے شب پارہ کی صورت نہیں دیکھنے دی۔ کپتن خاں ان میں کئی مرتبہ اسے پوچھنے جاتا تھا۔ لالا اور شمول بھی ہر وقت اس کی چوکسی میں رہتے تھے۔ چار دن تک وہ زرین کی طرح اڈے ہی پہ رہی۔ کاننتے کہتا تھا، جب تک اس کا اصل ٹھکانہ ہو واپس نہیں آیا، اسے نیند نہیں آئی۔ چار دن میں وہ سب سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ کپتن خاں کو بھائی صاحب کہتی تھی اور کپتن خاں اسے بھتیجی کے مخاطب کرتا تھا۔ یہاں اس کا زیادہ دنوں تک رہنا ٹھیک نہیں تھا اور نہ کلکتے میں کوئی مکان لے کے اسے تنہا رکھا جا سکتا تھا۔ کپتن خاں کا اصرار تھا کہ میری واپسی تک شب پارہ کو گاؤں میں اس کی ماں کے پاس بھیج دیا جائے۔ کاننتے نے اس کا مشورہ نہیں مانا۔ وہ اسے فیض آباد زرین کی حویلی میں لے جا سکتا تھا مگر وہاں پہلے ہی خاصے لوگ تھے۔ چار دن بعد رات کو کاننتے اسے لے کے اڈے سے باہر نکلا اور بمبئی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سے کپتن خاں، لالا اور شمول اسٹیشن پہ آ گئے۔ شمول نے اسے بالیاں، لالا نے چوڑیاں اور کپتن خاں نے بہت سی چیزیں دے کے رخصت کیا۔

جولین شب پارہ سے مل کے بہت خوش ہوئی۔ کاننتے نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جولین بھی اکیلی اکیلی ویران ویران سی رہتی تھی۔ شب پارہ کے آ جانے سے جیسے اس کا کوئی کھویا ہوا عزیز مل گیا تھا۔ کاننتے نے جب اس سے کہا کہ جولی! یہ لاڈلے کی امانت ہے تو بولی میرے لیے ان کی جگہ ہے۔ وہ وہاں مجبوراً تو صرف دو دن لیکن یہ اطمینان کر کے ہی اس نے واپسی کا ارادہ کیا کہ شب پارہ وہاں خوش رہے گی۔ چار مہینے میں وہ چار بار بمبئی گیا اور ہر مرتبہ فیض آباد ہوتا ہوا آیا۔ کاننتے کے مطابق اس کے نام میرے منتقل کیے ہوئے روپوں میں سے اسے ایک پیسہ نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے بینک میں اس کے نام کر رکھا تھا کے لیے ہوئے روپوں میں سے ڈھائی لاکھ روپے منتقل کیے تھے۔ دو لاکھ پچیس ہزار شب پارہ کے لیے اور پچیس ہزار اضافی اخراجات کسی خرچ کے لیے۔ کرمین بیگم کے نصیب میں یہ دولت نہیں تھی تو میں اور کاننتے کیا کر سکتے تھے۔

میں نے کاننتے کے ہاتھ چوم لیے۔ رات بھر وہ مجھے اسی کی باتیں سناتا رہا۔ میرا بس چلتا تو میں اسی وقت اڑ کے شب پارہ کو دیکھنے پہنچ جاتا۔ گھر ملبوس میں وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہوگی جیسے نئی گھر میں نظر آتی تھی، بکھرے بال، ... ویرانی بھری ہوئی، گھر میں ادھر سے ادھر بھٹکتی ہوئی۔ آوازیں

پڑتی رہیں۔ ایک لمحے باورچی خانے میں، دوسرے لمحے چھت پر کپڑے پھیلاتے، بچھا بیگم کے کہتے ہو اس کا رنگ بھی کچھ اور تھا۔ کسی گڑیا کی طرح بنی ہوئی جیسے جھل جا مرا تھا کے دکھ دوڑتی جیسے اپنی روح کے بغیر دوڑتی ہو۔ کاننتے کہہ رہا تھا۔ جب بھی وہ بمبئی جاتا، شب پارہ پہلا سوال یہی کرتی۔ "کاننتے بھائی! کوئی خط آیا؟ کب آ رہے ہیں؟" کاننتے ہر مرتبہ اس سے جھوٹ بول کے چلا آتا۔

تیسرے دن صبح جھبل نے ٹیکسی منگوائی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا کے کہا۔ میں سمجھا کہ وہ بیرو سے ملنے جا رہا ہے۔ بیرو اور آباجان کو مجھے بچھڑے تین ہی دن ہوئے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا ایک مدت گزر گئی ہے۔ ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور سیالدہ اسٹیشن پر آ کے ٹھہر گئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ جھبل سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا گیٹ عبور کر کے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ گاڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں جا کے برتھ پر لیٹ گیا۔ ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟" مجھ سے نہ رہا تو میں نے پوچھ لیا۔

"شبانے کے پاس۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"اور وہ لوگ؟" میں نے جھجک کے پوچھا۔

"آ جائیں گے وہ۔"

ابھی گاڑی چلنے میں کچھ ہی دیر ہوگی کہ بیرو، زورا، مارٹی اور آباجان مجھے قلیوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر آتے دکھائی دیے۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہے تھے کہ میں اتر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔ "ادھر، ادھر جھبل بھائی ادھر ہیں۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

بیرو نے مجھے ٹانگوں سے اٹھا کے اوپر کر لیا۔ میری نظر فوراً آباجان پر گئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اتنے دنوں بعد میں نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ بیرو مجھے اٹھائے اٹھائے ان کے پاس لے گیا۔ "بڑے صاحب! ابھی اس کو دیکھے ہو، ایک دم عربی گھوڑے کے مافک ہے۔ کیا بولتے ہیں اس کو ٹل ٹل ٹل۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اور اس نے مجھے اوپر اچھال کے برتھ پر پھینک دیا۔ آباجان میری کمر پر تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی وہ سب جھبل کی برتھ کی طرف لپکے۔ بیرو جھبل کا جسم جگہ جگہ سے ٹٹولنے لگا۔ جھبل نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کو باری باری دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی تو بیرو نے اس کی چھاتی پر ہاتھ مار کے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ آباجان جھبل

کے سرھانے بیٹھ کے اُس کا ماتھا چھُونے لگے۔ انھوں نے اُس کی نبض بھی دیکھی۔ جُگل نے گردن اُن کے ہاتھوں پہ ڈال دی اور ابّاجان نے اُس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

شاید اُن کے آنے ہی کی دیر تھی گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ انھوں نے سامان سوٹ کیسوں اور چمڑے کی تھیلیوں میں بھر لیا تھا۔ دو ایک ٹین کے بکسے بھی تھے جس کے کپڑے صاف ستھرے اُجلے تھے۔ ابّاجان کا خط بنا ہوا تھا۔ جسم پہ دو پلّی ٹوپی، کرتا پاجامہ اُوپر سے بنڈی پہنے ہوئے تھے اور چہرہ بھی اُجلا اُجلا، نکھرا نکھرا تھا۔ جنّت میں ہم نے جس جگتو کو دیکھا تھا، وہ اس سے قطعی مختلف تھا لیکن وہ بہت دُبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔ ہڈیاں گِنی جا سکتی تھیں۔ راستے میں صرف دو ٹکٹ چیکر، ایک پُروا ان اسٹیشن پہ دوسرا مغل سرائے پہ ٹکٹ چیک کرنے آئے تھے اور مطمئن ہو کے چلے گئے مگر جب تک گاڑی فیض آباد تک نہیں پہنچ جاتی تھی ہمارے مطمئن ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پچھلا تجربہ سامنے تھا۔ گاڑی کسی جگہ ٹھہرتی تو پولیس کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا۔ کوئی ایک معمولی سپاہی ڈبّے میں اچانک آ کے ہمارے سامان پہ اُنگلی اُٹھا سکتا تھا۔ وہ تلاشی کا مطالبہ کرتا تو انکار کیسے کیا جاتا۔ انکار میں زور بھی ہو سکتا ہے جب ایسا سامان ساتھ نہ ہو جو ہم چھپائے ہوئے تھے۔ مخمل کے تھیلے، ہاتھی، گھوڑے، غلاموں کی فوج، بادبانی، زرنگار ملبوسات، عزت، شان، سبھی کچھ ان صندوقوں میں بند تھا۔ جس کی نظر پڑتا، دُشمن ہو جاتا، دماغ پھٹ جاتا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے سامان کی اِس طرح تلاشی نہیں لی جاتی لیکن یہ کوئی قانون نہیں تھا۔ کسی کو کسی جگہ بھی شک ہو سکتا تھا۔

گاڑی کی رفتار ابتدا میں تیز تھی، بعد میں سُست پڑ گئی۔ ایک اسٹیشن پہ لیٹ ہوئی تو لیٹ ہوتی گئی۔ اسمبلی سے آگے میں ابّاجان کی برتھ پہ جا کے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ فرزانہ، فاروق اور اکبر کے بارے میں اُن سے پوچھوں مگر ابّاجان ہی کے خیال سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ریسیو کرنے پر اُن کے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی خیال آتا تھا، وہ اپنے دل میں کہیں یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ زوال میں میرے ذہن پہ دھول جم گئی ہے۔ تاہم میں نے لب نہیں کھولے۔ سچ نہیں تو کل نکل نہیں تو یہ سوچ انھیں بتانا ہی تھا۔ مجھے نہیں تو جہاں گیر کو میری طرح جہاں گیر کو اُن سے پوچھتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہوگی کیونکہ اُس کے سامنے نئی گھر سے نکل کر مگر اُس نے اُسے محفل میں ہار سنگھار کیے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ فیض آباد قریب آتے آتے گاڑی لیٹ ہونے کے سبب دُور ہو جاتا تھا۔ گاڑی

کو رات میں کسی وقت پہنچنا تھا لیکن وہ ساری رات گزار کے کہیں صبح پانچ بجے فیض آباد کے علاقے میں داخل ہوئی جہاں میں دروازے کا دستہ تھامے اسٹیشن آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زرّیں خانم، نیساں، منیر علی، زہرہ، جہاں گیر سب کے چہرے بار بار سامنے آ جاتے تھے۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ مارق بھی میرے پہلو میں دروازے پہ آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

جُگل کو پھر اُٹھانا پڑا۔ اسٹیشن پہ مسافروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ ہم نے کچھ دیر بھیڑ چھٹنے کا انتظار کیا، تب باہر نکلے۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر نے ایک سرسری نظر ہمارے ٹکٹوں پہ ڈالی، پھر سامان پہ ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں شک سی اُبھری مگر وہ مسکرا کے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھنے لگا۔ قلیوں نے ہمیں فوراً تانگوں تک پہنچا دیا۔ تانگے کے جھٹکے جُگل کے جسم کے لیے تکلیف دہ ہوتے لیکن کوئی اور سواری ہی نہیں تھی۔ اسٹیشن سے کچھ دُور ہی چنگی پڑتی تھی۔ تانگا آگے نکل جاتا مگر سڑک کے بیچ میں ایک دُبلے پتلے پستہ قد آدمی نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے رُکنے کا حکم دیا۔ "کچھ نہیں ہے میرے سرکار!" کوچوان نے گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے ہنس کر کہا۔

چنگی والے نے اُس کی بات نہیں سُنی اور پائدان پہ رکھے ہوئے بکسے کی طرف منہ بناتے ہوئے بولا۔ "کیا ہے؟"

"میرے جواہرات ہیں۔" جُگل نے کرختی آواز میں کہا۔

اُس نے ناراضی سے جُگل کی طرف سر اُٹھا کے دیکھا لیکن پلکیں جھپکا کے رہ گیا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔" وہ کسمسا کے بولا۔

"ٹھیک ہی بولا ہے۔ ادھر چنگی میں میرے جواہرات کے جانے کے کیا دام ہوتے ہیں؟" جُگل نے نرمی سے کہا۔ "رسید کاٹ دو بابو۔"

"سامان کھول کے دکھاؤ۔"

"ضمانت کر بادشاہو!" چہرے نے درشتی سے کہا۔ "اپن کو جانا ہے۔" اُس نے دس رُپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے کیا۔ "رسید کاٹ کے رکھنا، واپسی میں اپن ادھر سے لے لیں گے۔"

"سامان دکھا کے دام لگیں گے۔" چنگی والا تانگے کا بم تھام کے بولا جیسے تانگا روک لے گا۔

کوچوان نے اُسے بیچ میں سمجھانے کی کوشش کی اور ہم سے بولا۔ "دس رُپے اور دے دو جناب عالی! دس روپے کا رزق کٹ جائے گا تو باقی کیا بچے گا۔ کچھ غریب لوگوں کا بھی خیال کیجیے۔"

"ایسا ہے۔" چہرے نے جیب سے دس رُپے کا ایک نوٹ اور نکالا۔ "ایسا ہے تو پہلے بولنا! ادھر یہ خالی پیلی آنکھیں کیوں دکھاتا ہے۔ سالا اپنے کو کیا سمجھ کے رُعب مارتا ہے۔"

کوچوان نے چنگی والے کو آنکھ مار کے اشارہ کیا۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے چنگی پہ بیٹھے ہوئے منشی کو دو روپے نیچے کھول کے دس کا رسید بنایا اور دوڑ کے رسید لے آیا۔ چلتے چلتے وہ سلام کرنا نہیں بھولا۔ "ناراض مت ہونا جناب!"

تانگے والے نے چابک اُٹھا کے گھوڑے پہ زور سے مارا۔ گھوڑا سرپٹ شہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔

ہمارے پاس چنگی کی رسید تھی لیکن آگے کسی موڑ پر کسی سپاہی نے ہمیں نہیں روکا۔ صرف مٹھائی اور دودھ کی اِکّا دُکّا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پہ ابھی سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ بازار سے گزر کے حویلی تک جانے والا راستہ مختصر تھا۔ میرے دل میں سائیں سائیں سی ہو رہی تھی۔ حویلی قریب آ رہی تھی۔ ابّاجان کو دیکھ کے جہاں گیر کی کیا حالت ہوگی اور زرّیں جُگل کو دیکھ کے کیا کرے گی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ ہی دیر میں حویلی ہمارے سامنے تھی۔

"آگے پھاٹک پہ کھینچ کے لینا۔" میرے بولنے سے پہلے جُگل نے اُونچی آواز میں کوچوان سے کہا۔ اُس نے باگیں کھینچ لیں اور تانگا جھکولے کھاتا ہوا ٹھہر گیا۔ سب سے پہلے میں نیچے اُترا۔ حویلی کا پھاٹک بند تھا۔ بڈھا چوکیدار شیرا وہاں موجود نہیں تھا۔ چہرے نے جُگل کو سہارا دے کے نیچے اُتارا۔ ابّاجان، زورا اور مارق نظریں گھُما گھُما کے حویلی دیکھ رہے تھے۔ باہر سے ساری عمارت کا رنگ گہرا تھا اور وہ کسی پرانے قلعے سے مشابہ تھی۔ میں پھاٹک کے دروازے پر پہنچا اور میں نے زور زور سے کنڈا کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟" اندر سے شیرا کی لرزتی آواز گونجی۔ ساتھ ہی اُس نے پھاٹک کی کھڑکی کھول دی۔ مجھے سامنے دیکھ کے وہ آنکھیں ملنے لگا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں چیخا۔ "لاڈلے میاں!"

"شیرا چاچا!" میں نے اُسے کولیا میں بھر لیا۔ "مجھے ایسا بھی نہیں رو، دیکھ ابّاجان پیچھے آ رہے ہیں۔"

جیسے ہی شیرا کی نظر جُگل پر پڑی وہ اُچھلنے لگا اور میری گرفت سے آزاد ہو کے اُس کی جانب بھاگا۔

"ابھی تک چل رہا ہے رے!" جُگل اُس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"تم نے جو ادھر باندھ رکھا ہے۔ بنیا رکے ہوتے ہے۔"

"بنیا کیسے ہے؟" جُگل نے تمتمائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے سے مت پوچھو، خود ہی دیکھ لینا۔"

"جا کے جلدی بول، ادھر کیا سستا رہا ہے۔"

شیرا ہنسنے لگا اور ہنستا ہوا اندر عمارت کے دروازے پر جا

کے کواڑ دھڑ دھڑانے لگا۔ کوچوان، چہرہ، مارق اور زورا جلدی جلدی سامان اُٹھا لائے۔ شیرا کو زیادہ چلّانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور جھڑے ہوئے شوں سے پوچھا۔ "کیا بات ہے شیرا چاچا؟" میں نے آواز پہچان لی۔ وہ زرّیں ہی تھی۔

"دیکھو کون آیا ہے۔" شیرا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زرّیں نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ زرّیں کے سراپا کا ایک ہیولا سا ہرا، پیلے، زرد، اُداسی، شگفتگی، پھر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح، بجلی کی طرح کوندتی چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے جُگل سے لپٹنے سے آ لگی۔

جُگل اُس کے سر پہ اپنا سر رکھے آنکھیں میچے لمحوں تک چپ کھڑا رہا۔ زرّیں بُری طرح سسکنے لگی تھی۔ "تا... تا..." جُگل بوجھل لہجے میں بولا۔ "آ گیا ہوں رہی! اب کے جب بولے گی، جبھی لوٹوں گا۔ نہیں بولے گی تو نہیں جاؤں گا۔" جُگل نے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کے چہرہ سامنے کیا اور اُس کی پیشانی چومنے لگا۔ اُس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ زرّیں سر تا پا لرز رہی تھی۔ اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ کچھ اجنبی لوگ بھی کھڑے ہیں۔ ہم سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ چہرے نے سر جھکا لیا۔ "سنبھل رہی!" جُگل نے اپنے بازوؤں کا حصار کھول کے ابّاجان کی طرف اشارہ کیا۔ "اِدھر دیکھ، پہچان تو کون ہیں یہ؟ چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے؟"

زرّیں کی بھیگی پلکیں پٹ پٹانے لگیں۔ اُسے فوراً اپنے دوپٹے کا ہوش آیا۔ جُگل نے اپنی آستین سے اُس کی آنکھیں پونچھ دی تھیں۔ زرّیں کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہونٹوں سے گردن خم کر کے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں ابّاجان کو سلام کیا۔

"ابھی سنبھالا رے بابا! دیکھ لڑکی جیسی بنی نہیں۔"

"تقی کے ابّا!" ابّاجان چونکے، زرّیں بھی۔ اُس نے حواس باختگی سے پہلے میری طرف دیکھا، پھر ابّاجان کی طرف اور انھیں دوبارہ سلام کیا۔ ابّاجان نے آگے بڑھ کے اپنے کانپتے ہاتھ اُس کے سر پہ رکھ دیے اور کچھ بولے نہیں کہ جُگل نے تقی کا نام کیوں لیا ہے۔ وہ گنگ سے ہو گئے تھے۔

اُسی لمحے جہاں گیر اندر کے دروازے پہ سمندر کی لہر کے مانند اُمڈتا ہوا آیا۔ اُس نے پہلے مجھے دیکھا تھا اور میری طرف بڑھا تھا لیکن جُگل سے جا کے لپٹ گیا۔ ابّاجان زرّیں کے سامنے دروازے کی جانب پشت کیے کھڑے تھے اس لیے

ہیں۔ فیصل کو کسی نہ کسی لے آئے یہ بتانا ہی تھا۔ اُس کے آنے پر منیر علی ابا جان کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ مجھ سے مجرو کی لال آنکھیں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ مجرو کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ زرّیں نے خیر سے کہہ کے اُسے اندر بلوا لیا اور جلد سے جلد کسی ڈاکٹر کو لے آنے کو کہا۔ پہلے بھی ایک بار مجرو میرے لیے فیض آباد سے ایک مشہور ڈاکٹر کو لایا تھا۔ زرّیں ہی نے اُسے پرکھلایا ہوگا کہ ہم لوگ حویلی میں ہیں۔ زرّیں کی بات مجرو کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ فوراً باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آیا تو ڈاکٹر اُس کے ساتھ تھا۔

زرّیں نے فیصل کا پلنگ وہیں برآمدے میں لگوا دیا تھا اور اُسے اُٹھنے سے بالکل منع کر دیا تھا۔ فیصل نے پھر وہاں سے جنبش نہیں کی، ضرورتاً ہی اُٹھا ہو تو اُٹھا ہو۔ زرّیں کے کہنے پر دوپہر کا کھانا مجرو نے ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھایا۔ پھر اقبے کے تمام لوگوں کو لے کے چلا گیا۔ پیرو، زورا، مارتی اور ابا جان کے لیے الگ الگ کمروں کا انتظام کیا گیا تھا لیکن وہ تینوں ایک ہی کمرے میں آ گئے۔ منیر علی ابا جان کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے، جہاں گیر بھی انھی کے ساتھ تھا۔ شام کو مجرو پیرو اور زورا کو اقبے پہ لے گیا۔ مارتی میری وجہ سے وہیں رہ گیا تھا اور جیتی جیتی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ رات کو فیصل کو پھر بخار آ گیا۔ زرّیں نے اُسے گرم دودھ کے ایک گھونٹ اور دواؤں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں دیا اور رات گئے تک سرہانے بیٹھی اُس کا سر دباتی رہی۔

تین دن تک وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا، کوئی فرصت بھی نہیں تھی۔ اگر ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے ہی سے کسی کو فرصت نہیں ملی تھی۔ ابا جان بھی جیسے ساری دُنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ دوسری صبح وہ منیر علی کے ساتھ زمینوں پہ چلے گئے۔ رات کو لوٹے تو منیر علی اُنھیں اندر لے گئے۔ میں نے اندر جا کے دیکھا تو ایک طرف سلمٰی اُن کے پہلو میں بیٹھی تھی، دوسری طرف نیساں۔ دونوں کی زبانیں چہک رہی تھیں۔ وہ کبھی نیساں کی بات سنتے، کبھی سلمٰی کی۔ کبھی جہاں گیر بیچ میں بولنے لگتا۔ زہرہ اور خانم بھی وہیں موجود تھیں۔ منیر علی کے قہقہے گونج رہے تھے۔ مجھے رشک ہوا کہ ابا جان کا قصہ تیز ہے۔ نیساں اور سلمٰی کوئی کم سن تو نہیں لیکن ابا جان اُن کے درمیان بچے بنے بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ حویلی میں دو ایک پہر ٹھیرنے کے بعد واپس جانے کے لیے اصرار کریں گے۔ زرتاج، فرزانہ، فارحہ اور اکبر کے پاس۔ چار دن تک اُنھوں نے اُن کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ کہیں جانے کا کوئی اشارہ کیا۔ کئی مرتبہ میں نے جہاں گیر کو اُن سے چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جہاں گیر نے اُن سے ضرور پوچھا ہوگا۔ میں جہاں گیر سے معلوم کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کون سی بات مجھے روک لیتی تھی۔ اس دوران ابا جان کو زرّیں، خانم، منیر علی اور میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ وہ جہاں گیر اور منیر علی آپس میں صرف موسم کی باتیں تو نہیں کرتے رہتے ہوں گے۔ ابا جان کے چہرے سے طویل سفر کے آثار دھُل چکے تھے اور اُن کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔ چار دن تک اُنھوں نے تہہ خانے کا سامان بھی نہیں کھلوایا تھا۔

پیرو، زورا اور مارتی کو بھی شاید واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ وہ گھر والے بنے ہوئے تھے۔ اور زیادہ تر انھی کے ساتھ رہتا تھا۔ نیساں، سلمٰی، مجو میاں، زہرہ، خانم ہر وقت اُن کے ارد گرد رہتی تھیں یا پھر وہ مجرو اور اقبے کے آدمیوں میں گھرے رہتے تھے۔ زرّیں تو مستقل فیصل کے پلنگ سے بندھ گئی تھی حالانکہ اب فیصل کی طبیعت نسبتاً بہتر تھی۔ زخم سکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ بخار بھی پھر نہیں آیا تھا۔

حویلی میں ایک دھوم سی مچی ہوئی تھی۔ جسے دیکھو بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ نیساں، زہرہ باورچی خانے میں کھانا پکوا رہی ہیں، سلمٰی ترکاری کاٹ رہی ہے۔ خانم ملازماؤں سے صفائی کرا رہی ہیں، بستروں کی چادریں بدلوا رہی ہیں۔ صحن میں چھڑکاؤ کروا رہی ہیں۔ کبھی شربت آ رہا ہے، کبھی چائے۔ صبح و شام انواع و اقسام کے کھانے پک رہے ہیں۔ پکانے کے دوران حسبِ معمول نیساں چہکتی رہتی تھی۔ بار بار جاتی: ہریالی کیسی ہے؟ اُلٹے پلٹے کیسے ہیں؟ جس چیز کے بارے میں وہ پوچھتی تھی اس کا مطلب تھا کہ اُس نے پکائی ہے۔ میں اُسے چڑانے کے لیے کہہ دیتا: بہت بے مزہ ہے۔ وہ میرے سامنے سے جھٹ پلیٹ اُٹھا لیتی اور صورت رونی سی ہو جاتی۔ جب تک میں اُس کے ہاتھ سے پلیٹ واپس نہ لے لیتا، اُس کے گالوں کی سُرخی واپس نہ آتی۔ آتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جہاں گیر نے اچھے نمبروں سے میٹرک کر لیا ہے اور فرسٹ ایئر کی تیاری کر رہا ہے۔ ارشد بھی ایم اے کر رہا ہے۔ وہ جہاں گیر، نیساں، سلمٰی، مجو میاں کو روزانہ کئی گھنٹے پڑھاتا اور منیر علی کے ساتھ زمینوں پہ نکل جاتا۔ اس کے علاوہ دو اور ٹیوٹر بھی اُنھیں پڑھانے آتے تھے۔ نیساں نے مجھے بتایا کہ خانم اب اُسے زیادہ نہیں ڈانٹتی ہیں، وہ کبھی کبھی کمرے میں بند ہو کے ستار بجا لیتی ہیں۔ ہر دوسرے، تیسرے مہینے منیر علی کا لڑکا تنویر علی

علی گڑھ سے آ جاتا ہے۔ وہ دو تین دن سے زیادہ نہیں رہتا مگر اُس کے آ جانے سے بہت رونق ہو جاتی ہے۔ زرّیں یا کتابیں پڑھتی رہتی ہے یا وہ اور خانم علی کے کمرے سجاتی رہتی ہیں۔ کبھی زرّیں خانم سے فرمائش کر کے ستار سنتی ہے مگر اُن دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ نیساں کہتی تھی کہ زرّیں باجی ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ بعض اوقات تو اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ رات کو دیر تک باغ میں اکیلی بیٹھی رہتی ہیں لیکن جب بھی بابا (منیر علی) یا خانم اُن کے پاس جا کے طبیعت پوچھتے ہیں گھبرا جاتی ہیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ بابا جب بھی باہر جاتے ہیں تو وہ دروازے تک اُنھیں رخصت کرنے آتی ہیں اور جب وہ لوٹتے ہیں تو پہلے انھی کو پوچھتے ہیں۔

اتنے دن ہو گئے تھے، زرّیں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس رات میں کمرے میں آ کے لیٹا ہی تھا کہ زرّیں کی خوشبو مجھے دروازے پہ محسوس ہوئی۔ خوشبو بھی چاپ کی طرح ہوتی ہے۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی۔ دبے پاؤں دروازے پہ آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ کوئی آیا ہے اور یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گیا: "آؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر آ جاؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

وہ جھجکتی جھجکتی اندر آ گئی۔ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور دوپٹے سے لٹیں جھانک رہی تھیں۔ ہرا دوپٹا اُس کے سُرخ و سفید رنگ پر کھلتا تھا۔ میں اُسے کن انکھیوں ہی سے دیکھتا رہا تھا۔ اب اُس کا سراپا میری کھلی آنکھوں کے سامنے تھا۔ آڑا پاجامہ اور کرتا اُس کا خاص لباس تھا۔ اس میں اُس کا نکلتا ہوا قد اور نکل آتا تھا۔ صرف چوڑیاں کلائیوں میں تھیں یا کانوں میں بالے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی نئی زرّیں کو دیکھ رہا ہوں۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ اُس سے کہنے کو کوئی بات ہی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھ گئی تھی۔ اچھا ہوا جو اُس نے سر جھکا لیا تھا۔ مجھے اُسے دیکھنے کا خوب موقع مل گیا۔ "ابا جان کو دیکھا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

- "بالکل تمھارے ہی ابا جان ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی۔

- "کیا مطلب؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

- "میرا مطلب ہے تمھارے جیسے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اُن کا چہرہ، ناک نقشہ تم سے اور جہاں گیر سے کتنا ملتا ہے۔ وہی لمبی ناک، اونچا قد، گہری بھویں۔ بابا سے تو بہت ہی ملتا ہے۔"

- "تمھیں اُنھیں ہمارے ساتھ دیکھ کے تعجب تو بہت ہوا ہوگا۔"

- "نہیں۔" وہ اعتماد سے بولی۔ "مجھے یقین تھا ایک دن وہ ضرور مل جائیں گے۔"

- "تمھاری بات ہوئی؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

- "ہر وقت ہی ہوتی ہے۔"

- "کیا بات کرتے ہیں؟"

- "بہت خوش ہیں، بہت ہی خوش۔"

- "میرے بارے میں کچھ کہتے ہیں؟" میں نے مذبذب سے پوچھا۔

- "پوچھتے رہتے ہیں۔"

- "کیا، کیا پوچھتے رہتے ہیں؟"

- "تم سامنے نہیں ہوتے تو انھیں گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔"

- "ہُوں۔" میں نے ہنکاری بھری اور چپ ہو گیا۔

- "تم تو ایسے معلوم کر رہے ہو جیسے تمھاری اُن سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ تم انھیں دیکھتے بھی جیسے نہیں ہو۔"

- "سچ پوچھو تو ایسا ہی ہے۔ اتنے دنوں سے وہ ساتھ ہیں اور میری اُن سے کبھی ایک آدھ جملے سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اُن سے کیا کہوں۔ اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔"

- "تمھیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔"

- "مجھ سے اُن کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔"

- "وہ تم سے بہت سی باتیں کرنے کے آرزو مند ہوں گے۔"

- "ہو سکتا ہے لیکن زرّیں، مجھے..... مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔" وہ کھِل کھلا کے ہنس پڑی۔ کمرے میں جیسے ستارے جھنجھنا گئے۔

- "میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

- "تمھیں تو شاید سبھی سے ڈر لگتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

- "ہاں زرّیں!" میری آواز ڈوب گئی۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

- "یا شاید تم اپنے آپ سے ہی اتنی باتیں کر لیتے ہو کہ پھر کسی اور سے کچھ کہنے سننے کو دل نہیں کرتا ہوگا۔"

میں اُس کی صورت دیکھنے لگا اور میرا جی چاہا کہ اپنا منہ کھسوٹ لوں۔ آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، اب کے زرّیں سے ڈھیر سی باتیں کروں گا۔ اُس سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ زرّیں اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ میں اُس پہ اعتبار نہیں کرتا یا اُسے غیر سمجھتا ہوں۔ ہر بار فیض آباد آتے وقت میں ایسا ہی سوچتا تھا اور ہر بار میری زبان پہ فالج سا گر جاتا تھا۔ "زرّیں! تم، تم نہ جانے کیا سوچتی ہوگی۔ میں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

- "تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

- "میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، میں تمھیں کیا بتاؤں زرّیں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" اُس نے مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔

"کیا سمجھتی ہو؟"

"مایوسی گناہ ہے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا۔" وہ وثوق سے بولی۔ "جسے تم اپنا کہہ سکو۔"

"شاید کبھی نہ آئے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"اللہ میاں نے چاہا تو ضرور آئے گا۔"

"کوئی اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہے۔"

"ابا جان کے مل جانے کے بعد ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"شاید میں بہت تھک گیا ہوں زریں۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میرا دل کچھ اور چاہتا ہے۔"

"کیا چاہتا ہے؟"

"مرجانے کو چاہتا ہے مجھے سسکیاں لے دو۔"

"تم نے پھر ایسی باتیں شروع کر دیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"میں سب کو بہت دکھ دیتا ہوں تم سمجھتی ہو مجھے اس کا احساس نہیں ہے۔ میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان رہتے ہیں مر تک جاتے ہیں۔"

"مرنا تو سب کو ایک دن ہے۔ جس کا وقت آئے گا اُسے کون روکے گا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی کے لیے مر تک جاتے ہیں۔"

"جو چلے گئے؟ لو اور آدمی خود کو کس طرح تسلی دے۔"

"تم بھی تو دوسروں کے لیے خود کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ دوسرے بھی تو تمہیں تنگ کرتے ہیں وہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ مر جائیں تو شاید تمہیں کچھ سکون مل جائے۔ تمہارا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔"

"زریں!" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

"سبھی تمہارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔" وہ ڈگمگاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"لیکن میں تو کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا۔ میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے۔ میرا بھی تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت خوش رہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم یہاں کس طرح رہتی ہو۔ تمہیں میرا ہر آن خیال ہے۔ زریں! تم مجھے بہت یاد آتی تھیں۔ کاش! کاش میں ہمیشہ تمہارے پاس رہتا اور تمہارے ماتھے پر ایک شکن بھی نہ آنے دیتا۔ میں تمہارے لیے...." میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا تھا۔ کسی کی لرزتی آنکھیں دیکھ کے میری زبان ٹھٹھر گئی۔ اُس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔

میں پلنگ سے اُٹھ کے بے اختیار اُس کے پاس پہنچ گیا اور میں نے اُس کے شانے تھام کے اُسے اُٹھا لیا۔ زریں کو چکر سا آگیا تھا۔ میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے تھے۔ میں نے اُسے جلدی سے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ اُس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ میں فرش پر اُس کے پیروں کے نزدیک بیٹھ کے ہانپنے لگا اور پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میرا سر اُس کے پیروں پر جھک گیا۔ میں اُس کے پیروں پہ اپنا سر رکھ کے رونا چاہتا تھا کہ اُس نے پاؤں کھینچ لیے اور کرسی سے اُٹھ کے خود بھی میرے مقابل فرش پہ بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کے سسکنے لگی۔ میں چٹھائی سے ٹکا رہا۔ میرا سارا جسم بے جان سا ہو گیا تھا۔ بے شمار لمحے گزر گئے ہوں گے۔ زریں کو دیکھنے کوئی بھی اس طرف آسکتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "مت رو زریں! خدا کے لیے مت رو۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"تمہیں رُلانا مقصود نہیں تھا۔ میں تو تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ تم.... تم کہیں.... کہیں مجھے...."

"کچھ مت کہو مجھے معلوم ہے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں نے سوچا ہے صرف ایک بار اور جاؤں گا پھر میں آجاؤں گا۔"

"خدا نے چاہا تو تمہیں پھر جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی ان شاء اللہ۔ اگر خدانخواستہ تم یونہی واپس آگئے تو میں تم سے دوبارہ جانے کو کہوں گی۔ کیا اس سے بڑا کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے۔"

"زریں! تم تم کتنی...." میرے ہونٹ بھینچ کے رہ گئے۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" وہ سادگی سے بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر زمین بہت بڑی ہے۔"

"آدمی کا حوصلہ زمین سے بڑا ہوتا ہے۔ کاش میں بھی تمہارے ساتھ چلتی۔"

"ضرور لے چلتا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ گلیوں میں، بازاروں میں، کیسے کیسے محل کوچوں میں، کبھی اِس دروازے کبھی اُس دروازے۔ صبح یہاں شام وہاں۔ بے منزل۔"

"مجھے اندازہ ہے لیکن جلدی جلدی گھر تو واپس آسکتے ہو۔"

"ہر بار یہ خیال آتا ہے کہ یہاں تک آگئے ہیں تو اور آگے دیکھ لیں اسی میں وقت گزر جاتا ہے۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔"

وہ اپنی گمبھیر کھنکتی آواز میں مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ میری خاموشی پر اُس نے موضوع بدل دیا اور خانم، نیسان، زہرہ وغیرہ کی باتیں کرنے لگی۔ اس طرح کبھی اُس نے مجھ سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مینا چہچہا رہی تھی۔ مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ دلہنوں میں بیٹھی دلہن کے مانند سمٹی بیٹھی تھی اور اُس کی پلکیں پھڑپھڑ جھپک رہی تھیں۔ گھڑی نے دو بجائے تو وہ چونک اُٹھی۔ "میں اب جاتی ہوں۔"

"کچھ دیر اور بیٹھو۔"

"بابا کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے ٹھیک چھ چھ گھنٹے بعد انھیں گولیاں ملتے رہنا چاہیے۔ تواتر میں فرق نہیں آنا چاہیے۔"

"میں تمہیں پہنچا آتا ہوں۔"

"اب تم آرام کرو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"رات تمہارے لیے نہیں ہوئی؟"

"مجھے دن میں کون سا کام ہوتا ہے۔"

"اور میں تو یہاں دن بھر پچھاڑا پڑا رہتا ہوں۔"

اُس نے مسکراتی جھلملاتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور دروازے تک جاتے جاتے بولی۔ "دودھ پی لینا۔"

دالان میں چاندنی چٹک رہی تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ مردانے تک وہ میرے ساتھ چلتی رہی۔ سائے گہرے ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں تجمل کو دوا پلا کے پھر واپس آجائے۔ مجھے بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں اور نیند بھی نہیں آرہی۔ تجمل کے کمرے کے دروازے پر اُس نے ہلکی سی تھپکی دی اور پلٹ کے مجھے سرگوشی میں شب بخیر کہتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

صبح ناشتے کے بعد ہم سب تجمل کے پاس چوکی پر بیٹھے تھے۔ تجمل نے اپنا پیر کھول رکھا تھا اور دادا بابا کے دیکھ رہا تھا۔ زخم بھر گیا تھا۔ اتفاق سے اُس وقت مردانے میں پیرو، زورا، مارتی، ابا جان اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ چار دن کی چھٹی کے بعد رفیع جان گھر پڑھانے کے لیے لائبریری میں چلا گیا تھا۔ بشیر علی بھی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے اُٹھ کے اندر چلے گئے تھے۔ تجمل نے ابا جان سے کہا۔ "آپ آپ چلے جاؤ بابا!" وہ اپنا پیر ٹھونکنے لگا۔ "ابھی ادھر دیکھو! سب ٹھیک ہے۔ بنیا چلنے دیتی تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو جاتا۔ پیرو دادا تو ساتھ ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"اپن کا اپنے بچھڑے کوئی نہیں بولتا۔" پیرو نے آنکھیں جھکا کے کہا۔ "بمبئی سے نکلے ہوئے دن ہو گئے دادا! وہ تمہیں تو بابا ابھی بھی سوکھ گیا ہوگا۔ گیتا اماں بھی دروازہ دیکھتی ہوں گی۔"

"ایسا تو اپن بھی سوچتا ہے تجمل بھائی۔"

"پھر آجانا۔"

"ٹھیک ہے جیسا تم بولتا ہے۔"

"لیکن مجھے بھی آپ لوگوں سے کچھ کہنا تھا۔" ابا جان کسمساتے ہوئے بولے۔

"بولو بابا!" پیرو نے اضطراب سے کہا۔

"مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کہنا چاہیے۔"

ابا جان کی زبان اٹک رہی تھی۔ "یہاں وہ سب آگرہ وغیرہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن بہرحال آپ تو ہیں ہی۔ میرے لیے کچھ اور مت سمجھیے۔ میری درخواست ہے کہ...."

"بولو بابا! ایسی کیا بات ہے۔" تجمل تردد سے بولا۔

"میری خواہش ہے کہ آپ...." ابا جان کہتے کہتے رک گئے۔ "میری خوشی اسی میں ہوگی اگر آپ...." چند لمحوں کے توقف سے وہ دھیمی آواز میں بولے۔ "اگر ان پتھروں میں بھی شریک ہوں۔"

"یہ کیا کہتے ہیں بڑے صاحب؟" تجمل کا تو منہ کھلا رہ گیا۔ "دادا! سنتے ہو بابا کیا بول رہے ہیں۔"

"سُنتا ہے تجمل بھائی!"

ابا جان کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ "آپ نے انکار کیا تو میرے لیے بھی یہ پتھر رہ جائیں گے۔ یہ بہت ہی پشتوں تک ساتھ رہیں گے اور ختم نہیں ہوں گے۔ میں انھیں رکھ کے کیا کروں گا۔ میں اکیلا انھیں اتنی بڑی تعداد میں لا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب آپ...."

"رہنے دو بابا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی بس کرو۔"

"انکار کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"نہیں آئے گی بابا! نہیں آئے گی۔"

"آخر آپ کو عذر کیوں ہے؟"

"ابھی کیا بولیں بابا!" تجمل نے جھک کے کہا اور چیا تر کھل کے بولا۔ "اپنے کو اس کے کی لت پڑ گئی ہے یہی اپنا دھن ہے۔"

ابا جان متذبذب نظروں سے تجمل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"ہم تو اور آپ کو دیکھے گیا تھا بابا! گیتا کی قسم لے لو اپنے من میں کوئی چیسکر جگر نہیں تھا۔"

"مجھے علم ہے لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہم سبھی اس میں شریک ہوں کیونکہ سب اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ شاید دو ہی دن میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے ان سے زیادہ اپنے لوٹنے نہ کر دیکھنے کی جستجو تھی مگر جستجو میں کسی سبب سے تھی۔ سب سے بڑا سبب یہی سب کچھ تھا لیکن یقین کیجیے میرے دماغ میں اتنا کچھ نہیں تھا۔ میری استطاعت تھی کہ میں اتنا کچھ لا سکوں۔ یہ دنیا کے بیش قیمت نوادر ہیں مجھے تھوڑی بہت شُد بُد ہے مگر اس کی صحیح قیمت کا اندازہ کرنا میرے لیے بھی مشکل ہے۔ اس سے ہم نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں اور اسے استعمال کرنے کا، میں جہاں تک سمجھتا ہوں ہمیں بطور حق پہنچتا ہے جس چیز کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں اُس

ہیں اس کی کارفرمائی کا بھی دخل ہے۔ نہیں ہے کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب سمیٹ کے خوش رہ سکوں گا؟ مجھے سکون مل جائے گا؟"

"ابھی آپ ایسا کیوں سوچتے ہو؟ آپ کے پاس ہے تو اپنے پاس ہے۔ ادھر سب آپ کے لاڈلے جیسے ہیں، ضرورت ہوئے گی تو آپ ہی کے در پہ آئیں گے، اپنے بابا کے پاس۔"

اباجان اصرار کرتے رہے۔ مالتی اور زورا بھی شد و مد سے بیچ میں بولنے لگے تھے، انھوں نے اباجان کی کوئی بات نہیں سُنی۔ کہنے لگے "سمجھ لیجیے، ہمارا حصّہ آپ کے پاس امانت ہے۔" طرح طرح کی دلیلیں دے کے انھیں خاموش کر دیا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔

اُسی دن کچھ دیر بعد ہی اباجان، میں اور پیرو تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ پیرو اور میں نے تھیلے کھول لیے۔ اباجان نے ہتھیلی پر جانچ کے دس پانچ پتھر الگ کر لیے اور اُسی دن دوپہر کو ہم تینوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں حضرت گنج کے علاقے میں واقع کارلٹن ہوٹل میں ٹھیرے۔ یہ لکھنؤ کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔ شام کو ہم پہنچے تھے اور شام ہی کو میں اور پیرو امرائے کی طرف نکل گئے۔ رات تک جوہریوں کی آمد کا سلسلہ بندھا رہا۔ دوسرے دن صبح اُن کے ساتھ چند نواب بھی آئے۔ تیسرے دن رات کو ہم واپس فیض آباد پہنچے تو تینوں کی بنڈیوں میں ڈھائی لاکھ روپے موجود تھے۔ اباجان کو بہت جلدی تھی، سودے بازی کرتے تو شاید تین لاکھ تک رقم ہو جاتی۔ چلتے وقت انھوں نے لکھنؤ سے سب گھر والوں کے لیے بہت سی چیزیں خریدیں۔ سب کے لیے سونے کی چوڑیاں، کپڑے، جوتیاں، پھل اور مٹھائیاں۔ کچھ رقم رکھ کے باقی سب انھوں نے منیر علی کے پاس جمع کرادی۔ منیر علی بھی نوٹوں کی اتنی گڈیاں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

راستے میں اُن کی اور پیرو کی باتوں سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ فرخ، فریال، نازیہ اور اکبر کو بمبئی میں اپنے دوست مولوی محمد اکرم کے ہاں ٹھیرا آئے ہیں۔ مولوی محمد اکرم سے میں بھی ملا تھا۔ وہ نہایت شریف آدمی تھے۔ یقیناً اباجان کی نظر میں اُن سب کی حفاظت کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوگی لیکن انھیں گھر سے نکلے ڈیڑھ سال سے کم کیا لگا ہوگا۔ مجھے جیسے تو برسوں ہو گئے تھے۔ ہم پہنچے تھے تو وہ وہاں موجود تھے۔ جگشوؤں کے طور طریق سیکھنے، کسی قافلے کے ساتھ جانے، تبت تک کے سفر، مجھے منزل اور خزانے والے منزل تک رسائی حاصل کرنے میں تین سال سے زیادہ کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے، جب سے میں نے یہ سُنا تھا،

اس کے باوجود کہ میں مولوی اکرام کے گھر جا چکا تھا، میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ فرخ اسی علاقے سے گھر سے باہر نکلی تھی۔ مولوی اکرم کے رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس عزت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اباجان نے چلتے ہوئے انھیں کوئی بڑی رقم دی ہوگی۔ میں جلد سے جلد بمبئی جانا چاہتا تھا۔ چاہے اباجان ابھی جانے کا ارادہ نہ کریں مگر اباجان نے دوسرے ہی دن صبح بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زریں خانم، نیساں اور زہرہ نے سفر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جہاں گیر بھی ہمارے ساتھ جانے کے لیے مچل رہا تھا، خانم کے کہنے پہ چپ ہو گیا۔ صرف ایک رات درمیان میں تھی مگر مجھے یہ رات کاٹے نہ کاٹتی تھی۔ رات کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ گئے تھے، مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ فرخ، فریال، نازیہ اور اکبر کے چہرے نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اب وہ بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔ مجھے شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کاش میں اباجان اور پیرو کے درمیان ہونے والی ان سب کے متعلق ہونے والی باتیں نہ سُن پاتا۔ اسی لیے میں اباجان سے نہیں پوچھتا تھا۔

کھانے کے بعد خانم میرے قریب آ کے چپکے سے بولی۔

"بابر میاں! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا بات ہے آپی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم میرے کمرے میں آ جانا، ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو بتایئے؟"

"پریشان مت ہو۔ شاید میں تم سے ابھی نہ کہتی، تم جا رہے ہو اس لیے تمھیں بتا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

رات گئے تک خانم کو فرصت نہیں ملی۔ میں کئی بار اُس کے کمرے کی طرف گیا لیکن وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ ضرور ایسی کوئی بات تھی جو خانم صرف مجھی سے کرنا چاہتی تھی۔ جب تک میں خانم کے کمرے میں نہیں گیا، مجھے وحشت ہوتی رہی۔ "میں نے تمھیں پریشان کر دیا۔" خانم مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "میں نے کہا تھا ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم گھبرائے کیوں ہو؟ اطمینان سے بیٹھو۔"

میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔

"بات یہ ہے کہ ابھی کوئی دو ہفتے ہوئے بابا نے مجھ سے ایک مشورہ لیا تھا۔" خانم رازدارانہ انداز میں بولی۔

"کیسا مشورہ؟"

"انھوں نے زریں کا ذکر کیا تھا۔ کہہ رہے تھے میری خواہش ہے کہ زریں کو اپنی بٹیا بنا لوں، ویسے وہ مجھے زہرہ ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں تم سے مشورہ کر رہا ہوں، بات نہیں ٹھیرا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت نازک معاملے ہوتے ہیں اور پھر ایک گھر میں رہنے سے تو اور بھی زیادہ نازک۔ وہ منیر علی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ زریں گھر سے کہیں اور نہ جائے، البتہ جب تک میری طرف سے اشارہ نہیں ملے گا وہ اپنی تمنا کبھی زبان پر نہیں لائیں گے اور اگر میری طرف سے انھیں کوئی امید افزا جواب نہ ملا تو وہ اس کا بالکل بُرا نہیں مانیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے بھی دوبارہ اشارتاً کبھی مجھ سے نہیں پوچھا۔ میں نے تمھیں یہ اس لیے بتایا ہے کہ تم سے مشورہ کروں؟"

"آپی! میرا مشورہ، میں... میں..." میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ منیر علی اور اُن کے سب کا ویکھا بھالا ہے۔ میں نے سوچا تم سے ذکر کر دوں۔"

"میں میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ فیصل بھائی اور خود زریں سے پوچھ لیجیے۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

"مجھ سے پوچھا نہیں جاتا بابر میاں!"

"پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم نے سُنا ہوگا کہ لڑکیاں گھروں میں آگ بیری کی طرح ہوتی ہیں۔ پتھر تو آئیں گے اور یہ کوئی چھپا نہیں۔ اسی طرح رشتے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں بالیوں کو دیر تک گھر میں بٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ کبھی نہ کبھی تو ہم سب کو اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔

"تم سوچ لو، بابا کو کہے ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ انھوں نے لوٹ کے نہیں پوچھا، وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ دوبارہ نہیں کہیں گے لیکن بالفرض انھوں نے پھر ذکر چھیڑ دیا تو میں کیا جواب دوں؟"

"آپ جو مناسب سمجھیں کہہ دیجیے گا۔"

"میری تو عقل کام نہیں کرتی۔"

"مجھ سے مت پوچھیے، میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"زریں کا تمھارے سوا کون ہے۔"

"آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔"

"مگر تم نے اس بارے میں کبھی غور تو کیا ہوگا؟"

"شاید کبھی نہیں۔"

"تمھاری رائے ہو تو میں بابا (فیصل) سے ذکر کروں۔"

"آپ کرنا چاہیں تو پہلے زریں سے پوچھ لیجیے۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"زریں بے چاری کیا کہے گی۔"

"تو پھر جیسا آپ کا جی چاہے۔"

"تم بھی کچھ بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے۔ ڈنگے بات کر کیا چپ رہوں؟ ضروری نہیں کہ تم فوراً جواب دو۔ میں سمجھتی ہوں کہ انھوں نے باقاعدہ بات نہیں کی ہے، محض اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اُن کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی یہی کرتی۔ زریں ہے ہی اتنی اچھی، ہر کوئی اُسے اپنے گھر کی دلھن بنانا چاہے گا۔"

نیساں چھنکتی ہوئی کمرے میں اچانک داخل ہوئی تو خانم چپ ہو گئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ نیساں نہ آتی تو نہ جانے کب تک مجھے خانم کی یہ اجنبی اجنبی باتیں سننی پڑتیں۔ خانم سے کچھ کہے بغیر میں نیساں ہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ "آپ یہاں چھپے بیٹھے تھے، ہم نے حویلی کا کونا کونا چھان لیا۔" نیساں ہنستے ہوئے بولی اور میری انگلی پکڑے پکڑے ایک طرف چل پڑی۔ مجھے اُس وقت کچھ ہوش آیا جب میں نے اپنے سامنے زہرہ کو کھڑے دیکھا۔ زہرہ جیسے میرے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا کنگن کھنکنے لگا۔ "لائیے زہرہ آپا!" نیساں شرارت سے بولی۔ "بابر بھائی! آپ ذرا آنکھیں تو بند کیجیے۔" بند کیجیے، میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ نیساں کے حکم پر کھولیں تو وہ میرے سامنے ایک سوئٹر لہرا رہی تھی۔ "بتائیے کیسا ہے؟"

"اچھا ہے، بہت اچھا..."

"رنگ پسند ہے آپ کو؟"

"ہاں سب کچھ پسند ہے۔"

"زہرہ آپا نے اپنے ہاتھوں سے بُنا ہے۔ ذرا آپ اسے پہن کے دکھائیے۔" وہ چہکتے ہوئے بولی۔ میں نے اُس سے محبت نہیں کی ورنہ وہ ضد کرنے لگتی۔ اُس نے پیچھے سے اور کندھوں سے سوئٹر کھینچ کے درست کیا اور گھوم گھوم کے جائزہ لینے لگی۔ "سچ بابر بھائی! آپ اس میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔" وہ جوش میں بولی۔ "ایک رتی کم نہ زیادہ، بالکل ناپا تلا آیا ہے۔ معلوم ہے زہرہ آپا نے صرف اندازے سے بنایا ہے۔"

میں نے زہرہ کو ایک نظر دیکھا۔ وہ سر جھکائے انگلیاں چٹخا رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ "زہرہ آپا کہتی ہیں کہ آپ اُن لوگوں کو لے کے جلد ہی آ جائیے گا، سب انھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔" نیساں تیز تیز لہجے میں بولی۔ میں نے اُس سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم زہرہ خود کیوں نہیں بولتی، وہ گونگی تو نہیں ہے۔ نیساں کو شاید احساس

ہو گیا کہ میں اُس کی باتیں توجہ سے نہیں سُن پا رہا ہوں۔ اُس کا چہرہ بجھنے لگا۔ وہ زرک کے مشتاق آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ وہ پریشان سی ہو گئی تھی۔ میری طبیعت پوچھنے لگی۔ میں نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا، اُس کے ہاتھ چومے اور اس سے پہلے کہ اُس کی [illegible] کی آنکھیں چھلکنے لگتیں میں منہ پھیر کے چلا آیا اور اپنے کمرے میں آ کے میں نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے اپنا جسم نڈھال خالی سا لگ رہا تھا۔ کھوکھلا، راکھ کا ڈھیر۔ ساری رات میں دیواروں پر روشنی کے لرزتے سائے دیکھتا رہا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی تو پہلی دستک پر میں نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ میں سمجھا شاید زرین ہو گی مگر وہ جہانگیر تھا اور یہ بتانے آیا تھا کہ اب مجھے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ بالکل دھیان نہیں رہا تھا کہ صبح ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔

گاڑی صبح چھ بجے جاتی تھی۔

ہم ٹھیک ساڑھے چار بجے حویلی سے نکل گئے تھے [illegible] کرتا مگر کوئی نہیں ہمراہ تھا۔ منیر علی، ارشد، جہانگیر، حمود اور دوسرے کے دوسرے لوگ ہمیں اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے تھے۔ گاڑی وقت پر روانہ ہوئی۔ ہمیں ایک ڈبا خالی مل گیا تھا۔ فیصل کی ہدایت پر جہانگیر نے فرسٹ کلاس ہی کے ٹکٹ لیے تھے۔ نشستیں بہت آرام دہ تھیں۔ کچھ دیر تک وہ سب باتیں کرتے رہے پھر برتھوں پر لیٹ گئے۔ لکھنؤ اسٹیشن گزر گیا اور سندیلہ آیا تو مجھے سمت کا اندازہ ہوا۔ لکھنؤ سے براہِ راست بمبئی جانے کے بجائے ہم دلی کی طرف جا رہے تھے گویا دلی سے پھر ہمیں بمبئی جانے والی گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزرتے رہے۔ بریلی اسٹیشن پر مارق نے ٹفن کھول دیں۔ سب یہ دیکھ کے ہنسنے لگے کہ زرین نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا ہے۔ میں بھی دسترخوان پر بیٹھ گیا اور آخر تک اُن کا ساتھ دیتا رہا۔ یہ بریلی اسٹیشن تھا۔ بریلی سے مراد آباد صرف باون میل کی دوری پر واقع ہے۔ درمیان میں رام پور کا شہر آئے گا، پھر مراد آباد۔ مراد آباد کی طرف سے گزرنے کے خیال سے میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اتنے دن گزر گئے تھے جب میں منیر علی کو لے کے ہم سیدھے فیض آباد چلے آئے تھے۔ اس کے بعد تبت کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب کہیں اس عرصے میں اپنے شہر واپس نہ آ گئے ہوں۔ انھیں کہیں ملازمت نہ ملی ہو تو آخر انھوں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ گاڑی بریلی سے چل چکی تھی جیسے جیسے مراد آباد قریب آتا جا رہا تھا، میرا گمان جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کتنا فرق پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کا۔ مگر میں آباجان سے کس طرح کہہ سکتا تھا کہ ایک پہر کے لیے مراد آباد رُک جائیے۔ یوں بھی ہمیں شام کو دلی پہنچ کے رات کے ۱۰ بجے تک بمبئی کی گاڑی کا انتظار کرنا تھا اور صبح کو نہیں شام کو ہم بمبئی پہنچیں تو کون سا گھاٹا ہو جائے گا۔ بعد میں پھر کب اس طرف آنا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ ان سے کس طرح کہوں۔ وہ کیا کہنے لگیں گے۔ گاڑی تیز رفتاری سے مراد آباد کی سمت بڑھ رہی تھی۔ میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد آباجان نے سامنے کی برتھ پر لیٹ کے آنکھیں موندیں تو مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے جہانگیر کو جھنجھوڑا۔ "دادا! میری ایک بات مانو گے؟" میں نے اس سے سرگوشی میں التجا کی۔

"ہاں بھائی!" وہ تعجب سے بولا۔ "کوئی کھیل ہے؟"

"کھیل ویل کچھ نہیں۔ تم آباجان سے کوئی بہانہ کر کے کچھ دیر کے لیے مراد آباد رُک جاؤ تو تمھارا بڑا احسان ہوگا۔ انھیں مت بتانا کہ میں نے کہا ہے۔ مجھے وہاں بس تھوڑی دیر لگے گی۔ شام کو مراد آباد سے ایک گاڑی پانچ بجے کے قریب دلی جاتی ہے۔ اس سے بھی بمبئی کی گاڑی کا میل بنتا ہے۔ سفر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دادا! آباجان کو تم کسی طرح سمجھا دو۔"

جہانگیر نے ایک دو لمحے کے لیے سوچا اور عجیب سی نظروں سے میری صورت دیکھتے دیکھتے سر ہلانے لگا۔ وہ آباجان کے پاس جانے کے لیے اُٹھ گیا تو میں [illegible] دل سے گاڑی سے باہر جھانکنے لگا۔

معلوم نہیں جہانگیر نے آباجان سے کیا کہا۔ مجھے تبھی پتا چلا جب اُس نے اوپر کی برتھوں پر لیٹے بچے مارق اور زورا سے نیچے آ کے سامان سمیٹنے کو کہا۔

رام پور اسٹیشن سے مراد آباد کا فاصلہ صرف سولہ میل تھا۔ آدھے گھنٹے میں گاڑی پہنچ جاتی تھی مگر یہ آدھا گھنٹا جیسے پھیل گیا تھا۔ کٹ گھر کے اسٹیشن سے پہلے رام گنگا کے پل پہ گاڑی ٹھہر گئی۔ دریا میں پانی زیادہ تھا۔ جب تک پل صاف نہیں ہو گیا، گاڑی کھڑی رہی پھر گھسٹ گھسٹ کے چلنے لگی۔ میں اکیلا ہوتا تو کٹ گھر پہ ہی اُتر جاتا۔ یہاں سے مولوی صاحب کا محلہ فیض گنج زیادہ قریب تھا۔ تانگہ دس منٹ میں مجھے اُن کے محلے پہنچا دیتا۔ میری ملاکے والے سینے میں دھڑک رہے تھے اور میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کیا عجب کہ زرین کی بات سچ ہی ہو جائے۔

دس منٹ کی تاخیر سے گاڑی مراد آباد کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کے سامنے ہی اسلامیہ مسافر خانہ تھا۔ میں وہاں پہلے بھی جا چکا تھا۔ ہمارے پاس سامان زیادہ نہیں تھا۔ ایک ہی

قلی نے اُسے مسافر خانے تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کے منتظم کو سب مولوی کہتے تھے۔ رجسٹر پر انھوں نے ہمارے ناموں کا اندراج کیا۔ جہانگیر، زورا اور مارق کے نام ہم نے بدل دیے۔ خواہ مخواہ وہ چونکتے۔ اُوپر کی منزل کے ایک روشن اور صاف ستھرے کمرے میں آباجان، زورا اور مارق کو ٹھہرا کے میں اور جہانگیر فوراً مسافر خانے سے نکل آئے اور تانگے پر بیٹھ کے فیض گنج جا کے ہی رُکے۔ پھر مولوی صاحب کے مکان کی گلی میں پہنچنے میں ہمیں دو چار منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں نے دھڑکتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ "کیا مولوی محمد شفیق صاحب یہیں رہتے ہیں؟" میں نے ڈگمگاتی آواز میں پوچھا۔

دوسرے ہی لمحے میرا دل ڈوبنے لگا۔ "مولوی محمد شفیق صاحب؟" اُس نے کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کے تذبذب سے دہرایا۔ "اب وہ یہاں نہیں رہتے۔ ہم نے یہ مکان اُن سے خرید لیا ہے۔"

"آپ نے خرید لیا ہے؟ کب؟"

"ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔"

"کیا وہ یہاں آئے تھے؟"

"جی ہاں، اُنھی سے ہم نے لیا ہے۔"

"آپ کے گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں ہے؟"

"بھائی سوئے ہیں۔"

"کب تک اُٹھ جائیں گے؟"

"آپ ابا جی کی دکان پہ چلے جائیے۔ منڈی چوک میں اُن کی بساط خانے کی دکان ہے۔"

"کس نام سے؟"

وہ جھجک کے بولی۔ "حافظ صاحب کی دکان کسی سے پوچھ لیجیے گا۔"

"آپ کا بہت شکریہ۔"

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم پردیسی ہیں۔ مولوی شفیق صاحب کے واقف کار۔"

منڈی چوک بھی دور نہیں تھا۔ حافظ صاحب کی دکان تلاش کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ دکان پر ایک پستہ قد شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بھری بھری خشخشی داڑھی، سرخی رنگ، سر پہ [illegible] کی ٹوپی۔ مولوی صاحب کا نام سُن کے وہ گھبرا سا گیا۔ "سنا ہے آپ ہی نے اُن کا مکان خریدا ہے؟"

"جی ہاں، ابھی حال میں خریدا ہے۔" وہ کسی قدر تُرشی سے بولا۔

"تو کیا وہ یہاں آئے تھے؟"

"اُن کے بغیر سودا کیسے ہو سکتا تھا؟"

"کب آئے تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"پھر وہ کہاں چلے گئے؟"

"میں نہیں کہہ سکتا۔ وہ ایک عرصے بعد مراد آباد آئے تھے۔ صرف دو دن کے لیے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے۔ [illegible] اُن کی کچھ زمین تھی اور یہ مکان۔ دونوں کا سودا کر کے واپس چلے گئے۔"

"زمین کن صاحب نے خریدی؟"

"میں واقف نہیں ہوں۔" وہ اُلجھ کے بولے۔ "البتہ مجھے اتنا علم ہے کہ انھوں نے زمین بھی بیچی ہے۔"

"کیا انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے آئے ہیں، کہاں رہتے ہیں؟ ظاہر ہے آپ نے پوچھا تو ہوگا؟"

"میرا آباد میں کہیں قیام بتاتے تھے۔"

"میرا آباد میں! وہاں اُن کی ایک بہن بھی رہتی تھیں۔ کیا وہ کوئی پتہ دے گئے ہیں؟"

"کاغذ پر انھوں نے مراد آباد ہی کا پتہ لکھوایا تھا۔"

"کیا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی تھی؟"

"ہو سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا نا، وہ مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کوئی دس سال میں وہ مراد آباد واپس آئے تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔"

"لیکن میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔"

"جو آپ پوچھ رہے ہیں، اُسی کا جواب دے رہا ہوں۔"

"وہ یہاں اور لوگوں سے بھی ملے ہوں گے۔ یہ اُن کا شہر ہے۔ کیا آپ مجھے چند ایسے لوگوں کے نام نہیں بتا سکتے ہیں جن سے وہ ملے ہوں؟ ممکن ہے انھیں انھوں نے اپنا پتہ بتایا ہو۔ دیکھیے ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ ہمیں مولوی صاحب سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہوں تو مسافر سمجھ کے کر دیجیے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

"عزیزم! مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے بتا دیا۔ مجھے مکان سے غرض تھی۔ کچھ اور جاننے بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی ہی اُلجھنیں کیا کم ہیں۔ آپ چاہیں تو میں کچھ نام بتا دوں۔ اِن لوگوں سے مل لیں مگر میرا خیال ہے آپ کو ناکامی ہوگی۔ مولوی صاحب بہت جلدی میں آئے تھے۔ جلد سے جلد سودا کرنے کی فکر تھی۔ آئے اور چلے گئے۔"

اُس کے بتانے پر ہم دوبارہ فیض گنج گئے اور اُن دو

تین آدمیوں سے ملے مولوی صاحب کی اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور اُنھیں اتنا ہی معلوم تھا، جتنا باسطی حافظ صاحب کو۔
مولوی صاحب بہت مجبوری ہی کی حالت میں یہاں آئے ہوں گے اور انھوں نے زیادہ لوگوں سے ملنا گوارا نہیں کیا ہوگا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ مولوی صاحب نے مسافرخانے میں مسافروں کی آمدورفت کے رجسٹر پر اپنا پتہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ میں اور ہیرو کہیں اور جانے کے بجائے تانگے میں بیٹھ کے فوراً مسافرخانے واپس پہنچے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن منتظم صوفی جی ہمیں رجسٹر دکھانے سے کترانے لگے۔ میں نے بہت التجا کی تو کہنے لگے: "آپ عادل صاحب سے مل لیجیے۔ وہ کہہ دیتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

عادل صاحب کا دفتر مسافرخانے کے وسط میں واقع تھا۔ وہ لمبے قد گندمی رنگ کشادہ پیشانی کے ایک نرم خو شخص تھے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سفید بے داغ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی اور بتایا کہ مجھے مولوی صاحب کے پتے کی شدید ضرورت ہے۔ "آپ کا بڑا کرم ہوگا۔"

انھوں نے صوفی جی کو اندر بلا لیا اور مجھے رجسٹر دکھانے کو کہا۔ ڈیڑھ مہینے پہلے کے مسافروں کی فہرست دیکھ کے اِس کی تصدیق ہوگئی کہ مولوی صاحب مسافرخانے میں ٹھیرے تھے اور اُن کے ساتھ ایک برقع پوش خاتون بھی تھیں یعنی اُن کی بیگم۔

"کیا اُن کی بیگم بھی اُن کے ساتھ تھیں؟"

"رجسٹر تو یہی بتا رہا ہے جناب۔" صوفی جی منہ بنا کے بولے۔

"کیا آپ نے انھیں دیکھا تھا؟"

"میاں!" وہ ناراضی سے بولے۔ "ہم یہاں آپ کے خیال میں دوسروں کی عورتوں کو تکتے رہتے ہیں؟ یہاں شُرفا ٹھیرتے ہیں۔"

رجسٹر پر لکھے ہوئے لفظ میرے سامنے تھے۔ انھیں دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اگلے خانوں میں مولوی صاحب کا پتہ درج تھا۔

"آپ پتہ دیکھ رہے تھے؟" عادل صاحب نے مجھے ٹوکا۔ اُن کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

اسی لمحے صوفی جی نے میرے سامنے سے رجسٹر اُٹھا لیا۔

ہیرو دادا نے پیچھے سے مجھے کہنی ماری: "ارے بھیا! صاحب کیا پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے عادل صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے نہیں سنا تھا کہ انھوں نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

"ابھی صاحب کا پتہ آپ کو درکار تھا؟" عادل صاحب تذبذب سے بولے۔

"ہاں!" میں نے سر جھکا کے ڈولتی آواز میں کہا۔

"آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں کچھ اور نہیں۔" میں جلدی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"روز یہاں سیکڑوں مسافر آتے جاتے ہیں لیکن مولوی صاحب کا آنا مجھے یاد ہے۔ کچھ یوں بھی کہ ایک زمانے میں اُن کا تعلق بھی اِسی شہر سے تھا۔ میں اُن دنوں مسافرخانے کی نئی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اس لیے ایک ہی بار اُن سے ملاقات ہوسکی وہ بھی سرسری۔ مولوی صاحب بھی کچھ جلدی میں تھے' وہ تین ہی روز ٹھیرے ہوں گے۔" عادل صاحب جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے تھے' اُن کی آواز دھیمی تھی۔ "مجھے کچھ بتائیے؟" وہ چونک کے بولے۔ "شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔"

"ان ہی کی کھوج میں ہے۔" ہیرو نے تیزی سے کہا۔ "ابھی وہ کچھ اور بولتا تھا کیا اپنا مطلب ہے کہ آپ؟..."

"نہیں" عادل صاحب ہیرو کی بات کاٹ کے بولے۔ "دراصل عرصہ ہوا وہ یہ شہر چھوڑ کے جا چکے ہیں۔ پہلے بھی وہ گھومتے ہی رہتے تھے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایسے لوگ عموماً تنہائی پسند ہوتے ہیں عمر میں مجھ سے خاصے بڑے ہیں۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ لیے دیے رہنے والے شخص ہیں۔ سلام دعا مزاج پرسی ہی تک بات ہو سکی۔ مسافرخانے کی نئی عمارت کا نقشہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے سارے شمالی ہند میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مسافرخانہ ہوگا۔ میں نے کہا: بس دُعا کیجیے یہ کام کسی طرح تکمیل پا جائے۔ کوکب صاحب کے متعلق پوچھا جو مسافرخانے کی تعمیر میں پیش پیش ہیں۔ کوکب صاحب ایک مشاعرے میں امروہہ گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو مولوی صاحب جا چکے تھے۔ میں نے اُن سے مولوی صاحب کا ذکر کیا تو ملاقات نہ ہونے کا افسوس کرنے لگے۔ صورت یہ ہے جناب کہ یہاں از خود کوئی دفتر میں آ جاتا ہے تو ملاقات ہو جاتی ہے ورنہ ہم اپنی جانب سے مسافروں کے معاملات میں غیر ضروری طور پر مُخل نہیں ہوتے۔" چند لمحے رُک کے عادل صاحب بولے: "افسوس ہے کہ اُن کے بارے میں مجھے کچھ اور معلوم نہیں ہے۔ کوئی اور خدمت ہو تو فرمائیں؟"

"آپ کا شکریہ صاحب!" ہیرو نے بلونٹ کے انداز میں جُھک کے سلام کرتے ہوئے کہا: "آپ کی مہربانی..."

میں عادل صاحب کو سلام کیے بغیر باہر چلا آیا۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور مجھے چکر سے آ رہے تھے۔ ہیرو میرے ساتھ نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ عادل صاحب سے اور کیا باتیں کر رہا تھا۔ خواہ مخواہ وہ کسی شک میں پڑ جاتے۔ مولوی صاحب کے بارے میں انھیں اِس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا، معلوم ہوتا تو چھپاتے نہیں۔ وہ طبیعت کے کھرے، بات چھپانے والے آدمی نظر نہیں آتے تھے۔ میں مسافرخانے سے باہر اسٹیشن روڈ پر آ کے کھڑا ہو گیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹیشن تھا جہاں مسافروں کی بھیڑ لگی تھی۔ تانگے والوں کے شور میں ہر آواز دب گئی تھی۔ شاید ابھی ابھی کوئی گاڑی آئی تھی۔ لکھنؤ سے آنے والی گاڑی کہیں آگے جا رہی ہو۔ یکایک میرے ذہن میں آیا میں اِسی گاڑی سے نکل سکتا ہوں۔ اباجان زہرا اور دادی مسافرخانے کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ اُن میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑے مجھے جلد سے جلد یہاں سے دُور ہو جانا چاہیے۔ اُوپر جاؤں گا تو مجھے اُنھی کے ساتھ جانا پڑے گا مگر اباجان کے خیال سے میں ٹھیر رہا۔ اس طرح میرے چلے جانے پر وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نہ جانے کیا کیا سوچیں اور کتنی دیر تک انتظار کرتے رہیں حالانکہ ہیرو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں کس طرف جا سکتا ہوں مگر وہ اباجان کو کس طرح مطمئن کر سکے گا۔ بہتر ہے کہ ایک رقعہ لکھ کے کسی آدمی کے ہاتھ اباجان کے کمرے میں بھیج دوں کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ میں چند روز بعد اُن سے بمبئی آملوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ہیرو آ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے واپس اندر لے گیا۔ میں اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

چند منٹ بعد ہم سب سامان کے ساتھ مسافرخانے سے نکل آئے اور تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ہمیں ایک دو منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو چھوٹ جاتی۔ دو مسافروں کے سوا سارا ڈبا خالی پڑا تھا۔ کچھ دُور تک گاڑی رینگ رینگ کے چلتی رہی پھر اُس نے رفتار پکڑ لی۔ مرادآباد سے حیدرآباد جانے کے لیے بھی ایک سیدھا راستہ تھا۔ اگر میں اُن سے تنہا بھی ہوتا تو مجھے اِسی طرف دلّی سے گزر کے آگے جانا پڑتا۔ یہاں نہیں تو دلّی اسٹیشن پر میں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

مسافرخانے کے رجسٹر پر لکھے ہوئے لفظ میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ ہر جگہ وہی لفظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ جہاں نگر کا علاقہ حیدرآباد میں تھا اور میں پہلے بھی اس علاقے سے گزرتے تھے۔ ہو سکتا ہے اُس مکان کے ارد گرد بھی گھومے ہوں جہاں مولوی صاحب نے اپنا قیام لکھوایا تھا۔ ہم نے علاقے کی تمام [illegible] مدرسوں میں اور جہاں جہاں ممکن تھا معاملے کے پوچھ لیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں کہیں ہوتے تو کوئی بتاتا۔ وہ اُن دنوں حیدرآباد سے سیکڑوں میل دُور جھیلپر میں بسے ہوئے تھے۔ جھیلپر کے بعد میں دوبارہ حیدرآباد جانے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے طے کیا تھا کہ سب سے پہلے وہیں جاؤں گا۔ حیدرآباد میں صاحب علم لوگوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ جھیلپر سے مولوی صاحب سارا گھر چھوڑ کے چلے تھے انھیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے تھا جہاں اُن کے چند شناسا موجود ہوں۔ جن حالات میں انھیں جھیلپر سے دُور ہونا پڑا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں جب ایک نوجوان لڑکی بھی اُن کے ساتھ تھی انھیں دربدر مارے مارے پھرنے کے بجائے کسی ایسے ٹھکانے کا رُخ کرنا چاہیے تھا جہاں ہاتھ پھیلائے بغیر کوئی سہارا مل جانے کی توقع ہو۔ عارضی طور پر سہی چلتے وقت اُن کے پاس پیسے بھی کم تھے۔ صرف اتنے جو رحمت خاں نے جھیلپر سے فرار کرتے ہوئے انھیں دیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عرصہ ہوا حیدرآباد میں اُن کی اکلوتی بہن بیاہی گئی ہے۔ میں اُس کا گھر تلاش نہیں کر سکا تھا لیکن مولوی صاحب کو اپنی بہن کا پتہ معلوم ہوگا۔ اُس کے شوہر کے رشتے دار، جان پہچان والے وہاں موجود ہوں گے۔ جھیلپر سے آنے کے بعد بھوپال نے اچانک تبت جانے کا ارادہ کر لیا ورنہ میں ایک مرتبہ حیدرآباد ضرور جاتا۔

رجسٹر میں مولوی صاحب نے اپنے ساتھ سفر کرنے والی لڑکی کو اپنی بیگم کی حیثیت سے درج کرایا تھا۔ ظاہر ہے مرادآباد میں وہ اُس سے اپنا کوئی اور رشتہ نہیں بتا سکتے تھے۔ یہاں سب جانتے تھے کہ انھوں نے شادی نہیں کی ہے، لڑکی کو وہ اپنی بیٹی نہیں بتا سکتے تھے۔ جھیلپر سے عزت و عافیت کے ساتھ نکلنے کے بعد وہ معلوم نہیں لڑکی کو کہاں کہاں منہ چھپاتے پھرے ہوں۔ انھیں کوئی ایسا ہی اندیشہ ہوگا اسی لیے وہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ یقیناً گزشتہ برسوں میں انھیں لڑکی کی تلاش میں گھومنے والے [illegible] قبیلے کے لوگوں سے کوئی واسطہ پڑا ہوگا جبھی وہ اتنی احتیاط برتتے تھے۔ اب انھیں جھیلپر کے [illegible] کے آدمیوں سے بھی اندیشہ ہوگا کہ وہ انھیں دوبارہ نہ تلاش کر لیں۔

میرا دل نہیں مانتا تھا مگر ایک اور بات بھی ہو سکتی تھی جس سے مولوی صاحب خوف زدہ ہوں۔ شاید انھیں یہ خیال ہو کہ میں کہیں اُن سے اپنی امانت واپس لینے نہ آ جاؤں۔ ممکن ہے میری ہی وجہ سے ایسا ہو۔ تھوڑا بہت قاعدہ قانون انھیں بھی معلوم ہوگا کہ مجھے قتل کی سزا میں کم سنی کی وجہ سے رعایت مل سکتی ہے یا پھر انھیں میرے مقدمے کے فیصلے کا علم ہو گیا تھا۔ انھیں پورا

یقین ہوگا کہ سات سال بعد جیل سے باہر آنے کے بعد میں اُسی کو تلاش کروں گا، کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ جیل کے سات سال میں ایک ایک دن ایک ایک لمحہ گن گن کے ہی کاٹوں گا۔ ایک ہی اُمید مجھے وہاں زندہ رکھے گی کہ باہر کوئی میرا منتظر ہے۔ جیل کا دروازہ کھلنے کی دیر ہوگی کہ میری آنکھیں بھر بھر کے اسے دیکھنے کے لیے بھٹکتی پھریں گی۔ انھیں خوب اندازہ ہوگا کہ وقت کی دھول جم جانے سے اُس کی تصویر مٹا نہیں سکے گی۔

میری خبر رکھنا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ جیل کے سوا میرا ٹھکانا اور ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا پتہ بہت آسان تھا۔ وہ مجھے خط لکھ سکتے تھے، مجھ سے آ کے مل سکتے تھے۔ خود نہیں تو اپنا کوئی پیغام بھیج سکتے تھے اور اُن کے دل میں اِس زہرہ والے اگر کوئی وسوسہ تھا کہ اس طرح جیل کے حکام کو میرے حوالے جانے کا موقع مل جائے گا اور حقیقتاً اُن کے اور کرا کے سکون میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے تو وہ کوئی اور تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ شروع میں نہیں تو تین چار سال بعد وہ اپنے نام اور پتے کے بغیر لوئی اور کرا کی خیریت کا دو سطری خط لکھ سکتے تھے۔ میرے لیے تو ایک اشارہ بہت ہوتا۔

جیل میں اُن کا خط نہ آنے اور میری خبر نہ لینے کی میں نے اپنے طور پر بہت سی تاویلیں کر رکھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب نے یہ خاموشی جان بوجھ کے اختیار کی ہوئی ہے۔ میں نے انھیں اپنے اور کرا کے بارے میں تقریباً سبھی کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ جس رات دریا کے کنارے اجنبی لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور کرا کو ہم سے چھین لے جانے کی کوشش کی تھی وہ جانگ قبیلے کے لوگ یا اُن کے بھیجے ہوئے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ اُس رات وہ ناکام ہو گئے۔ میں جیل چلا گیا لیکن مولوی صاحب کے خیال میں جیل میں بھی وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا ہوں گے۔ انھیں سراغ لگانے کی فکر ہوگی۔ مولوی صاحب بھی اُسی روز کلکتے سے چلے گئے ہوں گے اور انھوں نے خط لیں نہیں لکھا کہ میں اُن کے آبائی شہر سے واقف ہی تھا۔ میرے اور اُن کے درمیان کی بات تھی، کسی تیسرے کو اس کا علم نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مولوی صاحب نے حفظِ ماتقدم کے لیے مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا ہے۔ یہی سوچ کر رہا ہوتے ہی میں سیدھا مراد آباد ہی آؤں گا اور مراد آباد جیسے شہر میں انھیں ڈھونڈنا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔ اِس دوران کرا نے بھی انھیں اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا چنانچہ جانگ قبیلے کے لوگوں کے سلسلے میں وہ لوگ حساس ہو گئے ہوں گے۔ انھیں قدم قدم پر ان کی طرف سے خطرہ ہوگا۔ جیل سے نجات پانے کے بعد میں نے سیدھے مراد آباد ہی کا رخ کیا تھا۔ مولوی صاحب میرے لیے وہاں کوئی خبر نہیں چھوڑ کے گئے تھے۔ وہ میرے سے مراد آباد گئے ہی نہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس رات کے بعد اُن دونوں کو کیا افتاد پیش آئی۔ میں بار بار جیسلمیر میں منیر علی کا گھر ملنے ہی پر اُن کے بارے میں ٹھیک پتہ چل سکا اور پہلی بار مجھے کچھ ایسا گمان ہوا کہ انھیں میرا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے میرے سامنے سے کرا کو دور رکھنے کے لیے انھوں نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ وہ ایک سزا یافتہ آدمی کو کرا کے لیے مناسب نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اُن کا ایسا سوچنا بھی ایک طرح سے برحق تھا۔ میرا اُن سے رشتہ ہی کون سا تھا۔ دلوں کی ملاقات تھی۔ رشتہ اُن کا کرا سے تھا جو اپنے دلوں تک اُن کے ساتھ رہی۔ میں اُن کا کون ہوتا تھا۔ جیل میں اکثر لوگ بدل جاتے ہیں۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ میں نے وہاں تعلیم بھی جاری رکھی ہے۔ میں ہر لمحے اُس کے لیے دعائیں کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ میرے سامنے رہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُس نے میرے بغیر بہت دُکھ اٹھائے ہیں۔ میں ادھر جیل میں ہوں تو وہ بھی زندگی جیل کے مانند کاٹ رہی ہوگی۔ مجھے تو سلاخوں کا بادہ تھی وہ تو سلاخوں کے بغیر قید ہوگی۔ اس لیے مجھے جیل سے اُس کے لیے ایک مکمل آدمی ایک ستون بن کے نکلنا چاہیے۔ راتوں کو جاگ جاگ کے میں اسی لیے پڑھتا رہتا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں نے جیل میں رہنے کے باوجود ایم اے کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں نے تحمل سے منتر سیکھے تھے۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو ہر اعتبار سے مستعد اور مستحکم رہنا چاہیے۔ سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہے، اپنا گھر بنانا ہے۔ میں اُس کا پاسبان بن کر، میری چھاؤں میں آ کے وہ گزرا ہوا سب کچھ بھول جائے گی۔ قتل نے بھی مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ رہا ہونے کے بعد مجھے وقت پر کام کرنا ہے۔ وہ تو میرے لیے وہی خواب دیکھتا تھا جو میں خود دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے ایک بڑا وکیل بنانا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب کو میری فکر ہوتی تو انھیں یہ سب معلوم ہوتا۔ اُن کے ذہن میں بس ایک ہی بات ہوگی کہ میں جیل چلا گیا ہوں، وہ بھی آدمیوں کے قتل کے جرم میں۔ سو میرے بدن پر کوڑھ نمودار ہو گیا ہوگا، میرا چہرہ سیاہ ہو گیا ہوگا۔ اُن کے خیال میں جیل جانے کے بعد ہر شخص کا چہرہ رنگ روپ بدل جاتا ہوگا۔

وہ انھیں اتنی عزیز ہو گئی ہوگی کہ اُسے جُدا کرنے کا تصور بھی اُن کے لیے عذاب ہوگا۔ وہ اس کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں گے جو خوشی کے ساتھ لے جائے کہ کرا کو اُن کی آنکھوں سے دُور نہ لے جائے۔ ایسا ایک شخص انھیں جیسلمیر میں ملا تھا۔ ارشد منیر علی کا بھتیجا۔ منیر علی کے خاندان کو وہ اچھی طرح پرکھ چکے تھے۔ ارشد ایک

تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ انھوں نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ منیر علی کے بقول راناستاب نے انھیں بہت بڑی دولت کی پیشکش کی تھی مگر اُس کی دولت کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ اس عرصے میں نہ جانے کتنے لوگوں، کتنے خاندانوں نے اُن سے کرا کے لیے درخواست کی ہوگی۔ مولوی صاحب نے کہیں ہامی نہیں بھری تھی۔ کیا انھیں اس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن کرا کو اُن سے جُدا ہونا ہے۔ ہر لڑکی کو ایک گھر سے رخصت ہو کے دوسرا گھر بسانا پڑتا ہے۔ میں جانتا نہیں تھا اور میں مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ کرا کے لیے کس شخص کی تلاش میں تھے؟ انھیں کس دن اور کس شخص کا انتظار تھا؟ کون آنے والا تھا؟ شاید کوئی بھی نہیں۔ نہ میں نہ کوئی اور۔ بس انھیں ایک مشتاق اُمید موہوم سی توقع ہوگی کہ کسی دن کرا خود تھک جائے گی اور پھر وہ جو چاہیں گے اُس کے لیے فیصلہ کر سکیں گے۔ انھوں نے جتنے لوگوں کو مسترد کیا ہوگا، بیشتر کرا کے سبب سے کیا ہوگا۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وقت نے کرا کا ارادہ اور فروزاں کر دیا ہے۔ میں اُس کے پاس نہیں تھا لیکن میری ساعتیں اُس کے سینے میں بسی ہوئی ہیں۔ میری پرچھائیاں ہر لمحے اُسے حصار میں لیے رہتی ہیں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ نہیں ہے، اُس کی اپنی الگ ایک دنیا ہے۔

بعد میں زہرہ نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ ہر چند کہ مجھے اس تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تو تھا کہ وہ وہی ہوگی، اُس کا قد بڑھ گیا ہوگا، اُس کا رنگ نکھر گیا ہوگا، شکل صورت میں وہ پہلے سے بہت بدل گئی ہوگی لیکن وہ ہوگی وہی جس رات وہ مجھ سے جُدا ہوئی تھی۔ وہیں بی بی زہرہ نے کہا تھا کہ وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہے، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ نہ اُسے لباس کا شوق ہے نہ زیور کا۔ کوئی آ کے خود اُسے پوچھ جائے تو ٹھیک ہے، نہ آئے تو شکایت نہیں کرتی۔ گھنٹوں تنہا بیٹھی دیواریں تکتی رہتی ہے۔ اتنا وعدہ مولوی صاحب کے جانے کے لیے کافی تھا کہ اُس کی منزل تو ایک ہی ہے۔ اُسے ایک ہی شخص کا انتظار ہے، وہی اس کی نیند، وہی اس کا خواب ہے، وہی اس کی روح ہے۔ وہ اس کے لیے زر و جواہر اکٹھے کریں یا اُسے دیواروں میں بند تہ خانوں میں محبوس کر رکھیں، [illegible] ڈال دیں یا ساری دُنیا کی خوشیاں اس کے قدموں میں بکھیر دیں، اُس کی خوشی تو ایک ہی شخص میں نہاں ہے۔ نو برس گزر چکے تھے۔ مولوی صاحب کو اور کتنے برسوں کا انتظار تھا۔ نو برس کیا، نو صدیاں نو یُگ بیت جائیں، وہ تو وہی رہے گی۔ مولوی صاحب نہیں جانتے تھے کہ کبھی کبھی دو آدمیوں سے ایک آدمی کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ دو آدمی جو بظاہر الگ الگ نظر آتے ہیں بباطن ایک ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا خیال ہوگا کہ وقت دُنیا بدل دیتا ہے۔ وقت ایک دن اُسے بھی منقلب کرے گا۔ انھوں نے اس سے جانے کیا کیا کہا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں مگر انھوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا اور کہا ہوگا تو اس نے تسلیم نہیں کیا ہوگا۔ اُس کا دل بھی ایک آئینہ ہے۔ وہ بھی اس سے کچھ کہتا ہوگا جیسے میرا دل کہتا ہے۔ مولوی صاحب نے جینے کے لیے اُسے طرح طرح کے آسرے دیے ہوں گے لیکن وہ ایک ہی آسرے پر زندہ تھی، اپنے آسرے پر۔

زہرہ تو مجھے بہت بعد میں ملی تھی۔ زہرہ سے ملنے سے پہلے ہی میں اُس کے بارے میں یہ سب کچھ جانتا تھا۔ میرا یقین ہی میری زندگی تھا۔ مولوی صاحب اُسے دُور دُور لیے پھریں، زمین سات سمندر پار لے جائیں۔ ایک دن انھیں میری یاد ضرور آئے گی۔ ایک دن وہ خود نڈھال ہو جائیں گے۔ وہ کرا پر ایک سب سے بڑی مہربانی ضرور کریں گے جسے اب تک وہ نہیں سمجھے تھے اور سمجھتے تھے تو اپنے آپ سے ضد کر رہے تھے۔ بے شک انھیں کرا بہت عزیز ہو سکتی تھی۔ اُن کا بھی زندگی میں کوئی اپنا نہیں تھا۔ ایک کرا ہی تھی اور کرا اُن کی جو جستجو سراپا نور تھی۔ اس کا چہرہ چمکتا رہتا تھا۔ اُن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اُسے اتنا ہی عزیز رکھتا۔ ایک آبا جان ہی تھے جنھوں نے اُس کی قدر نہیں کی۔ جب وہ گھر آئی تھی تو نتھی نے بے ساختہ کہا تھا۔ بالکل گڑیا ہے، جی چاہتا ہے طاق میں سجا کے دونوں وقت دیکھتی رہوں۔ امی کو بھی وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ انھوں نے بُری طرح اس کی بلائیں لی تھیں۔ چشم بد دُور نظر بد سے بچائے۔ یہ کہتے کہتے اُن کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ آبا جان ذرا سا تحمل کر لیتے تو دیکھتے، وہ نتھی سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی، انھیں اپنے بیٹوں بیٹیوں سے زیادہ وہ پیاری ہوتی۔ آبا جان نے اُس کی طرف نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ اُن کی پناہ میں آئی ہے، اُس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ بے سہارا لڑکی اُن کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے راتوں رات بُدھ گیا سے بھاگتی ہوئی آئی ہے، اُس نے کچھ سمجھا ہوگا جبھی اُس طرف کا رخ کیا۔ ایسے کون کسی کے گھر آتا ہے۔ آبا جان کو اس کا نہیں تو کم از کم میرا ہی پاس رکھنا چاہیے تھا۔ میں بھی اُسی گھر کا ایک فرد تھا۔ مجھے کسی کو اپنی مرضی سے اپنے گھر میں رکھنے کا حق نہیں تھا؟ آبا جان وہاں اُس کا رہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے تو کہیں اور بھیج دیتے۔ زمین اتنی تنگ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو اُس کے لیے ایک گھر بنا سکتے تھے۔ وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، اپنے ساتھ دولت بھی لائی تھی، جیسے جواہر سے بھری پوٹلی۔ اُس کے لیے جو آبا جان نہیں کر سکے، وہ مولوی صاحب ایک اجنبی آدمی نے کیا۔ مولوی صاحب ایک بار میری لو وہ لے کے تو دیکھتے کہ میری

ان کتنی تھکی ہوئی ہے۔ مجھ سے اُن کے سامنے نگاہیں بھی نہیں
ٹھا سکیں گی۔ میں نے اُن کو سکھ چین چھین لیا تھا۔ اُنھوں نے
کے لیے کتنی پریشانیاں اُٹھائی تھیں۔ ساری زندگی اس پر قربان
تھی۔ زمانے بھر کی نگاہوں سے اُسے بچائے رکھتے
نے تھے۔ میرے پاس اُن کے احسانات کا کوئی بدل نہیں تھا۔
ی صاحب نہ ہوتے تو آج وہ کہاں ہوتی۔ انھیں پیسوں کی کوئی
پڑ گئی تھی کہ وہ مرادآباد میں اپنی آبائی زمین اور مکان بیچنے آئے
۔ اس مکان اور زمین سے انھیں کیا ملا ہوگا۔ چند ہزار روپے!
بھی وہ ایسا ویسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہر وقت انھیں دھڑکا لگا
ہوگا۔ رانا ممتاب کے واقعے کے بعد وہ اُسے ایک لمحے کے لیے
چھوڑنا نہیں چاہتے ہوں گے لیکن گھر چلانے کے لیے انھیں
سے باہر تو نکلنا پڑتا ہوگا۔ بھیک بھی جسم ہلائے بغیر نہیں ملتی۔
میری جیب میں خزانے کی کنجی رکھی تھی۔ کرشنا جی کی ساری
ت جس کی توں بینک میں پڑی تھی۔ میں نے صرف نیہال کے لیے
ہزار روپے کی رقم خرچ کی تھی۔ شہ بالا کے لیے دی جانے والی
من بیگم کے نصیب ہی میں نہیں تھی۔ کالا منتے نے مجھے پچیس ہزار روپے
چیکنگ چیک واپس کر دیا تھا اور کلکتے کے بینک میں جمع
جانے والے روپے میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی تھی۔
کرشنا جی نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔ میرے سوا کوئی اس
کے مختار نہیں تھا۔ اُن کی روح بھی اس بات سے خوش ہوتی کہ
پیسے میں نے خود پر خرچ کیے ہیں۔ میرے ہی سکھ کے لیے انھوں
جمع کیا تھا۔ جس وقت انھوں نے وصیت لکھوائی تھی اُن کی
زندہ تھیں لیکن اپنی ماں کے نام انھوں نے کچھ نہیں لکھوایا
تھا کہ وہ اُن کے لیے اپنی جگہ ایک اور بیٹا چھوڑ کے جا رہی
نہیں یقین ہوگا کہ اُن کے بعد میں اُن کی ماں کی خدمت میں
دریغ نہیں کروں گا۔ کرشنا جی کی طرح اُن کی ماں نے بھی
کا موقع نہیں دیا۔ وہ مجھ پر اتنا بڑا بوجھ لاد کے چلے گئے
پتہ نہیں کہیں۔ جب انھیں معلوم تھا کہ مجھے پیسے خرچ کرنا
ا اور بہت سی چیزیں پیسوں سے خریدی بھی نہیں جا
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان روپوں کو کیا کروں۔
یں رکھی ہوئی چیک بک مجھے بہت بوجھل لگتی تھی۔ مولوی
ب ہوتے تو میں یہ سب اُن کے حوالے کر دیتا۔ گڑیا کی
ر کھنے کے معاوضے کے طور پر نہیں، اس کا تو معاوضہ ہی نہیں
ں اس کے لیے تو کرشنا جی کی دولت کیا، قارون کا خزانہ
ہے۔ بس جیسے کرشنا جی کا جی چاہا تھا کہ وہ چلتے وقت
م یہ سب کر جائیں، میرا بھی جی چاہتا تھا کہ کرشنا جی

نے مجھے اپنی جان بچانے کا معاوضہ نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا عزیز اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ میں بھی مولوی صاحب کو اپنے ابا جان، کرشنا جی اور تجمل کی طرح سمجھتا تھا۔ ایک بار وہ مُڑ کے دیکھتے، آزما لیتا۔ ہی سمجھ کر اگر مجھ سے دُور کو گئے تو انھیں مجھ سے اتنی بدگمانی نہ ہوتی۔ میں اُن کا دستِ بازو ہی بنتا۔ پھر انھیں سر چھپانے کے لیے کسی بستی کی بچی کھچی خاک نہ چھاننی پڑتی۔ وہ دیکھتے تو میں کہ کتنے لوگ انھیں پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو میں اکیلا بہت تھا۔ میں انھیں کوئی کام نہ کرنے دیتا۔ میرے بازوؤں میں منوں بوجھ اُٹھانے کی طاقت ہے۔ کچھ اور نہیں تو میں مزدوری ہی کر سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ بیڑیوں کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں مجھ سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا ورنہ میں کیا نہیں کر سکتا۔ کرشنا جی کی دولت ایک اتفاق ہے۔ میں نے اس کی طلب کی تھی نہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بغیر بھی میں کچھ کرنے کی تھوڑی بہت اہلیت ضرور رکھتا ہوں۔ میرے ہاتھ کٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔

شاید مولوی صاحب کو یہی گمان ہو گیا تھا کہ میں گڑیا کو اُن سے جُدا کر دوں گا۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے اتنا کم ظرف، بے حس اور تنگ دل کیوں سمجھتے تھے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں گڑیا پر بھی جبر کر رہے تھے۔ کیا اتنے دنوں تک وہ نہیں جان سکے تھے کہ گڑیا اندھی بھی نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے بہترین اسباب تو فراہم کر سکتے ہیں مگر کیا وہ اس کے ہونٹوں کے لیے مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کے لیے چمک بھی مہیا کر سکتے ہیں۔ انھیں گڑیا کا اس قدر خیال ہے تو ایک سامنے کی بات اُن کی عقل میں کیوں نہیں آرہی ہے۔ میری صورت میری حیثیت گڑیا کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میں اچھا ہوں یا بُرا، میرے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی ہے یا سفیدی۔ میں جیل سے جانور بن کے نکلا ہوں یا آدمی۔ میں جیسا بھی ہوں وہ مجھے اپنی قسمت سمجھ کے قبول کر لے گی اور یہی حال میرا ہے۔ اگر مجھے زہرہ سے یہ معلوم ہوتا کہ وقت نے گڑیا کی شکل بگاڑ دی ہے، وہ سب کچھ بھول گئی ہے، مولوی صاحب نے اس کا ہاتھ ارشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے یا وہ رانا ممتاب کے محل میں حکومت کر رہی ہے تو میں یہ سب اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کے قبول کر لیتا۔ وہ جہاں ہوتی، جیسی ہوتی میرے لیے تو وہی تھی۔ اس کا پیار کوئی مول تول کا رشتہ نہیں تھا کہ اگر لین ہے تو اس کا جواب لین ہوگا۔ میری آنکھوں سے بینائی چلی جائے گی تو وہ مجھے اپاہج سمجھ کے مسترد کر دے گی، وہ میری دسترس سے دُور ہو جائے گی تو اس کی تصویر میرے سینے میں دھندلی پڑ جائے گی۔

میری سفیدی پر اس کی سفیدی کا انحصار نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو زندگی میں گڑیا کی طرح کوئی شخص نہیں ملا تھا تو یہ میری یا اس کی غلطی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ اُن کے سامنے تھا۔ کون انھیں جاکے بتاتا کہ ایک دن نہیں، ایک برس نہیں، اب نو برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ جیل میں تو مجبوری تھی لیکن جیل سے باہر ایک ایک پل مجھے ڈستا رہا ہے۔ میں نے انھیں گلی گلی ڈھونڈا ہے۔ کہاں کہاں نہیں گیا ہوں۔ میرے پیروں میں چھالے تک پڑ گئے۔ میری آنکھیں اس کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیں۔ کون اُن سے جاکے کہتا کہ میری رگوں میں ہر وقت کھولن ہوتی رہتی ہے، جی اُڑا اُڑا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں مجھے ہو کیا جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے سب بھول جاتا ہوں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوب طمانچے ماروں، اپنا جسم شکنجے میں کس لوں، کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں یا ریل کے نیچے آجاؤں۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کتنے لوگ میری وجہ سے پریشان رہتے ہیں اور مجھ سے کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی۔ وہ سب بہت اچھے ہیں جو مجھے نہ جانے کیا سمجھ کے معاف کر دیتے ہیں۔ زہرہ میرے ناز اُٹھاتی رہتی ہے۔ نیہال میرے لیے جب دیکھو مصلے پر پیشانی رگڑتی رہتی ہے۔ جولین کو میں ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔ مولوی صاحب کچھ یاد نہیں تو مجھے ایک چٹکی زہر ہی بھیج دیتے۔ ایک بار میرے سامنے آکے خنجر گھونپ دیتے۔ کون میری طرف سے جاکے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میری خطائیں معاف کر دیں۔ خدا بھی اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے۔

گاڑی تیز رفتاری سے دلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں کھڑکی پر سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کتنے اسٹیشن آئے اور گزر گئے ہیں۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل سی چل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد کسی نے میری پشت پر تھپکی دی تو میں ہڑبڑا سا گیا۔ مارٹی ہاتھ میں چائے کا گلاس لیے سامنے کھڑا تھا اور ابا جان سمیت اُن سب کی نگاہیں مجھی پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈبے میں روشنی بہت کم ہو گئی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیری ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر اُمڈتا ہوا شور ڈبے میں گونج رہا تھا۔ میں سمجھا دلی آگئی ہے۔ میں نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں مارٹی سے پوچھا۔ وہ پلکیں جھپکانے لگا۔

"دلی ابھی دُور ہے راجا استاد!" اس نے چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی یہ گڑھ مکتیشر آیا ہے۔"

مجھے مارٹی کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن دلی آجاتی تو وہ سب اُترنے کی جلدی کرتے۔ گڑھ مکتیشر مرادآباد سے دلی کا آدھا فاصلہ بھی باقی تھا۔ میں نے مارٹی کے ہاتھ سے چائے کا گلاس لے لیا۔ منع کرتا تو وہ فضول میں اصرار کرنے لگتا۔ میرے مقابل کی نشست پر دیوار سے ٹیک لگائے ابا جان نیم دراز تھے۔ پیرو اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ مرزا دروازے پہ کھڑا تھا۔ مرادآباد سے چلنے والے دونوں مسافر اب ڈبے میں موجود نہیں تھے۔ میں نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ پیرو اُٹھ کے میرے پاس آگیا اور میری گردن میں بازو ڈال کے مجھ سے پوچھنے لگا۔ میں کسمسا کے رہ گیا۔ "ابا جی کیا سوچتا ہے لاڈلے بھائی؟" پیرو مجھے گدگداتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

میں سر جھکائے خاموش رہا۔

"اپنے کو نہیں بولے گا؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میرے دل میں آیا پیرو سے کہہ کے پوچھوں۔ اچھا ہے ابا جان کو بتا دینا چاہیے کہ میں دلی سے اُن کے ساتھ جانے کے بجائے حیدرآباد جانے والی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ حیدرآباد سے بمبئی زیادہ دور نہیں ہے۔ اُن کے پہنچنے کے دو تین روز بعد میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ پیرو سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ابا جان سے کوئی بھی عذر کر دے گا لیکن وہ اُن سے کیا عذر کر سکتا ہے۔ فیض آباد میں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ابا جان میرے اچانک راستہ بدل دینے اور ساتھ چھوڑ جانے سے بہت حیران ہوں گے۔ وہ پیرو سے طرح طرح کے سوال کریں گے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خاموش ہو جاتے مگر اب وہ بہت کشمکش میں پڑ جائیں گے اور اگر کچھ کہیں گے نہیں تو اُن کے دل میں بے شمار وسوسے پیدا ہوں گے۔ یہ بہت عجیب بات ہے نو سال بعد جانی بہنوں کو دیکھنے کی صورت پیدا ہوئی ہے اور میں جا رہا ہوں۔ ابا جان کو خود بھی فرخ، فریال، نادرہ اور اکبر کی صورتیں دیکھنے کی بہت بے چینی ہوگی۔ نو سال سے وہ جس دن کی آرزو کر رہے تھے، وہ دن قریب ہی تھا۔ اب وہ دن آنے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جہانگیر بھی انھیں مل گیا تھا۔ امی اور تجمل انھیں بہت یاد آرہی ہوں گی۔ ابا جان جہانگیر کو بھی فیض آباد سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ تجمل نے روک دیا۔ بہرحال میں ساتھ تھا۔ فرخ، فریال، نادرہ اور اکبر کے لیے میں مر چکا ہوں گا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے اُن کی حیرت اور مسرت کا ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ابا جان مجھے اُن کے سامنے لے جاکے پہلے پہیلیاں بجھوائیں گے کہ پہچانو یہ کون ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے شاید فرخ پہچان لے یا بھی۔ جہانگیر پہلی نظر میں مجھے نہیں پہچان پایا تھا۔

ابا جان کی اس وقت ایک ہی تمنا ہوگی کہ جلد سے جلد بمبئی پہنچ کے مجھے اُن کے سامنے کھڑا کر دیں۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے اُن کی آنکھیں ترس رہی ہوں گی۔ درمیان میں میرے چلے جانے سے

…یں بےحد اذیت ہوگی۔ پیرو انھیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش
…ے گا لیکن ظاہر ہے وہ اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔
…ں میں خود اُن سے کہہ سکتا کہ صرف دو دن کے لیے مجھے اجازت
…دیجیے۔ میری آنکھیں بھی اُن سب کے چہرے دیکھنے کے لیے
…تاب ہیں شاید ابا جان سے زیادہ۔ فیض آباد میں وہ مجھے
…اور بمبئی جانے کے آثار نظر نہیں آتے تھے تو سب سے زیادہ
…لی بھی کر رہی تھی۔ بمبئی میں مولوی اکرام کے فلیٹ پر میں کئی
…ایا گیا تھا۔ کرشنا جی نے سارے ہندوستان کے تھانوں میں گشتی
…روانہ کیے تھے۔ انھی خطوط کے نتیجے میں ابا جان کا سراغ مل
…تھا۔ ابا جان نے مجھے نہیں ڈھونڈا مگر میں نے پنجل نے کرشنا جی
…نہیں پا سکا۔ اسے انھیں ڈھونڈا تھا۔ سلطان، سرلا، بمبئی، پٹھو،
…شن، یہاں پیرو، زورا، مارٹی، ہلاکو سبھی اس میں شامل تھے۔
…جان کا تھے اور بہت سے لوگ علیحدہ غور کیا جائے تو وہ سبھی
…جان ہی کی وجہ سے ترنت گئے تھے۔ یہاں بھی جہاں جہاں
…و قبل جاتے ہیں مولوی صاحب کے ساتھ انھیں بھی پوچھتے
…بمبئی میں جو ہر لیب کے پاس جہاں وہ کرا کے لائے گئے تھے
…پہنچتے تھے میں نے اور کرشنا جی نے اُن سے اُن کا پتا حل
…کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ ممکن ہے ابا جان کو پنجل نے کچھ
…و کرم نے کوئی در کوئی گھر نہیں چھوڑا تھا۔ فیض آباد میں مجھے
…ی جھلک مل جاتی کہ فرخ، فریال وغیرہ بمبئی میں مولوی اکرام
…ت میں ہیں تو میں شاید کسی سے کہے بغیر بمبئی چلا جاتا۔ میں
…نہ ٹھہرتا۔ مجھے اپنی ننھی پارہ صفت فرخ اور بھوری آنکھوں
…ے بالوں والی فریال کو گلے لگانے کی ابا جان سے زیادہ حسرت تھی۔
مجھے پہلے انھی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ یقیناً میں دو دن
…بمبئی سے حیدرآباد جا سکتا ہوں لیکن دو دن کیا، مجھ سے تو
…بھی نہیں گوارا ہو رہا۔ ایسی صورت میں میں انھیں کیا دیکھ
…گا اور اُن سے کیا بات کر سکوں گا۔ مجھے پہلے حیدرآباد کا
…ہے گا۔ اتنے عرصے بعد تو مولوی صاحب کا کوئی نشان ملا تھا۔
…ل بھروسا نہیں کہ کل وہ اپنا گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیں کہ کسی
…ت نکل جائیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے مجھے
…کسی کو خبر کیے بغیر سرائے خانے کے رجسٹر پر مندرج پتے پر پہنچ جانا
…مجھے ایک طرف سے تسلی ہوگئی تھی کہ فرخ، فریال وغیرہ
…اکرام کے ساتھ ایک گھر میں محفوظ ہیں۔ ابا جان کا انتظام
…ی ترنت کے سفر کو نکلے تھے اور اب ابا جان انھی کے پاس
…جا رہے ہیں۔ پیرو، زورا اور مارٹی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ایک
…ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اُن سب سے بچھڑے

ہوئے جہاں اتنے برس گزر گئے ہیں وہاں دو دن اور سہی۔ جب
تک میں وہاں پہنچ نہ جاؤں بہتر ہے ابا جان اُن سے میرا تذکرہ ہی
نہ کریں۔ ادھر حیدرآباد میں وہ بہت اکیلی ہوگی۔ فرخ، فریال کی سا
انتظار نہیں ہے۔ انھیں میرے بارے میں کوئی علم ہی نہیں لیکن وہ تو
اپنی آہٹ پر بھی چونک جاتی ہوگی۔ فرخ، فریال ایک دوسرے کے
ساتھ ہیں اُس کا وہاں کوئی بھی ہم زباں، ہم نفس نہیں ہوگا۔ زہرہ
کہتی تھی کہ وہ کسی کو اپنا حال نہیں بتاتی۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں
کرتی۔ مولوی صاحب کی دیوار کے سائے کے باوجود وہ بے سایہ
تھی۔ ہر دم ہر پل اُس کی اس بند چھت ٹوٹ جاتی ہوگی۔ ابا جان کو
نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ میں انھیں کیا بتاؤں کہ یہ وہی لڑکی ہے
جسے انھوں نے اپنے گھر میں پناہ دینے میں پہل کی تھی اور
جس کے لیے میں گھر سے چلا آیا تھا۔ اُس کے لیے میں نے لوٹے
سات سال جیل میں کاٹے تھے۔ ابا جان کی وہ کوئی نہیں ہوتی
تھی لیکن میرے لیے سبھی کچھ تھی۔ ابا جان نے اب تک نہیں سمجھا تھا
تو انھیں اب سمجھ لینا چاہیے کہ میں اُس کے بغیر شاید کچھ بھی نہیں
ہوں۔ وہ مجھ سے دور ہے، مجھ سے الگ نہیں۔ میں اُس کا کوئی روپ
ہوں یا وہ میرا وہ سارا روپ ہے۔

پیرو میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن میں اُس سے حیدرآباد
جانے کے متعلق اپنے ارادے کا ذکر کرتے کرتے رہ جاتا تھا۔ چلتے
ابا جان کی نظریں بھی مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں میرے
بارے میں کچھ شبہ سا ہوگیا ہے یا یہ میرا وہم تھا۔ وہ آنکھیں کھولے
کسی سوچ میں گم تھے اور ایک دم چونک کے میری طرف دیکھنے
لگتے تھے۔ میں اُن کے سامنے پیرو سے کوئی بات کرتا اور بعد میں
پیرو اُن سے میرے حیدرآباد جانے کا کوئی جواز پیش کرتا تو وہ
فوراً سمجھ جاتے کہ پیرو کو میں نے مجبور کیا ہے۔ پیرو کا کوئی کام نہیں
میاں جی کا کام ہے۔ میں نے انتظار کیا کہ ابا جان کی توجہ کسی دوسری
جانب مبذول ہو تو میں پیرو کو بتاؤں۔ مالوڑ اسٹیشن بھی آ کے گزر
گیا۔ مالوڑ آنے کا مطلب تھا کہ دلی صرف تیس میل دور رہ گئی
ہے۔ ڈبے میں کم روشنی کے ننھے روشن ہو گئے تھے اور کھڑکی سے
باہر کچھ نظر آنا مشکل ہوگیا تھا۔ گرد شیشے کی مجبور کرنے کے بعد
گاڑی کی رفتار کسی قدر سست پڑ گئی تھی۔ غازی آباد بھی آ گیا۔
ابا جان نے ایک پل کے لیے پلکیں بھی جھپکائیں اور گاڑی دلی کی
حدود میں داخل ہوگئی۔ اب ایک ہی صورت تھی اگر پیرو سے کوئی
بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تو زورا اور مارٹی کو سمجھا کے میں دلی
اسٹیشن ہی پر کہیں گم ہو جاؤں۔ دلی اسٹیشن بہت بڑا ہے۔ میں
وہاں ہجوم میں رل مل سکتا ہوں۔ میری جیب میں ایک دو روپے

ہی پڑے تھے لیکن روپوں کے بغیر مجھے اپنا سفر کسی نہ کسی
طرح جاری رکھنا تھا۔

دلی اسٹیشن پر میرے قدم جیسے رک سے رہے تھے۔ دس نمبر پلیٹ
فارم پر گاڑی آ کے ٹھیری تھی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔
سارا اسٹیشن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور ہر طرف گاڑیوں، مسافروں،
قلیوں کا شور پھیلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات دس بجے کے
قریب حیدرآباد کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس دوران
وقت تبدیل ہوگیا ہو تا ہم میں ناگ پور تک جانے والی کسی گاڑی
میں بیٹھ سکتا تھا یا ایسی کسی گاڑی میں جو اورنگ آباد تک جائے۔
ایسی ایک گاڑی بھی بھوپال اور منماڑ سے گزرتی ہوئی بمبئی تک جاتی
تھی اور منماڑ سے مجھے اورنگ آباد اور حیدرآباد کے لیے دوسری
گاڑیاں مل سکتی تھیں۔ ابا جان چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ مارٹی اور
زورا مختصر سامان کے ساتھ اُن کے ہمراہ تھے۔ میں کچھ دیر تک اُن کے
پیچھے پیچھے پیرو کے ساتھ چلتا رہا پھر جب وہ کچھ اوجھل ہوگئے تو
میں نے پیرو کا ہاتھ پکڑ کے آہستگی سے کہا: "دادا! مجھے تم سے ایک
بات کرنی ہے۔"

پیرو ایک لمحے کے لیے رک گیا اور میری طرف تعجب
نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "اپن جانتا ہے تو ابھی کون سی بات
بولنا مانگتا ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو؟" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔
"تم اکیلا کدھر کو بھی نہیں جانے کو مانگتا!"
"دادا!" میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔
وہ مجھے سینے سے چپکاتے ہوئے بولا: "اپن جانتا ہے۔"
"دادا! میرا اُدھر جانا ضروری ہے۔" میری آواز بھرّا گئی۔
وہ سر ہلانے لگا: "اپن بھی تمھارے ساتھ چلے گا۔"
"نہیں دادا! تم ابا جان کے ساتھ جاؤ۔ میں تم سے وعدہ
کرتا ہوں جلدی واپس آ جاؤں گا، دیر بالکل نہیں کروں گا۔ تم ابا جان
سے کوئی بہانہ کر دو۔ میری طرف سے مت کہنا۔"
"اپن نے بڑے صاحب سے بول دیا ہے۔"
"تم نے، تم نے اُن سے بات کر لی ہے؟"
"دلی سے پہلے ہی اُس کو بولا تھا۔"
"تم نے اُن سے کیا کہا؟"
"بول دیا راجا!" وہ ہنس کے بولا: "اپن نے بولا، ابھی ہم زورا
اور مارٹی کے ساتھ سیدھا بمبئی جاؤ۔ اپن لوٹ کے آتا ہے۔"
"پھر وہ کیا بولے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔
"تھوڑا دیر چپ رہا پھر بولا: ٹھیک ہے۔ اپن بھی تمھارے

ساتھ چلے گا۔"
"نہیں، نہیں۔"
"اپن نے منع کرا پر وہ بولا، ابھی سب ساتھ ساتھ ہی بمبئی
چلے گا۔ دو تین دن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو تین دن بعد اپن
لوگ بمبئی پہنچ سکتا ہے۔"
"مگر تم نے اُن سے کس طرح کہا تھا؟"
"وہی جو اپن بولتا ہے۔"
"میرا تو نہیں بتایا تھا؟"
اُس نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا۔ ابا جان، زورا اور
مارٹی آگے مسافروں میں گم ہو گئے تھے: "ابھی تھوڑا بہت چلنا
ہے۔" وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"دادا، دادا!" میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی: "میری
بات سنو۔"
"گاڑی کا ٹیم نکلا جاتا ہے راجا!"
"پہلے میری ایک بات سن لو۔"
وہ ٹھیر گیا: "ابھی سب ٹھیک ہے راجا!"
"دادا! اُن سے کہو وہ چلے جائیں۔ اُن کو ہمارے ساتھ جانا
مناسب نہیں ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔
"اپن اُس سے ایسا نہیں بول سکتا۔"
"انھیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے
چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں تم بھی مت جاؤ،
خواہ مخواہ تم سب پریشان ہو گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"
"اپن سب سمجھتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا۔
"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ تمھارا اور سب کا
وہاں جانا بالکل لاحاصل ہے۔ تم بھی تنگ ہو گے، مجھ پر بھی بوجھ
بنے گا یا پھر..... پھر ایسا کرو صرف تم چلو اور اِن سب کو بمبئی
کی گاڑی میں بٹھا دو۔"
"وہ لوگ نہیں مانے گا راجا! اپن نے بول کے دیکھا ہے۔"
"لیکن تم، تم....."
"ابھی اُدھر جا کے دیکھے گا۔ چلو اِدھر سے نکلے۔"
"ٹھیک ہے پھر میں بھی بمبئی چلتا ہوں۔"
پیرو میری بات سنی اَن سنی کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ابا جان،
زورا اور مارٹی ہمارے انتظار میں آگے جا کے رک گئے تھے۔ ہم
اُن کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جانے والی گاڑی روانہ
ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔ میں نے اُن کے پیچھے پیچھے ہو کے
وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن پیرو میرے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ اس

نے جیب سے روپے نکال کے مارفی اور زورا کو دیے اور انھیں
پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ٹی ٹی سے ٹکٹ کی تبدیلی کے متعلق
معلومات کرنے کی ہدایت کی۔ اُن کے واپس آنے سے پہلے ہم
فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے تھے۔ میں نے باہر
ڈبوں پر لگی ہوئی تختیوں میں حیدرآباد کا نام دیکھ لیا تھا۔ اب کچھ
سننے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی بھی چل پڑی۔
میرے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔

آج کی رات کل کا پورا دن کل کی ساری رات پھر کہیں
دوسرے دن دوپہر کو یہ سفر ختم ہونا تھا۔ درمیان میں گاڑی لیٹ
ہوجائے تو شام بھی ہوسکتی تھی رات بھی۔ ریل گاڑی کے سوا اور
کوئی تیز ترین ذریعہ نہیں تھا۔ دلی اسٹیشن کے دور ہوتے ہی انھوں
نے فرش پر چادر بچھا کے کھانا لگا دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں
بھی ان کے ساتھ فرش پر آگیا۔ صبح فیض آباد سے چلتے ہوئے زلیخا
نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا تھا کہ دوپہر کو کھانے کے باوجود
باقی رہ گیا تھا۔ ثنا میری طرح کسی کو بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ ابا جان
نے چند لقمے لیے ہوں گے کہ ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اُن سب کے نوالوں
سے بیشمار بار الٹے حلق میں اٹک رہے تھے۔ نیساں نے میٹھے چاول
بطورِ خاص میرے لیے پکائے تھے۔ مجھ سے وہ بھی نہیں کھائے گئے۔
انھوں نے جیسے ہی کھانا سمیٹا میں اوپر کی برتھ پر جا کے لیٹ گیا۔
ابا جان میری برتھ کے عین نیچے تھے اس لیے نہ وہ مجھے دیکھ سکتے
تھے نہ میں انھیں۔ ڈبے میں چھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ دو پہلے
سے موجود تھے۔ ایک خوش پوش جسامت مند، سانولے رنگ اور
بھرے ہوئے چہرے کا نوجوان۔ دوسری اُس کے ساتھ سونے جیسی
رنگت، کتابی چہرے کی ایک لڑکی۔ اُس نے کاسنی ساڑی پہن رکھی
تھی۔ کانوں میں سفید آویزے لٹک رہے تھے۔ گلے میں ہار، ہاتھوں
میں چوڑیاں۔ وہ نوجوان کی بیوی ہوسکتی تھی یا بہن بھی۔ ڈبے میں داخل
ہوتے وقت میں نے اُسے ایک نظر ہی دیکھا تھا اور نہ جانے
کیوں مجھے شبہ ہوا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔
بعد میں مجھے اُس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہ ہم سب کی طرف پیٹھ
کرکے اور ساڑی کا پلو سر پر ڈال کے کونے میں بیٹھی رہی۔ ہم پانچ
آدمیوں کو ڈبے میں دیکھ کے نوجوان نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا
لیکن پھر ثنے اُسے سمجھایا کہ ایک مزید آدمی کی موجودگی سے اُسے
کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ چپ تو ہوگیا مگر دیر تک اُس کے چہرے پر
کھچاؤ رہا۔ ڈبے میں برتھیں بھی صرف چھ تھیں۔ تین اوپر تین نیچے
کی برتھوں پر نوجوان اُس کے ساتھ والی لڑکی اور ابا جان تھے اور
ایک پر میں۔ دوسری پر ثنے، تیسری پر ایک دوسرے کے سروں کی طرف
پیر کیے زورا اور مارفی۔ برتھ پر آکے میں نے جیسے ہی آنکھیں موندنے
کی کوشش کی میرا دل ڈوبنے سا لگا جیسے میں کہیں گرنے لگا ہوں۔
میں نے پھر آنکھیں بند ہی نہیں کیں۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کا شور بڑھ گیا تھا۔ رفتار بہت
تیز تھی۔ ڈبے میں ہلکی روشنی کا بلب روشن کردیا گیا تھا۔ پھر زورا
اور مارفی جلد ہی بے سُدھ ہوگئے۔ گاڑی چلے ہوئے دیر ہوچکی
تھی۔ اوپر میری طبیعت بہت گھبرانے لگی تو میں نے نیچے اُترنے
کا ارادہ کیا مگر سب کی نیند میں خلل پڑنے کے خیال سے وہیں پڑا
رہا۔ مجھے حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ نیچے ایک عورت بھی موجود تھی۔
میرا اُترنا ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ ظاہر ہے میں ابا جان ہی کی برتھ
پر جاکے بیٹھ سکتا تھا۔ باقی دو برتھوں پر نوجوان اور لڑکی آرام کر رہے
تھے۔ اسی دوران کسی لمحے میں نے کروٹ بدلی تو میری نظریں بھی
اس لڑکی پر گئیں جو نیچے میری برتھ کے عین مقابل لیٹی تھی۔ وہ بھی
جاگ رہی تھی۔ کم روشنی کے باوجود میں اس کا سانولا چہرہ اچھی طرح
دیکھ سکتا تھا۔ اُسے فوراً احساس ہوگیا کہ کوئی اُس کی جانب دیکھ رہا
ہے۔ ایک ثانیے کے لیے اُس کے سارے بدن میں ایک لہر سی
گزر گئی۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اُس نے اپنا منہ چشم زدن
میں دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے پھر وہی گمان ہوا جو اُسے پہلی بار دیکھ کے
ہوا تھا۔ میں نے یقیناً اُسے پہلے کہیں دیکھا تھا۔ کہاں اور کب؟ یہ کچھ
یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ ایک بار نہیں کئی
بار میں نے اُسے دیکھا تھا۔ پھر یکایک مجھے یاد آیا۔ ہو نہ ہو یہ سونیا
ہے۔ سونیا کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ جیل میں میں نے امتحانات دینے
شروع کیے تھے اور ایف اے میں اوّل آیا تھا تو جیلر صاحب اتنے
خوش ہوئے کہ مجھے بیوی بچوں سے ملانے اپنے گھر لے گئے۔
اُن کے گھر والے مجھے دیکھ کے سہمے ہوئے تھے۔ جیلر صاحب نے
انھیں بتایا، یہ ہے وہ قیدی لاڈلا۔ نام اس کا خیر خاں ہے مگر جیل
میں سب اسے لاڈلا کہتے ہیں۔ بعد میں میں اُن کے گھر باقاعدہ
آنے جانے لگا تھا۔ جیلر صاحب میری تعلیم میں خاصی دلچسپی لیتے
تھے۔ ہر امتحان میں اوّل آنے پر وہ انعام میں مجھے کتابوں کا
تحفہ دیا کرتے تھے۔ وہ جیلر صاحب کی لڑکی سونیا تھی۔

اسی دلچسپ سرگزشت کے
بقیہ واقعات تیسرے حصے
میں ملاحظہ فرمائیے